سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

ماہنامہ

سرگزشت کراچی

دسمبر 2017

نگران اعلیٰ
معراج رسول



ماہر ریاضی: اس شخص کی روداد جسے شاعر مشہور کیا گیا

ادب کا قطب: اردو کے ایک معروف قلم کار کا زندگی نامہ

عشق گزیدہ: ایک ایسے انوکھے عشق کی داستان جو آپ کو حیران کردے گی

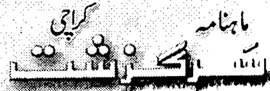
قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

شاعرِ رومان

اس کی پیدائش 31 فروری 1911ء کو سلطان محمد خان کے گھر ہوئی تھی۔ اسے صرف تین سال کی عمر میں مولوی ابراہیم سیالکوٹی کے زیرِ تربیت دے دیا گیا تھا۔ 1915ء تک اس نے قرآن شریف کے دو پارے حفظ کر لیے تھے۔ پھر اسے 1916ء میں اردو فارسی کی تعلیم کے لیے بٹھا دیا گیا۔ 1921ء میں سیالکوٹ کے مشہور اسکول اسکاچ مشن ہائی اسکول کی چوتھی جماعت میں داخلہ دلوایا گیا۔ اس اسکول سے اس نے 1927ء میں فرسٹ ڈویژن سے میٹرک پاس کیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد اس نے مرے کالج سیالکوٹ میں داخلہ لیا۔ وہ فارسی اور انگریزی میں اچھی خاصی قابلیت حاصل کر چکا تھا، درسی کتابوں کے علاوہ وہ غیر نصابی کتابوں کا مطالعہ بھی کرتا رہتا تھا۔ اسے فارسی اور اردو شاعری سے عشق ہوتا جا رہا تھا اسی دوران میں اس نے خود بھی شاعری کی کوشش شروع کر دی اور 1928ء میں اس نے پہلی غزل کہی۔ 1929ء میں اس نے امتیازی نمبروں سے انٹرمیڈیٹ کر لیا۔ مرے کالج سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد وہ لاہور آ گیا۔ یہاں آ کر اس نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا اور اسی کالج سے اس نے 1931ء میں بی اے آنرز کیا۔ وہ ایم اے کی تیاری کرنے لگا۔ اور 1933ء میں اس نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے کر لیا۔ 1934ء اس نے دوسری بار ایم اے کیا اور اسی سال اس کا پہلا مضمون بھی شائع ہوا۔ اس نے امرت سر کے ایم اے او کالج میں ممبرشپ کے لیے درخواست بھیج دی۔ تعلیمی کیریئر شاندار تھا اسے فوراً منتخب کر لیا گیا۔ اس کالج میں دو مشہور افسانہ نگار محمد الظفیر اور ڈاکٹر رشیدہ جہاں بھی تھے۔ ڈاکٹر رشیدہ جہاں نے اس کے اندر چھپے ہوئے جوہر کو پہچان لیا۔ اور اسے مشورہ دیا کہ وہ رومانی شاعری کی بجائے عملی کام کی طرف قلم کا رخ موڑ دے...... کیونکہ زندگی میں غمِ جاناں کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ یہ بھوک سے تڑپتے بچے، یہ ننگی انسانیت کا بھی کچھ تقاضا ہے ان پر بھی کچھ لکھو۔ 1935ء میں ڈاکٹر ملک راج آنند، صاحب زادہ محمود الظفر، سید سجاد ظہیر اور ڈاکٹر تاثیر نے لندن میں منصوبہ بنایا کہ وطن لوٹ کر ترقی پسندوں کی ایک تنظیم بنایا جائے۔ 1936ء میں سجاد ظہیر نے وطن لوٹ کر ملک کے ممتاز ادیبوں سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ بہت سارے لوگ جمع ہو گئے نیاز فتح پوری نے بھرپور حوصلہ افزائی کی، منشی پریم چند نے تو تائید کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے انعقاد کرنے کا اعلان بھی کر دیا۔ لکھنؤ میں یہ کانفرنس منعقد ہوئی اور اس کی صدارت کے لیے بھی منشی جی کو چنا گیا۔ اس کو اس انجمن سازی کی خبر ہوئی تو وہ بھی اس میں شامل ہو گئے اور پھر آہستہ آہستہ اس انجمن کے روحِ رواں بن گئے۔ اسی دوران میں ڈاکٹر ڈی ایم تاثیر ایم اے او کالج کے پرنسپل بن کر آئے۔ (سلیمان تاثیر کے والد) ڈاکٹر ڈی ایم تاثیر نے ایک یورپین لڑکی سے شادی کی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد سلیمان تاثیر کی خالہ بھی ڈاکٹر تاثیر کے پاس آ گئیں ان کا نام ایلس تھا۔ وہ ڈاکٹر تاثیر سے ملنے پہنچے تو ان کی ملاقات ایلس سے ہو گئی۔ پہلی ہی نظر میں ایلس انھیں بھا گئی اور وہ اس پر دل و جاں سے فدا ہو گئے۔ ایلس مغربی تہذیب کی پروردہ تھی اپنی مالک آپ تھی لیکن فیض کا گھرانا کٹر مذہبی تھا۔ اسی کشمکش میں دو سال گزر گئے اور ماں کو بیٹے کی خواہش پوری کرنا پڑی۔ اجازت ملتے ہی وہ ایلس کو لے کر سرینگر پہنچ گئے ان کے ساتھ بڑے بھائی بھی تھے۔ شادی سادگی سے ہوئی۔ ایلس کی اس کی زندگی میں آنے کے بعد اس کی شاعری نے ایک نیا موڑ لے لیا۔ ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی اس نے رومانی غزلیں خوب کہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اردو ادب میں ایک بڑا مقام حاصل کر لیا۔ اس شاعر کو ہم فیض احمد فیض کے نام سے جانتے ہیں۔

☆☆☆

جلد 27 ❖ شمارہ 11 ❖ دسمبر 2017ء



مدیرۂ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیر : پرویز بلگرامی

نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر

◆◆◆

منیجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

◆◆◆

سرکولیشن منیجر

سید منیر حسین

0333-3285269

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 800 روپے



پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

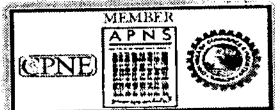
مقامِ اشاعت: C-63' فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ' کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس' ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200
E-mail: jdpgroup@hotmail.com



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

اس ماہ بھی ایک منی کہانی لیں جو یوں ہے کہ ایک محکمے میں دس ملازمتیں تھیں۔ سلیکشن بورڈ نے انٹرویو کے بعد لسٹ بنائی۔ ابھی میٹنگ برخواست بھی نہیں ہوئی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ فون سننے کے بعد ایک رکن نے کہا۔ ”یہ لو...... لسٹ فائنل ہوئی کہ منسٹر صاحب کی سفارش آگئی۔ ان کے بندے کو فٹ کرنے کے لیے اس لسٹ میں سے کس کا نام نکالوں؟“

”لسٹ میں شامل ان صاحب کی سفارش ایم پی اے صاحب نے کی ہے اور یہ نام میرے داماد کا ہے اور یہ نام داؤد صاحب کا بھیجا ہوا ہے۔“ کمیٹی کے صدر نے لسٹ کو سامنے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

منسٹر صاحب کا بھیجا ہوا نام ہم مسترد بھی تو نہیں کر سکتے۔ دیگر سفارشی بھی کسی نہ کسی کے بھیجے ہوئے ہیں۔ کہہ کر اس نے پھر سے لسٹ پر نظر ڈالی اور ایک نام پر انگلی رکھ کر بولا۔ ”یہی ایک نام ہے جس کی کسی نے سفارش نہیں کی، اسی کا نام نکال دیتے ہیں۔“

”لیکن یہ تو میرٹ پر آرہا ہے۔“

”تو کیا ہوا کسی کو رکھنے اور نکالنے کا اختیار تو ہمارے پاس ہے۔“

”صدر صاحب کی بات پر سب متفق ہوگئے۔“

یہی آج کا المیہ ہے۔ میرٹ کو ہم نے زمین کی گہرائی میں دفن کر دیا ہے اور پھر کہتے ہیں ہمارا ملک ترقی نہیں کر رہا ہے۔

معراج رسول

[redacted]

شہرِ خیال

مدیرِ اعلیٰ



☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کا تبصرہ کورنگی کراچی سے۔ ''چیف صاحب آپ کا کہنا درست ہے کہ ہم نے اپنے وطن کو کرائے کا گھر سمجھ لیا ہے اور اس کے ساتھ سلوک بھی ویسا ہی کر رہے ہیں۔ ہمارے رہبر و رہنما حکومت ہم پر کرتے ہیں اور اس کی ساری پلاننگ دبئی و لندن میں بیٹھ کر کی جاتی ہے اور اس میں حکومت و اپوزیشن کی بھی تفریق نہیں رہی۔ سب کے سب ایک دوسرے پر لندن پلان، دبئی پلان کی پھبتیاں کستے نظر آتے ہیں۔ ہمارے سرکاری ملازم بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے ہیں۔ کسی بھی وزارت کے کسی بھی محکمے کا کوئی معمولی سا افسر بھی پکڑا جاتا ہے تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ کروڑوں روپے کا چونا وہ قومی خزانے کو لگا چکا ہے اور مزید یہ کہ اس کی مہنگی ترین جائدادیں بھی دبئی و لندن میں موجود ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ پاکستان کو وہ اپنا گھر نہیں سمجھتے اور شاید کرایہ کا بھی نہیں کیونکہ کرایہ دار کو کم از کم کرایہ تو ادا کرنا پڑتا ہے، یہاں تو الٹا حساب ہے، سب کی لوٹ مار نے وطن کو گروی رکھ دیا ہے اور پوری قوم ششدر ہے کہ ہم اپنی آیندہ نسل کو ایک گروی گھر دیں گے۔ ''شہرِ خیال'' میں نزہت افتخار کو خوش آمدید اور پہلی آمد پر چیف صاحب کے توصیفی کلمات بھی۔ بشریٰ افضل اور روبینہ ثاقب انصاری پھر نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ بس خدا خیر کرے۔ حیدر دہلوی کی سخن سازی پر دو رائے نہیں ہو سکتی لیکن ان کی ازدواجی اور سماجی زندگی حیرت کی بھول بھلیاں تھیں جس میں صرف گم ہوا جا سکتا ہے سو ہم بھی ہو گئے۔ ''روایت شکن'' کے ہم منتظر تھے بلکہ بڑی شدت سے منتظر تھے کہ گلوبل اساتذہ کی ٹاپ ٹین میں شامل سلیمہ بی بی کے حالات جان سکیں۔ زویا اعجاز نے کمال کر دیا، ہمیں سلیمہ صاحبہ سے ملوا کر ان کا اعزاز ان کی انتھک محنت، شوق، لگن اور جنون کی بدولت ہے۔ یاد کرتا ہے زمانہ انہی انسانوں کو، بھیانک سازش گو کہ ہمارے لیے نئی نہیں تھی لیکن اپنی انفرادیت کی وجہ سے وہ ہم کو بھائی ہے۔ ابراہم لنکن کی غلاموں کی تجارت کے خلاف کی گئی جدوجہد امریکی قوم کا احسانِ عظیم ہے، پوری مغربی اقوام پر اور اپنے عظیم رہبر کا قتل سیاہ دھبا ہے امریکی قوم پر۔ ''انوکھی شادیاں'' بہت عرق ریزی سے تیار کی گئی تفصیل تھی اور اپنے عنوان کی طرح انوکھی بھی۔ بھیڑیے کسی بھی ملک میں ہوں جانور ہی کہلاتے ہیں۔ سفینہ جیسی خواتین کئی ملکوں میں بیک وقت ایک جیسے حالات سے نبرد آزما ہیں۔ ایک ہی قسم کے بھیڑیوں کے سامنے۔ ''سیریل کلر'' واجبی جب کہ ''گمشدہ شہزادی'' مناسب تھی۔ ندیم اقبال صاحب کی تحریر میں پری جمال کے قصے کو ہم سمجھتے ہیں کہ وہ نظر و ٹو سے زیادہ کچھ نہیں۔ محترم فلمی انداز سے گریز کریں۔ آپ کو اپنے اندازِ بیان میں کسی تجربے یا کسی تڑکے کی ضرورت ہے ہی نہیں۔ ''عکس بند'' اپنی کھوج کا حق ادا کر رہی تھی۔ ''ناسور'' حسبِ توقع تشنگی لیے ہوئے تھی جب کہ اس مرتبہ پارچے سب کے سب شاندار تھے۔ تمام مراسلہ نگاروں کا شکریہ۔ اب آتے ہیں حاصلِ مطالعہ ''شومین'' کی طرف۔ شومین میں سید نور کا کوئی شریک تھا تو وہ مرحوم شباب کیرانوی صاحب تھے۔ کیا شاندار فلمیں اور شاندار فنکار انہوں نے فلم انڈسٹری کو دیے۔ سید نور کے بارے میں اتنی تفصیل ایک ساتھ ہم نے پہلی مرتبہ پڑھی۔ بہت سی بشری کمزوریاں شاہ صاحب ہوتے ہوئے بھی ان کی مجاجن کے ظلم شاہ کی طرح ان میں بھی ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مجاجن فلم کی کہانی ان کی اور صائمہ کی ذاتی کہانی ہے جو فلمائی گئی۔ ہمارے خیال میں پاکستانی فلمی تاریخ میں صائمہ اور سید نور کو زندہ رکھنے کے لیے یہ ایک فلم ہی کافی ہے۔ اداکار ادیب کو ساری زندگی کوئی ایوارڈ نہیں ملا لیکن سید نور نے انہیں ظل شاہ کے والد کے کردار میں پیش کر کے ان کی ہر محرومی کا ازالہ کر دیا۔ بلاشبہ سید نور کی ہر فلم جاندار اور خوب صورت ہوتی ہے بھلے وہ باکس آفس کے کسی بھی خانے میں فٹ بیٹھتی ہو۔ صائمہ نور کا حسن توبہ شکن ہے لیکن سید نور کوئی عام سے مرد نہیں ہیں۔ سید کی اعلیٰ و ارفع ذات کے امین ہیں۔ کیسے رخسانہ نور کی حق تلفی کر بیٹھے اور اگر کر ہی بیٹھے تھے تو ان سے اجازت لے لیتے تو ان کی حقیقی مجاجن شاید انہیں مایوس نہ کرتی۔ کیونکہ فلم مجاجن میں ان کی بیوی کا کردار ادا کرنے والی مدیحہ شاہ جیسی وہ ہرگز نہیں تھیں۔ سید نور اور صائمہ اپنی لو اسٹوری میں رخسانہ نور کا

فلمی کردار تخلیق کرتے وقت یہ بھول گئے تھے کہ حقیقت کھلنے پر وہ خود کو ویمپ کے روپ میں برداشت نہیں کر پائیں گی۔''

☆ منشی محمد عزیز مے لڈن ضلع وہاڑی سے لکھتے ہیں۔ ''نومبر کا شمارہ ایک دوست کے ہاتھوں 24 اکتوبر کو منگوایا۔ ''شہرِ خیال'' کا سرسری جائزہ لینے پر اپنا خط نظر آ ہی گیا۔ شکریہ اور اقتباسات کی اشاعت کے لیے ڈبل شکریہ۔ سرورق پر ایک اداس چہرہ نظر آیا۔ اداریہ میں ایک اور مختصر مگر سبق آموز کہانی کا ذکر تھا۔ یک تھمی داستاں میں فیض احمد فیض کے والد محترم کا ذکر خیر تھا۔ شہرِ خیال میں پہلی مرتبہ حاضری لگوانے والی نزہت افتخار کو ایک ماہ کی صدارت مل گئی، مبارک باد۔ نزابت افشال کو کس قلمکار کے فون نمبر کی ضرورت پڑ گئی؟ ''سخن ساز'' کے حیدر دہلوی کا نام میرے لیے نیا تھا، تفصیل حالات زندگی سے حاصل ہوئی۔ ''روایت شکن'' ایک باہمت اور پُرعزم خاتون کی داستان تھی۔ زویا اعجاز زبردست لکھ رہی ہیں۔ سید احتشام کی ''بھیانک سازش'' میں بہت سی بین الاقوامی مخفی باتیں عیاں ہوئیں۔ انوکھی شادیاں وسیم بن اشرف کی بھرپور اور بہترین تحقیقاتی تحریر تھی، مبارکباد۔ اس ماہ کی بہترین تحریر بھیڑیے تھی۔ جس کو پڑھ کر دل غموں کے گہرے سمندر میں ڈوب گیا۔ کتنے بے بس تھے بوسنیا کے مسلمان جو کہ اپنے ہی وطن میں پردیسی بن بیٹھے۔ ''شومین'' میں سید نور کے عروج کی داستان کو بڑی باریک بینی سے محترم انور فرہاد نے پیش کیا۔ ''سیریل کلر'' انسان کے نام پر دھبا ہے انسان نما بھیڑیوں کا مختصر تذکرہ پسند آیا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں پری جمال کی مختصر داستان رنجیدہ کر گئی۔ مطیع اللہ کا ذکر پڑھتے ہوئے ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔ سرورق کی کہانی ''صاحب جی'' ایک نادان لڑکی کی کہانی تھی۔ ''بہنیں'' پڑھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ رفعت کا جذبہ قابل ستائش تھا۔ ''خوش بخت'' میں ابرار بے چارہ بیوی کو طلاق دے بیٹھا اور خوش بخت بھی ہاتھ سے گئی۔ ''محبت گزیدہ'' کا انجام خوش گوار تھا۔ ''کالی گوری'' میں تہمینہ کا کردار حیرت انگیز تھا۔ ''تعبیر خواب'' میں ڈاکٹر قرۃ العین کا عزم حیرت انگیز تھا۔ ''دل والا'' اسم با مسمّیٰ تھی۔ حیات بخش محبت کو سلام۔''

☆ موموا قبال سیالکوٹ سے لکھتی ہیں۔ ''شہرِ خیال'' میں آنے کا بہت دل کرتا تھا مگر خوف غالب تھا کہ میرا خط مسترد نہ ہو جائے۔ خیر......اب ہم آ چکے ہیں۔ یہاں کا ماحول بھی زبردست ہے۔ بشریٰ افضل کا خط پسند آیا۔ لیڈی کلر، بابائے جغرافیہ زبردست تھیں۔ اس کے علاوہ ناسور، گناہ گار، ٹھکرائی ہوئی لڑکی، سمندر، گدھ بہت اچھی تھیں۔ ہم بھی کچھ نہ کچھ جلد بھیج دیں گے۔ سب خوش وخرم اور خوشحال رہیے۔ ہماری دعا ہے۔''

☆ ذیشان ریاض کی آمد فیصل آباد سے۔ ''نیا شمارہ منیر لائبریری سے لیا تو موسم کی مناسبت سے سوچا تبصرہ لکھ لوں۔ پہلا صفحہ کھولا تو بکریاں چرانے والے پر نظر جا ٹھہری۔ بڑے لوگوں کے ماں باپ کے کارنامے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ ''شہرِ خیال'' میں نزہت افتخار کو ویلکم کہتے ہیں۔ میرے سسرالی شہر ساہیوال کی باسی جو ٹھہریں۔ الفاظ کا چناؤ بہت بہتر ہے۔ عبدالجبار رومی غائب تھے۔ کچھ نئے اور باقی پرانے قارئین سے سجا سلسلہ اچھا جا رہا ہے۔ حیدر دہلوی کی داستان حیات اچھی لگی۔ اتنے اچھے انداز کی تحریر ہے کہ انسان وقتی طور پر اپنے آپ کو وہاں محسوس کرتا ہے۔ ''بھیانک سازش'' میں کئی راز کھلے ''انوکھی شادیاں'' بھی دلچسپ رہی۔ ''بھیڑیئے'' کاشف زبیر کی سسپنس سے بھرپور رہی۔ ''شومین'' سید نور قلم اسٹار صائمہ خوش قسمت ہیں کہ سید نور کی صورت میں انہیں ہمسفر ملا۔ ''سیریل کلر'' بھی دلچسپ رہی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' ویری گڈ۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم بھی ندیم صاحب کے ساتھ کینیڈا میں ہی ہیں۔ نسرین اس دفعہ غیر حاضر تھی۔ ''عکس بند'' کیمرے کے بارے میں معلومات بہت دلچسپ رہی۔ اسکول لائف یاد آ گئی۔ اس وقت کیمرے بہت مہنگے ہوتے تھے۔ ''بیت بازی'' کے شعر پرانے ہیں۔ ''صاحب جی'' ہمارے معاشرے کی کہانی تقریباً ہر گھر کی ہے۔ مزمل سلیم تاندلیانوالہ کا پرانا موضوع ہے جس پہ کہانی لکھی ہے۔ جدید موضوع تلاش کریں۔ ''محبت گزیدہ'' مونا صاحبہ لاہور کی کہانی ہمارے معاشرے کے نیچرل کردار ہیں۔ آئندہ بھی آتی رہیے گا۔ جنوری میں ''مرگِ ناگہاں'' کے نمبر کا بے چینی سے انتظار ہے۔ ''کالی گوری'' سلمیٰ اعوان صاحبہ چالیس سال میری عمر ہے، مجھے تو کبھی ایسا کردار نظر نہیں آیا، ویلڈن جی۔ ڈاکٹر عظمیٰ فیصل آباد کی ''دل والا'' اچھی رہی۔ سلام قبول کریں۔ ثمینہ طاہر بٹ منجھی ہوئی لکھاری ہیں۔ اللہ زورِ قلم اور دے۔ آخر میں سب قارئین اور سرگزشت کی پوری ٹیم کو سلام۔''

☆ حسیب اشرف کا ای میل۔ ''قابل احترام مدیر میں اپنی غلطی کو مان رہا ہوں کہ میری کہانی کہیں اور بھی شائع ہو گئی لیکن یہ میری ہی تحریر کردہ کہانی ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ میں چربہ ساز ہوں اس لیے میری کہانیوں پر پابندی لگائی جا رہی ہے۔ میں پھر ایک بار کہہ دوں کہ میں چور نہیں ہوں، یہ سو فیصد میری کہانی ہے۔ ہوا یہ کہ آپ کو گزشتہ سال کے آخر میں یہ سچ بیانی ارسال کی تھی۔ جب کافی عرصہ انتظار کیا اور وہ شائع نہیں ہوئی تو اسے ایک دوسرے ڈائجسٹ میں بھیج دی جہاں وہ چھپ گئی۔ یہ میری غلطی تھی اور اس غلطی پر میں معافی کا طلب گار ہوں (آپ کی کہانی ہمارے ریکارڈ کے مطابق ہمیں 24 جون 2017ء کو موصول ہوئی، جسے اکتوبر کے شمارے میں شائع کیا گیا یعنی جولائی میں پڑھا گیا، اگست میں بورڈ نے متفقہ فیصلے سے منتخب کر کے مدیر کے حوالے کیا۔ ستمبر میں کمپوز ہو کر اکتوبر کے شمارے میں شامل اشاعت ہوئی۔ گویا درمیان میں صرف دو ماہ گزرے۔ اس کی واحد وجہ تحریر میں جھول تھی جسے دور کرنے میں وقت لگا۔ پاکستان کے کسی بھی اسپتال میں دل کا ٹرانسپلانٹ نہیں ہوتا۔ کئی ماہر

امراض قلب سے بھی پتا کیا اور اس خامی کو دور کیا گیا۔ کسی زندہ انسان کا دل ایک دوسرے شخص کے اندر پلانٹ کرنا جرم ہے کیونکہ دل نکلنے کے بعد وہ شخص مر جائے گا۔ ایسی غلطی دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہوسکتی کیونکہ اس طرح ڈاکٹر قتل جیسا جرم کر نہیں سکتا۔ اس قسم کی خامیوں کو دور کرنے میں وقت لگا۔ ایک بات اور بتادوں کہ کاپی رائٹ کے قانون کے مطابق اگر کوئی کہانی یا تحریر کسی جگہ شائع ہوتی ہے تو اس تحریر کا مالک ادارہ بن جاتا ہے پھر ادارے کی اجازت کے بغیر مصنف کسی دوسری جگہ اسے شائع کراتا ہے تو وہ پاکستان پینل کوڈ کے مطابق جرم ہے۔ یہ آپ سے نادانستگی میں غلطی سرزد ہوئی ہے اس لیے معافی ضروری ہے۔ اُمید ہے ایسی غلطی پھر نہیں ہوگی۔ اب دوبارہ سے آپ لکھنا شروع کردیں)۔"

☆ سدرہ بانو ناگوری کراچی سے لکھتی ہیں۔ "نزہت افتخار، 'نشیمِ خیال' میں خوش آمدید، خوب صورت تبصرے کے ساتھ صدارت کی کرسی کی بہت بہت مبارک باد۔ آپ آتی رہنا غائب مت ہوجانا۔ ندیم افضل میں اور میرا شہر کراچی خدا کے فضل و کرم سے بخیریت ہیں، بس کچھ پاگل اور جنونی قسم کے لوگ ہیں جنہیں اس شہر کا امن وسکون ہضم نہیں ہورہا۔ امجد علی اتنے سارے رسالوں میں تبصرے لکھتے ہیں تو یقیناً رسالہ پڑھتے بھی ہوں گے۔ پھر بھی آپ کو کہانی لکھنے کا انداز نہیں آیا۔ بھئی واہ کیا کہنے آپ کی معصومیت کے۔ "انوکھی شادیاں" اچھی نہیں لگی اِدھر اُدھر سے خبریں جوڑ کر تحریر کی شکل دی گئی ہے۔ زدیا اعجاز کی "روایت شکن" پڑھ کر مجھے بڑا افسوس ہوا کہ اس سے پہلے کبھی سلیمہ بیگم کا تذکرہ پڑھنے کو نہیں ملا۔ ملالہ یوسف زئی کی ڈائری نے اسے عالمی سطح پر خوب پذیرائی بخشی۔ آج دنیا کا ہر شخص اسے جانتا ہے مگر سلیمہ بیگم کے عزم اور کامیابی کو کسی نے کبھی متعارف کروانا بھی گوارا نہیں کیا، ایسا کیوں؟ یہ مفاد پرستی نہیں تو اور کیا ہے۔ اسے بے حسی کہیں کہ کیا کہیں۔ زدیا اعجاز آپ کا شکریہ کہ پاکستان کی اس بیٹی کو آپ نے سرگزشت کے صفحات پر رونق بخشی۔ "شمشال سے ٹورنٹو" میں ندیم بھائی آپ، سرجی اور شہباز ہی ٹورنٹو کی سرد ہواؤں میں ٹھٹھرنے کو کافی تھے۔ یہ مطیع اللہ کہاں سے "آ گئی"۔ یہ قسط بھی آخر تک دلچسپ رہی مگر سعد کے فون نے تجسس میں ڈال دیا ہے کہ نہ جانے نسرین کے ساتھ کیا ہوا ہو۔ بے چاری پہلے ہی بہت دکھی ہے۔ "ناسور" میں ڈاکٹر صاحب نے غضب کردیا۔ ڈاکٹر صاحب ہاتھ ذرا ہولا رکھیے۔ ہمارا دل ویسے ہی بہت کمزور ہے۔ "شومین" میں سید نور کا تذکرہ شوبز میں عشق معاشقے اور شادیاں کوئی نئی بات نہیں ہے مگر اس انڈسٹری کے ہر ستارے کو رخسانہ نور جیسی شریکِ حیات بھی تو نہیں ملتی۔ سید نور نے بڑی بے قدری کی۔ صائمہ کو اگر اس کا پچھتاوا ہے تو کہیں نہ کہیں دل کے کسی گوشے میں سید نور کو یہ غلطی بے چین کیے ہوئے ہوگی شاید اسی لیے انہوں نے اپنی فلم کا نام "چین آئے نہ" رکھ کر اپنے آپ کو کچھ تسلی دلاسے دینے کی کوشش کی ہو۔ "سیریل کلر" پڑھ کر چھرامار گروپ کی یاد آگئی جس نے شہر کراچی میں اپنی دہشت پھیلا رکھی ہے۔ "صاحب جی" میں وہی ہوا جو خوابوں کے پیچھے بھاگنے والیوں کا ہوتا ہے اس لیے کہتے ہیں کہ اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلانے چاہیے۔ سلمیٰ اعوان زبردست رہیں۔ احسان مندی اور طمانیت سے بھرپور عشق کے انوکھے راز اجاگر کرتی یہ تحریر بہت خوب رہی، ویلڈن۔ "زر، زن اور زمین" معاشرے میں پلتی ایسی بیماری جو ہر دوسرے فرد کو جونک کی طرح چمٹی ہوئی ہے۔ زر، زن اور زمین تینوں کے بغیر انسان ادھورا ہے اور تینوں کے بغیر جینا بھی مشکل ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ شاہد کو عقل آ ہی گئی۔ چاہے دیر سے ہی آئی وہ کہتے ہیں نا کہ دیر آید درست آید۔ "تعبیرِ خواب" کی تعبیر اچھی رہی۔ حبیب الرحمٰن کا اندازِ تحریر دل کو چھو گیا۔"

☆ اعجاز حسین سٹھار نور پور تھل سے لکھتے ہیں۔ "پرچہ عین وقت پر ہاتھ آ گیا ہے لیکن ہمارا خط پھر غائب، یہاں صرف محکمہ ڈاک کو ہی موردِ الزام ٹھہرایا جارہا ہے لیکن کسی حد تک ہمارے ساتھ دفتری دھاندلی بھی ہورہی ہے میں نے کئی قیاس آرائیوں، خیالات اور خدشات کو یکجا کیا تو مکمل اور واضح تصویر سامنے آگئی ہے۔ یہ ناقابلِ معافی جرم ہے لیکن بے بسی اور مجبوری میں سوائے خالی افسوس کے کیا کیا جاسکتا ہے۔ "انوکھی شادیاں" پڑھتے ہوئے کبھی حیران، پریشان اور کئی بار مسکرا بھی دیے یہ تو کئی خطوط اور ادوار کے قصے ہیں۔ یہاں قریب کے دیہاتوں میں رسموں رواج اور شادی کے موقع کے لین دین میں فرق پایا جاتا ہے۔ "شومین" میں سید نور کی شخصیت، بچپن اور فلم نگری کی آمد کے بجائے انور فرہاد صاحب ان کی وکالت میں دلائل دیتے نظر آئے جیسے انہیں بے گناہ ثابت کرکے رہائی دلانا مقصود ہو، خاص طور پر ان کے بچپن اور نوجوانی کے دنوں کی معلومات سے محرومی کھٹک رہی ہے۔ انور فرہاد نے یہ مضمون سابقہ ڈگر سے ہٹ کر لکھا ہے خیر غیر دلچسپ تو نہیں کہوں گا لیکن تشنگی ضرور چھوڑ گیا ہے۔ "ناسور" کے واقعات دن بدن بدل رہے ہیں البتہ ہنگامہ آرائی، دل کی دھڑکن کا غیر متوازن ہونا اور ہولناکی میں کمی نہیں آئی۔ اب اپنے پسندیدہ سلسلے سچ بیانیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ "صاحب جی" میں راشد شریف، مہذب اور خاندانی نظر آئے وہ چاہتے تو نعیمہ کو بہلا پھسلا کر اور جھوٹے خواب دکھا کر تنہائی کے لمحات میں من مرضی کرسکتے تھے، نعیمہ شادی کے وعدے پر ٹلتی رہتی اور قسمت کا لکھا جان کر خاموشی اختیار کرلیتی لیکن اس نے چھونا تک گوارا نہ کیا، خواب، سراب نہ جھانسا دیا، سب کہانیاں خود نعیمہ نے خیالی گھڑیں، پرواز میں رہی اور تصوراتی محل تعمیر کرلیے، وہ تو شکر کریں کہ عزت بچ گئی، ضمیر پر بوجھ نہیں ہے اور سلیم بھی بددل نہ ہوا بلکہ بروقت دستیاب ہوگیا۔ یہ بات طے ہے کہ بڑے بڑے چوہدری جاگیردار اور سیٹھ لوگ نوکرانیوں یا چھوٹی ذات کی لڑکیوں کو بہو، بیویاں بنانے لگیں تو معاشرے میں کیسے سر اٹھا کر چل سکیں گے پھر حالات جاننے والے لوگ بھی موقع بہ موقع ایسا طعنہ دینے سے نہیں چوکتے اور ایسی کمزوریاں عمر بھر تک ساتھ چلتی ہیں۔ بس اپنی اوقات میں رہا جائے تو یہ فائدے کا سودا ہے۔ "بہنیں" خوب

صورت اور ایثار کو اجاگر کرتی کہانی ہے۔ آج کی خود غرضی، خود پسندی اور زر سے متاثر سوچ کو دیکھیں تو ایسے رویے عجیب لگتے ہیں
کردار معاشرے کا حسن ہیں۔ ''محبت گزیدہ'' میں فیروز کے جذباتی اور لاابالی قدم نے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، عام زندگی
ساتھ رہتے ہوئے غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں، نرم رویہ، معاملہ فہمی اور صبر سے حالات معمول پر لائے جاسکتے ہیں۔ اور کبھی فریق
خلوص، نیت، جذبوں کی سچائی اور ثابت قدمی سونے پر سہاگا ثابت ہوتے ہیں تب روٹھی خوشیاں اور کھوئی منزلیں راستے بھٹک کر واپس
سلام پیش کرتی ہیں۔ نیلم کے کھرے جذبے زندگی کے ساتھ منزل تک ہاتھ پکڑ کر پہنچائے گئے ہیں اور یہاں موناکے بے غرض کر
فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ بھلا ایسی دوست کب قدم ڈگمگانے دیتی ہیں۔ ''کالی گوری'' میں تہمینہ محبت کی معراج پر نظر آئی، جو لوگ زند
حقیقتوں کو خلوص دل سے تسلیم کرتے ہیں وہ سکھی رہتے ہیں وگرنہ ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے خوامخواہ دل جلانے اور ٹینشن دینے
حاصل ہونا ہے سب اپنے مقدر کی خوشیاں سمیٹنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔ تہمینہ نے جو راہ اپنائی ہے سب کا فائدہ ہے اور چار دیواری کے
ہنگامہ آرائی کے بجائے امن کی فضاء قائم ہے وگرنہ متین نفسیاتی مریض بن کر سب کچھ گنوا بیٹھتا۔ ''تعبیر خواب'' پڑھ کر ڈاکٹر قرۃ العین
محنت، لگن اور عزم کا قائل ہونا پڑا۔ ہمارے علاقے کی ایک میٹرک کی لڑکی کو اس کے چچازاد نے ان پڑھ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا۔ موصوف ا
قد کاٹھ اور کھیلوں میں نمایاں ہونے کی وجہ سے آرمی میں کیپٹن ہو گئے تھے، لڑکی نے بات دل پر لے لی اور آج ایک کامیاب ڈاکٹر ہے لیکن
شادی نہیں کی۔ ''دل والا'' میں حیات بخش کا کردار انوکھا اور سرپرائز دینے والا ہے۔ محبت قربانیاں مانگتی ہے اور اہل دل دیتے
گھبراتے نہیں ہیں، کوئی تشہیر نہیں بس اپنی کیفیت میں مست رہتے ہیں، کسی صلے کی توقع نہیں کرتے، بس دعا ہے کہ حیات بخش کی کشتی
کنارے لگ گئی ہو، بے چین روح کسی منزل پر مستقل پڑاؤ ڈال چکی ہو، والدین اور بہنوں کا وہ واحد سہارا تھا اس کا پُرسکون رہنا
زندگیوں کی بقا ہے۔ ''خدا کرے'' کی عندلیب مجھے شروع میں ہی مشکوک لگی تھی وہ کتنی عظیم ماں کی بیٹی تھی لیکن انگاروں سے کھیل رہی تھی
وہ کتنی چالاک، ہوشیار اور عیار ہو گی لیکن مرد کے پھندوں کی جکڑن بھی سخت ہوتی ہے، نکل بھاگنے اور آزاد ہونے کا چانس نہ ہونے کے
برابر ہوتا ہے پھر عندلیب تو بار بار دانے پر چونچ مار رہی تھی۔ وہ منزل پانے تک کسی بڑے نقصان سے بچ گئی ہو یہ دعا دل سے نکل رہی
پھر ماں کی نظر تحفظ کا حصار بنی ہوئی تھی اس وجہ سے اس کے سنبھل جانے اور مقصد پالینے کا یقین ہے۔''

☆ عبا عمر انصاری کراچی سے لکھتی ہیں۔ ''میں اور میرے چند دوست تقریباً دس سال سے سرگزشت پڑھ رہے ہیں اور اس کے
عشق میں مبتلا ہیں۔ یہ ہمارا پہلا خط اور پہلی فرمائش آپ کی خدمت میں ارسال ہے۔ بعض وجوہات کی بنا پر ہم آپ کا یہ معیاری جریدہ
مارکیٹ سے خرید کر پڑھتے ہیں۔ سرگزشت کا ہر مضمون ہمیں بے حد پسند آتا ہے مگر خصوصاً فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے مضامین ہمیں
بہت پسند آتے ہیں جو کہ انتہائی عرق ریزی سے اور تحقیقات کے بعد کہانی کا روپ دھارتے ہیں۔ ہماری آپ سے ایک چھوٹی سی گزارش
ہے کہ سرگزشت میں ہر ماہ عالمی ادب سے ماخوذ شہرۂ آفاق ناولوں جن پر ہالی ووڈ یا دنیا کے اور کسی ملک میں بنائی گئی معیاری فلموں کی تلخیص
ہر ماہ پیش کریں اور اس سلسلے میں مذکورہ فلم بمعہ تصاویر جامعیت سے بھرپور ہو۔ یقیناً یہ سلسلہ سرگزشت کے لیے انتہائی مفید رہے گا اس
سلسلے میں آپ اپنے دوسرے قارئین سے رائے لے سکتے ہیں۔ اُمید ہے آپ ہماری ان گزارشات پر عمل کرنے کی کوشش کریں
گے۔ (سرگزشت کا مزاج اور ہے۔ اس میں آپ بیتی یا جگ بیتی ہی شامل کی جاتی ہے۔ فلم یا عالمی ادب سے کہانیاں لینے کے لیے ہمارے
ادارے میں دو ڈائجسٹ ہیں۔ جاسوسی اور سسپنس ڈائجسٹ۔ اس وجہ سے ہم معذرت خواہ ہیں)''

☆ رضا احمد اعوان ضلع بھکر سے لکھتے ہیں۔ ''نومبر کا شمارہ خوب صورت ٹائٹل اور اپنی چمک دمک کے ساتھ میرے سامنے ہے۔
اس مرتبہ مراسلات بہت زیادہ تھے ان کو کم کریں۔ ''بیت بازی'' ختم کرکے اس کی جگہ انعامی موضوعاتی اشعار کا سلسلہ شروع کریں۔ انور
فرہاد کا مضمون ''شومین'' ہدایت کار و فلم ساز سید نور کی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے تھا اور شاہ صاحب کی زندگی کے کچھ گوشے بے نقاب ہوئے
جن پر پہلے پردہ پڑا ہوا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ رخسانہ نور ایک بہت حساس شاعرہ اور بہترین کہانی نویس، ادیبہ، اسکرپٹ رائٹر تھیں اور سید
نور سے بے حد محبت کرتی تھیں، انہیں توقع نہیں تھی کہ سید نور انہیں چھوڑ کر دوسری شادی کرلیں گے لیکن جب سید نور نے رخسانہ نور سے بے
وفائی کی، اس کا مان، اس کا دل توڑ کر دوسری شادی رچالی تو رخسانہ نور کے لیے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت ثابت ہوا اور اسی صدمے کے
باعث وہ جانبر نہ ہوسکیں۔ اب سید نور صاحب یہ حقیقت تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن وہ ان کی موت کے ذمہ دار ہیں۔ ''انوکھی شادیاں''
بہترین تحریر تھی جس کی بدولت ہمیں مختلف ممالک میں رائج دلچسپ عجیب و غریب رسم و رواج سے آگاہی ہوئی، ویلڈن وسیم بن اشرف۔
''بیت بازی'' میں کوئی شعر متاثر نہ کرسکا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' ایک دلچسپ سفرنامہ ہے۔ ندیم اقبال صاحب آغاز سے لے کر اب تک
دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ''ناسور'' پر جمود طاری ہے۔ کہانی چند کرداروں میں الجھی ہوئی ہے، آگے نہیں بڑھ رہی۔ شیراز خان کی
''سیریل کلر'' پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ انسانی نفسیات بھی عجیب ہے اچھائی کی طرف چل پڑے تو فرشتوں کو پیچھے چھوڑ دے اور برائی
کرنے پر آجائے تو گناہوں کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔ سید احتشام کی تحریر ''بھیانک سازش'' بھی اچھی تحریر ثابت ہوئی۔ اس

مرتبہ سچ بیانیوں میں تقریباً تمام کہانیاں اپنے اندر دلچسپی سمیٹے ہوئے تھیں لیکن نعیمہ سلیم کی ''صاحب جی'' سب پر بھاری ثابت ہوئی۔ شہر خیال میں خالد محمود، آفتاب احمد نصیر اشرفی، آرٹسٹ محمد عامر ساحل اور نظیر احمد راجپوت کے تبصرے پسندیدہ تھے۔ انور فرہاد سے درخواست ہے کہ اداکارہ زیبا، دیبا، علی سفیان آفاقی (مرحوم) پر بھی مفصل مضمون لکھیں جن کی سرگزشت کے لیے خدمات کو بھلایا نہیں جاسکتا۔''

☆ قیصر خان بھکر سے رقم طراز ہیں۔ ''انکل معراج نے اداریہ میں اپنے پرائے کا فرق سمجھایا جو پاکستانی قوم کی ترجمانی کرتا ہے ہم نے اپنی اپنی مسجد بنالی ہے، ایک پرچم کے نیچے والا ایجنڈا بھی ختم ہوتا جارہا ہے۔ ادارے تباہی کی طرف جارہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نام پر بنا تھا پاکستان، اب اللہ تعالیٰ ہی سے دعا ہے کہ اچھے لوگ آجائیں (آمین)۔ ''شہر خیال'' اور ''یک سخنی'' دونوں پسندیدہ ہیں۔ فیض احمد فیض کی والد کی داستان بھی اور شہر خیال میں حیرت کا جھٹکا لگا جب کہ پہلی بار نام پڑھا اور آپی نزہت افتخار کرسی صدارت پر فائز تھیں بہت مبارک اور خوش آمدید۔ ایک صنف نازک کا اضافہ اور کرسی صدارت پر پہلا تبصرہ بہت خوب۔ ہم آپ کو دل سے خوش آمدید کہتے ہیں۔ (سرگزشت میں نئے پرانے کی تخصیص نہیں جو اچھا لکھے گا قارئین اسے ہی پسند کرتے ہیں۔ خواہ وہ نیا کیوں نہ ہو) اس کے ساتھ خالد صاحب ملتان والے حاضر تھے، بہت شکریہ انکل جی۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے حیدر دہلوی کے بارے میں بہت خوب صورت لکھا۔ زویا اعجاز نے صحیح معنوں میں خراجِ تحسین پیش کیا اور ہم کو اتنی عظیم معلمہ کے بارے میں آگاہی دی۔ سید احتشام نے بہت بڑی سازش کے بارے میں لکھا، نواب زادہ لیاقت علی خان شہید کے بارے میں بھی مضمون لکھیں (قائد ملت پر مضمون آچکا ہے)۔ ''انوکھی شادیاں'' بہت دلچسپ مضمون تھا، کاشف زبیر صاحب بوسنیا کے مظلوم مسلمانوں کی کہانی لے کر آئے، بہت دکھ ہوتا ہے مسلمانوں کا زوال دیکھ کر۔ انور فرہاد، سید نور کو خراجِ تحسین پیش کررہے تھے۔ بہت خوب صورت مضمون تھا اور ایک بات کہ مرنے کے بعد کیوں لکھا جائے پہلے بھی تو لکھ سکتے ہیں، اچھا لگا۔ اداکارہ نیلی کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ وہ نہایت کسمپرسی میں ہیں۔ ''سیریل کلر'' میں جاوید لاہور والے کا نام نہیں تھا۔ انکل ندیم اقبال کا سفرنامہ پورے زور شور سے جاری ہے۔ اور ایک ادبی شہکار کی شکل میں جاری ہے۔ بہترین اسلوب کی وجہ سے بہت پسند ہے۔ ''ناسور'' کہانی میں ڈاکٹر صاحب نے ہیرو کے بھائی پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے، بہت دکھ ہوا۔ سچ بیانیوں میں ''صاحب جی'' اچھے آدمی تھے ورنہ عزت سے محروم ہوجاتی پنگی ممو صاحبہ۔ بہنیں قربانی کی کہانی تھی جو کہ عورت کا خاصا ہے۔ ''محبت گزیدہ'' میں مونا نے دوستی کا حق ادا کیا اور فیروز صاحب کو غیرت دلائی۔ ''کالی گوری'' سلمیٰ اعوان صاحبہ نے جو کہانی لکھی محبت کے بارے میں اس کو اول نمبر پر آنا چاہیے تھا۔ محبت والے محبوب کی رضا میں خوش رہتے ہیں۔ متین سمجھدار تھا۔ قربانی محبت کی میراث ہے اور وہ یہ میراث پا گیا۔ ایسے لوگ اس دور میں بہت کم ہیں جو محبت کا مطلب سمجھیں۔ غیر حاضر میں ڈاکٹر قرۃ العین، ڈاکٹر روبینہ نفیس، سید انور عباس شاہ، معظم علی وغیرہ ہیں۔''

☆ عبدالحمید عرف جانی کا تبصرہ بہاولپور سے۔ ''حسب حال'' نامی پروگرام ایک چینل سے نشر کیا گیا۔ اس پروگرام میں سنتوش کمار کی فیملی کا ذکر کچھ اس طرح سے کیا کہ انڈیا میں سنتوش کمار نے فلم دل لگی میں کام کیا تھا۔ اب ذرا غور فرمائیں سنتوش کمار نے انڈیا میں صرف ایک فلم آہنسا میں کام کیا تھا۔ سہیل احمد صاحب نے دل لگی کا ذکر کیا۔ دل لگی میں تو ثریا اور شیام کا مرکزی کردار تھا۔ اس فلم کا گانا بہت مشہور ہوا تھا ''تو میرا چاند میں تیری چاندنی'' اور اس کے بعد ڈائریکٹر محبوب نے اپنی فلم انداز کے لیے سنتوش کمار کو آفر کی۔ مگر سنتوش کمار نے یہ کہہ کر آفر ٹھکرادی کہ میں پاکستان جارہا ہوں۔ اس کے بعد ڈائریکٹر محبوب نے فلم انداز میں دلیپ کمار کو سائن کیا جو اس وقت کی سپرہٹ فلم ثابت ہوئی۔ سنتوش کمار کے چار بھائی تھے۔ سب سے بڑے سنتوش کمار اور پھر درپن تیسرے نمبر پر ڈائریکٹر سلیمان اور چوتھے نمبر پر منصور ہے۔ درپن نے انڈیا کی فلم عدل جہانگیر میں مرکزی کردار ادا کیا تھا اور پاکستان آکر کئی سپرہٹ فلموں میں اداکاری کی تھی لیکن اصل پہچان فلم سہیلی سے ہوئی جس میں درپن ڈبل رول میں نظر آئے۔ یہ بھی درپن کی سپرہٹ فلم تھی۔ سہیل صاحب کے لیے ایک مشورہ پیش خدمت ہے کہ نہار منہ بادام کھایا کریں یادداشت کے لیے فائدے مند ہے شکریہ۔ میں مدیر اعلیٰ سے گزارش کرتا ہوں کہ نئی نسل کو کچھ معلوم نہیں کہ سنتوش کمار اور درپن نے فنکارانہ زندگی کیسے گزاری، ان کے بارے میں تحریر کیا جائے اور پھر آشا پوسلے جو پاکستانی فلم تیری یاد کی پہلی ہیروئن تھیں اس فلم کا ہیرو ناصر خان تھا آپ کی بہت بہت نوازش ہوگی پرانے فنکاروں کو یاد رکھنے سے دل کو سکون ملتا ہے اس دور کی باتیں یاد آتی ہیں۔''

☆ نزابت افشاں نے مہورہ تحصیل فتح جنگ سے لکھا ہے۔ ''27 اکتوبر کو صبح صبح ہی سرگزشت مل گیا۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح سوئے ہوئے ضمیر کے لیے تازیانہ تھا۔ فیض کے والد کے متعلق بہت اہم معلومات حاصل ہوئیں۔ سچ ہے کہ تعلیم ہی نے انہیں قعر گمنامی سے نکال کر بام عروج تک پہنچایا۔ ڈاکٹر ساجد امجد، حیدر دہلوی کی سوانح حیات کے ساتھ موجود تھے۔ خود غرض، خودسختہ اور تنگ نظر ہم عصر شعراء اور ادیب، حیدر دہلوی کو وہ مقام دینے سے گریزاں رہے جس کے وہ مستحق تھے۔ ایسا صرف حیدر دہلوی کے ساتھ ہی نہیں ہوا بلکہ ناصر کاظمی اور مصطفیٰ زیدی جیسے لوگوں کے ساتھ بھی ایسی ہی غفلت برتی گئی کہ آخر کار مصطفیٰ زیدی کو اپنے آخری مجموعے ''کوہ ندا'' کے دیباچے میں لکھنا پڑا کہ ''یہ ان کا آخری مجموعہ ہے'' اس کے کچھ ہی عرصہ بعد اپریل 1970ء میں اردو کا یہ منفرد شاعر دنیا سے رخصت ہوگیا۔ ''روایت شکن'' زویا اعجاز کی بھرپور اور متاثر کرنے والی کہانی تھی۔ ''بھیانک سازش'' امریکی معاشرے کی سازشی ذہنیت اور بربریت کا منہ بولتا

ثبوت تھی۔ ”انوکھی شادیاں“ پڑھ کر ہنسی آئی اور حیرانگی بھی ہوئی کیونکہ اسلام ایسی فضول رسموں کی اجازت نہیں دیتا گو کہ اب ہمارے ہاں بھی شاخ نازک پہ آشیانہ بنانے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور یہ لمحہ فکریہ ہے۔ کاشف زبیر کی تحریر ”بھیڑیے“ نے رلا دیا۔ افسوس کہ آج بھی وہاں ظلم وستم کی آگ بھڑک رہی ہے۔ اللہ پاک مسلمانوں کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ ”سیریل کلر“ پڑھ کر دل کانپ اٹھا۔ ایسے لوگ انسان کہلانے کے لائق نہیں۔ ”شمشال سے ٹورنٹو“ بہترین موڑ پر ہے۔ ندیم صاحب کو پھر نسرین کا بلاوہ آگیا ہے۔ اب دیکھیے وہ جاتے ہیں کہ نہیں۔ شکیل صدیقی اس بار بھی سائنسی معلومات سے بھرپور تحریر کے ساتھ حاضر تھے۔ ”ناسور“ میں فہیم کی ٹانگوں کا کٹ جانا اور کالیا کا اغوا ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ آنے والے حالات نعمان کے لیے سخت ہوں گے۔ ”صاحب جی“ اچھی تحریر تھی۔ شکر ہے کہ مالکن کا بیٹا گھٹیا فطرت کا مالک نہیں تھا ورنہ محترمہ آج اپنی عزت کے مزار پر نوحہ گری میں مصروف ہوتیں۔ تنگ کپڑے پہن کر مالکن کے بیٹے کو اپنی طرف مائل کرنا نعیمہ کا ہرگز کوئی قابل فخر کارنامہ نہیں تھا۔ ”خوش بخت“ واقعی خوش بخت تھی لیکن ابرار کا اب اس کی تلاش میں شادیوں پر شادیاں کرتے جانا ہرگز سمجھ میں نہیں آیا۔ (اس نے صاف لکھا ہے کہ عورت کی قسمت مردوں سے بہتر ہوتی ہے اسی لیے شادی کر رہا ہے کہ اس کی قسمت پلٹ جائے) ”محبت گزیدہ“ بھی اچھی رہی۔ ”کالی گوری“ بہت ہی زبردست کہانی رہی۔ تہمینہ جیسے لوگ ہمارے معاشرے میں ہوں تو دنیا جنت بن سکتی ہے۔ ”تعبیر خواب“ کی مرکزی عورت ڈاکٹر قرۃ العین سراہے جانے کے قابل ہے۔ ”دل والا“ نے حیران کردیا۔ واہ رے محبت۔ ”خدا کرے“ میں ایک ماں اپنی بیٹی کے بہتر مستقبل کے لیے بھکارن بن گئی، کیا کہنا؟ دعا ہے کہ عندلیب اب راہ راست پر آجائے۔ ”زن، زر، زمین“ بھی زبردست رہی۔ ”شہر خیال“ میں نو وارد نزہت افتخار سسٹر کو بہت بہت خوش آمدید۔ آفتاب نصیر اشرفی، خالد محمود، سدرہ بانو ناگوری، منشی محمد عزیز میئے اور رانا شاہد بھائی کے تبصرے بہترین تھے۔ سیف اللہ آف ملک وال کا تبصرہ بھی زبردست تھا۔ خصوصاً ان کے اس جملے کی داد ہم پر فرض ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ندیم اقبال صاحب کی ڈائری سے اور نسرینیں نکل آئیں۔ انور سلطان اور ندیم افضل بھی بہترین تبصروں کے ساتھ موجود تھے۔ ایک غلطی کی اصلاح کرتا چلوں کہ مجی رحمان نے صفحہ نمبر 45 پر یہ مشہور شعر

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت بدلنے کا

اقبال سے منسوب کردیا۔ حالانکہ کلیات اقبال یا باقیات اقبال کے کسی بھی نسخے میں یہ شعر نہیں ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ شعر ان کا نہیں ہے۔ یہ شعر ہے مولانا ظفر علی خان کا (دیکھیے کلیات ظفر علی خان)۔ 2015ء میں سرگزشت میں ذرہ حیدر آبادی کا مضمون اس حوالے سے چھپا تھا جس میں یہ تصحیح کی گئی تھی۔ شاید مجی رحمٰن کے مدِ نظر ذرہ صاحب کا وہ مضمون نہیں رہا ورنہ یہ غلطی نہ ہو پاتی۔“

☆ سیف اللہ کا تبصرہ ملک وال سے۔ ”معراج رسول صاحب نے چھوٹی سی تحریر میں بتا دیا ہے کہ اپنے گھر اور کرائے کے گھر میں کیا فرق ہوتا ہے جیسے اپنے گھر کھانے میں اور کسی کے دعوتِ ولیمہ میں کھانے کا فرق نظر آتا ہے۔ ساجد امجد صاحب، خیام الہند کے لقب سے مشہور ہونے والے حیدر دہلوی صاحب کو ڈھونڈ کر لے آئے ہیں۔ حالاتِ زندگی معلوم ہوئی۔ زویا اعجاز صاحبہ کی ”روایت شکن“ سلیمہ بیگم قدم بقدم حالات سے مقابلہ کرتی اور ترقی کی منزلیں طے کرتی نظر آتی ہے اور اللہ نے انہیں نوازا بھی ہے۔ پتا چلا کہ محنت رنگ ضرور دکھلاتی ہے۔ بھلے دیر ہوجائے۔ سید احتشام صاحب کی ”بھیانک سازش“ کے عنوان سے تحریر نے امریکی صدر کے خلاف سازشیں مختلف کرداروں کا رول، صدر کا قتل اور بعد کے چند دنوں کے حالات واضح کیے اور آخر میں سانپ سیڑھی والے کھیل کی طرح بات اس نکتے پر ختم ہوئی کہ اس بھیانک سازش کے مرکزی کردار کا اب تک پتا نہ چل سکا۔ تاریخ نامکمل تحقیقات سے بھری پڑی ہے جیسے ہمارے ہاں لیاقت علی خان کا قتل، صدر ضیاء کا حادثہ وغیرہ ایسے واقعات ڈھیروں ہیں۔ وسیم بن اشرف نے پتا نہیں کتنی محنت سے اور کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر واقعات ”انوکھی شادیاں“ کی صورت میں جمع کردیے ہیں۔ ہر شادی کے متعلق جہاں حیرانی ہوئی ہے وہیں مسکراہٹ بھی آجاتی ہے۔ مضمون دلچسپ لگا۔ سلمٰی اعوان اس دفعہ سچ بیانیوں میں ”کالی گوری“ لے کر آئیں۔ ان کی تحریر زیادہ اچھی لگی اس لیے کہ تحریر سادہ اور آسان ہے۔ سچ بیانی میں ایک وکھری قسم کی محبت کی معراج نظر آئی۔ شیراز خان کی ”سیریل کلر“ میں انسان کے دشمن نفسیاتی مریضوں کی تصویر نظر آئی۔ کچھ عرصہ پہلے لاہور میں بھی ایک واقعہ ہوا تھا شاید سو کے قریب بچے اس ظالم نے قتل کیے تھے، غالباً اقبال نام تھا اس کا، صاحب مضمون اس کا تذکرہ نہ کرسکے، پتا نہیں کیوں۔ انور فرہاد کے فلمی خزانے سے ”شومین“ کے نام سے سید نور کے متعلق بہت تفصیل سے پتا چلا۔ ساتھ ہی یہ بھی خوشی ہوئی کہ انور فرہاد نے شاید پہلی دفعہ جہاں خوبیاں بیان کی ہیں وہاں تنقید بھی بھرپور انداز میں کی ہے۔ کاشف زبیر کی تحریر ”بھیڑیے“ تو اچھی ہونی ہی تھی اور ہے۔ شکیل صدیقی کا ”عکس بند“ فرزانہ نگہت کی ”گمشدہ شہزادی“ معلوماتی تحریریں ہیں اور اچھی بھی ہیں۔“

☆ سید امتیاز حسین بخاری کی آمد سرگودھا سے۔ ”السلام علیکم! ماہ نومبر 2017ء کا ماہنامہ سرگزشت کراچی تازہ ترین معلومات اور نئی آب وتاب کے ساتھ نظر نواز جلوہ افروز ہوا۔ دل کو خوش اور نظر کو خیرہ کر گیا۔ آپ کا اداریہ بصیرت افروز اور غم انگیز تھا۔ ہم محسن کش اور احسان فراموش قوم ہیں، ہم نے اپنے نصاب سے سرسید احمد خانؒ، علامہ اقبالؒ جو دو قومی نظریہ کے بانی اور پرچارک تھے، نکال دیا اور اپنے

وطن پاکستان کی محبت فراموش کر بیٹھے۔ ایسا اداریہ لکھنا وقت کی اہم اور مقدم ضرورت ہے۔ آپ نے لکھ کر اپنا حق ادا کر دیا۔ وطن کی حفاظت نئی نسل کی ذمہ داری ہے جو محبِ الوطن ہو۔ اپنے مفادات سے بالاتر ہو کر سوچیں اور گھر کی حفاظت کریں۔ پاکستان ہمارا گھر ہے۔ ہمیں دل و جان سے پیارا ہے۔ یہ گھر میرا گلشن ہے۔ بکریاں چرانے والے نے ہمت و عزم لگن و استقلال جدوجہد، مسلسل محنت شاقہ عرق ریزی سے یہ مقام حاصل کیا جو قابل فخر ہے۔ ''سخن ساز'' جسے ڈاکٹر ساجد امجد نے تحریر کیا تھا کے مطالعے نے اشک بار ہونے پر مجبور کر دیا۔ ایسے عظیم شاعر کے ساتھ ارباب علم و ادب کا رویہ قابل مذمت ہے۔ ہمارے ساتھ بھی ایسے واقعات و حادثات گزرے ہیں مگر ہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور خصوصی احسان سے سرخرو ہو کر نکلے ہیں۔ آج مخالفین ہماری فنی اور شاعرانہ عظمت کے معترف ہیں۔ زویا اعجاز کی ''روایت شکن'' نے بہت ہی زیادہ متاثر کیا۔ ''شومین'' انور فرہاد کی ناقابل فراموش تحریر ہے جسے یاد رکھا جائے گا۔ سید نور نے رخسانہ نور پر سوکن کا بم برسا کر دہشت گردی کا ارتکاب کیا جو ناقابل معافی جرم ہے۔ بے چاری اسی غم میں دنیا سے چل بسی اور ہمیں اشک بار کر گئی۔ میں تو دوران مطالعہ روتا رہا۔ آپ نے میرا مراسلہ شائع کیا، شکر گزار اور ممنون احسان ہوں۔ دوسرا مراسلہ ارسال کر رہا ہوں۔ نمایاں مقام پر شامل اشاعت کر دیں۔ سرگزشت کا مطالعہ ابھی جاری ہے مکمل تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں، انشاء اللہ پھر حاضر ہوں گا۔''

☆ ندیم اقبال کا ای میل مشی گن امریکا سے۔ ''سب سے پہلے ان تمام دوستوں کا شکریہ جو مجھے اپنے خطوط میں یاد رکھتے ہیں۔ ان احباب کا بھی مشکور ہوں جو میری تحریر کو پسندیدگی کی سند دے کر مجھے حوصلہ دے رہے ہیں۔ یہ تو آپ سب ہی جانتے ہیں کہ میں کوئی پروفیشنل رائٹر نہیں ہوں اور اس کا اعتراف اپنے خطوط میں کرتا رہا ہوں۔ اپنی کتاب ''ناگا پربت کا عقاب'' کے پیش لفظ میں بھی کر چکا ہوں کہ سرگزشت نے مجھے آپ کے درمیان آنے کا موقع دیا۔ میری تحریر آپ تک پہنچائی اور ایک ڈائری لکھنے والا شخص بطور قلمکار مشہور ہو گیا۔ یہ سب آپ قارئین کی پسندیدگی کے سبب ممکن ہوا۔ اب آتا ہوں اس ماہ کے شمارے کی طرف۔ کہانیوں میں ''صاحب جی'' اور ''خوش بخت'' نے بہت مزہ دیا۔ ''کالی گوری'' بھی پسند آئی۔ اس لیے بھی کہ سلمیٰ اعوان جیسی کہنہ مشق قلمکار نے اسے تحریر کیا ہے۔ ''سخن ساز'' اور ''شومین'' بھی پسند آئی۔ ''انوکھی شادیاں'' بھی اچھی لگی۔ تعبیر خواب جیسا ایک واقعہ میرے علم میں بھی ہے۔ اگر کبھی موقع ملا تو ضرور تحریر کروں گا۔ ''بھیڑیئے'' پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ اس لیے کہ بوسنیا ہرزیگونیا میں مسلمانوں کو جس بیدردی سے شہید کیا گیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ابھی بہت سی تحریریں پڑھ نہیں پایا ہوں اس لیے تبصرہ پھر کبھی کروں گا۔ سدرہ بانو نا گوری، رانا محمد شاہد، عامر ساحل، منشی محمد عزیز مئے، سیف اللہ، نزہت افشاں کو سلام کہ وہ ہمیں یاد رکھے ہوئے ہیں۔ اس بار اپنے بھکر کے احباب کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔''

☆ نجمہ ملک، جھنگ سے لکھتی ہیں۔ ''نیا شمارہ بروقت ملا۔ اس بار کی تمام کی تمام سچ بیانیاں زبردست رہیں۔ خاص کر ''صاحب جی''۔ ابتدائی صفحات پر ''بھیڑیئے'' نمبرون رہی۔ ''سخن ساز'' نے ادبی معلومات میں اضافہ کیا۔ ''انوکھی شادیاں'' خبروں کو جمع کر کے مضمون بنایا گیا ہے۔ پلیز ایسی کہانیاں کم کم ہی دیا کریں۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' صرف سفر کہانی نہیں، ایک دلچسپ ناول میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ نسرین کا انجام کیا ہوتا ہے۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ وہ اب ندیم اقبال صاحب کے دوسرے پہلو میں بیٹھی ہوں گی۔ ''شومین'' بھی اچھی لگی۔''

☆ نزہت افتخار کا نامہ ساہیوال سے۔ ''اپنا خط دیکھ کر یقین نہیں آیا، کالج میں دکھایا تو سہیلیوں نے ٹریٹ مانگ لی۔ ایک بات اور بتادوں کہ ساہیوال میرا گھر ہے لیکن میرے والد کا کئی ماہ قبل لاہور تبادلہ ہو گیا تھا اس لیے میں بھی لاہور آ گئی اور یہاں مزید کئی سال رکنا ہے اس لیے ساہیوال خط میں لکھ دیا تھا۔ اب جب سب مجھے ساہیوال کی رہائشی سمجھ رہے ہیں تو یہی رہنے دیں اور آئندہ بھی ساہیوال لکھیں تاکہ میری پہچان برقرار رہے، اس ماہ کی خاص تحریر ''سخن ساز'' تھی۔ زویا اعجاز کی تحریر ''روایت شکن'' بھی خوب ہے۔ ''بھیانک سازش'' بھی پسند آئی۔ یہ سرگزشت کا خاصہ ہے کہ وہ معلومات سے بھرپور تحریریں ہی دیتا ہے۔ ''انوکھی شادیاں'' بھی دلچسپ ہے لیکن بہت سی خبریں جوڑ کر بنائی گئی ہیں۔ اس تحریر کو مزید بڑھایا جا سکتا تھا۔ سرگزشت میں ایسی تحریریں دلچسپی کا باعث ہیں لیکن اسے پڑھتے ہوئے ایسا لگا کہ اخبار پڑھ رہے ہیں۔ سرگزشت کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ اسے منتخب الفاظ کا سہارا لے کر کہانی کے انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ ''بھیڑیئے'' بھی اچھی لگی۔ ''شومین'' ذرا ہٹ کر لکھی گئی ہے۔ شاہ صاحب کو میں ایک اچھا انسان سمجھتی تھی، ان سے کسی ایسے فعل کی امید نہ تھی۔ ''سیریل کلر'' واجبی سی تھی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' نے گویا سحر طاری کر دیا ہے۔ واہ خوب لکھتے ہیں۔ اتنے مہینے گزر گئے، لیکن سفرنامے سے اکتاہٹ نہیں ہوئی، ویل ڈن۔ پلیز ''ناسور'' میں جو گرامر کی غلطیاں نظر آ رہی ہیں اسے تو درست کر لیں۔ عجیب سی اکتاہٹ ہو رہی ہے۔ ''صاحب جی'' بہت عمدہ سچ بیانی ہے۔ ''کالی گوری'' اور ''خوش بخت'' تعریف کے قابل کہانیاں ہیں۔ ''محبت گزیدہ'' اور ''زن، زر، زمین'' بھی دلچسپ رہی۔''

☆ نوشین ملک اسلام آباد سے لکھتی ہیں۔ ''اس بار کا شمارہ بروقت ملا یعنی 25 تاریخ کو مل گیا۔ تمام سچ بیانیاں دلچسپ ہیں۔ ''شومین'' بہت پسند آئی۔ انور فرہاد نے علی سفیان آفاقی کی جگہ پُر کر دی ہے۔ ''بھیڑیے'' بھی اچھی لگی۔ ''انوکھی شادیاں'' مزید بہتر ہو سکتی تھی۔ ''سیریل کلر'' بھی پسند آئی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' نے پہلی قسط سے سحر طاری کر دیا ہے۔ لگتا ہے کہ نسرین ہمیشہ کے لیے ندیم اقبال کی زندگی میں آجائے گی۔ پہلا خط ہے اس لیے اختصار سے کام لیا ہے۔''

☆ ایم عثمان کا ای میل۔ ''میں سرگزشت کا پرانا قاری ہوں۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ شمشال سے ٹورنٹو از ندیم اقبال کہاں سے ملے گی۔ میں نے اسلام آباد کے تمام بک اسٹال چھان مارے ہیں لیکن کہیں بھی یہ کتاب ملی نہیں ہے۔ یہ کہاں سے دستیاب ہوگی تاکہ میں خرید سکوں (یہ سفرنامہ ابھی جاری ہے۔ ختم ہونے کے بعد ہی یہ کتابی صورت میں آئے گی لیکن یہ بھی بتا دوں کہ ہم کتابی صورت میں کسی بھی کہانی کو شائع نہیں کرتے۔ مصنف خود شائع کراتے ہیں)''

☆ ڈاکٹر آفاق حسین سید نے ملتان سے لکھا ہے۔ ''سرگزشت ایک ایسا ڈائجسٹ ہے جس کی مثال نہیں۔ اسے میں 1992ء سے پڑھ رہا ہوں۔ تقریباً تمام شمارے میرے پاس محفوظ ہیں۔ یہ ڈائجسٹ ہے ہی ایسا جو بطور ریفرنس استعمال ہوتا ہے۔ اس بار ڈاکٹر ساجد امجد ایک بیش بہا تحفہ لے کر آئے ہیں۔ میں کب سے حیدر دہلوی کے بارے میں معلومات جمع کر رہا تھا۔ اس ایک تحریر نے خوش کر دیا۔ تمام باتیں معلوم ہو گئیں۔ امید ہے آئندہ بھی سرگزشت کا معیار قائم رکھنے کے لیے اسی طرح اساتذہ کے بارے میں بتاتے رہیں گے۔ اس ماہ ''سخن ساز'' کے علاوہ زویا اعجاز کی ''روایت سخن'' اور کاشف زبیر کی ''بھیڑیے'' بھی پسند آئی۔ ''انوکھی شادیاں'' بھی اچھی خاصی معلوماتی تحریر ہے۔ ''سیریل کلر'' میں کچھ ادھورا پن نظر آیا۔ نفسیاتی پہلو پر معلومات صفر ہے جب کہ اس زاویہ پر زیادہ معلومات فراہم کرنی چاہیے تھی۔ گوکہ مجھے فلمی معلومات سے دلچسپی نہیں، پھر بھی اسے پڑھا کیونکہ سید نور کی پہلی بیگم ایک اچھی شاعرہ تھیں۔ الحمرہ کے مشاعرے میں میرے ساتھ وہ بھی شریک تھیں۔ سچ بیانیاں پڑھی نہیں کیونکہ قصے کہانیاں پڑھنا میرے بس کی بات نہیں۔''

☆ سلمیٰ جبیں کا خط ٹورنٹو کینیڈا سے۔ ''نومبر کا شمارہ سامنے ہے جو اتفاقاً 10 نومبر تک مل گیا اور میں نے اسے ختم بھی کر لیا۔ یہاں 20 یا 25 تاریخ سے پہلے نہیں ملتا، اس لیے کبھی تبصرہ نہیں لکھا کیونکہ لکھتے لکھتے دوسرے ماہ کا پرچہ آپ لوگ تیار کر چکے ہوں گے۔ اس بار سرگزشت جلدی ملا تو سوچا کہ میں بھی ''مضطر خیال'' کے دروازے پر دستک دے دوں۔ اس بار ''صاحب جی'' اور ''کالی گوری'' لاجواب سچ بیانی ہے۔ محبت گزیدہ، خدا کرے، تعبیر خواب بھی دلچسپ ہے لیکن ''زن، زر، زمین'' عجیب الجھی الجھی سی لگی۔ ''خوش بخت'' پڑھ کر بے ساختہ ہنسی آگئی۔ وہ لوگ جو عملی زندگی میں صفر ہوتے ہیں وہی ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔ گوکہ یہ بات حدیث سے ثابت ہے کہ دولت عورت کی قسمت سے آتی ہے اور یہ بات ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہی ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ ایک شخص نے حضور اکرمؐ سے کہا کہ وہ کسمپرسی کی حالت میں ہے۔ ناداری بڑھتی جا رہی ہے تو حضور نے فرمایا کہ شادی کر لو، قسمت کھل جائے گی۔ اس صحابی کے ساتھ ایسا ہی ہوا لیکن ان صاحب کا مسئلہ ہی اور ہے۔''

☆ اکبر پاشا نے کراچی سے دستک دی ہے۔ ''سرگزشت نومبر 2017ء کا نیا شمارہ ملا۔ اس بار آپ نے معلومات سے لبالب بھرا شمارہ دیا ہے۔ کس کس تحریر کا ذکر کروں۔ ہر تحریر اپنی جگہ نگینے کی طرح جڑی ہوئی ہے۔ ''صاحب جی'' بہت پسند آئی۔ ''خوش بخت'' بھی عمدہ ہے۔ ''زن، زر، زمین'' اور ''کالی گوری'' بہت زیادہ اچھی تحریر ہے۔''

☆ انور علی بھٹو نے لاڑکانہ سے لکھا ہے۔ ''سرگزشت کی ہر تحریر لاجواب ہوتی ہے۔ نئے شمارے کی روایت بھی یہی ہے۔ اس ماہ مجھے ''صاحب جی'' بہت پسند آئی۔ کالی گوری، خوش بخت اور تعبیر خواب زیادہ اچھی کہانیاں ہیں۔ ''سخن ساز'' اور ''روایت شکن'' بہت اچھی ہیں۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' نے تو دیوانہ بنا رکھا ہے۔ ہر ماہ جب آخر میں باقی آئندہ لکھا دیکھتا ہوں تو غصہ آجاتا ہے۔''

تاخیر سے موصول خطوط:

ملک ریاض، حویلیاں ایبٹ آباد۔ رانا تنویر علی، خانیوال۔ شجاع چانڈیو، لاڑکانہ۔ رانا احسان، لاہور۔ کاشف سعید، مظفر گڑھ۔ واصف علی، کوٹ مومن۔ ریاض آرائیں، کراچی۔ رانا محسن، ملتان۔ شازیہ منان، میانوالی۔ راشدہ نواز، خانیوال۔ مغیرہ رشید، لیہ۔ غلام اکبر راجپوت، کوٹ مٹھن۔ طاہر مجاہد، میانوال رانجھا (منڈی بہاؤالدین)

ماہر ریاضی

ضیاء تسنیم بلگرامی

لوگ اس کو شاعر سمجھتے رہے جب کہ وہ ایک ریاضی داں تھا اسی نے شمسی کلینڈر کی خامیاں دور کیں، سائنسی میدان میں بہت کچھ کر دکھایا۔ اپنے دور کا مفکر ٹھہرا پھر بھی لوگ اسے شاعر سمجھتے رہے۔ اس کے اشعار زبان زد عام بنتے رہے۔ ادب شناس اس کے اشعار کی گہرائی و گیرائی سے محظوظ ہوتے رہے اور اس کی اصل خوبی لوگوں کے ذہن سے محو ہو گئی۔

ایک بڑے شاعر کی زندگی سے اخذ کردہ واقعات

خراسان کا مشہور شہر نیشا پور تاریخ کا انتہائی مشہور مقام ہے۔ یہ شہر ایک زمانے میں علم و فضل کا مرکز رہ چکا ہے۔ خراسان ابن خلکان کے مطابق چار کرسیوں میں سے ایک کرسی (صدر مقام) رہ چکا ہے باقی تین کرسیاں بلخ نے ہرات اور مرو ہیں۔

بغداد کے مشہور و معروف مدرسۂ نظامیہ سے بھی پہلے نیشا پور میں کئی بلند پایہ کالج موجود تھے۔ ان میں ایک تو مدرسۂ بیہقیہ اور دوسرا مدرسۂ سعیدیہ تھا۔ اسے سلطان محمود غزنوی کے بھائی نے اس وقت تعمیر کیا تھا جب وہ نیشا پور کا حاکم تھا۔ تیسرا مدرسہ اسی شہر میں خطیب بغدادی کے استاد ابو سعد اسماعیل بن علی استر آبادی نے قائم کیا تھا اور ان سب سے زیادہ عظیم الشان مدرسہ ابو اسحاق اسفرائنی کے لیے قائم ہوا تھا۔ یہ شخص انتہائی عالم و فاضل تھا اور اس نے 418ھ میں وفات پائی۔

نظام الملک نے بھی نیشا پور میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا اور اسے نظامیہ نیشا پور کہتے تھے۔ امام غزالی نے بھی اس مدرسے میں کچھ عرصہ درس دیا تھا۔

نیشا پور کے بارے میں بعض مورخ کہتے ہیں کہ اس کا ابتدائی نام ابر شہر تھا اور سامانیوں کے زمانے میں اس شہر کو ایک خاص مذہبی اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہیں کہیں ایک نہایت مشہور آتش کدہ تھا جب مسلمانوں نے اس شہر کو فتح کیا تو عرب سے آ کر بہت سے لوگ یہاں آباد ہو گئے اور یہ شہر خراسان کا پایۂ تخت قرار پایا۔

عمر خیام کی پیدائش اسی شہر میں ہوئی۔ اس کا نام تو عمیر



تھا لقب غیاث الدین اور کنیت ابوالفتح تھی۔ شاعری میں تخلص خیام اختیار کیا اس تخلص کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ ان کا آبائی پیشہ خیمہ دوزی تھا اسی لیے اس نے تخلص خیام اختیار کیا۔

ایرانی شعراء میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ مجد الدین ہمگو، رفو گر تھے اور اسی نسبت سے اپنا تخلص ہمگر رکھا۔ فردوسی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے والد زمینداری اور باغبانی کرتے تھے اسی وجہ سے انہوں نے اپنا تخلص فردوسی رکھا۔

حکیم عمر خیام کا ہم وطن کاتبی خوش نویس ہونے کی وجہ سے کاتبی مشہور ہوا۔

شیخ فرید الدین عطار عطر فروش تھے۔ اس لیے ان کے نام کے ساتھ عطار دائمی جز و ہو گیا۔ میرفی ہمدانی صراف تھے اسی لیے ان کے نام کے ساتھ میرفی لگ گیا۔

صیقلی بزدجردی شمشیر زنی .... سے تعلق رکھتے تھے اسی لیے صیقلی کہلائے۔ بساطی سمرقندی حصیر باف تھا اور ابتدا میں حصیر تخلص کرتا تھا بعد میں اپنے استاد مولانا عصمت اللہ بخاری کے حکم سے بساطی تخلص اختیار کیا۔

اس تفصیل کا مقصد یہ بتانا ہے کہ ماضی میں ایران کے بہت سے شعراء اپنے آبائی پیشہ کو تخلص میں استعمال کرتے تھے۔

چنانچہ عمر خیام نے بھی اپنی رباعی میں خیمہ دوزی کی طرف اشارہ کیا ہے حالانکہ خیمے کو وہ خیمہ ہائے حکمت تک محدود رکھتے ہوئے فرماتے ہیں۔

خیام کہ خیمہ ہائے حکمت جی دوخت
درکورۂ غم فتادہ و ناگاہ سوخت
مقراض اجل طناب ہمرش چورید
دلال قضا برانگنش بفروخت

(خیام حکمت کے خیمے سیا کرتا تھا۔ غم کی بھٹی میں گرا اور یک لخت جل گیا موت کی قینچی نے جب اس کی عمر کی طناب کاٹ دی تو قضا کے دلال نے اسے مفت بیچ ڈالا۔

عمر خیام کا سنہ پیدائش 410 ہجری بیان کیا جاتا ہے۔

اتنا مشہور شخص مدتوں تاریخ پیدائش کے حوالے سے زیر بحث رہا اور کوئی تو 408ھ ولادت پر بضد رہا اور کسی نے 410ھ بیان کیا۔

ہر وہ مشہور شخصیت جو کسی نامی گرامی خاندان سے تعلق نہیں رکھتی اس کے سن پیدائش کے بارے میں وثوق سے بتانا محال ہوتا ہے کیونکہ اس مستقبل کے نامی گرامی بچے کا کسی کو بھی یہ علم حاصل نہیں ہوتا کہ اسے آیندہ تاریخ کا اہم انسان قرار دیا جائے گا اور یہ مستقبل میں غیر معمولی کارنامے انجام دے گا۔

عمر خیام کے بارے میں بھی لوگوں کو نہیں معلوم تھا کہ 410ء میں پیدا ہونے والا یہ بچہ مختلف علوم میں مہارت تامہ رکھنے کی وجہ سے دنیا بھر میں شہرت کا حامل قرار پائے گا اور اپنی رباعیات کی وجہ سے بڑی قدر و منزلت حاصل کرے گا۔

خیام کے بچپنے سے ہم صرف اس حد تک واقف ہیں کہ یہ عجلت پسند اور خاموش لڑکا اکثر و بیشتر کتب فروشوں کی دکانوں میں کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہوا دیکھا جاتا تھا۔

انہی دکانوں میں اس عہد کے صاحب حیثیت گھرانوں کے کچھ نوجوان بھی اس لیے پہنچ جاتے تھے کہ وہ بھی علم و ادب کے جویا نوجوانوں میں شمار کیے جائیں۔ یہ دنیا دار شہرت کے بھوکے لوگ ہوتے تھے اور خیام کو ان سے کوئی سروکار نہ تھا اسے تو بس علم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ تصوف سے اسے دلچسپی تھی اور فلسفہ اسے پسند تھا ریاضی سے بھی انتہائی شغف تھا اور اپنے فکری ذوق میں کسی قدغن کو بھی پسند نہیں کرتا تھا اسی لیے عام لوگوں میں اسے پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔

اسی عہد کی دو مشہور شخصیات کی ہم درسی بھی اسے حاصل ہوئی ایک مشہور شخصیت نظام الملک طوسی کی تھی جس کا طالب علمی کے زمانے میں نام حسن بن علی تھا۔

دوسرا اہم درس رے کا حسن بن صباح تھا اس کا باپ باطنی مذہب سے تعلق رکھتا تھا اور سلجوقی حکومت باطنیوں کی دشمن تھی اسی لیے باطنی اپنے آپ کو چھپائے رکھتے تھے اپنے دین کی تبلیغ بھی انتہائی پُراسرار انداز میں کرتے۔ اسلام کے بہت سارے اہم اصولوں کو نہیں مانتے، مثلاً نماز، روزہ اور زکوٰۃ ان کی عبادت کا طریقہ بھی یکسر مختلف تھا۔ اس نے .... عورت مرد کے تعلقات کو مرکزی نقطہ بنایا تھا جس کی وجہ سے نوجوان اس کے فریب میں فوراً آ جاتے تھے، اور نعوذ باللہ وہ خود کو معبود کہتا تھا۔ اس کے باپ نے رے سے نیشا پور حصول تعلیم کے لیے اسی وجہ سے بھیج دیا تھا کہ وہ نیشا پور کے مدرسے میں تعلیم حاصل کرے۔

نیشا پور کے امام موفق بہت مشہور استاد تھے ان سے درس لیا نیشا پور کے امام موفق کو فقہ و درس حدیث دینے میں جو شہرت اور ناموری حاصل تھی وہ کسی اور کو نہیں ملی۔ ان کے بارے میں یہ بات شہرت پا چکی تھی کہ جو طالب علم آپ سے قرآن و حدیث پڑھتا ہے وہ ایک نہ ایک دن صاحب

دولت وثروت ہو جاتا ہے۔

عمر خیام کو بھی امام موفق نیشا پوری کے حلقۂ درس میں داخل کردیا گیا۔ اس وقت امام موفق کی عمر اسّی اور نوّے سال کے درمیان تھی۔

عمر خیام نے ابھی تک شاعری شروع نہیں کی تھی اسی لیے اس کو لوگ عمر کے نام سے جانتے تھے۔

طالب علموں نے اس درس گاہ میں پہلے تو ایک حسن نامی طوس کے طالب علم کو نمایاں حیثیت میں تعلیم حاصل کرتے دیکھا تھا اتالیق عبدالصمد، حسن کی نگرانی اور دیکھ بھال میں مصروف رہتا تھا اور طوس کا یہ حسن کئی سال سے یہاں زیرِ تعلیم تھا۔

عمر نے اسی دوران ایک دوسرے حسن نامی طالب علم کو اس درس گاہ میں داخل ہوتے دیکھا۔ یہ نیا حسن ایران کے مشہور شہر رے سے نیشاپور پہنچا تھا اور مدرسے کے کسی بھی استاد یا شاگرد کو اس کے مذہبی عقائد کا علم نہیں تھا۔

یہ تینوں ذہین ترین شاگرد دورانِ تعلیم ایک دوسرے کی ذہانت کا اندازہ لگاتے رہے اور دل ہی دل میں یہ اعتراف کرتے رہے کہ وہ اپنی اپنی جگہ بہت ذہین، طبع طباع، غیر معمولی حافظہ رکھنے والے ہم درس ہیں۔

ان تینوں نے معمولی گفت وشنید سے آپس میں تعلق قائم کیا۔

عمر خیام سے جب اس کے خاندان کے بارے میں پوچھا گیا کہ اس کے آباؤ اجداد کیا کرتے ہیں یعنی اس کا آبائی پیشہ کیا ہے تو عمر نے بلا جھجک بتادیا کہ وہ خیمہ دوز ہے۔

رے کے حسن نے کہا۔ ''تب پھر تجھے امام موفق کی درس گاہ سے کیا حاصل ہوگا، تجھے تو اپنا آبائی پیشہ اختیار کرنا چاہیے۔''

نیشاپور کے عمر نے بتایا۔ ''اسلام میں کوئی ایسی قید تو نہیں ہے کہ بیٹا باپ ہی کا پیشہ اختیار کرے۔ میں تو بہت سے علوم میں دلچسپی رکھتا ہوں اور اسی لیے امام موفق کی درس گاہ میں داخل ہوا ہوں۔''

عمر نے رے کے حسن سے پوچھا۔ ''تیرا باپ کیا کرتا ہے؟''

یہ انتہائی خطرناک سوال تھا اور اگر رے کا حسن اس سوال کا بالکل صحیح جواب دیتا تو اس کا اس درس گاہ میں رہنا دشوار ہو جاتا اور حکومت کی طرف سے بھی اسے پریشانیاں اٹھانا پڑتیں کیونکہ حسن کا باپ رے میں خفیہ باطنی تحریک کے لیے جدوجہد کررہا تھا اور اپنی ان ہی قابل گرفت کارگزاریوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اس نے عمر کو نیشاپور کے مدرسہ میں امام موفق کی شاگردی میں بٹھا دیا تھا۔

یہ غذا کینسر کا مریض بنانے کے لیے کافی

زیادہ چربی والی غذا کا استعمال بڑی آنت کے آخری حصے قولون کے کینسر کا باعث بن سکتا ہے اور یہ مرض بہت تیزی سے دنیا بھر میں پھیل رہا ہے۔ یہ بات امریکا میں ہونے والی ایک طبی تحقیق میں سامنے آئی۔ کلیولینڈ کلینک کی تحقیق کے مطابق زیادہ چربی والی غذائیں ایسے مالیکیولز کو متحرک کردیتی ہے جو کینسر کی رسولی کی نشوونما کا باعث بنتا ہے۔ کینسر کی یہ قسم دنیا میں سرطان کی چند عام قسموں میں سے ایک ہے اور صرف امریکا میں ہی اس کے ڈیڑھ لاکھ کے قریب کیسز سامنے آتے ہیں۔ تحقیقی ٹیم نے دریافت کیا کہ چربی سے بھرپور مغربی غذا یا فاسٹ فوڈ اس کینسر کا باعث بن رہے ہیں۔ یہ پہلی بار جنک فوڈ اور قولون کینسر کے درمیان تعلق کو دریافت کیا گیا ہے۔

مرسلہ: احمد جاوید، لاہور

عمر نے طوس کے حسن سے پوچھا۔ ''تیرا تعلق کہاں سے ہے؟''

طوس کے حسن نے بتایا۔ ''میں طوس سے حدیث و قرآن کی تعلیم حاصل کرنے آیا ہوں اور میرے تایا عبداللہ سلجوقی حکومت میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔''

طوس کے حسن کے جواب نے عمر کو یہ یقین دلادیا کہ ان کا یہ ہم درس دنیاوی جاہ ومرتبہ کے لیے تعلیم حاصل کررہا ہے۔

حسن طوسی نے ان دونوں نئے طالب علموں کے بارے میں یہ اندازہ لگایا تھا کہ یہ کبھی نہ کبھی کوئی دنیاوی اعلیٰ مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

پہلے ان تینوں میں جو معمولی تعلقات قائم ہوئے تھے ان میں آہستہ آہستہ شدت، گہرائی وگیرائی پیدا ہوتی چلی گئی اور یہ تینوں اپنے استاد سے جو کچھ پڑھتے تھے اسے یاد رکھتے تھے اور جو باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں ان پر تینوں ایک جگہ بیٹھ کے تفصیلی باتیں کرتے تھے اور سمجھنے سمجھانے کی کوششیں ہوتی تھیں۔

عمر نیشاپوری کو حسن طوسی کی ان باتوں سے کوئی غرض یا دلچسپی نہیں تھی جن میں دنیاوی جاہ طلبی کا عنصر ہوتا تھا۔

رے کا حسن ہر معاملے میں دلچسپی لیتا تھا بظاہر تو اس کو دین سے بڑی دلچسپی تھی اور دونوں ہم درس اس وقت رے کے حسن کی باتوں میں بہت دلچسپی لیتے تھے جب وہ کسی مشہور زمانہ مذہبی اصطلاح کے ظاہری و باطنی معانی و مطالب بتانے لگتا تھا۔

حسن طوسی کو اس کی ان باتوں سے یہ شبہہ پیدا ہوا کہ یہ شخص شافعی، حنفی، حنبلی یا مالکی نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ چاروں مسالک کے حامل ظاہری اور باطنی باتیں نہیں کرتے۔

حسن طوسی نے رے کے حسن سے پوچھا۔ ''سچ سچ بتا کہ تیرا باپ کیا کرتا ہے؟''

رے کے حسن نے بات کاٹ دینے کی کوشش کی اور کہا۔ ''میں علی بن احمد بن جعفر بن حسن بن صباح الحمیری ہوں اور میرا تعلق عرب خاندان سے ہے۔ میرا باپ مبلغ ہے اور اسے عقائد کی صنعائی سے بڑی دلچسپی رہتی ہے۔''

حسن طوسی نے عمر کو بتایا۔ ''رے کا کوئی شخص اگر مذہبی مبلغ ہے اور عقائد کی صفائی کی باتیں کرتا ہے تو میں اسے باطنی تحریک کا نمائندہ سمجھتا ہوں۔ یہ لوگ خاموشی سے اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں اور اسلامی مذہبی اصطلاحات کے ظاہری و باطنی مطالب سننے والوں کے دل و دماغ میں ٹھونس دیتے ہیں۔ جب کہ سلجوقی سلطنت ان کی بدترین دشمن ہے مجھے ڈر ہے کہ اگر رے کا حسن باطنی مذہب رکھتا ہے تو اسے بھی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

حسن کو ان باتوں سے کوئی واسطہ یا دلچسپی نہیں تھی اور وہ حسن طوسی کی باتوں کا صرف یہی مطلب لے سکا کہ باطنی مذہب کے لوگ مذہبی عقائد اور اصطلاحات کے دو معنی لیتے ہیں۔ ایک ظاہری دوسرا باطنی عمر تو باطنیوں کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کرنے کا خواہش مند ہوگیا۔

حسن طوسی نے عمر سے کہا۔ ''تو کسی بھی طرح رے کے حسن سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کر کہ کیا وہ واقعی باطنی ہے اور اس کا باپ کس دین کی تبلیغ کرتا رہتا ہے۔''

عمر نے جواب دیا۔ ''اے حسن طوسی! اگر میں اپنے رے کے اس ہم سبق سے یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ اس کا تعلق واقعی باطنی مذہب سے ہے تو اس سے ہمیں کیا فائدہ پہنچے گا اور ہم اگر سلجوقی حکومت کو اس کے بارے میں یہ بتا دیں گے کہ یہ باطنی ہے تو حکومت اس کو قید خانے میں ڈلوا دے گی اور ہمیں اس کے قید خانے میں پڑے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ یہ امام موفق سے قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کرنے آیا ہے ہمیں تو بس اسی معلومات سے غرض رکھنا چاہیے۔''

حسن طوسی نے کہا۔ ''اے عمر! میں شافعی مسلک سے تعلق رکھتا ہوں اور باطنی کو بہت برا سمجھتا ہوں۔ ان لوگوں نے دین میں بڑی خرابیاں پیدا کردی ہیں اور اگر انہیں ان کے اعمال سے باز نہ رکھا گیا تو یہ اسلام میں بڑی خرابیاں پیدا کردیں گے اور بہت زیادہ مسلمان گمراہ ہو جائیں گے۔''

عمر نے حسن کی ان باتوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی اور کہا۔ ''ہم تو یہاں علم حاصل کرنے آئے ہیں۔ ہمیں کسی کے عقیدے سے کوئی غرض نہیں اگر کوئی گمراہ ہے اور برے کام کر کے خدا کو ناراض کرتا ہے تو قیامت کے دن اسے اس کے بداعمال کی سزا ملے گی۔''

لیکن حسن طوسی، عمر نیشاپوری کی باتوں سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ باطنیوں کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا تھا اور ان سے جو فتنے وجود میں آئے تھے اور جن کے مزید آنے کا احتمال تھا وہ سب کچھ عمر نیشاپوری کو بتا سکتا تھا مگر اس خیال سے کہ اس مدرسے میں رے کا حسن بھی ان دونوں کا ہم سبق ہے اور ابھی یہ بات بھی پایہ ثبوت کو نہیں پہنچی کہ اس کا تعلق واقعی باطنی مذہب سے ہے۔ اس نے خاموشی اختیار کی مگر عمر نیشاپوری کو یہ نصیحت ضرور کی کہ لاعلم رہنے سے ہمیں نقصان تو پہنچ سکتا ہے مگر کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا اس لیے ہمیں رے کے حسن کے بارے میں معلومات ضرور حاصل کرنا چاہیے۔

عمر نیشاپوری نے جواب دیا۔ ''معلومات تو میں دنیا کے بہت سے امور کے بارے میں حاصل کروں گا ان میں حسن رے کے عقائد کے بارے میں معلومات بھی شامل ہیں لیکن اے حسن طوسی ہم تینوں کو ہم درس ہونے کا فائدہ اور رعایت بھی ملنی چاہیے۔''

ان دونوں کو نہیں معلوم تھا کہ چالاک حسن ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ مگر اس نے کسی بھی موقع پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اسے ان دونوں کے مذکورہ بحث و مباحثہ کا علم ہے۔

اب وہ بہت محتاط ہوگیا تھا اور کسی بھی ایسے مذہبی مسئلے پر بہت احتیاط سے باتیں کرتا تھا جن کے بے احتیاطی سے باتیں کرنے سے اس کا باطنی ہونا ثابت ہوجاتا۔

ان تینوں میں دوستی اور یگانگت اتنی بڑھی کہ ان کی

دوستی کی دوسرے مثالیں دیتے۔

امام موفق بھی ان تینوں سے بہت خوش رہتے اور انہیں اندازہ تھا کہ یہ تینوں اپنی اپنی جگہ خاص شہرت اور ناموری کے حامل ہو جائیں گے۔

امام موفق اپنی رہائش گاہ کے ایک حصے میں عموماً رات کو سکون و فراغت سے درس دیتے تھے اور طالب علم ان کے درس سے اتنا زیادہ افادہ کرتے تھے کہ جب وہ یہاں سے اٹھ کر اپنے ٹھکانوں پر پہنچتے تھے تو ان پر تکان غالب آجاتی تھی۔

رات کافی گزر چکی تھی اور انہیں نیند نہیں آرہی تھی اور تینوں اپنے اپنے بستروں پر دراز سونے کی کوشش کر رہے تھے۔

رے کا حسن صرف یہ سوچ رہا تھا کہ حسن طوسی عنقریب فارغ التحصیل ہو کر اپنے گھر چلا جائے گا کیونکہ اسے یہی معلوم ہوا تھا کہ چار سال پورے ہو جانے کے بعد حسن طوسی اپنے گھر چلا جائے گا۔

عمر نیشاپوری بھی یہی سوچتا تھا کہ اگر چار سال کے بعد حسن طوسی اس درسگاہ سے چلا گیا تو وہ اس کی زندگی بھر کمی محسوس کرے گا۔

رے کا حسن اپنے بارے میں دونوں ہم سبق دوستوں کی رائے اور رشک وشبہہ سے واقف ہو چکا تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ امام موفق کی درس گاہ سے فارغ ہو جانے والے کہیں نہ کہیں کوئی خاص مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اسے عمر نیشاپوری کے بارے میں تو یقین نہیں تھا کہ یہ شاعرانہ مزاج رکھنے والا مستغنی ہم درس کوئی اعلیٰ مقام حاصل کر سکے گا لیکن حسن طوسی کے بارے میں اس کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے دنیا میں غیر معمولی ترقی حاصل ہوگی۔ حسن طوسی بلا کا ذہین اور عملی شخص تھا وہ ہر معاملے میں پوری دلچسپی سے کام لیتا تھا جب کہ رے کا حسن بھی جنونی فطرت کا حامل تھا جس چیز کے پیچھے پڑ جاتا تھا اسے حاصل کر کے رہتا تھا اسی چالاک شخص کو ایک عجیب و غریب خیال آیا اور اپنے اس عجیب و نادر خیال کا ذکر عمر نیشاپوری سے کیا۔

عمر نیشاپوری فراغت میں بیٹھا اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا وہ دنیا کے بکھیڑوں میں پڑنا پسند نہیں کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ آیندہ اس کی زندگی میں کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ عمر کو علمی کام کرنے کے مواقع میسر رہیں اور فکر معاش کی طرف سے بھی اطمینان حاصل رہے۔

اپنے ان خیالات کا اظہار وہ کئی بار رے کے حسن کے سامنے بھی کر چکا تھا مگر رے کے حسن نے ہمیشہ یہی جواب دیا۔ ”اس مصروف دنیا میں فراغت محال ہے اور فکر معاشرے سے نجات نہیں مل سکتی۔“

عمر نیشاپوری کے احساسات، فکر اور خواہش سے واقف ہونے کے بعد رے کا حسن اس سے ملا اور پوچھا۔ ”بھائی عمر! یہ تو بتاؤ کہ تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا فیصلہ کیا؟“

عمر نیشاپوری نے جواب دیا۔ ”میں کیا فکر کروں گا کیونکہ انسان تو حالات، وقت اور زمانے کے ہاتھوں اپنی مرضی اور خواہش کی چیزیں حاصل کرنے میں شاذ و نادر کامیابی حاصل کرتا ہے۔ میں علمی کام کرنے والا مزاج اور فطرت رکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ مجھے آیندہ زندگی میں فکر معیشت سے نجات مل جائے اور میں تخلیہ میں بیٹھ کے دنیا سے بے نیاز ہو کے اپنے کام کرتا رہوں لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ایسا ہونا اگر ناممکن نہیں ہے تو محال ضرور ہے۔“

رے کا حسن امام موفق کی لیاقت، قابلیت اور ان کے درس دینے کے طریقوں کی دیر تک تعریفیں کرتا رہا اور تعریفیں کرنے کے بعد عمر نیشاپوری کو بتایا۔ ”اے عمر! میری اپنی معلومات کے مطابق یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ امام موفق کی درس گاہ سے فارغ التحصیل ہونے والوں نے بڑے بلند مقامات اور درجات حاصل کیے ہیں۔ ہم تینوں امام موفق کے چہیتے اور ذہین ترین طالب علم سمجھے جاتے ہیں اسی لیے کم از کم مجھے یہ یقین ہے کہ ہم تینوں آیندہ چل کے شہرت اور ناموری حاصل کریں گے اور دنیا ہمیں رشک کی نظروں سے دیکھے گی۔“

عمر نیشاپوری نے جواب دیا۔ ”دنیا میں شہرت و ناموری تو حاصل کی جا سکتی ہے لیکن جاہ و مرتبہ حاصل کرنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ میں تیرے بارے میں تو سوچ سکتا ہوں کہ تو غیر معمولی عملی، ذہنی اور علمی انسان ہے اور تو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے اس لیے تیرے لیے معیشت اور معاش کوئی مسئلہ نہیں ہوں گے اسی طرح حسن طوسی کے بارے میں میری یہ رائے ہے کہ یہ شخص بھی دنیا میں نہایت کامیاب انسان ہو گا اس کی باتیں سنو اس کے منصوبوں پر غور کرو وہ باتوں ہی باتوں میں ہمیں بتاتا رہتا ہے کہ بادشاہ کو کیسا ہونا چاہیے اور وزیر کو کامیاب

ارت کے لیے کیا کرنا چاہیے، یہ شخص تو امیروں، فقیہوں، عالموں، تاجروں، قاضیوں، مخبروں اور حکیموں تک کے بارے میں سوچتا رہتا ہے کہ ان سب کے کیا فرائض ہیں اور انہیں اپنے شعبوں میں مہارت اور کامیابیاں حاصل کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔''

رے کا حسن عمر نیشاپوری کی باتیں دلچسپی سے سنتا رہا اور پھر جیسے ہی عمر نیشاپوری نے سکوت اختیار کیا تو کہا۔ ''بخدا میں نے بھی حسن طوسی کے بارے میں یہی رائے قائم کی ہے اور مجھے یقین ہے کہ میرا یہ شریک درس دنیا میں بہت ترقی کرے گا اسی لیے اس وقت میں تجھ سے ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں میرا خیال ہے کہ تو مجھ سے اتفاق کرے گا۔''

عمر نیشاپوری نے پوچھا۔ ''مجھے اپنی اس نادر تجویز سے آگاہ کر جس کا تو نے یہاں آتے ہی ذکر کیا تھا۔''

رے کے حسن نے کہا۔ ''ہم دونوں حسن طوسی کے پاس چلتے ہیں اور اس سے کہیں گے کہ آؤ ہم تینوں ہم درس آپس میں مستقبل کا ایک معاہدہ کرلیں۔''

عمر نیشاپوری نے پوچھا۔ ''کیسا معاہدہ؟''

رے کے حسن نے عمر نیشاپوری کو سمجھایا۔ ''جیسا کہ ابھی کچھ دیر پہلے ہم دونوں نے امام موفق کی اس درس گاہ کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والا دنیاوی جاہ وثروت حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہوجاتا ہے ہم تینوں آپس میں یہ معاہدہ کریں گے کہ آئندہ مستقبل میں جو بھی غیر معمولی دنیاوی جاہ ومرتبہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے گا وہ اپنے دونوں ہم درسوں کو بھی فائدہ پہنچائے گا۔''

عمر نیشاپوری نے بے دلی سے کہا۔ ''تو کہتا ہے تو میں تیرے ساتھ حسن طوسی کے پاس چلتا ہوں اور تو اس کے سامنے اپنی یہ تجویز رکھے گا میرا خیال ہے کہ حسن ہماری اس تجویز کا مذاق اڑائے گا اور وہ ٹال جائے گا۔''

رے کے حسن نے جواب دیا۔ ''ایسا ممکن تو نہیں ہے کیونکہ میں حسن طوسی کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہوں وہ انتہائی شریف اور نیک نفس انسان ہے۔ اسی لیے وہ ہمارے خیال، منصوبے اور تجویز کو ضرور پسند کرے گا۔''

عمر نیشاپوری نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''تو اگر یہ سمجھتا ہے کہ ہم تینوں میں یہ معاہدہ ہوسکتا ہے تو میں تیرے ساتھ حسن طوسی کے پاس چلتا ہوں۔ میں حسن طوسی سے کوئی بات نہیں کروں گا لیکن جب تو اپنی یہ تجویز اس کے سامنے رکھے گا تو میں تجھ سے اتفاق کروں گا اور تیرا ساتھ دوں گا۔''

دونوں حسن طوسی کے پاس پہنچے وہ اس وقت بھی علم تاریخ پڑھ رہا تھا ان دونوں کو دیکھتے ہی کتاب ایک طرف رکھ دی اور دونوں کے چہروں کا جائزہ لینے کے بعد پوچھا۔ ''آج تم دونوں مجھے بے حد فکرمند لگ رہے ہو سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے؟''

رے کے حسن نے عمر نیشاپوری کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ میری تجویز کا ذکر تو کردے۔

لیکن عمر نیشاپوری نے کہا۔ ''منصوبہ تیرا ہے تجویز تو نے بیان کی ہے اس لیے یہاں بھی تو اسے اچھی طرح دل نشیں پیرائے میں بیان کرسکتا ہے۔''

رے کے حسن نے پہلے تو کچھ دیر امام موفق کی تعریفیں کیں اور یہاں سے فارغ ہونے والے کئی نامی گرامی شاگردوں کا ذکر کیا اور پورے یقین سے کہا۔ ''دوست حسن! ہم تینوں امام موفق کی درس گاہ کے غیر معمولی طالب علم ہیں اس لیے ہم تینوں یہاں سے نکلنے کے بعد دنیاوی جاہ ومنصب حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہوجائیں گے۔''

حسن طوسی نے اپنے ہم نام اور ہم درس ساتھی کے خیالات سے اتفاق نہیں کیا اور کہا۔ ''میں امام موفق کے کئی ایسے شاگردوں سے بھی واقف ہوں جو غیر معمولی عالم و فاضل بن گئے مگر دنیاوی جاہ ومنصب حاصل کرنے میں ناکام رہے۔''

رے کے حسن کو حسن طوسی کا یہ اختلاف اچھا نہیں لگا مگر اس ناپسندیدگی کو دل ودماغ میں چھپائے رکھا اور حسن طوسی کو راضی رکھنے کے لیے اس کی باتوں سے اتفاق کرلیا اور کہا۔ ''بے شک میں بھی امام موفق کے کئی ایسے شاگردوں سے واقف ہوں جن کا زمانہ وقت اور قسمت نے ساتھ نہیں دیا لیکن اس وقت میں ناکام آدمیوں کا ذکر بھی نہیں کروں گا۔ مجھے کامیاب انسان پسند ہیں۔ رے حسن طوسی ہمیں یقین ہے کہ تو ایک نہ ایک دن بہت بڑا آدمی بن جائے گا اور اس وقت ہم دونوں تیرے اعلیٰ ترین مقام اور درجے سے فائدہ اٹھائیں گے اس وقت ہم دونوں تجھ سے اسی موضوع پر بات کرنے آئے ہیں۔''

حسن طوسی نے جب پوچھا۔ ''کیا تم دونوں یقین رکھتے ہو کہ جو کچھ تم دونوں نے امام موفق کے شاگردوں کے بارے میں اپنا خیال وثوق سے ظاہر کیا ہے کیا مستقبل میں

ویسا ہی ہو کر رہے گا اور ہم تینوں میں سے کوئی ایک مقام جلیلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔"

عمر نیشاپوری نے کہا۔ "دوستو! میں خاموشی سے کام کرنے والا انسان ہوں، ہجوم سے گھبراتا ہوں اس لیے میں کوئی ایسا مقام اور مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا جس کا تعلق دربار سرکار سے ہو۔ اس لیے تم دونوں اپنی اپنی طبیعتوں کے بارے میں غور کر کے سمجھ سکتے ہو کہ کون کیا مرتبہ حاصل کرلے گا۔ رہ گیا ہم تینوں کا عہد نامہ تو میں اس میں تم دونوں کے کہنے سے شامل ہو جاؤں گا۔"

حسن طوسی نے رے کے حسن سے کہا۔ "چونکہ یہ تجویز تیری ہے تو اس معاہدے کی عبارت بھی تو ہی تیار کر اور ہم دونوں اس پر دستخط کر دیں گے۔"

رے کے حسن نے اسی وقت ایک عہد نامہ تیار کر دیا اور اس کا مشہور زمانہ مضمون یہ تھا۔ "یہ بات عام لوگوں میں بہت مشہور ہے کہ امام موفق کے شاگرد اعلیٰ مرتبوں پر پہنچ جاتے ہیں اگر ہم تینوں نہیں تو کم از کم ایک تو ضرور کسی منصب پر پہنچ جائے گا اب شرط یہ ہونی چاہیے کہ ہم میں سے جو کوئی بھی صاحب دولت بن جائے باقی دونوں ساتھیوں کو اپنے ساتھ برابر کا حصہ دار بنالے کوئی اور ترجیح کسی کو نہ ہو۔"

اس معاملے کی تین نقلیں تیار کی گئیں اور تینوں پر تینوں نے دستخط کیے اور ایک ایک معاہدہ تینوں نے اپنے پاس محفوظ کرلیا۔

تینوں شاگرد امام موفق سے درس لیتے رہے۔

آخر کار چار سال تک مسلسل درس لینے کے بعد حسن طوسی کو فارغ کر دیا گیا اور یہ اپنے وطن طوس لوٹ گیا۔

عمر نیشاپوری اور رے کا حسن دونوں امام موفق کی درس گاہ میں موجود رہے۔

عمر نیشاپوری کو اس کے بعض ہم سبق رے کے حسن کے بارے میں یہ بتاتے رہے کہ اس کا تعلق باطنی مذہب سے ہے اور یہ فتنہ مصر سے ایران پہنچا ہے۔

عمر نیشاپوری کو ان باتوں سے کوئی خاص غرض نہیں تھی لیکن اس نے اس قسم کی باتیں کرنے والے شریک درس طالب علموں سے یہ ضرور پوچھا کہ انہیں رے کے حسن کے بارے میں یہ راز کی باتیں کس نے بتائیں؟

ایسے سارے طالب علموں کا ایک ہی جواب تھا کہ انہیں یہ باتیں اپنے بزرگوں سے معلوم ہوئی ہیں اور بزرگوں کو یہ راز کی بات رے کے حاکم نے بتائی ہیں کیونکہ رے کا حاکم حسن کے باپ احمد بن علی سے اچھی طرح واقف ہے اور ان دونوں میں اکثر و بیشتر تلخ گفتگو ہوتی رہتی ہے۔

رے کا حاکم احمد بن علی صباح پر باطنی ہونے کا الزام لگاتا ہے اور احمد بن علی صباح جھوٹی قسمیں کھا کے انکار کر دیتا ہے اور ہمارے بزرگ تو یہاں تک بتاتے ہیں کہ رے کے حسن کا داخلہ نیشاپوری امام موفق کی درس گاہ میں اسی لیے کرا دیا گیا ہے کہ اس طرح شاید زمانے کو یہ یقین آجائے کہ اس کا تعلق باطنی مذہب سے نہیں ہے۔

عمر نیشاپوری ان مذہبی مباحث میں نہیں پڑنا چاہتا تھا اس لیے اس کی اپنے ہم درس حسن سے کبھی کوئی تلخ گفتگو نہیں ہوئی۔

رے کے حسن نے اپنے ہم درس عمر نیشاپوری کی وسعت قلبی، کشادہ دلی اور آزاد خیالی کو خوب اچھی طرح اندازہ لگانے کے بعد اس کو الصفا نامی رسائل کا مجموعہ پڑھنے کے لیے دیا اور عمر نیشاپوری نے اس کے مطالعہ کے بعد اس کا گہرا اثر قبول کیا۔

رے کے حسن نے جب یہ سمجھ لیا کہ عمر نیشاپوری اخوان الصفا سے متاثر ہوا ہے تو اس نے تخلیہ میں عمر نیشاپوری کو سمجھایا کہ اس کتاب کا علم دوسروں کو نہیں ہونا چاہیے۔

یہ دونوں شاگرد بھی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ حسن اپنے باپ کے پاس رے چلا گیا۔ عمر کو کہیں بھی نہیں جانا تھا اس لیے نیشاپور ہی میں فکر معاش کے سلسلے میں جدوجہد شروع کر دی اب عمر کا زیادہ وقت کتب فروشوں کی دکانوں پر گزرتا تھا جب کہ کتب فروش یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کی دکان کی نادر و نایاب کتابوں کو کوئی خریدے بغیر پڑھ لے۔

یہ کتب فروش اپنے امیر، رئیس کبیر، خریداروں کو ان کی مطلوبہ کتابیں کاتبوں سے لکھوا کے فروخت کرتے تھے۔

عمر نیشاپوری میں اتنی مالی استطاعت نہیں تھی کہ وہ کسی بھی کتب خانے کی مطلوبہ بہت سی کتابوں کو کاتبوں سے لکھوا کے حاصل کرے۔

عمر نیشاپوری کو اکثر و بیشتر اپنے دونوں شریک درس ساتھیوں کی یاد آتی رہی اور بطور خاص حسن طوسی کا [illegible] زیادہ آتا تھا وہ طوسی سے آنے والے لوگوں [illegible] کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہتا تھا لیکن [illegible]

حسن طوسی کے بارے میں کوئی دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے خاص معلومات حاصل نہ ہوتیں لیکن ایک شخص نے طوس سے آنے کے بعد بطور خاص عمر سے ملاقات کی اور عمر سے پوچھا۔ ''میں نے سنا ہے کہ تو اکثر و بیشتر اپنے شریک درس حسن طوسی کے بارے میں دریافت حال کرتا رہتا ہے اور دوسروں سے اس کے بارے میں کچھ جاننے کا خواہش مند رہتا ہے میں طوس گیا تھا اور تیری جستجو کو ذہن میں رکھتے ہوئے حسن طوسی سے ملاقات کی اور اس کے معاملات کے بارے میں تفصیلی معلومات بھی حاصل کیں۔''

عمر نے طوس سے آنے والے اس شخص کی بڑی خاطر مدارات کیں۔

اس نے طوس سے آنے والے شخص سے حسن طوسی کے حالات جاننا چاہے تو اسے بتایا گیا۔

''اے عمر! تیرے دوست حسن کا باپ خواجہ علی بلخ کے حاکم ابوعلی بن شاذان کے ماتحت کام کرتا تھا طوس کے حاکم کو برطرف کر دیا گیا اور اس سے مال گزاری کا حساب مانگا گیا۔ طوس کی مال گزاری کی وصولیابی حسن کے باپ خواجہ علی کے ذمہ تھی اور کئی سالوں سے یہ رقم بلخ کے حاکم کو نہیں پہنچی تھی اب جو بلخ کا حاکم زیر عتاب آیا اور اس سے مال گزاری کا حساب مانگا گیا تو طوس کا حساب کتاب بھی درمیان میں آ گیا۔ حسن کے باپ خواجہ علی کو بھی اس کے منصب سے الگ کر دیا گیا اور اس سے بھی مال گزاری کا حساب مانگا گیا خواجہ علی نے اپنا سب کچھ بیچ کر اس مصیبت سے نجات حاصل کرنا چاہی مگر گھر کا سب کچھ بیچ دینے کے بعد بھی حکومت کا حساب بے باق نہیں ہوا اور نوبت خواجہ علی کی گرفتاری اور سزا تک پہنچ گئی۔

اتنا کچھ بتانے کے بعد یہ شخص خاموش ہو گیا اور اس وقت عمر کی بے چینی اور پریشانی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی وہ آگے کی باتیں جاننا چاہتا تھا اور طوس سے آنے والے شخص نے شاید قصداً سکوت اختیار کر لیا تھا وہ عمر کی بے چینی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

جب اس شخص کے سکوت اختیار کیے ہوئے کچھ وقت گزر گیا تو عمر نے پوچھا۔ ''تو خاموش کیوں ہو گیا کیا حسن کے باپ کو قید کر دیا گیا؟''

اس شخص نے کہا۔ ''عمر! یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ جب حسن کے باپ خواجہ علی پر یہ افتاد پڑی ہوئی تھی اور وہ دہشت اور سراسیمگی کی حالت میں اِدھر اُدھر بھاگا پھر رہا تھا تو میں بھی وہیں موجود تھا میں تیرے ہم درس حسن سے بھی ملا اور اس کے پریشان حال باپ خواجہ علی سے بھی ملاقات کی جب میں وہاں پہنچا تو خواجہ علی نے اپنے آپ کو مکان میں قید کر رکھا تھا میں نے دروازے پر دستک دی تو غالباً اندر میری دستک سے پریشانیوں میں زیادہ اضافہ اس لیے ہو گیا کہ خواجہ علی کو یہ گمان گزرا کہ حکومت کی طرف سے ان کو گرفتار کرنے والے باہر دستک دے رہے ہیں۔ یہ بھی بالکل اتفاقی امر تھا کہ اسی وقت خواجہ علی کے مکان کے سامنے بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے خواجہ علی کے مکان کو بہت سے لوگوں نے محاصرے میں لے لیا یہ بھی ایک اتفاقی بات تھی کہ میرے سوا دروازے پر دستک کسی نے بھی نہیں دی تھی۔ غالباً اندر کوئی دروازے کی درز سے باہر کا جائزہ لے رہا تھا کیونکہ میں نے کسی کی آواز سنی وہ کسی کو بتا رہا تھا کہ باہر دروازے پر تو صرف ایک شخص ہے مگر دروازے سے دور لوگوں کا ہجوم ہے اور وہ سب طوس ہی کے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔''

دوسری آواز سنائی دی۔ ''ہم کب تک اندر منہ چھپائے بیٹھے رہیں گے اس لیے بیٹے حسن دروازہ کھول دو اور دروازے پر موجود شخص کو اندر بلا لو اور اس سے پوچھو کہ باہر طوس کے لوگ کیوں جمع ہوئے ہیں۔''

دروازہ کھل گیا اور مجھے اندر بلا لیا گیا۔ میں نے دروازہ کھولنے والے کو اس لیے پہچان لیا کہ میں نے اس نوجوان کو نیشاپور میں تیرے ساتھ دیکھا تھا۔ یہ حسن طوسی تھا جو امام موفق کی درس گاہ میں چار سال تک زیر تعلیم رہ چکا تھا۔

اندر کمرے میں حسن طوسی کا باپ ایک تخت پر غمگین بیٹھا مجھے دیکھ رہا تھا اور جب اس کو بھی یہ معلوم ہوا کہ میں نیشاپور سے آیا ہوں تو اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''اے شخص یہ تو اپنے ساتھ ایک ہجوم کیوں لگا لایا ہے۔''

میں نے خواجہ علی کو جواب دیا۔ ''میرا اس ہجوم سے کوئی تعلق نہیں۔ میں تو آپ کے بیٹے حسن سے ملاقات کرنے اس لیے آیا تھا کہ اس کے شریک درس عمر کو اس کا حال جاننے کی جستجو رہتی ہے۔''

حسن کے باپ نے پوچھا۔ ''تو پھر یہ باہر بہت سے لوگ کیوں جمع ہیں؟''

حسن نے اپنے باپ کو مشورہ دیا۔ ''والد محترم، ہمارے اندر بند رہنے سے مصیبت کم نہیں ہو گی بلکہ

بڑھ جائے گی اور اس پریشانی میں اگر آپ کو گرفتار کر لیا گیا تو بڑی ذلت و رسوائی ہوگی اس لیے باہر نکل کے جمع ہو جانے والوں سے معلوم کریں کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دروازے کو کھلتے دیکھ کر کئی آدمی دروازے کے قریب آ گئے اور اونچی آواز میں کسی نے کہا۔ "خواجہ علی! باہر آؤ اور ہجوم سے مت گھبراؤ۔"

خواجہ علی نے اپنے بیٹے حسن سے کہا۔ "میں باہر نکل کے ان سے پوچھتا ہوں کہ ان کا تعلق تو حکومت سے نہیں ہے پھر یہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

حسن نے جواب دیا۔ "ان کے چہروں پر اطمینان و سکون کی کیفیت ہے اس لیے طوس کے ان لوگوں سے بدگمانی مناسب نہیں ہے۔"

خواجہ علی نے باہر نکل کے دروازے کے قریب موجود آدمیوں سے پوچھا۔ "تم لوگ یہاں میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

خواجہ علی کے پیچھے اس کا بیٹا حسن اور میں بھی موجود تھے۔

تینوں میں سے ایک نے خواجہ علی سے پوچھا۔ "اے خواجہ! آپ اتنے خوف زدہ کیوں ہیں، دروازے کو اندر سے بند کر کے بیٹھ گئے اور یہ سمجھ لیا کہ اس طرح آپ نے مصیبت سے نجات حاصل کر لی ہے۔"

خواجہ علی نے ان تینوں کو بتایا۔ "دوستو! میں نے اپنی ساری جایداد اور جملہ گھریلو چیزیں بیچ کر رقم سرکاری خزانے میں داخل کروادی ہے مگر ابھی تک سرکاری واجبات میرے ذمہ ہیں اور کچھ ہی دنوں بعد میری گرفتاری کا فرمان جاری ہو جائے گا۔"

تینوں خواجہ علی سے کہنے لگے۔ "اے خواجہ! یہاں باہر بیٹھ کر تفصیلی باتیں نہیں ہو سکتیں اس لیے ہم تینوں کو اندر لے چلو ہم سب یہ چاہتے ہیں کہ تم اس مصیبت سے باعزت طریقے سے نجات حاصل کر لو۔"

خواجہ علی تینوں کو اندر لے گیا اور انہیں بیٹھنے کے لیے کرسیاں پیش کیں خود ان تینوں کے سامنے اپنے تخت پر بیٹھ گیا حسن طوسی نے مجھے بھی تخت کے کنارے بٹھا دیا۔

خواجہ علی نے تینوں ... سے پوچھا۔ "کیا پورا طوس میرا محاصرہ کیے ہوئے ہے؟"

یہ تینوں مسکرا رہے تھے ایک نے جواب دیا۔ "نہیں خواجہ علی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم نے طوس والوں کے

ساتھ بڑی مہربانی کا سلوک کیا ہے اور ہم سب تمہارے ہمیشہ سے شکر گزار ہیں اور تمہاری پریشانی کو ہم اپنی پریشانی سمجھ کے تمہارے غمگسار بن کے یہاں آئے ہیں۔"

خواجہ علی نے پوچھا۔ "مجھے تو سرکاری واجبات کا بڑا حصہ ادا کرنا ہے اور تم لوگ میرا کیا ساتھ دو گے؟"

تینوں نے آہستہ آہستہ آپس میں باتیں کیں اور کہا۔ "اے خواجہ علی! مت پریشان ہو ہم شہریوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہارے بقیہ واجبات ہم سب مل جل کے ادا کر دیں۔ تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے تمہارے اچھے دنوں کی یادگار ہم سب کے لیے عزت آبرو کی بات ہے۔"

خواجہ علی کو طوس والوں کی یہ مخلصانہ باتیں انتہائی امید افزا لگیں اور اندرونی جذبات کی شدت سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

طوس کے ان تینوں بزرگوں نے خواجہ علی کو دلاسہ دیا اور کہا۔ "اے خواجہ! ہم تجھے طوس کی عزت سمجھتے ہیں اب تو ہمیں حساب کتاب کر کے یہ بتا دے کہ کتنا واجب الادا حصہ اب بھی تیرے ذمہ ہے۔"

اس وقت تک باہر دروازے پر طوس کے بہت سے آدمی جمع ہو چکے تھے اور مطالبہ کر رہے تھے کہ خواجہ علی کو پریشان نہیں ہونا چاہیے، باہر آ کر اپنے ہم وطنوں کو اپنی خوشگوار صورت دکھائیں۔"

تینوں بزرگوں میں سے ایک باہر گیا اور شور کرنے والوں کو منع کیا کہ وہ خواجہ علی سے باتیں کرنے دیں اور شور کر کے پریشان نہ کریں۔

لیکن خواجہ علی کو وفور جذبات نے بیٹھنے نہیں دیا اور اس نے باہر نکل کے اپنے ہمدردوں کا شکریہ ادا کیا کہ تم سب کا شکریہ کہ میری مصیبتوں میں واقعی عملاً حصہ دار بن گئے ہو۔

یہ ہجوم خواجہ علی کو دیکھ کر بے چین ہو گیا اور لوگ یہی کہتے رہے کہ وہ سب خواجہ کے دکھ درد میں شریک ہیں اور خواجہ کو ذلت و رسوائی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

خواجہ علی نے ہجوم سے کچھ اور باتیں کیں اور اندر واپس آ کے تینوں کو بقیہ واجبات کی فہرست دے دی اور ان سے کہا۔ "یہ واجبات جتنی جلدی ادا ہو جائیں گے مجھے ذلت و رسوائی کا خوف نہیں رہے گا۔"

تینوں بزرگ بقیہ واجبات کا کاغذ لے کر باہر چلے گئے۔

خواجہ علی نے ان کی مشایعت کی اور جب ان تینوں نے یہ محسوس کیا کہ خواجہ علی ان کے ساتھ تنہا ہے اور خواجہ علی کا بیٹا حسن اور اس کا مہمان دونوں اندر رہ گئے ہیں تو ایک بزرگ نے سرگوشی میں خواجہ کو بتایا۔ "طوس کے لوگ اے خواجہ! تیرے بقیہ واجبات ادا کر دیں گے مگر وہ ان واجبات کے بدلے تجھ سے کوئی خدمت بھی لینا چاہتے ہیں۔"

خواجہ کو عزت آبرو پیاری تھی اور وہ اسے ہر قیمت پر بچانا چاہتا تھا۔

خواجہ علی نے مڑ کے اپنے دروازے کی طرف دیکھا اور آہستہ سے پوچھا۔ "تم لوگ مجھ سے کیا خدمت لو گے یہ بھی بقیہ واجبات کی ادائیگی سے پہلے ہی معلوم ہو جائے تو مناسب ہوگا۔"

تینوں میں سے ایک بزرگ جو طوس والوں کی نمائندگی کر رہا تھا اس نے جواب دیا۔ "اے خواجہ! تم پریشان مت ہو تمہیں تو اب مطمئن ہو جانا چاہیے کہ گرفتاری سے بچ جاؤ گے اور تم قید خانے میں نہیں ڈالے جاؤ گے۔"

خواجہ نے ایک بار پھر اپنے ادھ کھلے دروازے کی طرف دیکھا اور کہا۔ "مجھے تو اس خدمت کا علم ہونا چاہیے جو طوس والے میرے ذمہ کر دیں گے۔"

تینوں بزرگوں کی مسکراہٹ سے خواجہ علی نہیں سمجھ سکا کہ ان کے ہونٹوں کی ہنسی میں کوئی طنز ہے یا خواجہ کے لیے مخلصانہ جذبات۔

خواجہ علی کو بتایا گیا۔ "تجھ پر کوئی ایسا بوجھ نہیں ڈالا جائے گا جسے تو اٹھا نہ سکے۔"

لیکن وہ تینوں بزرگ اصرار کے باوجود کوئی معقول اور اطمینان بخش جواب دینے کے لیے تیار نہیں تھے جس سے خواجہ علی کی گھبراہٹ اور پریشانیوں میں اضافہ ہوتا رہا۔

آخر کار خواجہ علی نے احتیاط کو بھی بالائے طاق رکھ دیا اور کہا۔ "میں تو یہ چاہتا تھا کہ تم واجبات کی ادائیگی کے صلے میں مجھ سے لی جانے والی خدمت سے اس وقت مجھے آگاہ کر دو گے اور میرے بیٹے حسن کو اس کا پتا نہیں چلے گا لیکن تم لوگ معلوم نہیں کیوں رازداری سے کچھ اس طرح کام لے رہے ہو کہ میرا بیٹا حسن دروازے پر کھڑا ہمیں بغور تجسس سے دیکھ رہا ہے۔"

ان تینوں نے بھی دروازے کی طرف دیکھا تو انہیں خواجہ علی کے بیٹے حسن کے پیچھے کھڑا ہوا میں ان کا مہمان بھی نظر آیا۔

طوس سے آنے والے اس شخص نے عمر کو بتایا۔

''تیسرے دن خواجہ علی شرمندہ سر جھکائے ہوئے گھر میں داخل ہوا اور بیٹے کو بتایا حسن نے، آج طوس والوں نے اجب الادا رقوم کی ادائیگی کا مجھے معاوضہ بھی بتا دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ مجھے تین سال تک طوس والوں کی کسی معاوضے کے بغیر خدمت کرنا ہوگی۔ بیٹے حسن تو ان تین سالوں کا تصور کر کہ میں جس شہر میں حکومت کرتا رہا ہوں اب وہیں مجھے طوس والوں کی اجرت لیے بغیر مزدوری کرنا پڑے گی۔''

حسن کو باپ کی باتوں سے بڑی تکلیف پہنچی اور کہا۔

''والد محترم! جب یہاں آپ کی حکومت تھی مجھے آپ کا یہاں رہنا پسند نہیں تھا اور اب آپ ان کے مزدور ہو جائیں گے تو میری حالت اور خراب ہو جائے گی اس لیے مجھے تو آپ بخارا چلے جانے کی اجازت دیں وہاں کچھ عرصہ علمی مشاغل میں گزر جائے گا اس کے بعد حاضرِ خدمت ہو جاؤں گا۔''

عمر نے طوس سے آنے والے اس شخص کی باتیں بڑے دکھ سے سنیں اسے امام موفق کی درس گاہ میں کیا ہوا وہ معاہدہ یاد آیا وہ خود ابھی تک کوئی مقام و مرتبہ حاصل نہیں کر سکا تھا۔ حسن طوسی کے برے حالات کا بھی علم ہو گیا تھا معاہدے کے تیسرے فریق رئے کے حسن کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔

☆☆☆

زمانے کی سختیوں سے بے نیاز ہو جانے کے بعد اس نے دینی علوم کے علاوہ دوسرے دنیاوی علوم کی طرف توجہ دی اور یہ علوم اس نے کن استادوں سے حاصل کیے تاریخوں سے کچھ پتا نہیں چلتا۔ خیام کے سوانح لکھنے والے کو یہی دشواری پیش آتی ہے کہ خود عمر جو بعد میں عمر خیام کہلایا وہ شہرت اور نام و نمود کا جویا نہیں تھا اور اس نے اپنے بارے میں یہ نہیں بتایا کہ جن دوسرے علوم پر اسے کامل دسترس حاصل تھی ان کے اساتذہ کون تھے، فلسفہ کے سلسلے میں اس نے بوعلی سینا کا ذکر کیا ہے اور ان کو اپنا استاد کہتا تھا مگر تحقیق سے اس استادی اور شاگردی کا صرف اتنا پتا چلا کہ اس نے بوعلی سینا سے براہ راست علم حاصل نہیں کیا بلکہ اس کی کتابوں کے مطالعہ سے استادی اور شاگردی کا رشتہ قائم کر لیا۔

اس کے باپ کا انتقال ہوا تو عمر خیام کو کسی مربی اور سرپرست کی جستجو ہوئی اس وقت تک عمر خیام نے خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔ اب وہ فلسفی بھی تھا اور علم نجوم کا ماہر بھی، طبیب بھی تھا اور لغت، فقہ اور تاریخ کا عالم بھی اور بہترین ریاضی داں بھی۔ یہاں تک کہ بحیثیت مفسر بھی اسے شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ ہندی ریاضیات سے بھی واقفیت حاصل تھی۔ ادب اور انشا کے حوالے سے بھی لوگ اسے استاد کا مقام دیتے تھے۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتا تھا۔ اس کا حافظہ ایسا قوی تھا کہ اصفہان میں ایک کتاب سات بار بغور پڑھی تھی وہ اسے ایسی یاد رہی کہ نیشاپور پہنچ کر لکھوا دی اور جب اس کا اصل سے مقابلہ کیا گیا تو کوئی بڑا فرق نہ نکلا۔

خیام نے تحصیل کمال کے بعد درس و تدریس کے بجائے اپنے لیے تحریر و تصنیف کا کام پسند کیا۔ اس کا دماغ ریاضیات کے لیے بہت موزوں تھا مگر اس کی قدر و منزلت نہیں ہوئی اور وہ ناقدری کا شاکی رہا۔ وہ جبر و مقابلہ نامی کتاب کے دیباچہ میں زمانے کی ناقدردانی اور اپنی کسمپرسی کی شکایت کرتے ہوئے لکھتا ہے۔''میں اس فن کی تحقیق اور اس پر مسلسل غور و فکر کا وقت ایک مدت تک اس لیے نہ نکال سکا کہ زمانے کی گردشیں مجھے اس سے روکتی تھیں اور یہ قدر دانِ علم کے مٹ جانے کی مصیبت میں ہم مبتلا تھے کچھ تھوڑے اہل علم جو باقی ہیں وہ زیادہ تکلیف میں گرفتار ہیں اس لیے زمانے کی غفلتوں کے سبب سے وہ تحقیق کا وقت نہیں نکال سکے اور آج کل حکماء کے جو نقال موجود ہیں وہ حق کو باطل کے ساتھ ملا دیتے ہیں اور فرو علم کی نمائش کی حد سے آگے نہیں بڑھتے۔ جس قدر ان کو معلوم ہے اس کی بھی مانگ نہیں ہے لیکن چند بدنی ہست اغراض کے لیے۔''

خیام کا یہ فقرہ چند بدنی ہست اغراض کے لیے بڑا معنی خیز ہے۔ وہ پڑھنے والوں کو یہ بتا رہا ہے کہ علم طب اور نجوم کی وجہ سے اس کی طلب ہوتی رہتی ہے۔ جب سلاطین بیماری اور صحت کے لیے طبیب کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو اسے بلایا جاتا ہے۔ اسی طرح صلح و جنگ کے مواقع میں اس کو یاد کیا جاتا تھا اور اس سے تاریخوں کے سعد اور بد ہونے کے بارے میں پوچھا جاتا تھا۔

ان ہی پریشانیوں کے دوران اسے ابو طاہر نامی سرپرست مل گیا یہ شخص شمس الملک خاقان سمرقند و بخارا کے دربار سے وابستہ تھا اور بعد میں اس کے سلجوقی سلاطین سے بھی روابط اور تعلقات قائم ہو گئے۔ ابو طاہر نے عمر خیام کا شہرہ سنا تو اسے اپنے پاس بلا لیا۔ ابھی تک عمر خیام سلاطین کے درباروں تک نہیں پہنچا تھا۔ ابو طاہر کا نام عبدالرحمٰن بن

احمد تھا۔ تاریخ ولادت 430 ہجری ہے۔ یہ اصفہان میں پیدا ہوئے تھے اور سمرقند میں تعلیم پائی تھی۔ صاحب علم ہونے کے ساتھ یہ سمرقند کے بڑے صاحب ثروت لوگوں میں سے تھے۔ ابو طاہر نے عمر خیام کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اور اس کی شمس الملک خاقان بخارا سے اتنی تعریفیں کیں کہ عمر خیام کو شمس الملک تک رسائی حاصل ہوگئی۔ شمس الملک خود بھی بہت لائق اور عالم حکمران تھا اس نے خیام کی اتنی عزت کی کہ اپنے ساتھ تخت پر بٹھاتا تھا۔

لیکن اس شہرت ناموری اور قدردانی کے باوجود نظام الملک طوسی نے جو طالب علمی کے زمانے میں صرف حسن طوسی تھا اور اب ترقی کرتے کرتے الپ ارسلان سلجوقی کا وزیر بن چکا تھا اور یہاں تک پہنچنے میں اکیس یا بائیس سال گزر گئے تھے۔ نظام الملک کا شہرہ پورے ایران میں پھیل چکا تھا اور ہر طرف سے خواجہ حسن نظام الملک طوسی کے دوست احباب اس کے پاس پہنچنے لگے تھے۔ عمر خیام کو بھی اپنا معاہدہ یاد آیا اور وہ اپنے شریک درس خواجہ حسن طوسی سے ملاقات کرنے کے لیے مرو پہنچا۔

دونوں دوست انتہائی جذباتی کیفیت میں ملے۔ نظام الملک طوسی، خیام سے کمال تعظیم سے پیش آیا اور جب دونوں تخلیہ میں بیٹھے تو خیام نے دوران طالب علمی کا معاہدہ وزیر نظام الملک کے سامنے رکھ دیا۔

نظام الملک، عمر خیام کی شہرت اور علمی کمالات سے اچھی طرح واقف تھا۔

معاہدے کو سرسری نظروں سے دیکھ کر ایک طرف رکھ دیا اور عمر خیام سے کہا۔ ''آپ صاحب فضل و کمال ہیں اس لیے آپ کو بھی سلطان کی خدمت میں رہنا چاہیے کیونکہ امام موفق کی مجلس میں جو معاہدہ ہوا تھا اس کی رو سے منصب مشترک قرار پایا تھا اور میں اچھی طرح آپ کی دانش مندی اور کارگزاری سلطان کے ذہن نشین کردوں گا اور مجھے یقین ہے کہ میری طرح آپ بھی سلطان کے معتمد الیہ ہو جائیں گے۔''

عمر خیام، نظام الملک کی باتیں توجہ سے سنتا رہا اور جب نظام الملک نے سکوت اختیار کیا تو خیام نے کہا۔ ''خواجہ آپ نے جو کچھ فرمایا اس سے آپ کی شرافت کریم النفسی اور بلند ہمتی کا اظہار ہوتا ہے ورنہ مجھ جیسا شخص اس عزت افزائی کا کب مستحق ہے جو وزیر مشرق سے مغرب تک حکومت کررہا ہو اس کی طرف سے میری اتنی عزت افزائی باعث فخر ہے اس میں بھی کچھ شک نہیں ہے کہ خواجہ کی طرف سے جو ارشاد ہوا ہے وہ بالکل سچ ہے آپ جیسے عالی رتبہ کے سامنے اس کی کیا حقیقت ہے آپ کے احسانات مجھ پر بہت ہیں اگر میں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہوں تو مدتوں میں صرف آج کی نوازش کا شکر ادا نہیں ہو سکے گا، اگر آپ میری دلی آرزو جاننا چاہتے ہیں جس سے میں تمام عمر آپ کا بندہ بنا رہوں گا تو سن لیں کہ جس منصب کے لیے ارشاد ہوا ہے وہ میرے مناسب حال نہیں ہے بلکہ سچ پوچھیے تو یہ کفران نعمت ہے مگر میں آپ کی مہربانی سے یہ چاہتا ہوں کہ میں ایک گوشہ میں بیٹھ کے فوائد علمی کی اشاعت کروں اور ترقی عمر و دولت کی دعا مانگتا رہوں۔''

خواجہ نظام الملک طوسی خیام کی باتیں توجہ سے سنتا رہا اور ابھی وہ جواب میں کچھ کہہ بھی نہیں سکا تھا کہ خیام نے اپنی یہی باتیں دہرانا شروع کردیں کیونکہ خیام نے خواجہ کی خاموشی سے یہ سمجھا تھا کہ خواجہ نے اس کی باتیں توجہ سے نہیں سنی ہیں۔

خواجہ نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے خیام کو منع کیا کہ مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے تیرا مفہوم پا لیا ہے اب میں تجھ پر تیری مرضی کے مطابق نوازش کروں گا۔

اس وقت تو خواجہ نے نیشاپور کے حاکم کو ایک فرمان لکھا کہ خیام کو ہر سال بارہ مثقال سونا بطور وظیفہ جاری کیا جائے۔

خیام نے خواجہ کا شکریہ ادا کیا اور یہ فرمان لے کر نیشاپور چلا گیا اور وہاں تکمیل علوم و فنون میں ایسا مصروف ہوا کہ زمانے کی ناقدری کا گلہ دل سے نکل گیا۔

اب اس نے علم جبر و مقابلہ نامی ایک کتاب لکھی اور اس کے بعد کئی کتابیں مزید تخلیق کیں۔ خیام کا تمام ایران میں شہرہ ہوگیا اور اسے بوعلی سینا ثانی کہا جانے لگا۔

جب الپ ارسلان سلجوقی کی وفات کے بعد اس کے بھتیجے ملک شاہ نے حکومت سنبھالی تو اسے عمر خیام شدت سے یاد آیا اور اپنے وزیر خواجہ نظام الملک کو حکم دیا کہ خیام کو نیشاپور سے طلب کرے۔

حکم کی تعمیل ہوئی اور خیام کو ملک شاہ کے سامنے پیش کردیا گیا۔

ملک شاہ نے خیام کو حکم دیا کہ وہ سن جلالی تیار کرے یعنی ملک شاہ اس نامور مہندس سے مروجہ تقویم میں اصلاح

...ہم کروانا چاہتا تھا۔

دنیا کی تمام قوموں میں سات دن کا ہفتہ، تیس دن کا مہینا اور بارہ مہینے کا سال مانا جاتا ہے یہ تقسیم سینکڑوں سال سے رائج ہے۔ انسان نے عقل ومشاہدے کی بناء پر ایام اور ماہ و سال کی جو عقلی تقسیم کی تھی اگرچہ صحیح تھی لیکن ایک زمانے کے بعد جب یہ دیکھا کہ سال تو چاند کے دوروں کے حساب سے چل رہا ہے مگر تیس بتیس برس میں ہر موسم اپنے مرکز سے ہٹ جاتا ہے جس سے قمری حساب کی غلطیاں محسوس ہوئیں اور ثابت ہوا کہ آفتاب اور زمین کی گردش بھی ہمارے شب و روز میں اپنا عمل کرتی ہے بالآخر مسلسل تجربوں اور برسوں کے غور وفکر کے بعد آفتاب اور مہتاب کے سالانہ دورے حسب ذیل قرار پائے۔

سورج تین سو پینسٹھ دن پانچ گھنٹے اڑتالیس منٹ انچاس سیکنڈ۔

مہتاب تین سو چون دن۔ تمدنی ضرورتوں سے یہ مناسب سمجھا گیا کہ قمری مہینے شمسی مہینوں کے مطابق کرلیے جائیں۔ پارسیوں نے اسی اصول پر اوّل اپنے قمری سال میں پورے گیارہ دن کا اضافہ کرکے اس کو تین سو پینسٹھ دن کا شمسی سال بنالیا۔

ملک شاہ کے تمام دفاتر میں فارسی سن جاری تھا۔ آمدنی سن شمسی کے حساب سے وصول کی جاتی تھی اور خرچ قمری مہینوں کے حساب سے ہوتا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 107...ء مطابق 467ھ میں خزانے میں خرچ کے واسطے ایک پیسا بھی باقی نہ رہا۔ اس وقت ملک شاہ کو بے حد تشویش ہوئی اور اس نے ارادہ کرلیا کہ آمدنی اور خرچ کے لیے ایک منتظم سال قرار دیا جائے اسی لیے اس نے عمر خیام کو طلب کیا اور جب وہ ملک شاہ سے ملا تو ملک شاہ نے اپنا منشا ظاہر کیا اور کہا۔ ”اصلاح تقویم کے لیے ایک مستند مجلس منعقد کی جائے۔“

عمر خیام اپنے عہد کے ایسے نامور لوگوں سے واقف تھا جو اس سلسلے میں اس کی مدد کرسکتے تھے۔ چنانچہ اس نے ...ات اپنے جیسے حساب دانوں کی ایک مجلس تیار کی اور یہ ...انوں افراد اس کے مشیر اور معاون ومددگار قرار پائے۔

اصلاح تقویم کا یہ کام تین سال کی محنت میں تکمیل کو پہنچا۔ عمر خیام کی تحقیقات کا نتیجہ یہ تھا کہ آفتاب اپنا سالانہ دورہ تین سو پینسٹھ دن پانچ گھنٹے اور انچاس منٹ میں طے کرتا ہے۔ خیام نے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ ہر چوتھے سال ہر

ٹالمی (Ptolemy)

مصر کے یونانی بادشاہوں کا خاندان، جس نے 345ق م سے 40ء تک حکومت کی۔ ٹالمی اول نے جو سکندر اعظم کا ایک جرنیل تھا، 323ق م میں مصر پر قبضہ جمالیا اور اسی نام کے بادشاہ یکے بعد دیگرے اس کے جانشین بنے۔ آخری بادشاہ ٹالمی پنج دہم ملکہ قلوپطرہ کا پوتا تھا۔

ٹالین

خلیج فن لینڈ کے جنوبی ساحل پر ایسٹونیا کی بحری بندرگاہ اور دارالحکومت، اس کی بنیاد 1219ء میں رکھی گئی تھی۔ یہ ہینسٹک لیگ کا رکن بھی رہا۔ 1561ء میں یہ سویڈن اور 1750ء میں روس کی عملداری میں چلا گیا۔ یہاں تیرہویں صدی عیسوی کا بنا ہوا ایک قلعہ بھی ہے۔ اہم صنعتوں میں بجلی، پارچہ بافی اور کاغذ کی صنعتیں شامل ہیں۔ تیل کے کنوؤں کی کھدائی کے لیے مشینری بھی تیار ہوتی ہے۔ 1917ء تک اس کا نام ریول (جرمن) تھا۔

ٹامس کپ

بیڈمنٹن کے عالمی مقابلے کے کپ کا نام، اس کی حیثیت وہی ہے، جو ٹینس میں ڈیوس کپ کی ہے، گو اس کا سرکاری نام انٹرنیشنل بیڈمنٹن چمپئن شپ چیلنج کپ ہے، لیکن چاندی کی یہ خوبصورت صراحی تمام دنیا میں ٹامس کپ کے نام سے مشہور ہے۔ عالمی بیڈمنٹن چمپئن شپ کے بارے میں 1939ء میں انٹرنیشنل بیڈمنٹن فیڈریشن نے سنجیدگی سے غور کیا اور اس کے صدر جارج ٹامس کی طرف سے یہ کپ مقابلے میں رکھا گیا۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کی وجہ سے یہ مقابلے فوراً نہ ہوسکے۔ پہلا مقابلہ 1948ء میں ہوا۔ یہ مقابلے ہر تین سال بعد ہوتے ہیں ابتدائی مقابلوں کے لیے اسے چار علاقوں (زون) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ چاروں علاقوں کے فائنل جیتنے والے ملک یہ کپ حاصل کرنے کے لیے چمپئن ملک کے خلاف کھیلتے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ دو مسلم ممالک ملایشیا اور انڈونیشیا کے کھلاڑی بیڈمنٹن کے ان مقابلوں میں سرفہرست رہتے ہیں۔

مرسلہ: عارف اللہ، کراچی

ایک دن بڑھا دیا جائے اور سات دوروں کے ختم ہونے پر آٹھویں دور پر چار کے بجائے پانچویں سال ایک دن زیادہ کر دیا جائے اس حساب سے شمسی قمری سال کا فرق پورے تینتیس برس میں نکل جاتا ہے۔

یہ مسئلہ حل ہو گیا تو خیام نے اس سن کا نام سلطان جلال الدین ملک شاہ کے نام پر سن جلالی رکھا اور مہینوں کے نام بدستور وہی رہے جو پہلے تھے سن جلالی کی ابتدا جمعے سے ہوئی تھی رمضان المبارک کی دسویں تاریخ اور سال 471ھ مطابق پندرہ مارچ 1079ء۔

عمر خیام کو علم نجوم میں مہارت حاصل تھی حالانکہ وہ اپنی اس شہرت سے خوش نہیں تھا کیونکہ وہ علم نجوم کو سائنسی علم نہیں سمجھتا تھا اور اس علم کی نسبت سے اپنی شہرت میں سبکی محسوس کرتا تھا۔

سردی کا موسم تھا۔ عمر خیام صدر الدین محمد بن المذفر کے پاس شہر مترو میں بحیثیت مہمان ٹھہرا ہوا تھا۔ بادشاہ کو عمر خیام کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ آپ کے خواجہ بزرگ کے مہمان ہیں۔

بادشاہ کو عمر خیام کے علم نجوم کی آزمائش مقصود تھی۔ اس نے خواجہ بزرگ صدر الدین کے پاس اپنا ایک آدمی بھیجا اور پوچھا۔ ''مجھے بتایا گیا ہے کہ عمر خیام آپ کا مہمان ہے۔ آپ اس سے معلوم کریں کہ میں شکار کے لیے نکلنے والا ہوں مگر طوفانی بارشوں سے گھبراتا ہوں۔ عمر خیام علم نجوم میں مہارت رکھتا ہے اس سے کہو کہ وہ اپنے علم سے معلوم کر کے ہمیں بتائے کہ مجھے کس دن کتنے دنوں کے لیے شکار کے لیے نکلنا چاہیے میں بارشوں سے گھبراتا ہوں۔''

خواجہ بزرگ صدر الدین نے بادشاہ کے آدمی کو عمر خیام سے ملوا دیا اور اس نے بادشاہ کا پیغام براہ راست عمر خیام تک پہنچا دیا۔

عمر خیام نے خواجہ بزرگ صدر الدین سے کہا۔ ''مجھ کو حساب لگانے اور نتیجہ معلوم کرنے میں کئی دن لگ جائیں گے اس لیے بادشاہ کو مطلع فرما دیں کہ وہ مجھ پر عجلت کا دباؤ نہ ڈالیں۔ میں بادشاہ کے سوال کا جواب حساب لگا کر چند دنوں میں بھیج دوں گا۔'' اور بادشاہ کے آدمی سے بولا۔ ''تو ہمارے پاس رہ کے اپنا وقت نہ ضائع کر بادشاہ کو میرا جواب پہنچ جائے گا۔''

بادشاہ کا آدمی واپس چلا گیا اور خواجہ بزرگ صدر الدین کو گھبراہٹ ہوئی کہ خیام نے دو چار دن کا وقت لیا ہے اگر بادشاہ کا کام دو چار دن میں نہ ہوا تو وہ دونوں [سے] خفگی ظاہر کرے گا۔

لیکن صدر الدین، عمر خیام پر بھی کوئی دباؤ نہیں ڈال سکتے تھے بس نرمی سے درخواست کی۔ ''بادشاہ کا یہ کام جتنی جلدی ہو جائے گا اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔''

عمر خیام نے صدر الدین کی بے چینی اور پریشانی کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''خواجہ بزرگ! میں نے بادشاہ کو براہ راست جواب بھیجا ہے اور اب اگر میں بادشاہ کی توقع کے برعکس زیادہ دن حساب کتاب میں لگاؤں گا تو اس کی سزا مجھے ملے گی اور بادشاہ آپ سے کوئی جواب نہیں طلب کرے گا۔''

صدر الدین نے کہا۔ ''بھائی عمر خیام! اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ بادشاہ نے تم کو براہ راست پیغام نہیں بھیجا تھا۔ بادشاہ کا آدمی میرے پاس اس کا پیغام لے کر آیا تھا اور میں نے اس کو تیرے سامنے پیش کر دیا اور اس نے تجھ سے براہ راست جواب بھی پا لیا اس کے باوجود میں خود کو اس معاملے سے الگ نہیں کر سکتا۔''

عمر خیام نے کہا۔ ''اے خواجہ بزرگ! اب آپ خاموشی سے اپنی جگہ پر واپس جائیں اور مجھے کام کرنے دیں۔''

عمر خیام نے علم نجوم سے حساب لگانا شروع کر دیا اور اس کام میں اس نے دو دن لگا دیے۔

خواجہ بزرگ عمر خیام کو چھیڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن دو دن کا وقفہ خواجہ بزرگ کو بہت زیادہ لگا اور وہ شام کے وقت کھنکارتے ہوئے عمر خیام کے کمرے میں داخل ہو گئے اور عمر خیام سے پوچھا۔ ''بھائی عمر! دو دن ہو گئے ابھی کتنا وقت اور لگے گا۔''

عمر خیام نے جواب دیا۔ ''میں نے سوالات قائم کر کے ان کے جوابات معلوم کر لیے ہیں آپ چاہیں تو میرا حسابی فیصلہ بادشاہ کے پاس لے جا کر سنا دیں۔''

خواجہ بزرگ نے تشویش سے معلوم کیا۔ ''تو کیا میں تیرا علم نجوم سے متعلق جوابی فیصلہ کسی کے ذریعے بادشاہ کے پاس بھیج دوں۔''

عمر خیام نے جواب دیا۔ ''حضرت میں اس معاملے میں آپ کو کوئی زحمت اس لیے بھی نہیں دوں گا کہ بادشاہ نے اگر میرے جواب کو دیکھنے کے بعد کوئی سوال کر دیا تو آپ اس کا جواب نہیں دے سکیں گے اس لیے میں بادشاہ سے خود

ملوں گا۔"

خواجہ بزرگ نے پوچھا۔"کیا میں بھی تیرے ساتھ چل سکتا ہوں؟"

عمر خیام نے جواب دیا۔"آپ میرے ساتھ باشوق چلیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

خواجہ بزرگ نے اپنا ایک آدمی بادشاہ کے پاس بھیج دیا اور بادشاہ کو خبر مل گئی کہ عمر خیام اور خواجہ بزرگ اس کے سوالوں کا جواب لے کر بادشاہ کے پاس پہنچنے والے ہیں۔

بادشاہ دونوں کا بے چینی سے انتظار کرتا رہا اور پھر جیسے ہی بادشاہ کو اس کے دربانوں نے بتایا کہ خواجہ بزرگ اور عمر خیام بادشاہ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں تو بادشاہ نے ان دونوں کا آگے بڑھ کے استقبال کیا۔

ان دونوں کو بادشاہ کے روبرو بیٹھنے کی عزت حاصل ہوئی۔

خیام نے اپنے علم نجوم سے متعلقہ حسابی جواب نکالا اور کچھ دیر بادشاہ کو سمجھاتا رہا کہ فلاں تاریخ سے فلاں تاریخ تک مطلع صاف رہے گا اور اس دوران آپ شکار کھیلنے کے لیے جاسکتے ہیں۔

بادشاہ نے کہا۔"اے عمر خیام! تیرے بارے میں جو کچھ مجھے بتایا گیا یا میں جانتا تھا تو ہمیشہ اس سے زیادہ لائق و فائق ثابت ہوا۔"

عمر خیام نے بشریت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "بادشاہ سلامت! انسان بھول چوک اور خطا کا پتلا ہے۔ الانسان مرکب منِ الخطاوالنسیان۔"

بادشاہ نے عمر خیام کے حسابی جواب کو سامنے رکھ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔"تو ان دنوں میں آسمان سے بارش اور ژالہ باری نہیں ہوگی؟"

عمر خیام نے جواب دیا۔"حساب سے تو یہی معلوم ہوا آگے اللہ ہر معاملے میں قادر مطلق ہے۔"

بادشاہ نے دربار میں موجود امراء کے سامنے خیام کی بڑی تعریفیں کیں اور کہا۔"میں اس شخص کے کمالات کا قائل اور معتقد ہونے کے علاوہ اس کے ذاتی کردار حلم و مروت اور بے غرضی، بے لوث اور غیر تحریصی مزاج و کردار کا مداح ہوں۔"

بادشاہ کے پاس دونوں نے کچھ وقت گزارا اور اس وقت خواجہ بزرگ کو بھی بڑی خوشی اور فخر محسوس ہوتا رہا کہ عمر خیام جیسا بے مثال لائق فائق انسان ان کا مہمان ہے۔

ویدوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آریہ ابتداء میں مصریوں، یونانیوں اور رومیوں کی طرح مظاہر قدرت کی پوجا کرتے تھے۔ یعنی جن مظاہر یا چیزوں سے انہیں فائدہ پہنچتا تھا یا نقصان کا احتمال ہوتا تھا، ان کی پوجا شروع کردیتے تھے لیکن جوں جوں ان کی تہذیب ترقی کے مراحل طے کرتی گئی، خداؤں اور دیوتاؤں کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہوگیا۔ چاروں ویدوں میں کسی دیوی کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن ویدی زمانے کے بعد متعدد دیویاں دھرم میں داخل کرلی گئیں اور پھر تمام دیویوں اور دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے قربانیوں اور پوجا پاٹ کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا، جس پر عمل کرنا انتہائی دشوار ہوگیا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ایک ایسے طبقے کی ضرورت محسوس کی گئی جو عام معاشرے کے مفاد کی خاطر ان لاتعداد دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی کا اہتمام کرتا رہے اور باقی لوگ کاروبار حیات میں مصروف رہیں۔ چنانچہ اس طرح ایک بڑی اونچی، اتم جاتی وجود میں آئی جسے برہمن کہا جاتا ہے۔

مرسلہ: علی حیدر عابدی، کراچی

دونوں گھر واپس پہنچے تو خواجہ بزرگ نے خیام سے پوچھا۔"تم نے بادشاہ کو لکھ کر جو کچھ بتایا ہے اگر موسم اس کے خلاف ہوگیا اور تمہاری پیش گوئی جھوٹی ہوگئی تو بادشاہ کی طرف سے کیسا ردِعمل ہوگا۔"

عمر خیام نے جواب دیا۔"میں نے اپنے بشر ہونے کا پیشگی اظہار کردیا ہے اور یہ بھی بتادیا ہے کہ اللہ قادر مطلق ہے۔"

آخر وہ دن بھی آگیا جب بادشاہ کو شکار کے لیے محل سے باہر نکلنا تھا۔ ایک بھاری نفری کے ساتھ بادشاہ شکار کے لیے روانہ ہوا عمر خیام اور خواجہ بزرگ بادشاہ کے ساتھ سفر کررہے تھے۔

اس وقت آسمان پر بادلوں کا نام و نشان تک نہ تھا لیکن ابھی ان لوگوں نے تھوڑا سا سفر طے کیا تھا کہ آسمان ابر آلود ہونے لگا اور ٹھنڈی ہوائیں نمی لیے ہوئے چلنے لگیں۔

بادشاہ کے ہمراہی زیرلب مسکرائے کہ عمر خیام کی پیش گوئی غلط ثابت ہوگئی اور بارش ہوکر رہے گی اور بادشاہ نے بھی آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے خیام سے پوچھا۔ "تیرے حساب میں تو اس بارش کا کوئی ذکر نہیں ہے۔"

خیام نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ''بارش نہیں ہو گی اور آپ میرے بتائے ہوئے دنوں میں شکار سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔''

بادشاہ کے جن امراء نے بادشاہ اور عمر خیام کی باتیں سنی تھیں وہ عمر خیام کی ہٹ دھرمی پر تعجب کر رہے تھے۔ سبھی کو یقین تھا کہ جو بادل پوری فضا کو گھیرے میں لے چکے ہیں وہ برس کر رہیں گے۔

ان میں آپس میں علم نجوم اور اولیاء کی کرامات کا ذکر ہونے لگا اور وہ سبھی اس خیال پر متفق تھے کہ نجومی جھوٹے ہوتے ہیں لیکن اولیاء کی کرامات حقیقت ہوتی ہیں اولیاء کو خدا کی طرف سے یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ چاہیں تو بارش کروا دیں اور نہ چاہیں تو بادلوں کو برسے بغیر ہی واپس کر دیں۔

بادشاہ خود بھی پریشان تھا کہ اس نے اپنے امراء کے سامنے عمر خیام کی بڑی تعریفیں کر دی تھیں اور اس وقت عمر خیام جھوٹا ثابت ہو رہا تھا۔

بادشاہ نے ٹھہر کے بارش کا انتظار کیا اور عمر خیام سے پوچھا۔ ''تیری پیش گوئی تو جھوٹی ثابت ہو رہی ہے اور بادل بتا رہے ہیں کہ وہ برس کے رہیں گے۔''

خواجہ بزرگ نے عمر خیام کی طرف سے جواب دیا۔ ''بادشاہ سلامت پیش گوئی کرنے کے بعد خیام نے یہ بھی تو کہا تھا کہ اللہ قادر مطلق ہے اور وہ حسابی نتائج کو جھٹلا بھی سکتا ہے۔''

بادشاہ نے دونوں سے کہا۔ ''میرے ہمراہیوں کو دیکھو ان کے چہروں پر طنز اور استہزاء پایا جاتا ہے وہ اس وقت بہت خوش نظر آ رہے ہیں۔''

خیام نے جواب دیا۔ ''بادشاہ سلامت مجھے اپنے علم نجوم پر بھروسا ہے۔ یہ بادل چھٹ جائیں گے اور اگر تھوڑی سی بارش ہو بھی گئی تو چند دنوں میں یہاں کا موسم اتنا خشک ہو جائے گا کہ زمین نمی کو ترس جائے گی۔''

بادشاہ اور عمر خیام میں یہ گفتگو جاری تھی کہ ژالہ باری شروع ہو گئی اور لوگ خیموں میں پناہ لینے لگے۔ بادشاہ بھی اپنے خیمے میں چلا گیا اور عمر خیام اور خواجہ بزرگ کو اپنے ساتھ رکھا۔ خیام سے پوچھا۔ ''اے خیام! یہ کیا ہو رہا ہے لوگ تو تیرا مذاق اڑائیں گے۔''

خواجہ بزرگ بے حد شرمندہ تھے کہ وہ عمر خیام جیسے نالائق علم نجوم کے ماہر کو یکتائے زمانہ سمجھتے رہے حالانکہ آج اس کی ایک اہم ترین علم نجوم سے متعلق پیش گوئی غلط ثابت ہو گئی تھی۔

عمر خیام نے انتہائی پُراعتماد لہجے میں بادشاہ کو سمجھایا۔ ''آپ کسی قدر صبر و تحمل سے کام لیں دیکھئے ابھی تک بارش نہیں ہوئی صرف ژالہ باری ہو رہی ہے اور اس سے زمین بہت زیادہ نم نہیں ہو گی اور تین چار دنوں بعد آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ زمین بالکل خشک ہے اور آپ شکار سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔''

عمر خیام کے حاسدوں نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ یہیں سے محل واپس چلیے اور ژالہ باری کے بعد موسلا دھار بارش شروع ہو جائے گی۔ خیام کی جگہ اگر کسی ولی نے بارش نہ ہونے کی یقین دہانی کرائی ہوتی تو آسمان پر چھائے ہوئے بادل ولی کے حکم سے واپس چلے جاتے۔''

خواجہ بزرگ اور عمر خیام تو امراء کی ان باتوں سے پریشان ہو رہے تھے اور دونوں ہی یہ بھی سوچ رہے تھے کہ اگر بادشاہ نے اپنے ان خوشامدی امراء کی باتیں مان لیں اور شکار کا ارادہ ترک کر دیا اور محل واپس چلا گیا تو اس کے بعد خیام کی خواری لگ جائے گی۔

بادشاہ خاموش رہا اس نے امراء کی باتیں بھی سنی تھیں اور خیام کی اس پیش گوئی سے بھی آگاہ تھا کہ ژالہ باری تو ہو سکتی ہے مگر بارش نہیں ہو گی اور تین چار دنوں میں زمین نمی سے اتنی زیادہ محروم ہو جائے گی کہ ٹٹولنے اور کریدنے سے بھی نمی کا نام و نشان نہیں ملے گا۔

بادشاہ نے عمر خیام کی باتوں پر یقین کیا اور اعلان کروا دیا کہ عمر خیام کہتا ہے کہ بارش نہیں ہو گی اور یہ ژالہ باری بھی بالکل عارضی اور وقتی ہے اور بادل چھٹ جائیں گے اور تین چار دنوں میں زمین نمی سے محروم ہو جائے گی۔

یہ اعلان ہوتا رہا اور امراء اور بادشاہ کے شریک سفر آپس میں بیٹھ کے عمر خیام کا مذاق اڑاتے رہے۔ ان سب کو یقین تھا کہ بارش موسلا دھار ہو گی اور زمین بارش کے پانی کو ہفتوں جذب نہیں کر سکے گی اور آخر کار یہ ضدی اور ہٹ دھرم عمر خیام بادشاہ کے عتاب کا نشانہ بن کر رہے گا۔

خواجہ بزرگ نے عمر خیام کا ہاتھ پکڑا اور خیمے کے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ''آؤ باہر نکل کے موسم کا جائزہ لیں۔''

شرمسار عمر خیام خواجہ بزرگ کے ساتھ باہر نکلا تو زمین پر اولوں کا برسنا دیکھ کر پریشان ہوا۔ زمین سفید چھوٹے بڑے اولوں میں چھپ گئی تھی۔

خواجہ بزرگ نے ڈرے سہمے لہجے میں پوچھا۔ ''اے خیام! یہ کیا ہورہا ہے اگر ژالہ باری کے بعد موسلا دھار بارش ہوگئی تو بادشاہ یہیں سے اپنے محل واپس چلا جائے گا اور وہاں بیسیوں امراء کی موجودگی میں ہماری طلبی ہوگی تجھ سے جواب طلب کیا جائے گا اور بادشاہ کے سامنے موجود جملہ امراء تیرا مذاق اڑا رہے ہوں گے۔''

خیام نے خواجہ بزرگ کی باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا اور جواب دیا۔ ''خواجہ بزرگ! میری وجہ سے آپ پریشان نہ ہوں۔ موسلا دھار بارش تو ایک طرف رہی ژالہ باری بھی رک جائے گی اور بادلوں کا آسمان پر نام ونشان تک نہیں رہے گا اور یہ اپنی اپنی جگہ شرمسار اور نادم ہوکر مسکرانا تک بھول جائیں گے۔''

خواجہ بزرگ کو عمر خیام کی باتوں پر یقین نہیں آرہا تھا اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تیرے ساتھ مجھے بھی شرمندگیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔''

خیام نے کھلی فضا میں اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور اس پر کئی اولے گرے اگر وہ موٹا کپڑا نہ پہنے ہوئے ہوتا تو اولوں سے زخمی ہوجاتا۔

بادشاہ کو ژالہ باری کے بند ہونے کا بے چینی سے انتظار تھا اور وہ بار بار اپنے غلاموں کو حکم دے رہا تھا کہ باہر جا کر دیکھیں ژالہ باری میں کوئی کمی ہوئی کہ نہیں۔

آخر کافی دیر بعد بادشاہ کے ایک غلام نے بتایا۔ ''ژالہ باری رک گئی ہے اور زمین پر بکھری ہوئی ژالہ پگھل کے پانی کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے اور زمین پگھلے ہوئے اولوں کے پانی کو جذب کررہی ہے۔''

اب بادشاہ کے امراء اور مصاحبین پریشان تھے کہ واقعی عمر خیام کے بقول بارش نہیں ہوئی اور معاملہ ژالہ باری کی حد تک رہا۔

کئی امراء بھی باہر گئے اور بادشاہ کے غلام نے جو بتایا تھا وہی انہیں بھی نظر آیا۔ زمین پر بکھرے ہوئے اولے پانی کی شکل اختیار کرچکے تھے اوپر آسمان کی طرف دیکھا تو وہاں بھی بادل کم ہوتے جارہے تھے۔

جب بادشاہ کو بالکل یقین آگیا کہ ژالہ باری ختم ہو چکی ہے اور بادل بھی بہت کم رہ گئے ہیں تو وہ بھی خیمے سے باہر نکلا پہلے تو آسمان کی طرف دیکھا جہاں اب بادلوں کا نام ونشان تک موجود نہ تھا۔

زمین اولوں کے پانی کو تیزی سے جذب کررہی تھی۔

بادشاہ نے خیام اور صدر الدین کو بھی باہر بلوایا حالانکہ یہ دونوں بادشاہ کے پیچھے پیچھے چل کر کچھ فاصلے پر رک گئے تھے اور جب بادشاہ نے مڑ کے دونوں کو دیکھا تو خیام سے کہا۔ ''اللہ نے تیری آبرو رکھ لی اور آسمان سے بادل غائب ہوچکے ہیں۔''

خواجہ بزرگ نے اولوں سے آئی ہوئی کچھ دیر پہلے کی زمین کی طرف دیکھا اب وہاں بھی اولوں کے بجائے گیلی زمین نظر آئی زمین اولوں کے پانی کو تیزی سے جذب کررہی تھی۔

بادشاہ نے خیام سے پوچھا۔ ''کیا اب غائب ہو جانے والے بادل واپس نہیں آئیں گے؟''

خیام نے جواب دیا۔ ''از روئے حساب تو یہی معلوم ہوتا ہے ورنہ اللہ کی معیشت پر کسی کو اختیار نہیں۔''

لوگ خیموں سے باہر نکلے موسم انتہائی خوشگوار تھا اور ژالہ باری نے موسم کو زیادہ ہی خوشگوار بنا دیا تھا۔

وہ سب دو دو چار چار کی ٹکڑیوں میں تقسیم ہوکر آپس میں باتیں کرنے لگے۔

ان میں اکثریت ان کی تھی جو عمر خیام سے حسد کرتے تھے اور وہ ژالہ باری کو خیام کی ندامت کا ایک موقع سمجھ رہے تھے ان میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو اپنی خواہش کا اظہار پیش گوئی کی شکل میں کررہے تھے ان کا اصرار تھا کہ ژالہ باری کے بعد موسلا دھار بارش ضرور ہوتی اور جب ان سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا گیا کہ بادل تو رخصت ہوئے موسلا دھار بارش کس طرح ہوگی تو ان لوگوں نے وثوق سے کہا۔ ''اگر بادل تیزی سے واپس جاسکتے ہیں تو پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ واپس بھی آسکتے ہیں۔''

عمر خیام بے حد خوش تھا کہ خدا نے اس کو ذلت و رسوائی سے بچا لیا تھا۔

بادشاہ نے تین دن تک اس جگہ قیام کیا اور ان تین دنوں میں اس نے زمین کی جو کیفیت دیکھی تو بہت حیران ہوا زمین بالکل خشک ہوچکی تھی اور کریدنے اور کھودنے کے بعد بھی نمی کا نام ونشان تک نہیں ملتا تھا۔

بادشاہ نے آگے روانہ ہوجانے کا حکم دیا اور خیمے اکھڑ گئے سامان سمٹ گیا اور بار برداری کے جانور سامان اور خیموں سے لدے پھندے آگے روانہ ہوگئے۔

راستے میں بادشاہ نے خیام سے کئی بار پوچھا۔ ''اب تو ہمیں مصیبتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، آگے ژالہ باری

یا بارش تو نہیں ہوگی؟''
بادشاہ کے ان سوالوں کا خیام کے پاس یہی جواب تھا کہ مشیت ایزدی پر انسان کو کوئی قابو حاصل نہیں اور اس کے حساب کے مطابق اب ژالہ باری بھی نہیں ہونا چاہیے۔''
بادشاہ اطمینان سے شکار کھیلتا رہا اور بارش تو کیا آسمان بادلوں تک سے محروم رہا اور بادشاہ شکار کھیلنے کے بعد خوش و خرم واپس آ گیا وہ ابھی تک عمر خیام کی دوسری لیاقتوں اور علوم کا معترف تو تھا اب وہ اس کے علم نجوم کا بھی قائل ہو چکا تھا۔
لیکن عمر خیام کو اپنے علم نجوم کے کامیاب نتیجے سے زیادہ خوشی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے دوسرے علوم کے مقابلے میں اس علم کو حقیر سمجھتا تھا۔
کئی دنوں کے بعد بادشاہ کو اپنے بیٹے سنجر کی طرف سے فکر لاحق ہو گئی۔ وہ چیچک کے موذی مرض میں مبتلا تھا اور بڑے بڑے طبیب اس کے علاج سے قاصر تھے۔ عمر خیام کو یہ علم بھی حاصل تھا اور بادشاہ نے عمر خیام کو بھی طلب کر لیا۔
عمر خیام کو بادشاہ نے فکر مند لہجے میں بتایا۔ ''شہزادہ سنجر کو چیچک نکل آئی ہے اور کئی طبیب اس کو دیکھ کر مایوس ہوئے اب میں تجھ سے یہ اُمید رکھتا ہوں کہ تو شہزادے کو چیچک سے نجات دلا دے گا۔''
بادشاہ نے اپنے آدمیوں کے ذریعے عمر خیام کو شہزادے کے پاس بھیج دیا۔ اس وقت شہزادہ آنکھیں بند کیے پڑا ہوا تھا پورا چہرہ چیچک کے دانوں میں چھپ گیا تھا۔
عمر خیام پہلے تو شہزادے کو بغور دیکھتا رہا۔ کئی کئی دانے آپس میں مل گئے تھے۔ عمر خیام کو شہزادے کی بری حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔
اس نے خوب اچھی طرح شہزادے کا معائنہ کرنے کے بعد نسخہ لکھ دیا۔
شہزادہ خیام کو دیکھ کر پُر امید ہو گیا تھا۔
شہزادے کے پاس سے ہٹنے کے بعد باہر نکلتے ہوئے خیام سے کسی امیر نے پوچھا۔ ''شہزادہ ٹھیک تو ہو جائے گا؟''
عمر خیام نے جواب دیا۔ ''نہیں جناب! اس کے حلق کو اگر دانوں نے بند کر دیا یا آنکھیں دانوں سے متاثر ہو گئیں تو شہزادے کی جان بچ جانے کے باوجود وہ بینائی سے محروم ہو جائے گا۔''
پوچھنے والے امیر نے کہا۔ ''میں تو شہزادے کی زندگی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں کہ وہ مر بھی سکتا ہے۔''
دونوں کی باتیں شہزادے کا ایک انتہائی قریبی خدمت گار بھی سن رہا تھا۔ اس نے شہزادے کے پاس پہنچ کے شہزادے کی بلائیں لیں اور بڑبڑانے لگا۔ ''بڑا بدخواہ طبیب ہے۔ کہتا ہے شہزادہ مر جائے گا اور اگر بچ بھی گیا تو ہمیشہ کے لیے بینائی سے محروم ہو جائے گا۔''
شہزادے نے اپنے خدمت گار کی یہ ساری باتیں بڑے کرب سے سنیں اور کہا۔ ''تو خدا سے دعا کر کہ وہ مجھے صحت یاب کر دے اور میری بینائی بھی بحال رہے۔''
خدمت گار نے خوشامدانہ لہجے میں جواب دیا۔ ''میں تو ہر وقت آپ کی صحت یابی کی دعا کرتا رہتا ہوں اور میں نے خدا سے درخواست کی ہے کہ اگر موت شہزادے کی لکھ دی گئی ہے تو اے خدایا میری زندگی شہزادے کو دے دے، اللہ نے چاہا تو آپ صحت یاب بھی ہو جائیں گے اور بینائی کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''
شہزادے نے اپنے خدمت گار کو شکر گزار نظروں سے دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔
عمر خیام، شہزادے کا علاج کرتا رہا اور شہزادہ صحت یاب ہو گیا۔
عمر خیام صحت یاب شہزادے سے نیشاپور جانے کی اجازت طلب کرنے گیا تو اس وقت شہزادے کا خوشامدی خدمت گار بھی موجود تھا۔
عمر خیام نے شہزادے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔ ''شہزادے اللہ نے آپ کو صحت یاب کر دیا۔ حالانکہ میں بہت مایوس تھا اور میرے لیے یہ بہت بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ کی دونوں آنکھیں بھی محفوظ رہیں۔''
خدمت گار نے طنزاً شہزادے سے کہا۔ ''شہزادے! یہی شخص میرے سامنے ایک امیر سے آپ کی صحت یابی کے بارے میں مایوسی کی بات کر رہا تھا اس نے آپ کی زندگی کی طرف سے ہمیں مایوس کر دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ اگر شہزادہ اچھا ہو گیا تو اپنی آنکھوں کی بینائی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائے گا مگر اب کہ آپ صحت یاب بھی ہو چکے ہیں اور آپ کی دونوں آنکھیں بھی پُر نور ہیں تو یہ شخص آپ کی خوشامد کرنے کے لیے حاضر ہو گیا ہے۔''
خیام کو خدمت گار کی باتوں سے بے حد خوف محسوس ہوا کیونکہ اس نے تو مستقبل کے بادشاہ اور اس وقت کے ولی عہد کو عمر خیام سے ہمیشہ کے لیے برگشتہ اور بدگمان کر دیا تھا۔

☆......☆

سنجر کے سلطان بن جانے کے بعد خیام کی بڑی ناقدری ہوئی۔ اس وقت تک خیام علمی تحقیقات میں نمایاں مقام حاصل کر چکا تھا مگر کسی دربار سے وابستگی اختیار نہیں کی تھی اور اب وہ گوشہ نشین ہو گیا تھا اور شاعری کی طرف توجہ دے دی تھی۔

زندگی بھر کے تجربات اور عمر کے آخری دنوں میں ناکامی کے اثرات نے خیام کو بہت مایوس اور غمزدہ کر دیا تھا اور یہی رنگ اور اثرات اس کی رباعیات میں پائے جاتے ہیں۔ اس کی شاعری میں انتہائی بے باکی پائی جاتی ہے اور شراب کا عنصر غالب ہے وہ اپنی ایک رباعی میں مفتی شہر کو مخاطب کرتا ہے۔

اے مفتی شہر از تو پرکار تریم
بایں ہمہ مستی از تو ہشیار تریم
تو خون کسان خوزی و باخون اشارہ
انصاف بدہ کرام خونخوار تریم

(اے مفتی شہر! ہم تجھ سے زیادہ چالاک ہیں اور اس کے باوجود کہ مستی میں ہیں تجھ سے زیادہ ہوشیار ہیں تو لوگوں کا خون پیتا ہے اور ہم انگور کا خون (شراب) پیتے ہیں۔ انصاف سے بتا کہ ہم میں سے کون زیادہ خونخوار ہے)

ایک دوسری رباعی میں کہتا ہے

مسجد اگرچہ بانیاز آمدہ ایم
حقا کہ نہ ارابھر خاز آبدہ ایم
کفشے زدر خانہ حق وزدیدیم
آں کہنہ شیرہ است و باز آمدہ ایم

(ہم اگرچہ مسجد میں نیاز مند ہو کر آئے ہیں لیکن خدا جانتا ہے کہ ہم نماز کی خاطر نہیں آئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہم نے خانہ خدا کے دروازے سے ایک جوتی چرائی تھی اب وہ پرانی ہو چکی ہے اس لیے دوبارہ آئے ہیں)

یہ تو ریاکاروں سے متعلق دو رباعیاں تھیں اب ذرا دنیا اور دولت، دنیا کی ناپائیداری سے متعلق اس کی رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

غافل بچہ امیدوریں شوم سرا
بردولت او دل مہنداز بہر خدا
ہرگاہ کہ خواہد کہ کشیند بازپا
گبرو جلش وستب کہ بالا پیا

(خدارا بتاؤ کہ غافل انسان اس منحوس دنیا میں دولت دنیا کے ساتھ کس امید پر دل لگاتا ہے جب کہ حالت یہ ہے کہ جب بھی آدمی آرام سے بیٹھنا چاہتا ہے موت اسی وقت اس کا ہاتھ پکڑتی ہے کہ اٹھو اور چلو)

تیسری رباعی میں کہتا ہے

اے مرد خرد حدیث فردا ہوس است
درد ہر زدن لاف سخن ہا ہوس است
امروز چنیں پر کہ خرد مند کس است
واندکہ ہمہ جہاں چنیں یک نفس است

(اے عقل مند آدمی! فردا کی باتیں محض ہوس ہے دنیا میں ان باتوں کی سلاف زنی محض ہوس ہے آج جو شخص عقل مند ہے وہ جانتا ہے کہ تمام جہان صرف ایک لحظہ کے لیے ہے)

عمر تو چہ دو سدوچہ سرمدچہ ہزار
زیں کہنہ سربرون برنرت ناچیار
گر بادشہی و گرا گدائے بازار
ایں بردو یک نرخ بود آخرکار

(تیری عمر دو سو سال ہوئی تو کیا تین سو سال بلکہ ایک ہزار سال بھی ہوئی تو کیا اس پرائی سرائے (دنیا) سے تجھے آخر ضرور نکال لے جائیں گے تو اگر بادشاہ ہے یا بازار کا گداگر اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا آخرکار بادشاہ و گداگر ایک ہی حالت میں ہوں گے)

وہ اپنے مذہب عشق کے بارے میں کہتا ہے

یہ دختر عالم معانی عشق است
سربیت قصیدۂ جوانی عشق است
اے آنکل خبر نہ داری از عالم عشق
ایں نکتہ بداں کہ زندگانی عشق است

(عشق عالم معانی کا سرخرد ہے عشق جوانی کے قصیدے کا مطلع ہے اے کہ تجھے عالم عشق کی خبر نہیں یہ تھوڑی سی بات سمجھ لے کہ زندگانی عشق کے ساتھ ہی ہے)

بگرفت راعشق بکارے خوش خوش
گفتا جو من آدم تو یا بیروں کش
القصہ چاں سوخت و لم از غم او
کانش ہمہ ہیزم شد و ہیزم آتش

(عشق نے مجھے عجیب کام میں لگا دیا۔ اس سے کہا کہ میں آ گیا ہوں تو باہر جا، حاصل کلام یہ کہ میرا دل اس کے عشق میں ایسا چل گیا کہ آگ ایندھن ہو گئی اور ایندھن آگ ہو گیا)

قومے متفکر اندور مذہب و دیں

تجھے متحیر اند درشک و یقیں
نگاہ منادی برآمد زکمیں
کاہے بے خبراں راہ نہ آشنا یزایں

"ایک گروہ مذہب و دین کی تحقیق میں سرگرداں اور دوسرا فرقہ شک اور یقین کے فلسفہ میں گم ہورہا ہے۔ اچانک پردۂ غیب سے ندا آئی کہ اے بے خبر لوگو! راستہ نہ تو یہ ہے اور نہ وہ۔"

خیام کا عقیدہ تھا کہ دنیا میں خوشی نام کی کوئی چیز نہیں اس کی خوشی میں بھی غم موجود ہوتا ہے۔

ہشدار کہ رزگار شر انگیز است
ایمن منشیں کہ تیغ دوراں تیز است
درکام تو گر زمانہ لوز بند ہنر
زنہار فرو بر کہ زہر آمیز است

(ہشیار ہو کر رہ کیونکہ زمانہ شرانگیز ہے بے فکر ہو کر نہ بیٹھ کیونکہ زمانے کی تلوار بہت تیز ہے اگر زمانہ تیرے منہ میں حلوا بھی ڈالے تو اسے نہ کھا کہ وہ زہر آمیز ہے)

گل گفت بہ از لقائے من روئے عبرت
چند میں ستم گلاب گر بارے چیست
بلبل زبان حال باوی گفت
یک روز کہ خندیر کہ سالے باگر پست

(پھول کہتا تھا کہ دنیا میں مجھ سے زیادہ خوب صورت کسی کا چہرہ نہیں پھر کیا وجہ ہے کہ گلاب ساز مجھ پر اتنا ظلم کرتا ہے بلبل نے زبان حال سے جواب دیا کہ دنیا میں ایسا کون ہے جو ایک دن ہنسا ہو اور اسے سال بھر رونا نہ پڑا ہو)

افلاک کہ جز غم نفزائید دگر
نہ نہند بجاتا نہ ربایند دگر
ناآمدہ پا اگر بداند ربا
از دہرچہ می کشیم نایند دگر

(سوائے غم بڑھانے کے آسمانوں کا اور کوئی کام نہیں ہے کوئی ایک چیز بھی جگہ پر اس وقت تک نہیں رکھتے جب تک اس کے عوض دوسری چیز اٹھا نہ لیں۔ وہ لوگ جو ابھی تک دنیا میں نہیں آئے اگر ان کو معلوم ہو جائے کہ ہم یہاں کس مصیبت میں مبتلا ہیں تو وہ ہرگز دنیا میں آنے کی خواہش نہ کریں)

چوں ماصل آدمی دریں جائے در در
جز درد دل و دادن جاں نیست دگر
خرم دل آنکہ یک نفس زندہ بود
و آسودہ کسے کہ خود نہ ازد از بادکر

(اس دو دروازے والے مکان (دنیا) میں آدمی کو درد دل اور مر جانے کے سوا کچھ حاصل نہیں اس لیے خوش وہ ہے جو ایک دم بھی زندہ نہ رہا اور آسودہ وہ ہے جو سرے سے پیدا ہی نہ ہوا)

خیام تلقین کرتا ہے چونکہ دنیا میں آرام نہیں درد سے موافقت پیدا کہ

اے دل زمانہ رسم احسان مطلب
و از گردش دوراں سرو ساماں مطلب
درباں طلبی درد تو افزوں گردو
بادرد بساز کو ہیچ درباں مطلب

(اے دل زمانے سے احسان کی اُمید نہ رکھ آسمان کی گردش سے سرو سامان کی اُمید نہ رکھ اگر تو علاج کی خواہش کرے گا تو تیرا درد اور زیادہ ہوگا درد کے ساتھ موافقت کر اور علاج کے پیچھے مت پھر)

چندیں غم باحسرت دنیا چیست
ہرگز دیدی کسے کہ جاوید بزیست
ایں یک نفسے درمنت عار بکس
باعار ہے عاریتی باید زیست

(دنیا کی حسرتوں پر اتنا غم کیوں کہ میں کیا تو نے کبھی دیکھا ہے کہ کوئی شخص ہمیشہ جیا ہو۔ جان تیرے جسم میں صرف ایک سانس ہے جو تجھے عاریتاً دی گئی ہے بس ایسی عارضی چیز کے ساتھ عارضی طور پر ہی گزارا کرنا چاہیے)

ماس فلک از پیش دلارائی تہیت
آسودہ دریں جہاں نمی دائم کیست
ایمن نفسے زرگ نتواں زیست
پس فائدہ در جہان بے فائدہ چیست

(آسمان کے طشت میں دل آرائی کا سامان نہیں ہے میں نہیں جانتا کہ اس جہان میں کون آسودہ خاطر ہے ایک دم بھی ہم موت کے خطرے سے محفوظ نہیں پھر معلوم نہیں اس بے فائدہ جہان میں کیا فائدہ ہے)

خیام کا عقیدہ تھا کہ سب کچھ خدا کے اختیار میں ہے چنانچہ کہتا ہے

دارندہ جو ترکیب طبائع آراست
ازبرچہ او فگنوش اندر کم وکاست
گر یک آمد شکستن ازبہرچہ بود
در نیک نیا مدایں صورعیب کراست

(خدا نے جب مختلف طبائع کی ترکیب درست کی تو پھر کس لیے ان میں نقص ڈالے اگر یہ صورتیں خدا نے بنائی تھیں اور ٹھیک بن گئی تھیں تو پھر ان کو توڑ دینے کی کیا وجہ ہوئی اور اگر ٹھیک نہیں بنی تھیں تو یہ کس کا قصور ہے)

عشق ارچہ بلاست آں بلا حکم خداست
برحکم خدا خدمت خلق چراست
چوں نیک و بد خلق بہ تقدیر خداست
پس روز پسیں حساب بندہ چراست

(عشق اگر چہ بلا ہے لیکن یہ بلا خدا کے حکم کے مطابق آئی ہے پھر خدا کے حکم پر لوگ ملامت کیوں کرتے ہیں جب خلقت کی نیکی اور بدی خدا کے ہاتھ میں ہے تو پھر قیامت کے دن بندوں سے حساب لینے کا کیا مطلب ہے)

خیام نے بہت زیادہ جرأت سے کام لیا تو یہ رباعی وجود میں آئی

بزدار جو گل وجود مارا آراستہ
دانست زفعل ماچہ برخواہد خواست
بے حکمت نیست ہرگنا ہے کہ راست
پس سوختن قیامت از بہر جفاست

(خدا نے جب ہمارے جسم کی مٹی بنائی اسی وقت اسے معلوم تھا کہ ہمارے اعمال کیا ہوں گے ہم جو گناہ کرتے ہیں اس کے حکم کے بغیر نہیں کر سکتے پھر قیامت کے دن ہم کو دوزخ میں ڈالنے کا کیا مطلب ہے)

وہ تیسری جگہ خدا کے حکم رضا اور زمانہ کے ساتھ زمانہ سازی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے

باحکم خدا بجز رضا درنگر جنت
باخلق بجز روئے دریا در گرفت
ہر حیلہ کہ در تصور عقل آمد
کردیم ولے کہ باقضا درنگرفت

(خدا کے حکم کے سامنے رضا کے سوا کوئی چارہ نہیں خلقت کے ساتھ سوائے زمانہ سازی کے گزارہ مشکل ہے۔ عقل کے تصور میں جتنے حیلے آسکتے تھے وہ کیے لیکن کوئی حیلہ بھی قضا کو نہ ٹال سکا)

دوسری جگہ وہ کہتا ہے

تاکے زچراغ مسجد و دودِ کنشت
تاکے کر زیانِ دوزخ و سود بہشت
رو برسر لوح ہیں کہ استاد قضا
اندر ازل آنچ بود بے بود نوشت

(مسجد کے نور اور دیر کی تاریکی کا کب تک ذکر کرو گے دوزخ کے نقصان اور بہشت کے فائدے کب تک بیان کرو گے جا کر لوح محفوظ کو دیکھو کہ ازل کے دن استاد قضا نے جو کچھ ہونا تھا ہونے سے پہلے ہی لکھ دیا تھا)

لیکن یہی خیام ایک اور رباعی میں اپنے ان خیالوں کی تردید میں کہتا ہے

آنکس کہ گناہ نزد اور سہل بود
ایں نکتہ بگوید ارکہ او اہل بود
علم ازلی علت عصیاں کردن
نزدیک حکیم غایت جہل بود

(جو شخص گناہ کو جائز قرار دے اگر اس میں ذرا بھی عقل ہے تو یہ نکتہ سمجھ لے گا کہ گناہ کے عذر میں علم ازلی کا بہانہ کرنا دانا آدمی کے نزدیک حد درجہ کی جہالت ہے)

خیام معرفت اور عرفان کے حوالوں سے اپنی رباعیوں میں کہتا ہے

ساقی قدے کہ ہست عالم ظلمات
جز روئے تو نیست درجہاں آب حیات
از جان و جہان و ہرچہ درعالم ہست
مقصودِ توئی و بر محمدؐ صلوات

(اے ساقی! شراب کا پیالہ دے کیونکہ جہان تاویل ہے اور تیرے چہرے کے سوا اس دنیا میں اور کوئی آب حیات نہیں۔ جان اور دنیا و مافیہا سے مقصود صرف تیری ہی ذات ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود)

ایک اور جگہ بڑی بڑی باتیں کرنے والوں اور حور و قصور کے طلب گاروں کا ذکر اس طرح کرتا ہے

قومے زگزاف در غرور افتاوند
قومے زپئے حور و قصور افتاوند
معلوم شود جو پردہ ہابرواراند
کز کوئے تو دور دور افتاوند

"بعض لوگ لاف و گزاف کے دھوکے ہی میں پڑے رہے اور بعض لوگ حور و قصور کے طلب گار رہے لیکن جب پردہ اٹھے گا تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ لوگ تیرے کوچے سے بہت دور بھٹکتے رہے۔" اپنے بارے میں کہتا ہے

بازے بودم پریدہ از عالم راز
بوتا کہ پرم دمے نشیبے زفراز
ایں جاچو نیا ختم کے محرم راز
زاں درکہ درآمدم بروں رفتم باز

(میں ایک باز تھا جو عالم بالا سے اڑ کر آیا تا کہ کچھ دیر کے لیے بلندی کو چھوڑ کر پستی میں پرواز کروں لیکن میں نے دیکھا کہ یہاں میرا کوئی محرم راز نہیں اس لیے پھر اسی راستے واپس چلا گیا)

انسانوں کی منافقت اور دورنگی کا ذکر اس طرح کرتا ہے

یک دست بہ مصحف و یک دست بجام
گر مرد حلالیم گہے مرد حرام
مائیم دریں گنبد فیروزہ خام
نے کافر مطلق نہ مسلمان تمام

''ہمارے ایک ہاتھ میں قرآن ہے اور دوسرے ہاتھ میں شراب کا پیالہ کبھی ہم حلال کے پابند ہو جاتے ہیں اور کبھی حرام حلال کی پروا نہیں کرتے اس نیلے گنبد (آسمان) کے نیچے ہم ابھی خام ہیں نہ تو پورے کافر ہیں اور نہ پورے مسلمان۔''

ایک جگہ نو نقد اور تیرہ ادھار کے مفہوم کو اس طرح بیان کرتا ہے

من ہیچ ندانم کہ مرا آنکہ سرشت
از اہل بہشت کردیا دوزخ زشت
جامے و بتے و بربطے بر لبکشت
ایں چار مرا نقد و ترانسیہ بہشتا

''میں بالکل نہیں جانتا کہ جس نے مجھے پیدا کیا ہے اس نے مجھے بہشتوں کے زمرے میں لکھا ہے یا دوزخیوں میں جام شراب ہو معشوق ہو مگر ربط ہو اور لب کشیت ہو یہ چار چیزیں نقد میرے لیے چھوڑ دے اور بہشت کا ادھار بے شک تو لے لے۔''

خیام بتاتا ہے کہ زمانے کی تکالیف کو برداشت کیے بغیر مقصد حاصل نہیں کر سکتا، کہتا ہے

درد ہر کے بہ گلعذارے نہ سید
تا بردش از زمانہ خارے نرسید
درشانہ نگر کہ تا بصد شاخ نشد
دستش برزلف نگارے نرسید

''دنیا میں کوئی شخص اپنے مطلوب تک نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ زمانے کی تکلیفیں برداشت نہ کرے کیا تو نے نہیں دیکھا کہ کنگھی جب تک سو ٹکڑے نہ ہو جائے معشوق کی زلفوں تک نہیں پہنچتی۔''

خیام کی شاعری مختلف بلکہ متضاد خیالات کی حامل ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح غالب ایک ہی خیال کو دو مختلف متضاد شعروں میں کہتا ہے۔

بلبل کے کاروبار پر ہے خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

اور دوسری جگہ عشق کے بارے میں بتاتا ہے

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا

خیام نے انتہائی محنت و مشقت کی زندگی بسر کی اور یہ محنت و مشقت تحقیق اور علوم سے متعلق تھی۔ خیام پر اس کی بعض رباعیوں کی وجہ سے کفر و الحاد کا فتویٰ بھی دیا گیا مگر آج ہمیں فتویٰ دینے والوں کے ناموں کا علم نہیں ہے لیکن عمر خیام کی شہرت ایران سے نکل کر یورپ تک اور یورپ سے امریکا تک پہنچ چکی ہے ہم نے خیام کو صوفی حکیم تصوف کے خانے میں رکھ کر یہ مضمون لکھا ہے۔

اس کی موت کا واقعہ بھی بے حد عجیب و غریب ہے۔

خیام کی وفات 526ھ بتائی گئی ہے اور علامہ سید سلیمان ندوی ان کی تاریخ ولادت 440ھ بتاتے ہیں اس حساب سے وفات کے وقت خیام کی عمر 86 یا 87 برس کی ہوگی۔

خیام کی وفات سے متعلق یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔

خیام ایک دن بوعلی سینا کی مشہور فلسفیانہ تصنیف شفا کی الہیات کا مطالعہ کر رہا تھا جب وہ واحد اور کثیر کی بحث پر پہنچا تو سونے کا خلال کتاب میں رکھ کر اسے بند کر دیا اور کہا کہ چند سمجھ دار لوگوں کو بلاؤ مجھے وصیت کرنی ہے اور جب کچھ سمجھ دار لوگ آگئے تو انہیں وصیت کی اور نماز کے لیے کھڑا ہو گیا اس وقت سے پھر نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ رات کو عشاء کی نماز کے سجدے میں اس کی زبان سے یہ فقرے ادا ہوئے۔

''بارالٰہی! تو جانتا ہے کہ میں نے اپنے امکان پھر تجھ کو جانا تو مجھے معاف کر دے کہ میں نے تجھ کو جتنا بھی جانا وہی تیرے حضور میں میرا وسیلہ ہے۔'' یہ کہتے کہتے وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

خیام کو نیشاپور میں حیراہ کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ پہلے یہاں خیام کی قبر پر گلاب کے درختوں کا سایہ تھا۔

ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن اپنے سفر نامے میں لکھتے ہیں کہ خیام کی قبر ایک ویران سے باغ میں ہے جس میں کبھی پھولوں کی کیاریاں اور پانی کی نہر ہوا کرتی تھیں مگر اب وہاں خس و خاشاک کے سوا کچھ نہیں رہا نہ قبر پر کوئی کتبہ ہے جس سے نام یا شہرت کا پتا چلے۔

ہیپی نیو ایئر

وسیم بن اشرف

نئے سال کی آمد خوشیوں بھرا پیغام ہے۔ ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ نیا سال اس کے لیے خوشگوار ثابت ہو۔ اس خواہش کی تکمیل کے لیے لوگ کیسی کیسی عجیب و غریب حرکتیں کرتے ہیں۔



کیسی عجیب وغریب رسوم رائج ہیں

نئے سال کے آغاز پر دنیا کے مختلف علاقوں میں مختلف طریقوں سے نئے سال کو خوش آمدید کہنے کا رواج ہے کہیں عجیب بے تکی حرکتوں کے نظارے دیکھنے کو ملیں گے، کہیں کلچر، تہذیب وثقافت کی جھلک نمایاں ہوگی تو کہیں غیر حقیقی، توہم پرست رسومات اور روایات کے جلوے ہوں گے، دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف اقوام کے لوگ الگ الگ انداز میں نئے سال کا جشن منائیں گے، دنیا کے میلے میں رنگ برنگی دکانیں سجیں گی، امریکا کے ٹائم اسکوائر کی گھڑی پر

31 دسمبر کو 11 بجکر 59 منٹ ہوتے ہی اچانک نئے سال کی آمد کا شور مچتا ہے اور برسوں سے وہاں ایسا ہی ہو رہا ہے۔ فٹ بال کے متوالوں کے ملک برازیل میں نئے سال کی شام ہے، لوگ سفید لباس زیب تن کر رہے ہیں، وہ نئے سال میں گندی اور خراب روحوں سے خود کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کر رہے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ نئے سال کی پہلی شام کو مکمل سفید لباس زیب تن کرنے سے اس برس کوئی بدروح آپ کو ستائے گی نہیں، سفید لباس گندی روحوں کو آپ کے قریب نہیں پھٹکنے دے گا، بدروحوں سے ڈرنے والوں کے ملک برازیل میں ہی سال کی پہلی شام ہے سمندر کے کنارے لوگوں کا ہجوم ہے۔ وہ سات سمندروں کی لہروں میں چھلانگ لگانے آئے ہیں، اگر وہ چھلانگ لگائیں گے تو اس روایت کو زندہ رکھیں گے جس کے مطابق لہروں میں چھلانگ لگانے سے نیا سال ان کے لیے خوش بختیاں لائے گا، گھڑی پر 12 بجنے میں چند سیکنڈ باقی ہیں، لوگوں نے لہروں میں چھلانگیں لگانا شروع کر دیں، جب ڈبکی لگا کر سر پانی سے نکالا تو وہ نئے سال میں داخل ہو چکے تھے، انہوں نے خود کو برائیوں اور آلودگیوں سے پاک صاف کر لیا تھا۔ کچھ لوگ سمندر میں تازہ پھول اور گلدستے پھینک رہے تھے، وہ خوش بختی پانے کے لیے اپنی روایات کو نبھا رہے تھے۔

آدھی رات کا وقت تھا، ہر دوسرے گھر کا کوئی نہ کوئی فرد اپنے سامنے ایک چمچ مسور کی دال اور... مختلف قسم کے بیج رکھ کے بیٹھا تھا، 12 بجنے سے چند سیکنڈ قبل سبھی نے دال اور بیج کھانا شروع کر دیئے، یہ ملک چلی کے افراد تھے، وہ ہر نئے سال کا تہوار یونہی عجیب و غریب انداز میں مناتے ہیں، انہیں ایک اور رسم بھی ادا کرنا تھی، وہ اپنے جوتے کے تلے میں تھوڑی سی رقم بڑے اہتمام سے رکھ رہے تھے، ان کا عقیدہ ہے کہ یہ عمل کرنے سے اگلے 12 ماہ انہیں روپے پیسے کی کمی ہوگی نہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ رات کے اس خاص حصے میں بہت سے لوگ قبرستانوں میں جمع تھے، یہ خطرات سے کھیلنے اور چیلنج قبول کرنے کا حوصلہ رکھنے والے لوگ تھے، وہ قبرستان میں آدھی رات کو گھنٹی بجاتے ہیں، وہ اپنے محبوب اور پیارے لوگوں کو بتا رہے ہیں کہ نیا سال آ گیا ہے، ان لوگوں کو نئے سال کی نوید سنا رہے ہیں جو منوں مٹی تلے ابدی نیند سو رہے ہیں، عجب ہے یہ دنیا، عجب ہے ستمگار۔

نئے سال کی آمد پر آتش بازی کا ایسا زبردست مظاہرہ کیا جا رہا تھا کہ آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں، یہ انگشت بدنداں کر دینے والے مناظر تھے، نصف شب کو آسمان رنگوں سے منور تھا، وہاں کے باشندوں نے اپنے رواج کے مطابق سرخ لباس پہن رکھے تھے، بچے، بوڑھے، جوان، خواتین، مرد سبھی نے سرخ غباروں اور اسی رنگ کی آرائشی چیزوں سے گھروں، بازاروں، گلیوں، دکانوں، عمارتوں کو دلہن بنا رکھا تھا، بچوں کو سرخ رنگ کے لفافوں میں بطور انعام کچھ رقم بھی دی جا رہی تھی، بچے اس عمل کو اپنے لیے نیک شگون قرار دے رہے تھے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ رقم ان کے لیے خوشی اور خوشحالی لاتی ہے، جی ہاں یہ ذکر ہے اپنے پڑوسی اور دوست ملک چین کا، کہتے ہیں کہ دنیا میں چین وہ ملک ہے جس نے سب سے پہلے بارود یا آتش گیر مادہ ایجاد کیا تھا، پھر یہ کیسے ممکن ہے نیا سال آئے اور چینی آتش بازی کے سحر انگیز مظاہرے نہ کریں۔ دوسرے ایشیائی ملکوں کی طرح جہاں چینی نئے عیسوی سال کی آمد پر بڑا اہتمام کرتے ہیں وہاں یہ قوم اپنے چینی قمری سال کی آمد پر بھی شاندار جشن مناتی ہیں، یوں دو سال یعنی قمری اور عیسوی منانے سے ان کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

عجیب عقیدہ رکھنے والے کیوبا کے لوگ دوران سفر زہریلے کیڑوں یا سانپوں کے ڈسنے سے ڈرتے ہیں، وہ پیش بندی کے طور پر اس کا توڑ کرتے ہیں، کیوبا کے باشندوں کو وہاں کے روایتی معالج ہدایت دیتے ہیں کہ جیسے ہی نئے سال کی آمد کا اعلان ہو یعنی رات کے 12 بجیں وہ ایک سوٹ کیس سے اپنے گھر کے اطراف ایک خیالی یا تصوراتی دائرہ بنالیں، یہ ایک حفاظتی حصار ہے۔ اگر وہاں کے باشندوں نے یہ بنالیا تو پھر سال بھر انہیں کوئی زہریلا جاندار کاٹ سکتا ہے اور نہ ہی سال بھر دوسرے ممالک کے سفر کے دوران کوئی راستہ کھوٹا کرے گا اور غیر ملکی سفر کے بہت سے مواقع بھی میسر آئیں گے۔ کیوبا میں بعض افراد ایک اور قدیم روایت پر بھی عمل کرتے نظر آتے ہیں۔ 31 دسمبر کی نصف شب اپنے گھروں کی صفائی کرتے ہیں، جھاڑو دیتے ہیں، کھڑکیوں میں کھڑے ہو کر باہر پانی پھینکتے ہیں تاکہ گھر کے اندر کی بلائیں باہر نکل جائیں اور سال بھر پلٹ کر نہ آئیں۔

اس جہان رنگ و بو میں دوستوں اور پڑوسیوں سے محبت تو سبھی کرتے ہیں لیکن ڈنمارک میں نئے سال کی آمد پر چاہت کا یہ اظہار دلچسپ اور انوکھے انداز میں کیا جاتا ہے،

دوست اور پڑوسی ایک دوسرے کے گھروں کی دیواروں پر پلیٹیں اور گلاس پھینکتے ہیں جو ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں، یہ تو نئے سال کی آمد پر وہاں کا عام رواج ہے، خاص انداز یہ ہے کہ نصف شب کے قریب وہاں کے باشندے کرسیاں رکھ کران پر کھڑے ہو جاتے ہیں جیسے گھڑیاں 12 بجاتی ہیں تو وہ کرسیوں سے فرش پر چھلانگیں لگا دیتے ہیں اور یوں بڑے پُرجوش انداز میں نئے سال میں قدم رکھ کر یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ سال بھر اسی طرح ہر کام کریں گے اور کسی سے نہیں ڈریں گے۔

زندگی کی اس ہماہمی میں، گہما گہمی میں کچھ نیا اور عجیب وغریب دیکھنا ہو تو ایکواڈور چلے جائیں، یہاں نیا سال منانے کا انداز ہی نرالا ہے، یہاں کے باشندے اس موقع پر اپنے سیاستدانوں کے پتلے تو جلاتے ہی ہیں ساتھ ہی اپنے مخالفین کے پتلے بنا کر انہیں بھی نذر آتش کرنے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، گویا اس ملک میں گزرے سال کے آخری لمحات اور آنے والے سال کی ابتدائی گھڑیوں میں لوگ اپنے دل کی بھڑاس نکال کر آسمان کو روشن کر دیتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ناپسندیدہ لوگوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ ان لوگوں کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ گزشتہ برس کی منفی توانائی، منفی سوچ اور جذبے سے نجات حاصل کر لیتے ہیں، ان ممالک میں اس موقع پر ایک اہم کام اور بھی کیا جاتا ہے جو لوگ اپنے مخالفین یا سیاستدانوں کے پتلے جلانا پسند نہیں کرتے وہ اپنے گھر میں کچھ رقم اس طرح چھپا دیتے ہیں کہ کوئی اسے تلاش نہ کر سکے ان کا یہ عقیدہ ہے کہ گھر میں چھپائی گئی یہ رقم ان کے لیے سال بھر کی خوشحالی لاتی ہے۔

آپ کو کتنا عجیب لگے گا جب کوئی آپ سے یہ کہے کہ چائے کی پتی مستقبل کا حال بتا دیتی ہے، آپ کو ایسا کہنے والے کی دماغی صحت پر شبہ ہوگا لیکن کیا کہنے جرمن عوام کے جن کا یہ عقیدہ ہے کہ نیا سال ہمیں مستقبل کی جھلک دکھاتا ہے۔ 31 دسمبر کی نصف شب اہل جرمنی ایک پیالی میں چائے کی پتی ڈال کر اس میں پانی انڈیلتے ہیں اور پھر اس میں جھانکتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اس عمل سے انہیں مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی جھلکیاں دکھائی دے سکتی ہیں، حیران نہ ہوں آسٹریا میں بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے، وہاں کے بعض افراد ایک پچ سیسہ ٹھنڈے پانی میں ڈالتے ہیں، اس عمل کے نتیجے میں جو شکل بنتی ہے وہ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی ترجمانی کرتی ہے، یوں تو جرمن لوگ نئے سال کی آمد کے موقع پر ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر اپنے پسندیدہ پروگرام بھی دیکھتے ہیں۔

یونانی باشندے خصوصی طربیہ نغمے تیار کر رہے ہیں، جنہیں بچے گائیں گے، اس گائیکی کے عوض ان کے بڑے، پڑوسی اور خاندان کے لوگ انہیں انعامی رقم دیں گے، یہ رقم ان کے لیے بڑی اہم ہوگی، بچے اسے سال بھر سنبھال کر رکھیں گے کیونکہ یہ ان کے لیے خوش بختی کی علامت ہے، کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہے، 12 بجے سے دو سیکنڈ قبل یونانی اپنے گھروں، بازاروں کی لائٹس بند کر دیں گے۔ ہر طرف اندھیرے کا راج ہوگا، وہ نئے سال کو کھلی اور تازہ آنکھوں سے اترتے دیکھیں گے۔ پھر اچانک تمام لائٹس آن کر دی جاتی ہیں، ہر شے روشنی میں نہا جاتی ہے، پرانے سال کا نام و نشان باقی نہیں رہتا جبکہ نیا سال پوری آب و تاب کے ساتھ آ چکا ہوتا ہے۔ اس اہم ایونٹ کی ایک اور قدیم روایت VASILOPITA ہے۔ یہ ایک کیک ہے جو خاص طور پر اسی موقع کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ اس کیک کے اندر کوئی سکہ یا کوائن یا کوئی چھوٹی سی چیز چھپی ہوتی ہے، جس فرد کے حصے میں کیک کا وہ ٹکڑا آتا ہے جس میں سکہ چھپا ہوتا ہے، اسے بہت خوش قسمت سمجھا جاتا ہے کہ آنے والا سال اس کے لیے اپنے ساتھ بہت سی کامیابیاں لایا ہے۔

جاپان میں بھی نیا سال خاص انداز سے منایا جاتا ہے مگر یہاں کے بوڑھوں کی نظر میں اپنا کیلنڈر اہم ہے۔ بہت سے جاپانی اس سال کے جانور کے حساب سے نیا سال مناتے ہیں۔ جیسے 2014ء کے سال کا جانور گھوڑا تھا۔ یہ لوگ اس موقع پر مندروں میں جاتے ہیں اور ان کی گھنٹیاں 108 بار بجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اہل جاپان نئے سال کی آمد کے موقع پر اپنے گھروں کی صفائی ستھرائی کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ایک بات بہت اچھی ہے، یہ لوگ گزشتہ سال کے جھگڑے اور تنازعات اس موقع پر ختم کر دیتے ہیں تاکہ نئے سال میں بالکل نئے اور تازہ انداز سے داخل ہوں اور یہ سال جھگڑوں اور اختلافات سے پاک شروع ہو۔ اس طرح ان کا ملک تنازعات سے پاک ہو جاتا ہے۔

نیدرلینڈ یا ہالینڈ میں ہر بار نئے سال کی آمد کے موقع پر ہر ولندیزی کاربائیڈ شوٹنگ کے ایونٹ میں ضرور شریک ہوتا ہے۔ اس میں دودھ کے ڈبوں میں کیمیکل ڈال کر پہلے ہلایا جاتا ہے اور اس کے بعد اسے ہلکے دھماکے سے اڑایا

جاتا ہے۔ مگر چوں کہ یہ کسی حد تک خطرناک بھی ہوتا ہے، اس لیے ہالینڈ کے متعدد شہروں میں اس رسم پر پابندی عائد ہے۔ اس کے باوجود نوجوان اس موقع پر اس کاربائیڈ شوٹنگ سے لطف اندوز ہونے سے باز نہیں آتے لیکن ہالینڈ کے اکثر لوگ اس کو پسند نہیں کرتے، مگر چونکہ اس موقع پر جشن تو منانا ہے، چنانچہ اکثر شوقین لوگ اس موقع پر سمندر کا رخ کرتے ہیں، جہاں وہ اس سرد موقع پر سوئمنگ کے مختصر لباس میں نہ صرف منجمد کرنے والے پانی میں غوطہ خوری کرتے ہیں، بلکہ شمالی سمندر کی سرد لہروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نئے سال کا استقبال اس جرأت سے کرتے ہیں کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں۔ گویا ہالینڈ کے لوگ آنے والے نئے سال کو جرأت و بہادری کے حوالے سے وقف کرتے ہیں۔

فلپائن میں اگر نیا سال کسی نئے انداز کے فیشن سے شروع کیا جائے تو یہ ایک اچھی علامت ہوتی ہے۔ فلپائن کے لوگ ہر نئے سال کی آمد ایک خاص انداز سے مناتے ہیں۔ وہ اس موقع کے لیے مخصوص لباس زیب تن کرتے ہیں جن پر گول گول سے ڈیزائن بنے ہوتے ہیں۔ اس مخصوص شام کو وہ اپنی جیبوں میں گول سکے بھی رکھتے ہیں، کیونکہ گول ڈیزائن انہوں نے اس ایونٹ کے لیے خاص کیا ہوا ہے۔ اہل فلپائن نے گول ڈیزائن کو خوشی اور خوش حالی کی علامت قرار دے رکھا ہے۔ اس لیے بعض فیملیاں اور افراد تو اس موقع پر گول پھل جیسے سنگترے اور گریپ فروٹ (چکوترے) کھاتے ہیں، گول پھل سجاتے ہیں اور گول ڈیزائن کے پرچم اور جھنڈیاں اپنے گھروں پر لگاتے ہیں۔

روس میں نئے سال کے حوالے سے ایک دل چسپ رواج ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ اگر کسی کے دل میں کوئی ایسی خواہش ہے جس کے لیے وہ چاہتا ہے کہ یہ جلد از جلد پوری ہو؟ یا اس کا کوئی خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو رہا؟ تو وہ نئے سال کے موقع پر یہ کرتا ہے کہ اپنی اس خواہش کو کسی کاغذ پر لکھ کر اس کاغذ کو جلاتا ہے اور اس کی راکھ شمپین کے ایک گلاس میں ڈال کر اسے غٹاغٹ پی جاتا ہے۔ روسی نئے سال کی آمد کے موقع پر اپنی ادھوری اور تشنہ خواہش کی تکمیل کے لیے ایسا ہی کرتے ہیں۔ نئے سال کی روایتی تقریبات میں نئے سال کا درخت بھی شامل ہے جسے خصوصی اہتمام سے سجایا اور سنوارا جاتا ہے۔ اس موقع پر سانتا جیسی ایک فگر بھی آتی ہے جسے روسی Ded Moroz (Grandfather Frost) کہہ کر پکارتے ہیں۔ ڈیڈ موروز اصل میں فروسٹ یا انجماد کا دادا ہے۔ برف جیسی سفید داڑھی والا یہ بوڑھا اپنی پوتی Snegurochka کے ساتھ آتا ہے۔ یہ لڑکی برف کی خادمہ کہلاتی ہے۔ دونوں دادا پوتی مل کر بچوں میں تحفے تقسیم کرتے ہیں۔

اسکاٹ لینڈ کے لوگوں کو تحفے دینے کا کریز ہے۔ یہ لوگ اپنے دوستوں اور رشتے داروں کو بہانے بہانے سے تحفے دیتے ہیں اور اس حوالے سے کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ نئے سال کے موقع پر بھی اسکاٹ لینڈ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اگر آپ اپنے کسی دوست یا رشتے دار کے ہاں اس وقت پہنچتے ہیں جب نیا سال اپنی آمد کی گھنٹی بجا رہا ہوتا ہے، تو میزبان آپ کے سامنے بچھ جائیں گے اور آپ کی خاطر مدارت میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے لیکن چونکہ آپ اس گھر میں نئے سال میں داخل ہونے والے پہلے فرد قرار پائے، اس لیے آپ پر لازم ہے کہ اپنے میزبانوں کے لیے تحفے تحائف ضرور لے جائیں لیکن یہ تحفے زیادہ قیمتی نہیں ہونے چاہئیں بلکہ کم قیمت اور چھوٹے ہوں، مگر ان سے محبت کا اظہار ہوتا ہو۔ مثال کے طور پر ان تحفوں میں ڈبل روٹی بھی ہو سکتی ہے اور وہسکی بھی۔ اسکاٹ لینڈ کے لوگ نئے سال کا خیر مقدم آتش بازی سے بھی کرتے ہیں جو یہاں کی قدیم روایت ہے۔

اگر آپ جنوبی افریقا میں رہتے ہیں اور پیدل چلنے کے شوقین ہیں تو نئے سال کی آمد کے موقع پر ذرا احتیاط رہیں کیونکہ اس ملک کے شہر جوہانسبرگ میں ایک عجیب سی روایت ہے۔ جوہانسبرگ کے لوگ نئے سال کی آمد کے موقع پر اپنا پرانا فرنیچر، بجلی کی مصنوعات جیسے ریڈیو، ٹی وی وغیرہ اٹھا کر بڑی بے پروائی کے ساتھ گھروں کی کھڑکیوں میں سے باہر سڑکوں پر پھینک دیتے ہیں۔ انہیں اس بات کی کوئی فکر نہیں ہوتی کہ یہ سامان کسی کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ گویا جنوبی افریقا کے لوگ نئے سال کے آنے سے پہلے پرانی چیزوں سے نجات پانا پسند کرتے ہیں اور نئے سال میں نئی چیزیں خریدتے ہیں، تاکہ نیا زمانہ ان کے لیے نئی خوشیاں لائے۔

اسپین میں اور اسپینش بولنے والے دوسرے ملکوں میں نئے سال کی آمد بڑے خاص انداز سے منائی جاتی ہے۔ اس روز نصف شب کو 12 انگور کھانا یہاں کی قدیم روایت ہے۔ بارہ انگور بارہ مہینوں کی ترجمانی کرتے ہیں اور انہیں

کھانے کا مقصد یہ ہے کہ آنے والے سال کا ہر مہینا ان کے لیے خوش بختی لائے گا۔ یہ بارہ انگور بھی بڑے اہتمام اور سلیقے سے کھائے جاتے ہیں۔ اس موقع پر رات کے بارہ بجے جب نیا سال بارہ گھنٹیوں کے ساتھ اپنی آمد کا اعلان کرتا ہے تو اس کی ہر گھنٹی پر ایک انگور کھانا ہوگا، واقعی بہت دلچسپ روایت ہے۔

ویسے تو نئے سال کا جشن ہر ملک میں ہی نہایت جوش وخروش سے منایا جاتا ہے، تاہم اس دوران کھانے پینے پر بھی بہت زور دیا جاتا ہے۔ جہاں دنیا 2017ء کے اختتام پر 2018ء کے آغاز کا جشن منائے گی، وہیں کئی ممالک میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس سال کی شروعات کچھ خاص کھا کر کرتے ہیں۔ جیسے کسی ملک میں سال کا آغاز دال کھا کر کیا جاتا ہے، تو کہیں اس موقع پر انار کو ترجیح دی جاتی ہے اور ایسے ہی کئی ممالک کی اپنی اپنی روایات اور رسومات ہیں جنھیں سالوں سے اہمیت دی جارہی ہے۔

بیلاروس میں مکئی کھا کر، ایران میں فالودہ کھا کر، ارجنٹائن میں لوبیا کھا کر، آئرلینڈ میں بٹر بریڈ کھا کر، جاپان میں نوڈلز کھا کر، جرمنی میں ڈونٹ کھا کر، پولینڈ میں اچار کھا کر، بھارت میں مسور کی دال اور چاول کھا کر اور ترکی میں انار کھا کر نئے سال کا آغاز کیا جاتا ہے۔ اس کے سوا بھی بہت کچھ ہے جو حیران کر دیتا ہے۔ ایسی روایات ہیں کہ سننے اور دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں۔ مثلاً سوئٹزر لینڈ میں یہ عجیب وغریب روایت عام ہے کہ یہاں سال نو کا آغاز فرش پر آئس کریم گرا کر کیا جاتا ہے۔ کولمبیا میں لوگ اس روز خالی سوٹ کیس لے کر گلیوں اور محلوں میں گھومتے ہیں، تاکہ نیا سال ان کے لیے سیر وتفریح اور سفر کے مواقع لے کر آئے۔ ارجنٹائن میں لوگ نئے سال کا خیر مقدم داہنے پیر پر کھڑے ہوکر کرتے ہیں، تاکہ آنے والا سال ان کے خاندان کے لیے خوش قسمتی اور خوشحالی لے کر آئے۔ بولیویا کے لوگ نئے سال کے جشن منانے کے لیے سویٹ ڈش تیار کرتے ہیں جس میں ایک سکہ چھپا ہوتا ہے یہاں کے لوگوں میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ جس شخص کے حصے میں سکہ آتا ہے اس کے لیے نیا سال خوش بختی لے کر آتا ہے۔ اسٹونیا میں لوگ نئے سال پر سات بار کھانا کھاتے ہیں، تاکہ سال بھر ان پر اسی طرح رزق کی فراوانی رہے۔ رومانیہ کے لوگوں میں یہ روایت برسہا برس سے چلی آرہی ہے کہ اس روز خوش قسمتی حاصل کرنے کے لیے ایک سکہ دریا میں

اچھالا جاتا ہے۔ یہاں سال کی اختتامی شب کسان گائے کے کان میں سرگوشی کرتے ہیں اور اسے نیا سال مبارک کہتے ہیں لیکن اگر گائے جواب میں کچھ ردِعمل ظاہر کرے تو اسے آئندہ برس کے لیے بدقسمتی تصور کیا جاتا ہے۔ آئرلینڈ کے لوگ نئے سال کے آغاز پر شیطانی قوتوں کو گھر سے باہر نکالنے اور خوش قسمتی کے لیے دروازہ کھولنے کے لیے گھر کے دروازوں اور دیواروں پر ڈبل روٹی کے ٹکڑے پھینکتے ہیں۔ آسٹریلیا میں جہاں آتش بازی کے بڑے بڑے مظاہروں کے ساتھ نئے سال کا خیرمقدم کیا جاتا ہے، وہیں یہ روایت بھی عام ہے کہ اس روز لوگ سڑکوں اور گلیوں میں گھر کے برتنوں کو بجا کر نئے سال کا اعلان کرتے ہیں۔ اسکاٹ لینڈ میں لوگ سال کی آخری شب اپنے گھر کے صدر دروازے پر رکاوٹ کھڑی کر دیتے ہیں۔ لہٰذا اگلے دن جو شخص بھی اس رکاوٹ کو پھلانگ کر گھر میں داخل ہوتا ہے اسے گھر والوں کی خوش بختی کے لیے ایک تحفہ لانا پڑتا ہے۔ فرانس میں لوگ سال نو کی آمد پر خوب جی بھر کر پین کیک کھاتے ہیں، جبکہ ترکی میں یہ روایت چلی آرہی ہے کہ اس رات انار کے دانے گھر کی کھڑکی سے باہر پھینکے جاتے ہیں۔ اسی طرح، گوئٹے مالا کے لوگ سال نو کے لیے خوش قسمتی حاصل کرنے کے لیے بارہ سکوں کو گھر سے باہر اچھالنے کی رسم ادا کرتے ہیں۔

ہمیشہ نئے سال کا سورج سب سے پہلے نیوزی لینڈ میں طلوع ہوتا ہے لیکن اس کے طلوع ہونے سے چند گھنٹے قبل لوگ اس کا بھرپور استقبال کرتے ہیں اور نئی امیدوں کے چراغ جلاتے ہوئے شاندار آتش بازی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ نیوزی لینڈ کے شہر آک لینڈ کے مشہور سکائی ٹاور پر لگے گھڑیال پر جونہی 12 بجتے ہیں تو وہاں سے آتش بازی شروع کر دی جاتی ہے اور نئے سال کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ آسٹریلیا کے سب سے بڑے شہر سڈنی میں آتش بازی کے شاندار مظاہرے کے ساتھ نئے سال کا آغاز ہوتا ہے۔ اس موقع پر لاکھوں افراد ساحل سمندر، اوپیرا ہاؤس اور دوسرے مقامات پر نئے سال کے استقبال کے لیے ہونے والی آتش بازی کا مظاہرہ دیکھنے کے لیے موجود ہوتے ہیں۔ ان عقائد، رسوم و رواج اور اندھی تقلید کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں اور اسلام ہمیں ایسی توہم پرستی سے منع کرتا ہے۔ یہ صرف آپ کی معلومات میں اضافہ کے لیے ہے کہ دنیا میں کیا کیا عجیب ہو رہا ہے۔ 2018ء کی آمد آمد ہے۔

تخلیق کائنات سے لے کر آج تک سال کے بارہ مہینے ہوتے چلے آئے ہیں۔ یہ سال نہ تو گیارہ یا دس ماہ کا ہو سکتا ہے اور نہ ہی تیرہ یا چودہ ماہ کا۔ دن اور ماہ و سال کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ ازل سے لے کر ابد تک جاری رہے گا۔ واضح رہے کہ رومی سلطنت میں 153 قبل مسیح سے یہ روایت چلی آرہی تھی کہ یکم جنوری کو قونصل (شہروں کی دیکھ ریکھ کے لیے تعینات کیے جانے والے سرکاری افسران) مقرر کیے جاتے تھے اور اس تقرری کو سرکاری انتظام و انصرام کا اہم ترین حصہ سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت کی رومی سلطنت میں سال کی نشاندہی بھی ان میں مقرر کیے گئے قونصلوں کے حوالہ سے کی جاتی تھی۔ تقرریوں کے لیے اسی دن کا انتخاب کیوں کیا جاتا تھا، اس تعلق سے مورخین کا کہنا ہے کہ لفظ جنوری کا تعلق رومی لفظ ''جینس'' سے ہے جو اہل روم کے نزدیک تبدیلی اور آغاز کا دیوتا کہلاتا تھا اور اسی بنیاد پر جنوری کے مہینے کی پہلی تاریخ کو سال کی شروعات کے لیے منتخب کیا گیا۔ حالانکہ اس کے بعد بھی کیلنڈر میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں، لیکن پھر بھی آج تک نئے سال کی شروعات یکم جنوری سے ہی کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اپنی زندگی قمری تاریخوں کے لحاظ سے نہیں بلکہ شمسی و انگریزی تاریخ کے اعتبار سے گزارتے ہیں۔ سن عیسوی کہنے کی وجہ یہی ہے کہ ماہ و سال کا یہ حساب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یوم پیدائش سے منسوب ہے۔ شمسی کیلنڈر ایک ایسا کیلنڈر ہے جس پر دنیا بھر کی ایک بڑی آبادی عمل کرتی ہے اور اسی کے مطابق سرکاری و غیر سرکاری دفاتر میں کام ہوتا ہے۔

نئے سال کے موقع پر لیتھوا، فلپائن اور سان مرینو جیسے ملکوں میں سرکاری تعطیل ہوتی ہے جبکہ بنگلہ دیش، برونئی، پیراگوئے اور جاپان جیسے ممالک میں اس دن بینکوں کی چھٹی رہتی ہے۔ (نئے سال پر جاپان میں سرکاری چھٹی بھی ہوتی ہے)۔ آسٹریلیا، کینیڈا، برطانیہ اور امریکا میں ملک گیر سطح پر نئے سال پر سرکاری چھٹی تو نہیں ہوتی البتہ اس روز کچھ کاروبار جلد بند ہو جاتے ہیں۔ اسکول عموماً بند رہتے ہیں اور بہت سے لوگ نصف دن تک ہی کام کرتے ہیں۔ گریگرین کیلنڈر کے مطابق، 31 دسمبر کی تاریخ جاری سال کی آخری تاریخ ہوتی ہے اور یکم جنوری سال کا پہلا دن ہوتا ہے جو کہ نئے سال کے آغاز کی علامت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پوپ گریگری نے 1582 میں گریگرین کیلنڈر متعارف کرایا۔ یورپ کے کچھ

حصوں میں تو فوراً اس کیلنڈر کا استعمال کیا جانے لگا، لیکن متعدد ملکوں میں کئی صدیوں تک اس کا استعمال نہیں کیا گیا۔ امریکا اور برطانیہ نے 1752 میں گریگرین کیلنڈر کا استعمال کرنا شروع کیا۔

اب جبکہ سال نو دستک دینے کی تیاری میں ہے، لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں اس کا جشن منانے کی تیاریاں شروع کردی ہیں۔ گزشتہ کئی برسوں سے دیکھنے میں آیا ہے کہ سال نو کی آمد کا جشن 31 دسمبر کی رات کو اپنے نقطہ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ جب رات کے ٹھیک 12 بجے گھڑی کی سوئیاں تاریخ میں تبدیلی کا اعلان کرتی ہیں تو دنیا بھر کے بڑے بڑے شہروں کے ہوٹلوں، کلبوں، میخانوں، شاپنگ مالوں اور تفریح گاہوں وغیرہ میں جشن منانے والوں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔

اس رات کچھ دیر کے لیے اپنے سارے رنج و غم بھلا کر نئے سال کا پرتپاک خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ دعوتوں وضیافتوں کا دور دورہ ہوتا ہے۔ محفلیں اور مجلسیں منعقد ہوتی ہیں جس میں رقص و سرود کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ رنگ برنگی تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔ رات بھر شب بیداری ہوتی ہے موج و مستی جاری رہتی ہے۔ شراب وشباب کا بھرپور لطف لیا جاتا ہے۔ نئے سال کا یہ جشن انتہائی فحاشی اور عریانیت کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ تہذیب وثقافت کو گرد آلود کیا جاتا ہے۔ تفریح اور موج مستی کے نام پر اخلاقی قدروں کو پامال کیا جاتا ہے، پٹاخے چھوڑے جاتے ہیں، آتش بازیاں ہوتی ہیں۔ آتش بازیوں سے پوری فضا منور ہو جاتی ہے۔ ٹیلی فون کر کے یا پھر ایس ایم ایس کے ذریعہ مبارکباد کے پیغامات کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔

الغرض اس جشن میں لاکھوں، کروڑوں روپے برباد کردیئے جاتے ہیں۔ ایک طرف تو جشن اور موج مستی کے نام پر پانی کی طرح لاکھوں، کروڑوں روپے بہا دیئے جاتے ہیں تو دوسری طرف کئی ممالک اور معاشروں میں سینکڑوں اور ہزاروں افراد ایسے ہیں جو انتہائی فاقہ کشی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ وہ کھانے کے لیے ایک ایک دانے کو ترس رہے ہیں۔ کیا ہی بہتر ہو اگر ان پیسوں کو فضولیات میں خرچ نہ کر کے معاشرہ میں پریشان حال غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد کردی جائے۔

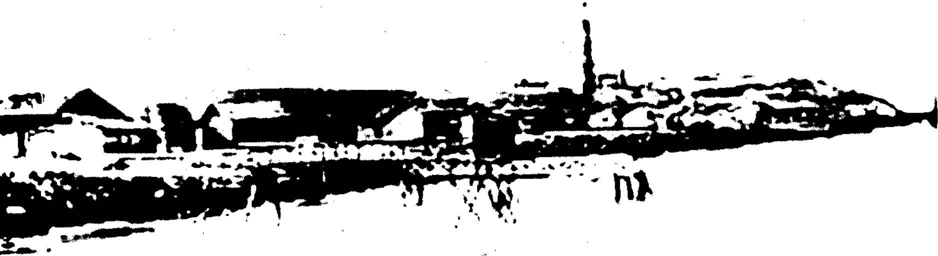
دیکھنے میں آیا ہے کہ نئے سال کا جشن منانے اور اس موقع پر بے دریغ پیسے خرچ کردینے کے معاملہ میں مسلمان بھی دیگر اقوام سے پیچھے نہیں ہیں۔ جہاں تک مسلمانوں کے لیے نئے سال کا جشن منانے کا سوال ہے، اسلام ایک سادہ مذہب ہے۔ وہ سادگی کو پسند کرتا ہے۔ اسلام میں ایسی خرافات اور لغویات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام میں بہترین عمل اسے قرار دیا گیا ہے جسے اللہ کی رضاجوئی کے لیے کیا جائے۔ جو اللہ کی عبادت، اطاعت گزاری اور خدمت خلق پر مبنی ہو۔ واضح رہے کہ یہ ماہ و سال تو محض دنوں کو سمجھنے اور ان کا شمار کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اس دن کی ایسی کیا خصوصیت ہے کہ ہم اسے جشن میں تبدیل کردیں اور پھر اس پر بیجا اسراف کرنے لگیں۔

ہم اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے زیادہ اس طرح کے ماہ و سال آتے اور جاتے دیکھتے رہتے ہیں اور ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اس میں ہم نے اپنی کون سی متاع عزیز گنوادی ہے اور آنے والے سال کو ہم کس طرح اپنے لیے کارآمد اور قیمتی بنا سکتے ہیں، اس پر کچھ سوچنے اور غور وفکر کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ خیال رہے کہ انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں یہ ماہ و سال بیش قیمت ہیں، بالخصوص قوموں کی زندگی میں یہ اہم رول ادا کرتے ہیں۔ بسا اوقات ایک لمحہ کی غلطی اور بھول صدیوں کے کیے ہوئے کارناموں پر پانی پھیر دیتی ہے اور ایک لمحہ کا صحیح استعمال صدیوں کو بیش قیمت بنا دیتا ہے۔

بہترین لوگ وہ ہیں جو ماہ و سال کی اہمیت کو صحیح طور پر سمجھتے ہیں اور صحیح سمجھنا یہی ہے کہ ہم آنے والے نئے سال کے ایک ایک لمحہ کا احتساب کریں۔

ہم محاسبہ نفس کرتے ہوئے اس پر غور وفکر کریں کہ اللہ نے ہمیں یہ جو ماہ و سال عطا کیے ہیں، اس میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ گزشتہ سال اور اس سے پہلے کے برسوں میں ہم سے کیا غلطیاں سرزد ہوئیں، ہم نے زندگی کی یہ بیش قیمت مدت فضولیات اور خرافات میں تو گزار نہیں دیں۔ ہم اپنے گزرے ہوئے کل کے آئینہ میں اپنے عمل کا محاسبہ کریں، اپنی ناکامیوں کا جائزہ لیں۔ ہر گزرا ہوا پل کسی بھی انسان کے لیے ایک سبق کا درجہ رکھتا ہے اور اس کے باوجود اگر ہم اپنے اس گزرے ہوئے پل سے سبق حاصل نہ کریں تو یہ ہماری بہت بڑی بدقسمتی ہو گی۔ آیئے ہم نئے سال کا خیر مقدم اس عہد کے ساتھ کرتے ہیں کہ ہم اس کے ایک ایک لمحہ کا صحیح استعمال ضرور کریں گے۔





کلاچی تا کراچی

محمد اقبال مانڈوا

کراچی جو مچھیروں کی ایک چھوٹی سی آبادی تھی۔ جس نے ترقی کے زینے طے کرتے ہوئے میٹرو پولیٹن شہر کا درجہ حاصل کرلیا۔ اس عروس البلاد کا ذکر ذرا الگ انداز میں قدم بہ قدم۔

سیر پاکستان کے حوالے سے ایک دستاویزی دلچسپ تحریر

کراچی بندرگاہ آزادی کے وقت کے کراچی کو مضافات سے علیحدہ کر کے دیکھا جائے تو بنیادی شہر کیماڑی سے سینٹرل جیل تک تھا، جیل کی موجودگی ہی اسے شہر کا سرا ثابت کرنے کے لیے کافی تھی، پہلا سرا یعنی کیماڑی تو وہیں ہے کیونکہ اس کی پشت پر سمندر ہے مگر دوسرا سرا اب سرا نہیں رہا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ کراچی کا اب کوئی سرا ہے ہی نہیں۔ کیماڑی کا اصل نام ''کیا ماڑی'' ہے۔ انگریز دور کے کاغذات اور آج بھی انگریزی میں اس کا تلفظ keamari ہی بنتا ہے۔

1947 میں مہاجرین کی آمد نے کراچی میں مروج مقامی الفاظ اور علاقوں کے نام کو جب اردو کی ڈھب سے استعمال کیا تو لفظ ''کیاماڑی'' اپنے اصل لہجے سے ہٹ کر ''کیماڑی'' بن گیا۔

کیاماڑی 2 الفاظ یعنی کیا اور ماڑی کا مرکب ہے، ماڑی سندھی زبان میں ٹیلے یا اونچی عمارت کو کہتے ہیں، مگر لفظ ''کیا'' کے کوئی معنی سمجھ میں نہیں آتے، لفظ ماری یا ماڑی بھی ہنوز تحقیق طلب ہے اور اس کے بارے میں جتنی بھی توجیہات پیش کی گئی ہیں انہیں خیال آفرینی یا قیاس آرائی ہی قرار دیا جاسکتا ہے، ماری کا لفظ کراچی کے ایک اور ساحلی علاقے ہاکس بے سے ملحقہ علاقے.... کے نام کے ساتھ آتا ہے، ہاکس بے کے ساحل سے لگتا علاقہ ماری پور ہے، ماری پور کو انگریز دور کے محکمہ نمک کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر مورے سے منسوب ہے جو سمجھ میں آنے والی بات ہے، محمد عثمان دموہی صاحب نے اپنی مشہور کتاب ''کراچی تاریخ کے آئینے میں'' کیماڑی کو پارسی خاندانوں کی انگریزی لفظ ''K'' سے ابتدا کو اور پارسیوں کی اس علاقے میں عمارتوں کو لفظ کیماڑی کی وجہ قرار دیا ہے مگر یہ اس لیے غلط ہوجاتا ہے کہ اصل نام کیماڑی نہیں بلکہ کیاماڑی ہے۔

بہرحال کیاماڑی ایک جزیرہ تھا، تقریباً 74000 ایکڑ پر مشتمل۔

یہ جزیرہ 1854 میں نیپئر مول برج بننے کے بعد شہر کا زمینی حصہ بنا، آگے چل کر یہ حصہ زمینی راستے یعنی بغیر پل کے کلفٹن سے بھی جڑ گیا۔

بندر روڈ سے کیماڑی میری چلی رے گھوڑا گاڑی
بابو ہوجانا فٹ پاتھ پر

ہمارے بچپن کے زمانے میں احمد رشدی کے گائے اس مشہور گیت نے ''کیاماڑی'' کو کیماڑی کیا بنایا اب یہ کیماڑی ہی کہلاتا ہے۔ مگر کراچی کے قدیمی علاقوں میں آج بھی قدیمی لوگوں یعنی مچھیروں اور پورٹ پر مزدوری کرنے والوں کی رہائش پزیر اولادیں اسے کیاماڑی ہی کہتی ہیں، احمد رشدی کے گائے اس گیت میں بندر روڈ کا حوالہ بڑا زبردست ہے یعنی وہ سڑک جو بندرگاہ سے شروع ہوتی ہے اور بندرگاہ سے ملحق شہر میں ضم ہوجاتی ہے۔ ''بندر'' فارسی میں پورٹ کو کہتے ہیں مگر اردو میں پورٹ کے لیے صرف بندر سے کام نہیں چلتا ساتھ میں گاہ بھی لگانا پڑتا ہے ورنہ معنی بدل کر کیا سے کیا ہوجاتے ہیں۔ یہ معروف سڑک ٹیٹی جیٹی سے شروع ہوکر اس ٹریفک سگنل پر ختم ہوتی تھی جہاں آج دلپسند سوئٹ یا اقبال سینٹر واقع ہے، بندر روڈ ہی پر کیا موقوف، شہر کراچی بھی برٹش راج کے ابتدائی ایام میں بس یہیں تک تھا، کم از کم تاریخی شواہد یہی بتلاتے ہیں۔ سینٹرل جیل بھی ان دنوں میں سٹی کورٹ سے متصل تھی اور کل ملا کر اس سڑک کی لمبائی بنتی تھی تقریباً تین کلو میٹر، یہیں جنرل پریڈ گراؤنڈ تھا جو بعد میں عیدگاہ میدان کہلایا اور یہ جو اقبال سینٹر ہے اس جگہ پہلا گورا قبرستان تھا، جنگ عظیم کے دوران کراچی لائے گئے اتحادی افواج کے زخمی فوجی جو جی نہ پائے یہیں دفن ہوئے اور ساتھ ہی برطانوی راج کے عمال بھی، کہتے ہیں یہاں رنچھوڑ لائن میں بسے ہوئے مارواڑی مسلمانوں کی قبریں بھی تھیں اور یہ سب کچھ سرکاری دستاویزات سے ثابت ہے مگر اقبال سینٹر سے متصل برسوں تک قائم رہنے والی لوح مزار کی دکانیں عہد رفتہ کے قبرستان ہونے کا بہت بڑا عوامی حوالہ ہیں، ان میں سے دو دکانیں ابھی تک ہیں جو اب لوح مزار سے زیادہ سنگ مرمر کی چھوٹی چھوٹی تنصیب کا کام کرتی ہیں، کہتے ہیں نا حلوائی کی دکان پر نانا جان کی فاتحہ، تو قبرستان پر قائم مٹھائی کی دکان اس محاورے کی گویا عملی تصویر ہے۔

بندر روڈ تاریخی نام یا تاریخی حوالہ ہے اور اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ہر دور کا معتبر حوالہ ہے مگر اس بہترین، کامل ترین اور بے عیب نام کو کیوں بدل دیا گیا؟ تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں ہر چیز کا سمجھنا ضروری نہیں اور خاص طور پر پاکستان میں، بہرحال ہم کراچی کے اس سرے یعنی کیاماڑی یا کیماڑی سے اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔

قدیم زمانے میں موجودہ کراچی کے آس پاس کے بہت سے علاقے ساحل کے طور پر استعمال ہوتے تھے، یہ علاقہ ایک گوٹھ یا پھر ایک کنویں یا کسی خاتون کے نام پر ''کراچی'' کے نام سے ملتے جلتے ناموں سے مشہور تھا۔ بحیرہ عرب سے لگتا یہ خطہ ساحل سے قریب زیادہ گہرا ہونے کی وجہ سے ''قدرتی بندرگاہ'' کہلاتا ہے یوں خام شکل کی حامل ان قدرتی طور پر بنی بنائی بندرگاہوں پر بڑی کشتیوں یا جہازوں کی لنگر اندازی اور ماہی گیری کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ خطہ 4000 سال قبل بھی آباد تھا کیونکہ دوران کھدائی ایسی قبریں ملی ہیں جن کے کتبے اسی زمانہ قدیم کے فونیشیائی رسم الخط میں تحریر ہیں، اگر ماضی قریب کی بات کریں تو محمد بن قاسم سنہ 712ء میں دیبل کی بندرگاہ یعنی بھنبھور کے راستے سندھ میں وارد ہوئے، ایک عرب، جہاز راں نے سنہ 1511ء میں کراچی کے ساحلی علاقے کو راس ال کرازی کا نام دیا، اسی طرح سے سلاطین عثمانیہ کے دور کے دستیاب بحری سفر کی دستاویزات میں ترک میر ملاح سید علی رئیس نے سنہ 1557ء میں بیچ سمندر کسی

ناگہانی صورتِ حال میں اس ساحل کو محفوظ ترین قرار دیتے ہوئے اسے کروشی کا نام دیا، سترھویں صدی ابتدائی سالوں تک خطے کی متحرک ترین بندرگاہ کا نام ''کھراک'' تھا جو کراچی کی موجودہ بندرگاہ کے مغرب میں واقع حب ندی کے بڑے دریائی دہانے پر واقع تھی۔ سنہ 1728 میں تیز بارشوں کے سبب حب ندی سے پانی کے ساتھ ساتھ ریت کی بڑھتی ہوئی ترسیل نے کھراک کی بندرگاہ کو آہستہ آہستہ ناقابل استعمال بنا دیا تو اس زمانے کے معروف ہندو تاجر سیٹھ بھور جول نے اپنے کارندوں کی مدد سے متبادل بندرگاہ تلاش کروائی اور وہ بندرگاہ وہی تھی جو آج کراچی بندرگاہ کہلاتی ہے، جلد ہی ٹھٹھہ کی دو بندرگاہیں بھی اسی طرح ریت گرنے کی وجہ سے ناقابل استعمال ہوئیں تو اس دریافت ہوئی نئی بندرگاہ پر انحصار کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا، یوں تین مختلف علاقوں کے لوگ جب یکجا ہونا شروع ہوئے تو بندرگاہ سے ملحق علاقے کی آبادی بڑھنے لگی اور علاقہ جو ٹکڑوں میں بٹی آبادیوں کی صورت میں تھا بتدریج اس صورت میں آتا گیا جس نے آگے جا کر شہر کی صورت اختیار کی، یوں موجودہ کراچی کے خدوخال سترھویں صدی عیسویں میں واضح ہونے شروع ہوئے، جبکہ کھراک اور ٹھٹھہ کی بندرگاہوں کے علاقوں سے آکر یہاں مستقل پڑاؤ ڈالنے والے چند خاندان اس شہر کے اوّلین باشندے کہلائے، کہا جاتا ہے ان کا پڑاؤ اس جگہ تھا جہاں آج کے پی ٹی بلڈنگ قائم ہے۔

کراچی نے کیماڑی بندرگاہ کی کوکھ سے جنم لیا ہے، جس کی پرشفقت آغوش میں پل کر یہ شہر تناور درخت بنا، شفقت مادر کی برکت سے اللہ سبحان تعالیٰ نے اس شہر کو غنی بنایا ہے سو اس کی گود میں جو آتا ہے پل جاتا ہے اللہ تعالیٰ اسے رہتی دنیا تک قائم ودائم رکھے۔

وہ سادہ زمانہ تھا، جدت سے نہ آشنا، بندرگاہ ایک لگے بندھے نظام کے تحت ضرور چلتی رہی مگر اتنا ضرور تھا کہ اس کے مقامی منتظم بندرگاہ کو ترقی دے کر زیادہ سے زیادہ فعال بنانے کے لیے سرگرم رہتے تھے ٹالپر خاندان (عرف عام میں تالپور خاندان) کے اقتدار میں آنے کے بعد بندرگاہ کی ترقی میں کافی پیش رفت ہوئی اور بندرگاہ زیادہ پُرسہولت ہوگئی جس کے سبب اس کی شہرت ہر چہار سو پھیل گئی اور مقامی اور بین الاقوامی تجارت میں قابل قدر اضافہ ہوا، یہ 1797 کا زمانہ اور میر فتح علی خان ٹالپر کا دور تھا۔ نزدیک کی ایک بندرگاہ سونمیانی بھی فعال تھی اور محصولات میں کمی اور پُرکشش مراعات پیش کر کے دونوں بندرگاہوں میں مقابلہ بھی رہتا تھا مگر کراچی کی بندرگاہ اپنے مخصوص قدرتی ڈھانچے کی بنا پر سون میانی کو پیچھے چھوڑ گئی۔ انگریزوں کے ہاتھ آنے کے بعد بندرگاہ کو جدید خطوط پر مزید ترقی ملی۔

کراچی پورٹ کو زیادہ فعال اور پُرسہولت بنانے کے لیے برٹش راج نے پہلے سے موجود ''ہاربر بورڈ'' کو توڑ کر بندرگاہ کو ایک خودمختار ادارے کے تحت کرنے کا فیصلہ کیا اور یوں سنہ 1854 میں کراچی پورٹ ٹرسٹ قائم ہوا۔ نئے نظام کے تحت پورٹ آپریشن جدید خطوط پر استوار ہونے لگا۔ بندرگاہ پر اترنے والا سامان پہلے کشتیوں کے ذریعے شہر تک پہنچتا تھا، کیونکہ اس وقت تک کیماڑی کی حیثیت ایک جزیرے ہی کی تھی۔ 1847 میں کازوے یا کراچی کی زبان میں بیٹھا پل تو چارلس نیپئر نے تعمیر کروادیا تھا جس کی وجہ بندرگاہ پر آیا بھیجے جانے والے سامان کی ترسیل آسان ہوگئی تھی مگر اس کے ساتھ ہی پورٹ ٹرسٹ کے تحت 1865 میں تعمیر ہونے والے نیٹی جیٹی کے پل نے کام کو مزید آسان بنا دیا، اسی طرح سے 1878 میں جہازوں کو ہچکولوں سے بچانے اور اور لہروں کے ساتھ آنے والی مٹی سے سمندر کو بچانے کے لیے بندرگاہ سے کچھ فاصلے پر بریک واٹر کے نام سے مضبوط کنکریٹ سے سمندری پشتے کی تعمیر بھی بندرگاہ کے لیے بہت سودمند ثابت ہوئی۔

بندرگاہ پر روشنی کا مینار ٹالپر حکمرانوں نے 1786 میں تعمیر کروایا تھا جسے ناکافی سمجھتے ہوئے چارلس نیپئر نے 1888 میں منوڑہ کے مقام پر بلند ترین لائٹ ہاؤس تعمیر کروایا جو اگلے برس تک فعال ہو چکا تھا۔ اس مستقل لائٹ ہاؤس کے علاوہ 1914 میں تیز روشنی پھینکنے والا جہاز بندرگاہ سے باہر کی 50 میل کی حدود میں کھڑا کر دیا گیا۔ مقصد اس کا دھند یا کہر کی صورت میں لائٹ ہاؤس کی ناکافی روشنی کو سہارا دینا تھا۔

سنہ 1886 اور 1895 میں مزید دو برتھوں کی تعمیر نے پورٹ آپریشن کو وسعت دی، لائٹ ہاؤس جدید خطوط پر استوار ہوا، 1909 موجودہ آئل انسٹالیشن ایریا کا آغاز OilBulk Pier کی تعمیر کی صورت میں ہوا، 1927 میں ویسٹ وہارف کی تعمیر مکمل ہوئی اور اس سے اگلے دس برسوں میں ایسٹ اور ویسٹ وہارف میں بھاپ سے چلنے والی کرینوں کی جگہ بجلی سے چلنے والی کرینوں نے لے لی۔

یہ اقدامات اور اس طرح کے بہت سارے اقدامات پورٹ کی کارکردگی، آپریشن اور آمدنی بڑھانے کا ذریعہ تو بنے ہی مگر اس کے سبب برٹش راج کی مضبوطی انگریز سرکار کے لیے

اضافی تحفہ ثابت ہوئے، بحیرہ عرب کے پانیوں.... میں برٹش نیوی مضبوط ہوئی اور اس کی شان میں قابل قدر اضافہ ہوا، آگے آنے والی جنگوں میں فوجی ساز و سامان کی ترسیل بھی آسان ہوگئی۔

آزادی کے بعد بھی پورٹ آپریشن پوری آب و تاب کے ساتھ جاری رہا، حکومت پاکستان کو اس کی اہمیت کا اندازہ تھا سو اس کی ترقی و ترتیب سے غفلت نہیں برتی، 70 کی دہائی تک میری ویدر ٹاور سے ذرا سے آگے بڑھتے ہی کھارے پانی اور مچھلی کی مخصوص بو محسوس ہونا شروع ہوجاتی تھی، اس لیے کہ سمندر اور فضا دونوں آلودگی سے پاک تھے، کھارادر کی عمارتوں سے بندرگاہ کی کرینیں نظر آتی تھیں اور جی الانہ روڈ کی عمارتوں میں کھارے پانی اور مچھلی کی باس مستقل آتی تھی مگر ان کے مکین اس کے خوگر ہوچکے تھے مگر نئے لوگوں اور مہمانوں کو خوب محسوس ہوتی تھی۔ پورٹ کی سرگرمیوں کے طفیل روزگار کے اچھے اور منافع بخش ذرائع دستیاب تھے چاہے صورت مزدوری ہو یا اشیاء کی ترسیل، لیاری کے علاقے کی ایک بڑی آبادی پورٹ کی سرگرمیوں کے طفیل اپنی روزی کے حصول کے لیے پورٹ ہی سے وابستہ تھی، وہ دور کنٹینرز کا نہیں تھا لہٰذا افرادی قوت کی طلب زیادہ تھی اور مزدوروں کے لیے روزی کا اعلیٰ ترین سامان، اسی لیے لیاری، کھارادر اور بندرگاہ کے قرب و جوار میں صبح و شام ہٹ بردار مزدور نظر آتے تھے، آئل ٹینکرز مرچنٹ شپس کے ذریعے آئے پیٹرول اور دیگر ایندھن کو محفوظ کرنے کے لیے بڑی بڑی ٹنکیوں کی قطار کے ساتھ آئل انسٹالیشن ایریا فعال تھا مگر کیماڑی کی آبادی محدود تھی۔ فی زمانہ کیماڑی کی آبادی روز افزوں بڑھ رہی ہے، آئل انسٹالیشن علاقے سے ایندھن کی سپلائی کے لیے آئل ٹینکرز کا جوتا تا بندھا رہتا ہے، آئل ٹینکر کے مالکان اور عملے نے کیماڑی کے قرب و جوار میں جس علاقے میں ڈیرے ڈالے تھے وہ اب شیریں جناح کالونی کہلاتا ہے اور آہستہ آہستہ پھیلتی ہوئی یہ آبادی کلفٹن تک پہنچ گئی ہے۔ شیریں جناح کالونی دراصل پہلے سے آباد ایک قدیم گاؤں بھٹہ ویلج کا تسلسل ہے جو سمندری جھاڑیوں کے دامن میں آباد تھا۔

بھٹہ ویلیج: کیماڑی کی ایک قدیم بستی کے طور پر معروف بھٹہ ویلیج دراصل سمندری جھاڑیوں سے گھرا علاقہ تھا جہاں کے باسی سمندر کے بیٹے ہیں جو قدیمی طور پر اس علاقے میں آباد ہیں جو کبھی سمندری جھاڑیوں کی نسبت سے جنگل آباد کہلاتا تھا، وقت گزرنے کے ساتھ درخت کٹتے گئے اور سمندری گڑھے ریت اور مٹی سے پُر ہوتے گئے اور وسیع علاقہ بھٹہ ولیج کے نام سے آباد ہوتا چلا گیا، 71 کی جنگ میں یہ علاقہ بھی ہوائی حملے اور بمباری کی زد میں آیا تھا جس سبب کثیر تعداد میں اموات ہوئی تھیں جن میں اکثریت مچھی برادری کی تھی۔

دن رات فعال رہنے والی کراچی کی اس بندرگاہ نے کیسے کیسے دور کیسے کیسے دن دیکھے ہیں اور کیسے کیسے مراحل سے گزری ہے، بندرگاہ جس کی آمدنی کا بڑا ذریعہ درآمدی محصول تھا اس نے مختلف محاصل کے ساتھ ایک ایسا محصول بھی وصول ہوتے دیکھا جسے سیاہ دھبا ہی قرار دیا جاسکتا ہے جو کمائی کا بد ترین پہلو ہے، غلاموں کی تجارت کے دور میں 1837 میں یہ بندرگاہ بھی اس قبیح تجارتی فعل سے آلودہ ہوئی جب افریقا سے بادبانی کشتیوں پر لائے جانے والے شیدی بچے اور لڑکے لڑکیاں اس بندرگاہ کے ذریعے فروخت کے لیے کراچی لائے جاتے تھے جو اس وقت غلاموں کی تجارت کی ایک بڑی منڈی کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ بندرگاہ ہر اس غیر اخلاقی و غیر سماجی تجارت کی صورت میں لائے ہوئے انسان فی بندہ ساڑھے پانچ روپے ٹیکس کی وصولی سے شہر میں داخلہ پاتے تھے اور اپنے عارضی آقاؤں کے ہاتھوں مستقل آقاؤں کے ہاتھ 60 روپے سے لے کر 250 روپے تک میں فروخت ہوتے تھے۔

اس بندرگاہ سے روانہ ہوئے ایک مسافر بردار جہاز واٹرنا کی غرقابی کا المناک واقعہ لوک کہانی کا درجہ رکھتا ہے، غرقاب ہونے والا یہ طویل الجثہ جہاز مقناطیسی نظام سے پیدا ہونے والی روشنی سے معمور تھا اور اس قدر روشن تھا کہ بجائے واٹرنا کے لوگوں نے اسے بجلی کا نام دے ڈالا، یہی نہیں بلکہ جہاز کے ایجنٹ حاجی قاسم کی عرفیت اس جہاز کی وجہ سے حاجی قاسم بجلی پڑ گئی، نومبر 1886 کو کراچی سے ممبئی اور گجرات کے ساحلی قصبات کو روانہ ہونے والے اس جہاز میں 18 راجکماروں کی براتیں جا رہی تھیں جن کے ساتھ 1000 کے لگ بھگ براتی تھے، 400 طالبعلم تھے جو میٹرک کا امتحان دینے ممبئی جا رہے تھے۔ گویا جہاز پورے کا پورا زی قدر مسافروں سے پُر تھا، گجرات کے ساحلوں تک پہنچتے پہنچتے جہاز طوفان کی لپیٹ میں آیا اور لپیٹ میں کیا آیا پھر کبھی ہاتھ نہ آیا، اس قدر بڑے اور جذباتی المیے پر جن گھروں کے چشم و چراغ بجھے تھے ان کے در و دیوار آج بھی نوحہ کناں ہیں۔

1919 میں ہوئی افغان برٹش جنگ میں برطانوی فوج کے لیے اسلحہ اور دیگر فوجی ساز و سامان اسی بندرگاہ کے طفیل آیا اور افغانوں کے خلاف خوب استعمال ہوا حتیٰ کہ افغان ڈیونڈر

لائن قائم کرنے اوراس کی پاسداری پر آمادہ ہو گئے۔اس بندرگاہ نے تقریباً یہی تاریخ دہراتی دیکھی جب امریکا 2001 میں افغانستان پر حملہ آور ہوا تو یہ بندرگاہ سرکاری پالیسی کے تحت امریکا کی حلیف تھی، امریکی طیارہ و میزائل بردار جہاز اسی سے ملحق پانیوں میں لنگر انداز تھے اور یہیں سے طیارے اڑان بھرتے اور میزائل مارا کرتے تھے۔

جنگ عظیم اوّل و دوم میں یہی بندرگاہ جرمنی کے خلاف برسر پیکار اتحادی فوجیوں کی حلیف تھی، یہیں سے اسلحہ کی ترسیل ہوتی تھی اور جنگ کے زخمی فوجی علاج کے لیے اس محفوظ شہر میں لائے جاتے تھے، حالانکہ استعماری رویے کے خلاف ہند کے عوام ان جنگوں میں برطانیہ کے حلیف نہیں تھے، ترکی کی سلطنت عثمانیہ کی جنگ میں جرمنی کی عملی حمایت کی وجہ سے ہند کے مسلمان بھی انگریزوں کے ساتھ نہ تھے، جوش ملیح آبادی جو پہلی جنگ عظیم میں بیس برس کے نوجوان تھے اپنے ہم عمر نوجوانوں کی محفل میں اس طرح کے شعر سناتے تھے

سلام اے تاجدار جرمنی اے ہٹلر اعظم
فدائے قوم شیدائے وطن اے نیّر اعظم
سنا ہوگا تو نے ایک بد بختوں کی بستی ہے
جہاں جیتی ہوئی ہر چیز جینے کو ترستی ہے
جہاں مزدور محنت کر کے مزدوری نہیں پاتا
اگر پاتا بھی ہے پھر بھی کبھی پوری نہیں پاتا
جہاں انسانیت الٹی چھری سے ذبح ہوتی ہے
جہاں نیلی روا اوڑھے خدا کی خلق سوتی ہے
بکنگھم کی خبر لینے جو اب کی بار تم جانا
ہمارے نام سے بھی ایک گولہ پھینکتے آنا

مگر عوامی اور سرکاری رویے میں فرق ہونا معمول کی بات ہے اور یہ بات بندرگاہ کو بھی اچھی طرح معلوم تھی۔

فروری 1946 میں اس بندرگاہ پر ہوئی ہنگامہ آرائی جس کے نتیجے میں اس کے احاطے میں متعین مقامی فوجیوں کی جانیں گئیں شاید یہ بندرگاہ کبھی نہ بھول سکے، آزادی کی تحریک میں اپنا حصہ ڈالنے والوں میں سے ایک سبھاش چندر بوس بھی تھے جنہوں نے رضا کاروں پر مشتمل انڈین نیشنل آرمی تشکیل دی تھی، اسی تنظیم کے ایک مسلمان کمانڈر کیپٹن رشید کی گرفتاری پر پہلے کلکتہ اور بنگال میں ہنگامے پھوٹے جو بڑھتے

ابجد

ابتدائی حروف تہجی اب ج د کا مرکب ہے جن سے کسی زبان کے حروف مراد ہوتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں فن تحریر کے رواج سے پیشتر اظہار مطلب کا واحد ذریعہ تصویریں ہوا کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ ان تصاویر کو مختصر کر کے حروف بنائے گئے۔ ابجد کی ایجاد کا سہرا فونیقی قوم کے سر ہے جس نے سب سے پہلے حروف تہجی مرتب کیے۔ بعد میں ماسوائے چین اور جاپان کے تمام دنیا نے انہیں اپنی ضرورت کے مطابق اپنایا۔ یورپ میں جو لاطینی حروف تہجی رائج ہیں وہ اسی قدیم فونیقی تہجی سے اخذ کیے گئے ہیں اور ان کا نام Alphabet ہے۔ جو ''الفا'' اور ''بیٹا'' کا مرکب ہے۔ یہ لاطینی زبان کے ابتدائی دو حروف ہیں اور فونیقی الف اور ب کے ہم آواز ہیں۔ موجودہ عربی حروف تہجی بھی فونیقی ہی کی ایک صورت ہیں، کیونکہ فونیقی قوم بھی عربوں کی طرح سامی النسل تھی۔ جس رسم الخط میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ حبش کو خط تحریر کیا تھا، اس میں اور فونیقی رسم الخط میں ایک عجیب مشابہت نظر آتی ہے۔ عربی ابجد: (دائیں سے بائیں) اب ت ث ج ح خ د ذ ر ز س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک ل م ن و ہ ء ی۔

اردو ابجد: (دائیں سے بائیں) اب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ی ے۔

یاد رہے کہ ہندی رسم الخط آرامی سے اخذ کیا گیا ہے اور آرامی رسم الخط بھی فونیقی رسم الخط ہی کی پیداوار ہے۔ اردو خط عربی رسم الخط کی ایک صورت ہے جس کو نستعلیق کہتے ہیں۔ اس میں 37 حروف ہیں۔ اس کے مقابلے پر فارسی کے 32 اور عربی کے 29 حروف ہیں۔ عربی تحریر نسخ میں ہوتی ہے۔

مرسلہ: نعمان اشرف، لاہور

ہوئے ممبئی اور کراچی تک آن پہنچے، کراچی میں متعین نیوی کے مقامی جوان آمادہ بغاوت ہوئے، تصادم ہوا اور ایک جہاز پر قبضہ کرلیا گیا، انگریز سرکار کی جانب سے افہام و تفہیم کی کوئی صورت نکالنے کی کوشش کی بجائے انگریز سپاہیوں پر مشتمل رجمنٹ سے سخت کارروائی کروائی گئی، فائرنگ کے نتیجے میں کئی مقامی جوان جاں بحق ہوئے، ان کی حمایت میں اٹھی شہری آواز کو بھی تشدد سے دبایا گیا مگر انگریز سرکار کو بالآخر کانگریس اور مسلم لیگ کے اکابرین کی مدد سے معاملے کو سلجھانا پڑا یوں اس بندرگاہ نے انگریزوں کے آخری ظلم اور ان کی ٹوٹتی قوت کا مشاہدہ بھی کرلیا۔

اس بندرگاہ نے 28 برس تک اللہ کے مہمانوں یعنی عازمین حج کو بحری جہازوں سے رخصت کرتے وقت روح پرور مناظر بھی دیکھے ہیں جب حرمین کا سفر بحری جہازوں سے بھی ہوتا تھا۔ پان اسلامک اسٹیم شپ کمپنی کے زیر اہتمام حاجیوں کے جہاز سفینہ عرب، سفینہ شمس، سفینہ مراد اور اس طرح کے دیگر بحری جہاز جن کا گنجائش 1200 حاجیوں تک کی ہوتی تھی حج سیزن کے دوران فعال ہوتے تھے، جب یہ جہاز روانہ ہوتے تو حاجیوں کو رخصت کرنے آئے ایک جم غفیر کی جانب سے نعرہ تکبیر کے فلک شگاف نعروں سے بندرگاہ گونج اٹھتی تھی، سمندری جہاز کے ذریعے سفر حج کا سلسلہ پان اسلامک اسٹیم شپ کمپنی نے 1958 میں شروع کیا تھا جو 1986 تک جاری رہا۔

اسی بندرگاہ نے 1965 کی جنگ کے دوران پاک بحریہ کے جنگی بیڑے کو دوارکا کی کامیاب جنگی مہم پر روانہ ہوتے اور فاتحانہ شان سے لوٹتے ہوئے دیکھا۔

یہ بندرگاہ اس خون آشام رات کی بھی گواہ ہے جو 1971 کی پاک بھارت جنگ کے دوران برپا ہوئی جب بھارت کی میزائل بردار گن شپس نے بندرگاہ کی آئل ٹنکیوں پر میزائل برسائے جس کے نتیجے بندرگاہ ایک ہفتے تک آگ کے شعلوں اور کراچی سیاہ دھویں کی لپیٹ میں رہا۔

ٹیپر موول روڈ: یہ سڑک کیماڑی کے گیٹ سے نیٹی جیٹی کے پل تک جاتی ہے، گیٹ سے باہر نکلتے ہی لب سڑک پر پورٹ انتظامیہ کے زیر انتظام ایک خوبصورت مسجد ہے جس کا نام بھی بہت خوبصورت ہے، "مسجد باب الاسلام"، پل کی طرف چلنا شروع کریں تو اس قدیم سڑک پر حضرت غائب شاہ کا مزار آتا ہے، اس مزار کی کوئی تحقیق نہیں مگر آنے والوں کا تانتا ضرور بندھا رہتا ہے، کیماڑی کا علاقہ قدیمی سندھی اور کچھی برادری سے آباد ہے لہٰذا مقامی زبان میں یہ مزار غیبن شاہ اور اردو میں غائب شاہ کے نام سے معروف ہے۔

کبھی اس سڑک پر نگینہ سینما ہوا کرتا تھا جو اب نگینہ شاپنگ مال بن چکا ہے، اس سڑک پر زیادہ تر تنصیبات بندرگاہ کے حوالے ہی سے ہیں، کسی زمانے میں اس سڑک اور اس سے ملحقہ علاقوں میں پارسیوں کے بے شمار آفس تھے۔

غائب شاہ کے مزار کے ساتھ ہی گلفروشوں کی دکانیں ہیں، دکانوں کی بڑی تعداد سے زائرین کی بڑی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل نہیں مگر مسلسل آتے زائرین کو یہ گلفروش بلند آواز میں اور مستقل جس انداز میں پکارتے ہیں اس سے طبیعت بڑی بدمزہ ہوتی ہے، مزار سے ملحق پر تقدس علاقے کا ماحول عجیب بیہودہ سا بن جاتا ہے، زائرین تو پریشان بلکہ حواس باختہ ہوجاتے ہیں مگر وہاں کی مستقل بنی ہوئی یہ صوتی آلودگی راگیروں کے لیے بھی کوفت کا سبب بنتی ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ اپنے مقررہ رزق ہر عدم اعتماد اور دوسرے کی روزی کو چھیننے کی سعئ لاحاصل، حد درجے کی نامناسب روایت ہے۔

مزار سے ملحق علاقہ جیکسن بازار کہلاتا ہے، اس بازار کا آغاز جہازوں کے اسکریپ یا اس سے حاصل پرانے سامان جیسے ایئر کنڈیشن، سائیکلوں اور اس طرح کی دوسری گھریلو اشیاء کی قائم دکانوں سے ہوا جس نے آگے چل کر باقاعدہ بازار کا درجہ حاصل کرلیا، اب یہ باقاعدہ سے الیکٹرانک مارکیٹ ہے جس کا انحصار صرف جہازوں کے مال پر نہیں بلکہ کمپنی پیک نیا مال وافر مقدار میں نظر آتا ہے۔

کبھی یہ علاقہ توحیدی مکتب فکر کا مرکز بھی رہا تھا آج بھی وہاں توحیدی مسجد ہے جہاں مسلمانوں کو مرکزیت سے جڑے رہنے اور جفاکشی سے نہ گھبرانے کی تعلیم دی جاتی، بنیادی فلسفہ حب اللہ ہے۔

علاقہ اب شہر کی طرح انتہائی خوبصورت بلڈنگوں کی تعمیرات کی راہ پر چل پڑا ہے، عجب نہیں کہ یہ کلفٹن کے شانہ بہ شانہ چلنے لگے۔

کراچی میں ہندوؤں کے 2 شمشان ہیں جن میں سے ایک کیماڑی میں ہے، جہاں یہ شمشان ہے اس مناسبت سے وہ سڑک مسان روڈ کہلاتی ہے، ایک قدیمی مندر بھی ہے جو زیادہ معروف نہیں۔

یہ سڑک نیپئر مول برج یعنی نیٹی جیٹی کے پل تک جاتی ہے اس لیے اس کا یہ نام رکھا گیا تھا ضمناً یہ سر چارلس جیمس نیپئر کے نام سے بھی موسوم ہوگئی ہے، چارلس جیمس نیپئر برٹش افواج کے عالی مرتبت سپاہ سالار اور سندھ کے گورنر تھے۔ اس سڑک پر ان کا نام ضمناً آگیا ورنہ ان کے نام سے موسوم سڑک وہ معروف ترین سڑک ہے جو یونی ٹاور، نیو چالی سے ہوتی ہوئی لی مارکیٹ تک جاتی ہے جس کا نیا نام الطاف حسین روڈ ہے۔

کراچی پورٹ ٹرسٹ: بندرگاہ کو شہر کے ساتھ ملانے والے نیٹی جیٹی کے پل کے ساتھ ہی کراچی پورٹ ٹرسٹ کی شاندار عمارت ہے، اس کی ڈیزائننگ ساحلی شہر کے شایان شان ہے، اس عمارت کے درو دیوار ساحلی گزرگاہ و لنگر کے مشابہ ڈیزائن کیے گئے ہیں۔ اس عمارت کی تعمیر اور افتتاح کے ساتھ دلچسپ تاریخی حقائق جڑے ہوئے ہیں، ہم لوگ کیماڑی سے شہر آتے جاتے اس عمارت کو بارہا دیکھتے اور گزر جاتے ہیں یا کبھی کسی قومی تہوار پر رات کے وقت بچوں کے ساتھ گزرتے اس پر کیے گئے شاندار چراغاں سے لطف اندوز ہوتے ہیں مگر کبھی اس عمارت کے سامنے ٹھہر جانا چاہیے، اس کے زرد پتھر اور اس کی تین مختلف تہذیبوں یعنی گوتھک، برٹش اور ہندو تہذیب سے مستعار لیے گئے فن تعمیر کو باہم ملا کر فن تعمیر کے اس نادر نمونے کی تخلیق آپ کو سحر زدہ کردے گی۔ عمارت کی دو منزلوں تک جاتے اس کے ستون اور ان ستونوں کو باہم ملانے والے شہتیر، ستونوں کے بالائی حصوں اور شہتیر پر کیا گیا آرائشی کام عمارت کی اندرونی و بیرونی خوبصورتی کو چار چاند لگائے ہوئے ہے۔ عمارت کی تعمیر پر تقریباً دس لاکھ روپے لاگت آئی تھی۔

اس تاریخی عمارت کی تعمیر کا کام 1912ء میں شروع ہوا جو 4 سال کے عرصے میں تکمیل کو پہنچا، اس کا افتتاح ممبئی کے گورنر لارڈ ولینگٹن نے 5 جنوری 1915 کو کیا تھا اس اعتبار سے یہ بلڈنگ 100 برس کی ہوگئی ہے مگر اس کے مضبوط اسٹرکچر اور مناسب دیکھ بھال نے اسے بوڑھا نہیں ہونے دیا۔ عمارت کا رقبہ تقریباً 1400 اسکوائر میٹر ہے۔

دوسری خوبی اس کلاسکی عمارت کے دروازے کھڑکیاں اور محرابیں ہیں جو سائز میں بہت بڑی ہیں۔ مہارت سے ڈیزائن کردہ مجموعہ دلکش نظارے کا حامل ہے، عمارت کا داخلی اور خارجی حصہ بہت سادہ، لیکن منفرد ہے۔ دو منزلوں پر قائم عمارت عمارتی لکڑی کی اعلیٰ ترین قسم یعنی مکمل طور پر برما ٹ... کے کام سے آراستہ ہے۔

ایک اور دلچسپ تاریخی حقیقت جو اس عمارت ... وابستہ ہے وہ یہ ہے کہ اس عمارت کے افتتاح کے صرف ایک ... بعد ہی جنگ عظیم اوّل میں یہ عمارت ہنگامی حالات کا شکار ہو... حکومت نے عمارت کو اپنے کنٹرول میں لے لیا اور انڈین نیش... اسپتال ٹرسٹ کو سونپ دیا جس نے یہاں 500 بستروں ... مشتمل ہنگامی فوجی اسپتال قائم کیا جو تین برس تک قائم رہا ... کے بعد اسے پورٹ ٹرسٹ کو واپس دے دیا گیا جس کے ... اس کے حقیقی دفتری امور کا آغاز ہوا۔

نیشنل شپنگ کارپوریشن: بندرگاہ کے سامنے سمندر ... اس سرے پر جہاں نیٹی جیٹی اور مولوی تمیز الدین روڈ کا سنگم ... ایک خوبصورت اور اسٹیٹ آف آرٹ عمارت سمندر کے ... پانی میں اپنا عکس بکھیرتی ہے، یہ PNSC بلڈنگ ہے ... پاکستان نیشنل شپنگ کارپوریشن کا صدر دفتر ہے۔

تقسیم ہند کے وقت پاکستان کے حصے میں نجی کمپنی... کے 4 تجارتی جہاز آئے، چونکہ اب یہ جہاز پاکستانی پرچم بر... تھے لہٰذا ان کو مناسب ضابطے کے تحت رکھنے اور ان کی فنکش... نظر رکھنے کے لیے 3 سرکاری ادارے قائم کیے گئے، ص... ایوب خان کے زمانے میں ان اداروں کو ایک ادارہ یعنی نیش... شپنگ کارپوریشن بنا دیا گیا، یہ ادارہ 1963 میں مناس... قانون سازی کے تحت قائم کیا گیا تھا۔ جس کا خاطر خواہ اثر ہوا... 1965 تک اس ادارے کی زیر نگرانی 53 جہاز ہوگئے جو ... نجی و ایک قومی شپنگ لائن "پاکستان شپنگ کمپنی" کی ملکیـ... تھے، ترقی کا سفر کامیابی سے جاری رہا اور جنگ 1971 ... جہازوں کی تعداد 71 تک پہنچ گئی تھی، سقوط مشرقی پاکستان ... بنا پر ہمیں 14 جہازوں سے محروم ہونا پڑا۔ 1974 میں ... صاحب کی حکومت نے نیشنل شپنگ کارپوریشن کو بشمول ... شپنگ کمپنیوں کے قومی تحویل میں لے لیا، قومیائی گئی کمپنی... کے 26 اور حکومتی کمپنی 25 جہاز پاکستان نیشنل شپـ... کارپوریشن کی ملکیت ہوگئے، حکومتی کمپنی کے یہ جہاز صدر ایو... خان کی حکومت کے مرتب کردہ پنج سالہ منصوبوں کے شاند... نتائج کا منہ بولتا ثبوت تھے۔

قومیائے جانے کے بعد اس ادارے کا حشر بھی وہی ... جو دیگر قومیائے گئے اداروں کا ہوا، آنے والے 16 برسوں ... یہ چلا بھی تو اس طرح کہ اس میں کوئی قابل ذکر ترقی نہ ہو...

شپنگ سیکٹر میں مکمل اجارہ داری کمپنیوں کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے مگر قومیائے جانے کے بعد یہ ادارہ سفید ہاتھی ثابت ہوا، 1990 میں نواز شریف حکومت نے شپنگ سیکٹر کو ڈی ریگولرائیز کردیا، اب یہ ادارہ اپنے 9 جہازوں پر قانع ہے۔

2007 میں فروری اور اگست، یعنی دو مرتبہ اس بلڈنگ کی ایک منزل پر آگ لگنے کے واقعات ہوئے، سوئے اتفاق دونوں واقعات اتوار کے روز ہی وقوع پزیر ہوئے، اس طرح کی پُراسرار آگ اور اس سے حاصل مطلوب نقصانات پاکستان میں معمول کی بات ہے جس کا الزام عموماً شارٹ سرکٹ اپنے سر لے لیتا ہے، جب بھی اس طرح کے واقعات رونما ہوتے ہیں، اخباری کالم اور مضامین میں ایک لامتناہی بحث چھڑ جاتی ہے، اس پر ایک واقعہ یاد آگیا کہ ہمارے پاس ایک چھوٹی سی بکری تھی کوئی چھ ماہ کی، ایک دن اس نے اچانک چیخ سی ماری اور گری اور آن کی آن میں چل بسی، اس کے کافی عرصے کے بعد راقم کی ملاقات ایک صاحب سے ہوئی جو دو سو بکروں کے ایک فارم کے نگراں تھے، انہیں واقعہ سنا کر بکری کے اس طرح سے اچانک مرجانے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے جواباً ارشاد فرمایا، ''سائیں ہمارا ماموں اسی طرح گر کے مرگیا تھا، تم بکری کو روتا ہے'' تو عرض یہ ہے کہ جس شہر میں مارکیٹوں کی مارکیٹیں جل جائیں وہاں کسی عمارت کی ایک منزل کو کیا رونا، فروری میں جب پہلی آگ لگی تھی، اتفاقاً نیٹی جیٹی سے گزر ہوا تو سوچا چلو نزدیک جا کر دیکھتے ہیں، وہاں پہنچ کر حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی، اس لیے کہ وہاں لوگ آ جا رہے تھے، والس آئسکریم کی سائیکل کھڑی تھی، ایک مکئی کے بھٹے والا کھڑا تھا اور ایک پاپڑ والا۔ وہاں کھڑے اور آتے جاتے لوگ آگ سے باقاعدہ سے لطف اندوزی میں مشغول تھے۔

کراچی ڈاک لیبر بورڈ: کراچی ڈاک لیبر بورڈ بندرگاہ کے مزدوروں کی بہبود کا ادارہ تھا، نیٹی جیٹی کا پل جہاں آ کر سی آئی کی طرف اترنا شروع ہوتا ہے بس وہیں گہرے نیلے رنگ کی دیواروں کی حامل جس عمارت پر بڑے بڑے حروف سے لکھا KDLB دور ہی سے نظر آتا ہے وہی اس ادارے کا صدر دفتر تھا۔ 1970 تک بندرگاہ میں مزدوری کا ''ہوائی روزی'' یا روزانہ اجرت'' کا نظام رائج تھا، پورٹ کے داروغہ و جمعدار کہلاتے، اہلکار سامان کی ہینڈلنگ کرتے اداروں کو مزدور فراہم کرنے کے ذمہ دار تھے، اسی لیے بندرگاہ اور اس سے ملحق علاقوں میں بک بردار مزدوروں کی ٹولیاں اور یہ داروغہ و جمعدار بحث کرتے نظر آتے تھے، اس غیر منصفانہ نظام کی بدولت غیر تعلیم یافتہ مزدوروں میں کام کی مستقل دلچسپی اور بچت کا تصور نہ تھا، مہنگائی اور دوسرے عوامل نے بندرگاہ کے مزدوروں میں بے چینی پیدا کی جس کے سبب پورٹ کا کام متاثر ہوا اور سامان کی کلیئرنس میں غیر ضروری تاخیر ہونے لگی جس کے سبب کارما ہوم کانفرنس میں پاکستان پر نہ صرف جرمانہ عائد ہوا بلکہ مستقل جرمانے کی دھمکی کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ 1974 میں ڈاک کے مزدوروں کی فلاح و بہبود کا یہ ادارہ قائم ہوگیا، ڈاک لیبر بورڈ کے نظام کے تحت مزدوروں کی ملازمت مستقل نہیں تھی مگر بورڈ کے کارڈ کے تحت انہیں بندرگاہ کا عامل تسلیم کیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ لگی بندھی مگر پُرکشش اجرت کے ساتھ ساتھ میڈیکل اور اس طرح کی دوسری سہولیات کے حقدار ٹھہرے تھے، 2006 میں کراچی پورٹ کے معاملات کی درستی کے لیے ورلڈ بینک کی تجویز پر یہ ادارہ ختم کردیا گیا۔

قاسم پورٹ: بھٹو صاحب کے دور میں جب بھاری صنعتوں کے قیام کی پالیسی بنی تو کراچی میں پیپری کے مقام پر اسٹیل مل کے پروجیکٹ کا آغاز ہوا، پیپری کا انڈسٹریل زون کراچی کے مشرق میں 35 کلومیٹر کے فاصلے پر تھا، اس زون میں چونکہ دوسری بڑی صنعتوں کی گنجائش رکھی گئی تھی لہٰذا مستقبل کی منصوبہ سازی میں علاقے میں ایک بندرگاہ کے قیام کی تجویز پیش کی گئی تھی تاکہ اسٹیل مل کے لیے درآمد ہونے والی بھاری مصنوعات کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچانے کی زحمت سے بچا جاسکے اور موجودہ بندرگاہ میں کام کی روائتی دباؤ کا شکار نہ ہو۔ مجوزہ آٹو موٹیو انڈسٹری کا قیام بھی ایک آزاد گھر آنگن کی بندرگاہ کا متقاضی تھا سو 1973 میں کی گئی مناسب قانون سازی کے بعد بندرگاہ کی بنیاد رکھی گئی اور 1980 میں بندرگاہ کا آغاز ہوگیا۔ 12 برتھوں اور جدید سہولتوں سے آراستہ اس بندرگاہ کی ڈیزائننگ ''گھر آنگن'' کی ہے کہ ہر میکینکل کامپلیکس کو ساحل کی سہولت دی گئی ہے تاکہ اس کی درآمد و برآمد کے لیے بغیر کسی رکاوٹ کے متعلقہ کارگو کی جہاز تک رسائی با آسانی ممکن ہوسکے۔ یہ بندرگاہ تکنیکی طور پر کراچی کی بندرگاہ کا پرتو ہے، فرق صرف یہ ہے کہ کراچی کی بندرگاہ کے قدرتی خدوخال کو جدید شکل دی گئی ہے مگر پورٹ قاسم مکمل طور ہر مصنوعی سیٹ اپ ہے۔

ابراہیم حیدری: کراچی کے مغرب اور جنوب میں خشکی اور سمندر ساتھ ساتھ چلتے ہیں، اسی مسلسل کنارے پر کورنگی کریک سے نزدیک تر ماہی گیروں کی ایک قدیم ترین بستی ''ابراہیم حیدری'' ہے، یہ بستی فضائیہ کے اڈے سے متصل ہے، ابراہیم حیدری ،،

درویشوں پیر و مرشد ابراہیم شاہ اور حیدر شاہ کے نام سے موسوم ہے، ان دونوں درویشوں کی قبور اب فضائیہ کے اڈے کے اندر آ گئی ہیں۔ یہاں فشری کی جیٹی بھی ہے اور میرین فوڈ کے پروسیسنگ پلانٹ بھی، کراچی کے دیگر ساحلوں کی طرح یہ بھی آباد اور مقامی لوگوں کی زبان میں مائی باپ ساحل ہے۔ اس بستی کی قدامت کے متعلق جو تاریخی روایات ہیں ان کے مطابق سکندر اعظم سے بھی پہلے دارا اول نے 521 قبل مسیح میں یونانی سیاح 'اسکائی لیکس' کو ہندوستان کے حالات دیکھنے بھیجا تھا۔ اس نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ علاقہ ریڑھی میاں اور کیماڑی کے بیچ والا علاقہ تھا جس میں ابراہیم حیدری بھی شامل ہے۔

موجودہ ابراہیم حیدری کی بستی ان دنوں میں بسی جب سندھ پر ٹالپر خاندان کی حکمرانی تھی، اس گھاٹ کو موزوں پا کر کچھ ماہی گیر یہاں آ کر کے اور رکے کیا یہیں کے ہو رہے۔ پھر گھر بنے، گھروں کے آنگن بنے، ہر آنگن کے سامنے پھیلا ہوا وسیع نیلا سمندر، سفید ریت، کنارے پر کھڑی بادبانی کشتیاں، جال بنتے ماہی گیر، یہ سب کچھ ابراہیم حیدری کے دالان کا حصہ بنتا چلا گیا۔

ماہی گیروں کی اس بستی کی اپنی سادگی اور اپنی روایات تھیں جن کا تذکرہ شہر کے ماہی گیر بھی کرتے تو ان کی آنکھوں میں چمک آ جاتی، عموماً گھرانے آپس کی صلاح سے شادیاں ساتھ رکھتے، سامان عروسی کی خریداری کے لیے عورتیں دو تین بیل گاڑیوں پر لی مارکیٹ، جوڑیا بازار اور کھارادر آتیں اور شام گئے جب لوٹتیں تو گاؤں کی منڈیر پر عورتیں ان کی منتظر ہوتیں جیسے ہی آتی ہوئی بیل گاڑیاں نظر آتیں عورتیں لوک گیت گانا شروع کرتیں۔ اور پھر دولہے دلہن کے گھر تک گاتی چلی جاتیں، شادی کی خوشی دمکتے چہروں اور کھنکتے گیتوں سے عیاں ہوتی۔

اس بستی کے صاف ستھرے ساحل اور اس کی چاندی کی سی چمکتی ریت نے فلمسازوں کو بھی متاثر کیا تھا، وحید مراد کی مشہور فلم سمندر کی شوٹنگ کے لیے ابراہیم حیدری کا ساحل پرائم لوکیشن تھا اسی طرح 60 ہی کی دہائی میں بننے والی ایک اور فلم ناخدا میں بھی یہی ساحل نمایاں ہے۔

یہاں کے ذہین ماہی گیر سمندر کے مزاج کو سمجھنے کی فطری صلاحیت کے حامل ہیں، 2013 میں بحیرہ عرب میں بننے والے ایک سمندری طوفان اور اس کے کراچی کی جانب ممکنہ رخ کی خبر کو پاکستان کے نوآموز اور تجارتی میڈیا نے جس طرح سے اٹھا کر آسمان پر چڑھایا ایسے میں کسی چینل کی میڈیا ٹیم ابراہیم حیدری گئی اور سمندر کے کنارے اطمینان سے بیٹھے جال بننے والے ماہی گیروں سے پوچھا کہ وہ آنے والے طوفان سے خوفزدہ نہیں؟ جواباً ایک ماہی گیر نے کہا طوفان کا خطرہ نہیں ہے، میڈیا ٹیم کا ایک ممبر کچھ زیادہ ہوشیاری دکھا کر کہنے لگا ''تم لوگوں کو معلوم نہیں ماہرین نے کتنے بڑے طوفان کی پیش گوئی کی ہے، حکومت نے ساحلی علاقے خالی کرنے کا حکم دیا ہے۔''

اس کے جواب میں ماہی گیر نے صرف ایک جملے میں بات ختم کر دی ''اچھا بابا جاؤ زیادہ بات نہ کرو۔''

ہمارے دوست مظہر بٹ صاحب ابراہیم حیدری کے بارے میں کیا کہتے ہیں ملاحظہ فرمائیں۔ ''چونکہ ابا کی مچھلی کی آڑھت تھی اس لیے وصولی کے لیے میں ہی انہیں فوکسی میں بٹھا کر ابراہیم حیدری اور ریڑھی گوٹھ کاروبار کے سلسلے میں اکثر لے جایا کرتا تھا۔ اس وقت میں سینئر کیمبرج کر رہا تھا۔ وہاں کے مقامی باشندے جو زیادہ تر سندھی اور کچھی ہیں بڑے مہمان نواز تھے۔ جیسی چائے اور پان وہاں اڑائے اب کہیں نہیں ملتے۔ وہاں غربت بہت تھی۔ کچے مکان اور چھاپڑے تھے۔ چھوٹی کشتیاں جو ہوڑا کہلاتی ہیں ماہی گیر شکار کے لیے استعمال کرتے تھے۔ بے حساب چھوٹی مچھلیاں پکڑی جاتی تھیں کہ اب ان کی نسل ہی تقریباً ختم ہوتی جا رہی ہے یا ان میں سے کچھ نسل کی مچھلیاں اب چین برآمد کی جا رہی ہیں۔ اس سے پیشتر چھوٹی مچھلیاں جنہیں گند کہا جاتا ہے خشک کر کے پولٹری میل کے کارخانوں کو فروخت کر دی جاتی تھیں۔ جیٹی بھی خستہ حال تھی۔ سڑکیں بھی ٹوٹی پھوٹی اور بے ترتیب بنی ہوئی، اس زمانے میں وہاں قرب و جوار میں بنگالی اور برمی پاڑے نہیں تھے۔ لیکن اب تو وہاں آوے کا آوا ہی بگڑ چکا ہے۔ نہ خالص دودھ۔ نہ لذیذ چائے۔ نہ وہ ظالم پان کہ منہ سے لگا نہ چھوٹے، نہ وہ مہمان نوازی نہ خلوص، بس نفسا نفسی ہے جو غالب ہے۔''

گویا پہلے بھی بہت اچھے حالات نہ تھے مگر اب جو ماحول ہے تو اس میں دم گھٹتا ہے۔ چند خاندانوں کی آبادی سے آغاز کرنے والی یہ بستی جس کی ابتدائی دنوں میں آبادی سینکڑوں میں تھی اب ہزاروں کے مراحل سے گزر ایک لاکھ سے بھی بڑھ گئی ہے۔ سمندر کے خوبصورت کناروں پر اب جیٹیاں بن گئی ہیں، ساحل کی سفید ریت اور نیلا پانی قصہ پارینہ بن چکے، بس کالی کیچڑ والی سیاہ مٹی ہے اور آلودگی ہے۔

خواہش کا نام عشق تھا' نمائش کا نام حسن
اہل ہوس نے دونوں کی مٹی خراب کی

ادب کا قطب

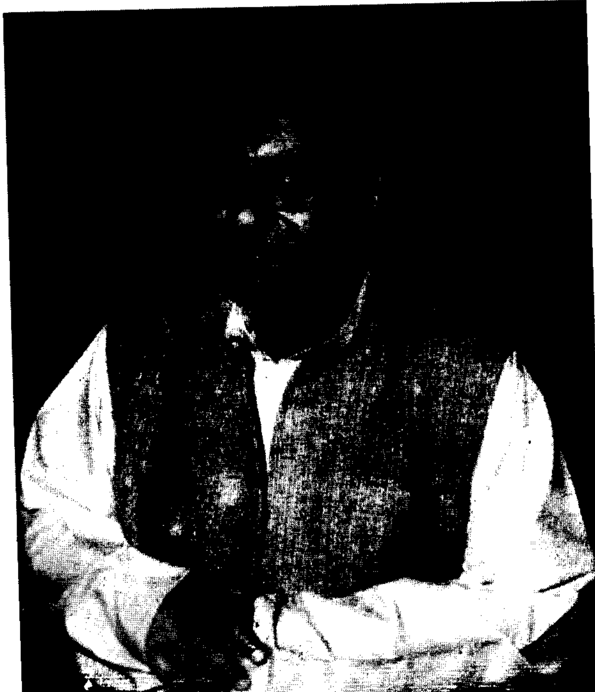
شکیل صدیقی

اردو ادب میں شہکار تخلیق کرنے والوں کی کثیر تعداد نظر آتی ہے۔ اس دور میں جب عوامی بولی ٹھولی میں اشعار کہنا درکنار، لوگ گفتگو میں بھی عوامی الفاظ استعمال کرنے سے اجتناب کرتے تھے مگر نظیر اکبر آبادی نے اسی عام فہم زبان میں شاعری کر کے مقبولیت حاصل کی۔ غالب کا دور مشکل الفاظ کو استعمال کرنے کا دور تھا لیکن غالب نے فارسی زدہ الفاظ کی جگہ سہل الفاظ کو برت کر مقبولیت پالی۔ قیام پاکستان کے بعد بھی ایسے بے شمار نام نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو منوایا۔ اپنی الگ شناخت منوانے والوں میں ایک بڑا نام مشفق خواجہ کا بھی ہے۔

جداگانہ انداز میں نثر لکھنے والے کی زندگی کے اہم گوشے

وہ ایک شریر، شوخ و شنگ لڑکا تھا۔ شرارت سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو ستا کر خوش ہوا کرتا تھا، بلکہ شرارتی ان معنوں میں کہ لفظوں کے پھول کھلایا کرتا تھا۔ وہ جملے باز اور بذلہ سنج تھا۔ اس کی صحبت میں رہنے والے اس سے محظوظ ہوا کرتے تھے۔

اس کا نام مشفق تھا چنانچہ وہ اپنے نام کی مناسبت سے مشفق اور مہربان تھا۔ گفتگو کے دوران اس کا لہجہ دھیما اور ملائم ہوتا تھا، جملے بچے تلے اور مزاح کی چاشنی میں ڈوبے



ہوئے۔ آہستہ آہستہ علم و ادب پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی چلی گئی اس لیے گفتگو کرنے والا اس کے نزدیک ہوتا چلا جاتا تھا۔ وہ مہمان نواز اور محبت کرنے والا بھی تھا۔

وہ کثیر الجہت فنکار تھا۔ ایک طرف اس نے غزل میں ایک نئے انداز سے اپنے اندر کی لطافت صفحۂ قرطاس پر منتقل کی تو دوسری طرف تحقیق کی پر پیچ اور دشوار دنیا سے اپنے علمی سفر کا آغاز کیا۔ ان دونوں میدانوں کے علاوہ جب اس نے ادبی شخصیتوں کی کارکردگی میں ناہمواریاں نشان زد کرنے کا آغاز کیا تو وقت گزرنے کے ساتھ غزل گوئی کی مشقت کو پس منظر میں دھکیل دیا اور تحقیق کو پیش منظر میں لے آیا۔

اس کی تیسری حیثیت کالم نگار کی تھی۔ اس کے قلم میں بلا کی بذلہ سنجی اور جملہ بازی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے قلم کی بجائے اپنے ہاتھوں میں نشتر تھام رکھا ہو۔ اس کی خامہ بدوشی نمکین کے علاوہ مسالے دار بھی تھی، لہٰذا اس کا قاری دوران مطالعہ چٹخارے لیتا تھا۔

☆......☆

اس کا اصلی نام خواجہ عبد الحئی تھا۔ وہ 19 دسمبر 1935ء میں اپنے آبائی مکان قدیر منزل، محمد نگر لاہور میں پیدا ہوا۔ اس کے والد خواجہ عبد الوحید علمی، ادبی اور دینی حلقوں میں ادب و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ لاہور میں ''کریمی پریس'' کے مالک تھے۔ انہیں علامہ اقبال کی کتابوں کے پہلے ایڈیشن چھاپنے کا فخر حاصل تھا۔ بہت سے فقید المثال ماہنامے، مثلاً عالمگیر، نیرنگ خیال اور شباب اردو وغیرہ اسی پریس میں چھپتے تھے۔ پریس کے اصل مالک میر امیر بخش تھے۔ ان کی صاحبزادی کی شادی خواجہ عبد الوحید سے ہوئی۔ تو وہ پریس امیر بخش کے بعد ان کا ہو گیا۔

بنیادی طور پر خواجہ عبد الوحید خاندان کشمیر سے ہجرت کر کے آیا تھا اور ''وائیں'' کہلاتا تھا۔ گویا وہ نومسلم تھے۔ ان کے جد امجد کا نام جمال وائیں تھا۔ ان کے بیٹے کمال وائیں تھے، جو زعفران کے تاجر تھے۔ خاندان کشمیر سے ان کا خاندان لاہور کب منتقل ہوا، اس کا سراغ نہیں لگتا۔ کمال وائیں کے بیٹے بوٹا تھے، جو لاہور کے خاصے متمول ٹھیکے دار تھے۔ انہوں نے بہت سی سرکاری اور غیر سرکاری عمارتیں تعمیر کرائی تھیں۔ میاں بوٹا کے سات بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام خواجہ کریم بخش تھا۔

امیر بخش کا گھرانا بھی علمی تھا۔ یوں تو ان کے خاندان میں بہت سی علمی و ادبی شخصیتیں گزری ہیں لیکن دو کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ خواجہ عبد الحمید، عبد الحئی کے سگے تایا تھے۔ مشہور لغت جامع اللغات جو چار جلدوں پر مشتمل تھی، انہوں نے ہی تالیف کی تھی۔ کرنل خواجہ عبد الرشید، عبد الحئی کے تایا زاد تھے۔ انہوں نے انگریزی، فارسی اور اردو میں جامع کتابیں لکھیں۔ مکتبہ برہان دہلی سے ان کی ایک کتاب ''معارف الاثار'' شائع ہوئی۔

علم و ادب کی روایت گویا عبد الحئی کو ورثے میں ملی۔ وہ بچپن سے کم گو اور کتابوں میں منہمک رہنے والا تھا۔ جب سارے بہن بھائی کھیل کود میں مشغول ہوتے یا ادھم مچا رہے ہوتے تو وہ کتابی کیڑے کی طرح گھر کے کسی کونے میں رسالہ یا کتاب چاٹ رہا ہوتا، اس نے گیارہ بارہ برس کی عمر ہی سے تعلیم و تربیت، مخزن، ترجمان القران، تارہ، ہمایوں روزنامہ انقلاب اور روزنامہ زمیندار کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ اسی زمانے میں اس نے مولوی احمد دین وکیل کی کتاب ''سرگذشت الفاظ'' پڑھی۔ وہ اپنے پسندیدہ تراشوں کو کاپیوں میں چپکا کر رکھتا تھا اور جو شعر اسے پسند آ جائے اسے کاپی میں درج کر لیا کرتا تھا۔ غالباً یہی وہ عادت تھی جس کی بنا پر اس نے شعر و ادب کی پُر خار وادی میں قدم رکھا۔

وہ چھوٹے بھائیوں کو تعلیم و تربیت کی کہانیاں پڑھ کر سناتا تھا۔ فرش پر دری بچھا کر تمام بچے دائرے میں بیٹھ جاتے اور اس کے بعد دھیمے لہجے میں وہ کہانی سنانے لگتا۔ یہ اس کا مخصوص انداز تھا، اس لیے کہ وہ کسی سے اونچی آواز میں گفتگو نہیں کرتے تھے۔ وہ قہقہے نہیں لگاتا بلکہ مسکرانے پر اکتفا کرتا تھا۔ وہ طبعاً جھگڑالو نہیں تھے، اس لیے بھائی بہنوں سے لڑائی جھگڑا نہیں کرتا۔ بزرگوں کا احترام اس کی سرشت میں داخل تھا۔ بڑھاپے تک اس کا معمول رہا کہ وہ مہینے میں ایک بار اپنے والدین کی قبروں پر ضرور جاتا اور فاتحہ خوانی کرتا۔ حالانکہ وہ مذہبی جنونی نہیں تھا، مذہب بس خود تک محدود رکھنے کا قائل تھا۔ نمود و نمائش کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ اسے روزہ رکھتے، نماز پڑھتے بھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

وہ نہ صرف یہ کہ کتابوں کا بے تحاشا مطالعہ کرتا تھا بلکہ اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے بچوں کی کہانیاں بھی لکھنے لگا تھا۔ اس کی کہانیاں اتنی دلچسپ ہوتیں کہ ناشر خرید لیتا۔ ایک بار اسے اور ان کے بڑے بھائی عبد القیوم کو پیسوں کی ضرورت پڑی تو اس نے ایک ناشر سے پیسے مانگے۔ اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ کوئی کہانی لاؤ تو رقم مل سکتی ہے۔ انہیں

پیسوں کی اشد ضرورت تھی۔ دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے، کافی دیر تک دماغ سوزی کی اور ایک کہانی کا خاکہ تیار کر ڈالا۔ پھر انہوں نے اور ان کے بھائی نے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر کہانی کی ایک مکمل کتاب لکھ ڈالی جو ناشر کو پسند آ گئی اور اس نے فوری رقم ادا کر دی۔ 1948 تا 1950 میں ان کی بارہ کہانیاں چھپیں۔ اب اس کی پہچان بننے لگی تھی پھر وہ لڑکپن کی حدود سے نکل کر نوجوانی کی سرحد میں آ چکا تھا۔ لوگ عزت دینے لگے تھے۔ روزنامہ امروز والوں نے فرمائش کر کے اس سے کہانیاں لکھوانی شروع کر دیں۔ اس طرح وہ بچوں کا مقبول قلمکار بننے لگا۔

کالج کے زمانے میں اس نے اردو کلاسیکی شاعری کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ تقریباً سارے ہی اہم اور غیر اہم شعرا کے دواوین ان کی نظروں سے گزرے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے پسندیدہ اشعار کو نشان زد بھی کرتے تھے، جنہیں بعد میں ایک رجسٹر میں نقل کر لیا کرتے تھے۔ ''اردو شاعری اور ابتذال'' کے عنوان سے بھی انہوں نے دوسرے رجسٹر میں کافی اشعار اکٹھا کیے تھے ممکن ہے اس موضوع پر کوئی مقالہ لکھنے کی تیاری کر رہے ہوں اور وقت نہ ملا ہو۔

ہر دس یا پندرہ روز کے بعد وہ اور دوسرے بھائی بہن اپنی بڑی بہن کے ہاں رات کے کھانے پر اکٹھا ہوتے جو دیوا اپارٹمنٹس کے فلیٹ نمبر 1 میں رہتی تھیں۔ بہن سے ملاقات اور تقریب بہر ملاقات کے لیے کھانا ان کا معمول تھا۔ وہ نہایت پابندی سے اس معمول پر عمل پیرا ہوتے تھے، لیکن اس وقت بھی ان کے ہاتھ میں کوئی کتاب دبی ہوتی تھی۔ اس لیے کہ کتاب ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔

ان کی جب کوئی کتاب چھپ کر آتی تو سب بھائی بہنوں کو اس کی ایک ایک کاپی بھیجتے۔ ہر کتاب پر کچھ نہ کچھ لکھ دیتے تھے۔ حس مزاح ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایک بار اپنے والد پر انہوں نے چھوٹے بھائی سے خاصا طویل نوٹ لکھوایا پھر اسے تحریر مکرر کیا اس طرح ان کے الفاظ زیادہ ہو گئے۔ غلطی سے اسے کاپی کر کے بھیجنے کی بجائے اسی کو بھیج دیا۔ مدیر نے اسے ان کی تحریر سمجھ کر انہی کے نام سے شائع کر دیا۔

مضمون شائع ہوا تو بھائی نے منہ پھلا لیا کہ محنت میری اور نام ان کا۔ اس نے اہلِ خانہ کی موجودگی میں کہا۔ ''بھائی نے میری محنت کو اپنے نام سے چھپوا لیا ہے۔''

''ہاں، میں بہت شرمندہ ہوں۔ اکثر لوگوں نے اسے پڑھ کر کہا ہے کہ تمہاری تحریر کا معیار بہت گر گیا ہے۔'' انہوں نے جھٹ سے جواب دیا۔

اس جواب پر سب نے زوردار قہقہہ لگایا۔

☆......☆

انہوں نے ابتدائی تعلیم سناتن دھرم ہائی اسکول، ایمپریس روڈ لاہور میں حاصل کی۔ پھر ان کے والد 1948ء میں نقل و مکانی کر کے کراچی آ گئے۔ وہ اس وقت محکمۂ اطلاعات میں ملازم تھے۔ کراچی آنے کی وجہ یہ تھی کہ محکمے نے ان کا تبادلہ کر دیا تھا۔ اس ''ہجرت'' کی وجہ سے مشفق کی تعلیم کا تسلسل باقی نہ رہ سکا۔ چنانچہ انہوں نے ایک پرائیویٹ .... طالب علم کی حیثیت سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اسلامیہ کالج کراچی سے گریجویشن کیا۔ یہاں انہیں پروفیسر سید محمد ابوالخیر کشفی، شجاع احمد زیبا، پروفیسر ممتاز حسین، سید حسن عسکری، پروفیسر کرار حسین جیسے اساتذہ کی رہنمائی حاصل ہوئی۔ (بعد میں پروفیسر ممتاز حسین اور شجاع احمد زیبا نے تو کافی عرصے تک ان کے کتب خانے سے استفادہ بھی کیا)

☆......☆

کالج کے چار برسوں میں ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی اور ان کے بہت قریب آ گئے تعلقات میں زیادہ استحکام پیدا ہوا اور ان کی بہت سی خوبیاں سامنے آئیں۔ ان کی تحریری صلاحیت کو دیکھتے ہوئے انہیں کالج میگزین کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا اور طے یہ کیا گیا کہ کسی ضرورت مند ادیب سے میگزین چھپوایا جائے تاکہ معقول رقم انہیں معاوضے کے طور پر دی جا سکے۔ ایک صاحب مل گئے، مگر یوں ہوا کہ وہ صاحب ڈکار لیے بغیر ساری رقم ہضم کر گئے۔ اس میں ان کا اتنا قصور بھی نہیں تھا جتنا کہ حالات کے جبر کا تھا۔ وہ مالی طور پر اتنے مجبور تھے کہ انہوں نے اپنی ماں کی بیماری پر رقم خرچ کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ بہر حال انہیں میگزین کا کام کرنا چاہیے تھا جو وہ نہ کر سکے۔

اس معاملے میں کشفی صاحب کا ردِعمل شدید تھا، مگر خواجہ عبدالحئی نے نرمی سے انہیں سمجھایا کہ اگر اس سال میگزین نہ چھپا تو کوئی قیامت نہیں آ جائے گی۔ وہ معاملات کو سنبھال لیں گے۔ چنانچہ اس ضمن میں انہوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ کراچی کے ادبی حلقوں تک بات نہ پہنچے ورنہ وہ تین کی تیرہ لگائیں گے۔

خواجہ عبدالحئی نے اس سال کئی ادبی نشستیں برپا

کیں، جن میں ادیب بلائے جاتے تھے۔ ان محفلوں پر جو خرچا آیا وہ کشفی صاحب اور خواجہ عبدالحیٔ نے اپنی جیب سے ادا کیا۔ اس طرح طالب علموں کو یقین آ گیا کہ وہ رقم جس سے میگزین نکالنے والے تھے وہ ادبی محفلوں پر خرچ ہو گئی۔ اس طرح یکبارگی کسی کی جیب پر بوجھ نہیں پڑا اور بات بن گئی۔ خواجہ عبدالحیٔ طالب علموں کو جو تاثر دینا چاہتے تھے، وہ بہ حسن و خوبی مرتب ہو گیا۔

☆......☆

خواجہ عبدالحیٔ نے اپنی تعلیمی مصروفیات مکمل کرنے سے قبل ہی یعنی 1957ء میں انجمن ترقی اردو سے وابستگی اختیار کر لی۔ اس کی بھی ایک دل چسپ داستان ہے۔ وہ طالب علمی کے دوران انجمن کے کتب خانے میں مطالعہ کرنے جاتے تھے۔ ایک روز بابائے اردو نے انہیں دیکھا تو پوچھا۔ ''تم کون ہو اور یہاں کیوں آتے ہو؟ یہاں تمہاری دل چسپی کا کیا سامان ہے؟''

''میں طالب علم ہوں اور مجھے قلمی کتابوں (مخطوطات) سے دل چسپی ہے۔'' خواجہ عبدالحیٔ نے جواب دیا۔ ''میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ مصنفین کیسے لکھتے ہیں اور چھپنے تک اس میں کیا کیا تبدیلیاں کی جاتی ہیں۔''

بابائے اردو اس جواب سے خوش ہوئے۔ انہوں نے پوچھا۔ ''صاحبزادے میرا کچھ کام کرو گے؟ یہاں میرا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہیں ہے۔''

''مجھے آپ کا ہاتھ بٹانے میں خوشی ہوگی۔'' خواجہ کا جواب تھا۔

بابائے اردو نے سر ہلایا اور خواجہ کو تھوڑا بہت کام دینا شروع کر دیا۔ وہ بھی اس لیے کہ خواجہ کے سفارشی بن کر ابن انشا آئے۔ انہوں نے ہی بابائے اردو سے خواجہ کا تعارف کراتے ہوئے تعریفوں کے پل باندھ دیئے تھے۔ پھر جب انہوں نے 1957ء میں کراچی یونی ورسٹی سے اردو میں ماسٹر کر لیا تو باقاعدہ ملازمت کی پیش کش کی جسے انہوں نے قبول کر لیا۔ جب ایم اے میں تھے تو ابن انشاء کے ساتھ مل کر انہوں نے یونی ورسٹی کا پہلا اردو میگزین بھی نکالا۔ اب خواجہ عبدالحیٔ کا نام کراچی کے ادبی حلقوں کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی پہچانا جانے لگا تھا لیکن اپنے اصل نام کو وہ عرصہ پہلے پیچھے چھوڑ چکے تھے۔ انہیں لوگ مشفق خواجہ کے نام سے پہچانتے تھے۔

ایک دو بار ایسا ہوا کہ بابائے اردو نے قلمی نسخے کے اقتباسات ان کو نقل کرنے کو دیے۔ جب انہوں نے نقل شدہ اقتباسات بابائے اردو کو پیش کیے تو انہوں نے کہا۔ ''حیرت ہے کہ تم نے اس دکنی زبان کے مسودے کو بالکل صحیح پڑھ لیا اور اتنی جلدی کام کر ڈالا؟''

''میں پنجابی ہوں، اس لیے پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ پنجابی اور دکنی زبان میں بہت مشابہت ہے۔ چنانچہ پنجابی جاننے والوں کے لیے دکنی پڑھنا آسان ہے۔'' مشفق نے جواب دیا اب بابائے اردو کو کیا معلوم کہ مشفق خواجہ جواب گڑھنے میں ماہر ہیں۔ ایسا نپا تلا جواب دیتے ہیں کہ لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی مطمئن ہو کر اثبات میں سر ہلانے لگے۔

انہوں نے بابائے اردو کی ادبی قابلیت سے گونا گوں فائدہ اٹھایا۔ ان کی علم سیکھنے کی لگن اور شوق دیکھ کر بابائے اردو نے انہیں ماہنامہ ''قومی زبان'' کا مدیر مقرر کر دیا۔ یہاں ان کی کارکردگی قابل ستائش رہی تو کچھ عرصے بعد بابائے اردو نے شعبہ تحقیق و اشاعت بھی ان کے سپرد کر دیا۔ یہ ذمے داریاں اس جیسے نوجوان کے لیے باعث فخر تھیں جس کی عمر ابھی بائیس برس تھی۔ (بابائے اردو نے بار بار ان کی صلاحیتوں کا تحریری طور اعتراف کیا ہے۔) کچھ عرصے بعد انہیں سہ ماہی ''اردو'' کی ادارت بھی دے دی گئی۔ بابائے اردو ان سے بہت متاثر تھے، لہٰذا انہیں ''قاموس الکتب'' کا مدیر بھی مقرر کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد انہیں باقاعدہ انجمن کے علمی شعبے میں شامل کر لیا گیا، جو معمولی بات نہیں تھی۔ اس لیے کہ بابائے اردو مشکل ہی سے کسی کے کام سے مطمئن ہوتے تھے۔ مشفق ان کے پیمانے پر پورے اترے تھے۔

مشفق خواجہ بھی بابائے اردو سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔ ''جب میجر آفتاب کے ساتھ تنازعے کے نتیجے میں انجمن کی لائبریری بند کر دی گئی تو بابائے اردو اپنے کمرے میں بیٹھ کر کام کرنے لگے۔ انہوں نے مجھے بھی کام پر لگا دیا۔ ان کے پاس ''لغت کبیر'' کا مسودہ ہوتا اور میرے ہاتھ میں پرچیاں، جن پر اسناد مکمل ہوتی تھیں۔ میں سند پڑھتا اور مولوی صاحب اسے متعلقہ جگہ پر درج کر دیتے۔ یہ کام بعض اوقات تین چار گھنٹے تک جاری رہتا۔ میں تھک جاتا، لیکن مولوی صاحب نہیں تھکتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک نوّے سال کا بوڑھا ایک ایسی کتاب پر کام کر رہا ہے، جس کو اپنی زندگی میں مکمل کرنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں۔ یقیناً یہ ان کی اعلا ظرفی تھی کہ جس شجر سایہ دار کو وہ پروان چڑھا رہے ہیں وہ ان

کو نہیں بلکہ بعد دوسروں کو فیض پہنچائے گا۔‘‘

مشفق خواجہ نے ساڑھے چار برس 57 تا 1961ء مولوی عبدالحق کی رہنمائی میں ادبی کام کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ اس کے بعد انہوں نے انجمن کی ملازمت چھوڑ دی۔ ان کے پاس اپنے ڈھیروں منصوبے تھے جن پر وہ اپنے انداز سے کام کرنا چاہتے تھے۔

وہ انجمن میں فیصلے سوچ سمجھ کر کرتے تھے اور لگی لپٹی رکھے بغیر رائے دیتے تھے۔ میٹنگوں میں شریک ہوتے تھے تو ان کی رائے مصلحتوں کا شکار نہیں ہوتی تھی۔ انجمن کے سارے کاموں پر گہری نظر رکھتے تھے، جب کسی مسئلے پر رائے دیتے تھے تو ہر پہلو پر غور کر کے دیتے تھے۔ اس لیے کہ انہیں انجمن کا مفاد عزیز تھا، لہٰذا ایسے اقدامات کے خلاف ڈٹ کر کھڑے ہو جاتے تھے جو انجمن کے مفاد میں نہ ہوں۔

ایک بار نورالحسن جعفری جو ان دنوں انجمن کے صدر تھے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا کہ کتب خانے میں انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور لاطینی میں جو کتابیں ہیں انہیں کسی اور کتب خانے کو دے دیا جائے، تاکہ اردو کتابوں کے لیے زیادہ سے زیادہ جگہ نکل سکے۔

انہیں لاکھ سمجھایا گیا کہ یہ سب کتابیں اردو زبان کی ابتدا، لسانی نظریات، تاریخ اور تاریخ اسلام کے مستند حوالوں کی بنیادی کتابیں ہیں، چنانچہ انہیں انجمن کے شیلفوں میں ہی رہنا چاہیے۔ ان پر کوئی اثر ہی نہ ہوا تو مشفق کو اس سے آگاہ کیا گیا۔ انہوں نے برہمی کا اظہار کیا اور نور الحسن سے کہا۔ ’’بابائے اردو نے جو حوالہ جاتی کتب اپنی ساری عمر صرف کر کے جمع کی ہیں کیا آپ چاہتے ہیں کہ وہ برباد ہو جائے۔‘‘

ان کے کہنے پر نورالحسن اس خیال پر عمل کرنے سے باز رہے اور غیر ملکی نادر کتابوں کا ذخیرہ محفوظ رہا۔ اس طرح کے واقعات تقریباً ہر ماہ ہی پیش آتے تھے اور مشفق خواجہ کی دانش مندی سے صورت حال بگڑنے سے بچ جاتی تھی۔

انجمن سے علیحدہ ہو کر مشفق نے تالیفی اور تخلیقی کام شروع کر دیا۔ دو سو قلمی نسخوں کی وضاحتی فہرست انہوں نے ’’جائزہ مخطوطات اردو‘‘ مرتب کی۔ پھر نہ جانے کہاں سے انہوں نے منشی احمد دین کی کتاب ’’اقبال‘‘ ڈھونڈ نکالی اور اسے مرتب کیا۔ اس کتاب کا قصہ بھی عجیب تھا۔ اس کا پہلا ایڈیشن 1923ء میں اقبال کی زندگی میں شائع ہوا تھا۔ اس میں زیادہ تر ’’بانگ درا‘‘ کا کلام تھا۔ علامہ اقبال نے احمد دین

ایک بار ایک خاتون نے مشفق خواجہ سے رابطہ کیا تاکہ ان کے پاس محفوظ قدیم کتابیں اچھے داموں فروخت کرا دیں۔ مشفق کو ان کی کتابوں کا پتا تھا کہ یہ ساری کتابیں پرانی ضرور ہیں، لیکن کتب خانوں میں دستیاب ہیں۔ جب کہ خاتون کے ذہن میں یہ بات جمی ہوئی تھی کہ ان کی کتابیں نادر و نایاب ہیں اور دنیا کے کسی گوشے میں نہیں ملیں گی۔ مشفق نے ان کی مجموعی قیمت پوچھی تو خاتون نے بہت زیادہ قیمت بتائی تو مشفق نے کہا۔ ’’محترمہ اس قیمت میں کتابیں تو کیا کتابوں کے ساتھ ان کے مصنفین کو بھی کوئی نہیں خریدے گا۔‘‘

☆☆☆

مشفق اپنے سے چھوٹوں کی علمی ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ ان کی خوب حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ انہیں ہمیشہ نصیحت کرتے تھے کہ شہرت و ناموری کے پیچھے نہ بھاگیں۔ بلکہ اپنے کام پر زیادہ توجہ دیں۔ اس ضمن میں ایک صاحب کو اس طرح سے نصیحت کی۔ ’’نام میں کیا رکھا ہے۔ اصل اہمیت کام کی ہے۔ آپ جتنی بھی محنت کر لیں، شیطان سے زیادہ نام نہیں کما سکتے۔ لیکن یہ بھی پیش نظر رہے کہ اس کا کام کیا ہے۔‘‘

☆☆☆

ایک ادیب محمود احمد عباسی کی عادت تھی کہ دوسروں سے مستعار لی ہوئی کتابیں واپس نہیں کرتے تھے۔ انجمن سے بھی کئی کتابیں لے چکے تھے اور واپس نہیں کی تھیں۔ بابائے اردو کہہ کہہ کر تھک گئے تھے۔ پھر انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ ایک محفل میں محمود احمد عباسی نے حاضرین سے پوچھا۔ ’’کیا کسی نے بابائے اردو کو خواب میں دیکھا ہے؟‘‘

☆☆☆

مشفق فوراً بول اٹھے۔ ’’میں نے دیکھا ہے۔‘‘

عباسی نے اشتیاق سے پوچھا۔ ’’وہ کس حال میں تھے اور کیا کہہ رہے تھے؟‘‘

مشفق نے جواب دیا۔ ’’بابائے اردو کہہ رہے تھے مجھے قبر میں اس وقت تک چین نہیں آئے گا جب تک عباسی، انجمن کی ساری کتابیں واپس نہیں کر دے گا۔‘‘

اس پر محفل میں موجود سب افراد ہنسنے لگے اور پھر عباسی صاحب کو ساری کتابیں واپس کرنا پڑیں۔

سے کہا۔ ''بانگ درا'' چھپ کر آنے والا ہے۔ اگر یہ کتاب پہلے آگئی تو لوگوں کو ناگوار ہوگا اور ''بانگ درا'' کی فروخت پر اثر پڑے گا۔'' چنانچہ احمد دین نے اپنی کتاب مارکیٹ میں نہیں آنے دی۔

مشفق خواجہ نے غالب اور صفیر بلگرامی کے تعلقات پر ایک کتاب مرتب کی۔ تحقیقی مضامین کا مجموعہ ''تحقیق نامہ'' کے نام سے شائع کیا۔ کلیات یگانہ کی تدوین کی۔ اس تدوین میں انہوں نے نو برس صرف کیے۔ نہ جانے کہاں کہاں سے یگانہ کے بارے میں مضامین اور کتابیں ڈھونڈیں۔ وفات سے پیشتر ان کا کارنامہ ''کلیات یگانہ'' کی تدوین ہے۔ جو ایک کارنامے سے کم نہیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا مرحلہ مطبوعہ کلام کو حاصل کرنے کا تھا، جو گزشتہ پچاس برس سے نایاب تھے۔ پھر نشتر یاس (لکھنؤ 1914) آیات وجدانی (لاہور 1927) اور گنجینہ (لاہور 1948) میں بہت سا کلام مشترک تھا۔ اسے الگ کرنا، قابل اعتراض باتوں کو نکال کر ان مجموعوں کی شناخت کو قائم رکھنا ایک کارنامہ تھا۔ اس کے علاوہ رسالوں سے... وہ بھی نایاب اور کمیاب رسالوں سے یگانہ کا وہ کلام جو ان کے کسی مجموعے میں نہیں آسکا تھا۔ انہیں حاصل کرنا اور ان سے استفادہ کرنا ان پر تحقیقی کام کرنا آسان نہ تھا۔ اس سے پیشتر کسی نے ایسی تحقیق کا ڈول نہیں ڈالا تھا۔ وہ تحقیق کے شناور تھے۔ اپنے کام میں لگے رہے۔

جب یہ سب مرحلے طے ہو چکے تو مشفق خواجہ اس فکر و تردد میں رہنے لگے کہ یگانہ کی بیاض کہاں ہے۔ اسے ڈھونڈی جائے۔

تلاش شروع ہوئی تو بیاضیں ایک ایک کر کے ملتی چلی گئیں۔ ان بیاضوں پر انہوں نے عرق ریزی کی تو وقت بھی کروٹیں بدلتا رہا اور دس برس گزر گئے۔ اگر مشفق سہل پسند ہوتے تو ان کے پاس یگانہ کے ہاتھ کا لکھا ان کے کلام کا آخری مسودہ تھا وہ صرف اس کی تدوین کر دیتے تو بھی ایک مستند چیز سامنے آجاتی، لیکن انہوں نے مختلف زمانوں کے مسودوں کا جائزہ لیا تب کلیات یگانہ آب و تاب سے سامنے آئی۔

انہیں تلاش و جستجو میں کمال حاصل تھا۔ وہ برصغیر کے مختلف کتب خانوں کے قلمی نسخوں سے پوری طرح واقف تھے۔ کون سا نسخہ کہاں؟ کب کا مرقومہ ہے؟ کس حالت میں ہے؟ یہ سب انہیں معلوم رہتا تھا۔ حقیقت ہے کہ وہ ادیب سے زیادہ کھوجی تھے۔ انہیں ہر وقت کسی نہ کسی کتاب کی تلاش رہتی تھی۔

مشفق کو کتابیں خریدنے، پڑھنے اور دوستوں کو تحفے میں دینے کا بھی شوق تھا۔ یہ شوق جنون کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ کسی نے ان کے لیے ایک اچھا جملہ کہا تھا کہ اگر دنیا میں کہیں کوئی اردو کی کوئی کتاب چھپتی ہے اور چاہے اس کے پانچ ہی نسخے چھپے ہوں، تو ایک نسخہ مشفق کے پاس ضرور ہوتا ہے۔ اور وہ اس کا مطالعہ بھی کر کے اپنی یادداشت میں محفوظ کر چکے ہوتے ہیں۔

شمس فاروقی ... بتاتے ہیں کہ ایک واقعہ کا تو میں خود شاہد ہوں۔ میرے والد مرحوم نے اپنے حالات پر مشتمل ایک رسالہ لکھا جس کا نام ''قصص الجمیل فی سوانح الخلیل'' تھا۔ اسے میں نے والد کے انتقال کے بعد 1973ء میں محدود تعداد میں چھپوایا تھا۔ یہ کتاب مارکیٹ میں نہیں آئی تھی۔ صرف خاندان کے افراد میں تقسیم ہوئی تھی۔ مگر نہ جانے مشفق صاحب کو اس کی کیسے اطلاع ہوگئی اور انہوں نے ایک کتاب.... کہیں سے حاصل بھی کر لی۔

دوستوں کو نوازنا خوب جانتے تھے۔ کسی کو پریشان دیکھتے، اسے ملازمت کی تلاش ہوتی یا کوئی معاشی مصیبت سے دوچار ہوتا تو سب کام چھوڑ چھاڑ کر اس کی مدد کرتے۔ یقیناً ان کو دست غیب سے بہت کچھ ملا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں وظیفہ ملا کرتا تھا یا پھر کتابوں سے آمدنی ہوتی تھی۔ (ادیبوں کو کتابوں کی فروخت سے جتنی آمدنی ہوتی ہے اس سے آپ بخوبی واقف ہوں گے) کوئی کتاب جو پاکستان میں شائع ہوتی اسے اپنے ہندوستانی دوستوں اور ادبی حلقوں کو ضرور بھیجا کرتے تھے اور ڈاک خرچ اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان اور پاکستان میں ڈاک کی شرح ایک تھی، یعنی ہندوستانی شرح پر ڈاک پاکستان آجاتی اور پاکستان سے مقامی شرح پر ہندوستان چلی جاتی۔ لیکن پھر یہ شرح ہندوستان میں تو اپنی جگہ قائم رہی لیکن پاکستان میں بڑھ گئی۔ اس کے بعد پاکستان میں محکمہ ڈاک دستار کارپوریشن کی شکل اختیار کر گیا تو ڈاک کی شرح آسمان کو چھونے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان سے بذریعہ ڈاک کتابیں بھیجنا کم کر دی گئیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ سو روپے قیمت کی کتاب پر تین سو روپے ڈاک خرچ ادا کیا جائے؟ مگر مشفق پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا وہ پہلے کی سی رفتار سے کتابیں تحفے میں ہندوستان بھیجتے رہے۔ اس کے علاوہ اکثر انڈین احباب فرمائش بھیج دیتے کہ

فلاں کتاب کا فلاں مضمون چاہیے تو اس کی فوٹو اسٹیٹ کر کے اپنے خرچ پر بھیجا کرتے تھے۔

انہیں شہرت کی تمنا نہیں تھی اور نہ یہ لالچ کہ ان کی خدمات کا کوئی معاوضہ ملنا چاہیے۔ رائٹرز گلڈ کی جانب سے اُن کی ایک کتاب کو انعام دینے کا اعلان کیا گیا تو انہوں نے انعام لینے سے انکار کر دیا کہ میں صلہ یا انعام کے لیے کتابیں نہیں لکھتا۔ اس کے علاوہ جب گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی میں پڑھانے کے بعد ڈاکٹر سلیم اختر نے ایم فل کرنے کا ارادہ کیا اور تھیس لکھوانے کا پروگرام بنایا تو دوستی کی بنا پر انہیں خط لکھا کہ وہ ان پر تھیس لکھوانا چاہتے ہیں تو مشفق خواجہ نے انہیں سختی سے منع کیا کہ انہوں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا کہ ان پر تحقیقی تھیس لکھوایا جائے۔

جامعات سے وابستہ اساتذہ اس بات کو جانتے ہیں کہ ''زندہ شخصیات'' پر ایم فل کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے تحقیقی تھیس کے لیے جب موضوع کے انتخاب کے چناؤ کا مرحلہ آتا ہے، اس وقت کی ''زندہ شخصیات'' کیسے کیسے دباؤ سفارشوں سے خود پر تھیس لکھوانے کا اہتمام کرتی ہیں۔ یہ تو ایک طرف رہا، بعض ''زندہ شخصیات'' تو تحقیقی مقالہ یا تھیس طالب علموں کو خود لکھ کر دینے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ مشفق کے انکار کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ وہ ایک زندہ اور تابندہ شخصیت ہونے کے باوجود پس پردہ رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔

ایک اور دلچسپ بات ملاحظہ فرمائیے کہ خالد احمد نے ماہنامہ ''بیاض'' میں ان کا گوشہ شائع کرنے کی اجازت چاہی تو انہوں نے منع کر دیا۔ ادیب کو نادان بچوں کی طرح شہرت کی طرف نہیں لپکنا چاہیے، لیکن شہرت کی دیوی اگر خود چل کر ان کے قریب آ رہی ہے تو اسے قبول کرنے سے انکار بھی نہیں کرنا چاہیے۔

اپنی علمیت و قابلیت کے باوجود انہیں شہرت کی تمنا نہیں تھی۔ حد یہ ہے کہ وہ اپنا نام تک چھپوانا گوارا نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے کئی کتابیں ناشرین کو مرتب کر کے دیں اور وہ بغیر نام کے شائع ہوئیں۔ اگر کوئی ناشر ان کا نام دینے پر اصرار کرتا تو راضی نہ ہوتے۔ انجمن ترقی اردو کے مجلّے ''اردو'' اور شش ماہی مجلّے ''غالب'' کو وہ مرتب کرتے رہے، لیکن اپنے نام کے بجائے مرتبین کا نام دیتے رہے۔

مولانا حسرت موہانی کے تذکرہ الشعرا کو شفقت رضوی نے مرتب کیا تو اس کے مقدمے میں ان لوگوں کا شکریہ ادا کیا ان میں مشفق خواجہ کا نام بھی تھا۔ کتاب کی پروف ریڈنگ ہو گئی، لیکن کتاب کا پروف جب مشفق خواجہ کے پاس آیا تو انہوں نے اس میں ترمیم کر دی۔ جہاں ان کا نام تھا اسے انہوں نے کاٹ دیا تھا، اس لیے وہ جگہ خالی ہو گئی۔ اس پر شفقت ناراض ہوئے، لیکن مشفق خواجہ کا کہنا تھا کہ میں نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا کہ میرا بھی نام شائع ہو۔ میں نے محض تمہاری مدد کی تھی۔

☆......☆

وہ تخلیقی ادب سے پوری طرح واقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے 1980ء میں ''تخلیقی ادب'' کے دو شمارے شائع کیے۔ یہ شمارے کیا تھے دنیائے ادب میں ایک وقیع اضافہ تھے۔ ان پرچوں نے ادبی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ مشفق خواجہ کے تعلقات پاک و ہند کے تمام ادیبوں سے تھے۔ انہوں نے ان سے غیر طبع تحریریں حاصل کیں، جن میں افسانے، ناول، ڈرامے اور تنقید سب کچھ شامل تھا۔ معروف لکھنے والوں سے انہوں نے مقالات لکھوائے۔ ''تخلیقی ادب'' کا دوسرا شمارہ سنگ میل ثابت ہوا۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں ''اردو تنقید کے دس سال'' کے نام سے مقالہ شائع ہوا تھا جو ایک طرح سے تحسین فراقی کا ادبی تعارف بھی تھا۔ اس شمارے میں یگانہ پر بھی ایک گوشہ تھا، جو تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل تھا اور یگانہ کا مطالعہ کرنے اور سمجھنے والوں کے لیے ناگزیر۔ مشفق خواجہ نے تخلیقی ادب کے پانچ شمارے شائع کیے۔ یہ شمارے ان کے پانچ فرزند تھے جنہیں انہوں نے خونِ جگر پلایا تھا۔ اپنی پیشکش کے اعتبار سے وہ ایک مثالی پرچہ تھا، جو مشفق خواجہ کی علمی مصروفیات کے باعث بند ہو گیا جو وہ ادبی حلقوں میں ناقابل فراموش تھا۔

یقیناً پرچے کی فروخت سے بڑی آمدنی نہیں ہو سکتی لیکن اس کے باوجود مشفق خواجہ ادیبوں کو ان کی تحریروں کا معاوضہ دیتے تھے۔ چاہے تھوڑا سہی مگر دیتے ضرور تھے۔ ڈاکٹر طاہر مسعود کہتے ہیں کہ وہ حساب کتاب میں کچے تھے میری پہلی کتاب ''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے'' (جس کا عنوان انہوں نے خود تجویز کیا تھا) میں نے خود شائع کی تھی۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب نے مکتبۂ اسلوب کا ڈول ڈالا ہوا تھا۔ میری کتاب کی ترسیل اسی مکتبے سے ہوئی۔ کتاب جیسے جیسے بکتی جاتی تھی مکتبے کا کمیشن رکھ کر خواجہ صاحب مجھے چیک کاٹ کر دے دیا کرتے تھے۔ اس معاملے میں مجھے کچھ کہنے سننے یا تقاضا کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ کتاب

کا دوسرا ایڈیشن خواجہ صاحب نے خود شائع کیا۔ اس کا معاوضہ انہوں نے یوں ادا کیا کہ میرے کالموں کی کتاب ”برگردن راوی“ کی اشاعت کے سارے اخراجات خود برداشت کیے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خواجہ صاحب معاملات میں صاف تھے۔ اس میں کسی قسم کی بے ایمانی اور بدنیتی روا نہ رکھتے تھے جیسا کہ اکثر اشاعتی اداروں کے مالکوں کی ہوتی ہے۔

بہت سے لوگ پوچھتے تھے کہ خواجہ صاحب کا ذریعۂ روزگار کیا ہے؟ ملازمت وغیرہ تو کرتے نہیں، پھر ان کا خرچا کیسے چلتا ہے اور وہ اتنے شاہانہ انداز میں زندگی کیسے گزارتے ہیں؟ جو ادیب ان کے کالموں کے ڈسے ہوئے تھے انہوں نے یہ بھی مشہور کرنے کی کوشش کی کہ خواجہ صاحب سی آئی اے کے پے رول پر ہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ خواجہ صاحب اپنے مالی معاملات کو نہایت نظم وضبط اور منصوبہ بندی کے ساتھ چلاتے تھے۔ والد صاحب مرحوم خواجہ عبدالوحید سے ترکے میں کچھ رقم ملی تھی۔ اسے انہوں نے فکسڈ ڈیپازٹ کرا دیا تھا۔ پھر شیئرز کی خرید و فروخت میں بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ جب تک ”جسارت“ میں لکھتے رہے وہاں سے بھی معقول معاوضہ ملتا رہا۔ مکتبۂ اسلوب بھی ان کی آمدنی کا ذریعہ تھا۔ بیگم کالج میں لیکچرار تھیں۔ اولاد کوئی نہیں تھی۔ اس لیے گھریلو ذمے داریوں سے آزاد تھے اور اپنی ساری آمدنی سے سارے شوق پورے کرتے تھے۔ ان کا شوق ادب کے سوا تھا ہی کیا۔ ادب ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ وہ کل وقتی ادیب اور محقق تھے۔ انہیں کئی علمی اداروں کے اعلا منصب کی پیشکش ہوئی، لیکن انہوں نے ہمیشہ معذرت کر لی۔ وہ اپنی آزادی کو کسی قیمت پر قربان نہیں کرنا چاہتے تھے۔

وہ اپنی شہرت اور نام ونمود کے متمنی نہیں تھے۔ اس لیے رسالے میں اپنا نام غیر اہم جگہ پر شائع کرتے تھے۔ حد یہ ہے کہ یگانہ پر انہوں نے جو کتاب نو سال صرف کرنے کے بعد مرتب کی اس پر ان کا نام کسی نمایاں جگہ نہیں ملے گا، البتہ پرنٹ لائن کے صفحے پر کاتب کے نام کے ساتھ ان کا نام لکھا دکھائی دے گا۔ اپنے بارے میں انہوں نے کہا تھا کہ شاید آپ کو یقین نہ آئے کہ اپنے متعلق پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔ خلیق انجم نے جو کتاب میرے بارے میں دہلی سے شائع کی تھی، چھ سال ہو گئے مگر میں نے آج تک کھول کر نہیں دیکھی۔

وہ محسنوں کا احسان کبھی نہیں بھولتے تھے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے نام پر علی گڑھ یونی ورسٹی میں پاکستان مطبوعات کا شعبہ انہی کی ایما پر قائم ہوا۔ انجمن ترقی اردو، دہلی میں ایسا ہی شعبہ ابن انشا کے نام سے قائم کرایا۔ دوستوں اور رفیقوں کی کتابیں اپنے خرچ پر علی گڑھ یونی ورسٹی، رضا لائبریری رامپور، انجمن ترقی اردو ہند اور خدا بخش لائبریری پٹنہ کو بھجواتے تھے۔

جب کراچی سے لاہور جاتے تو اورینٹل کالج کے شعبۂ اردو بھی جاتے تھے۔ عام طور پر شعبے کے اساتذہ سے اور طالب علموں سے بھی ملاقات کرتے تھے۔ وہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے معنی خیز موضوعات سمجھاتے۔ انہوں نے اٹھارویں صدی کی اردو شاعری کی فرہنگ، شاہ حاتم اور ان کے معاصر، چھمی نرائن شفیق اور مخمور اکبر آبادی وغیرہ موضوعات پر پی ایچ ڈی کروائیں۔ ”انیسویں صدی کے اردو گلدستے“ کا موضوع بھی انہی کا تجویز کردہ تھا۔ جس پر رفاقت علی شاہد نے پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا۔

☆......☆

مشفق کہتے تھے۔ ”یونی ورسٹیوں نے تحقیق کے کام کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ یونی ورسٹیوں میں ڈگری کے لیے تحقیق کی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کا معیار پست ہوتا جا رہا ہے۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ برصغیر میں اب تک جتنے مقالوں پر پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دی گئی ہیں، ان میں سے ایک چوتھائی مقالے بھی شائع نہیں ہوئے۔ ان کے شائع نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ خود ممتحن حضرات نے ان کی اشاعت پر پابندی لگا دی کہ انہیں شائع نہ کیا جائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مقالے کی اشاعت ہی نہیں ہوئی تو ڈگری کیسے دے دی گئی؟ عجب چیستان ہے؟“

☆......☆

انٹر کی تعلیم کی نگرانی، نصاب کا تعین اور امتحانوں کا انعقاد یونی ورسٹی کی ذمے داری تھی۔ انٹر کا نصاب انجمن کا شائع کردہ تھا، جسے شجاع احمد زیبا نے مرتب کیا تھا۔ یہ ایک سیدھا سادا انتخاب تھا۔ جس کی اشاعت سے انجمن کو ہر سال کچھ نہ کچھ مالی آمدنی ہو جایا کرتی تھی۔ جب یونی ورسٹی میں شعبۂ اردو قائم ہو گیا اور شعبے کے صدر کا تقرر بھی ہو گیا تو انہوں نے انجمن کا انتخاب نصاب سے خارج کر دیا اور ان کا مرتبہ انتخاب پڑھایا جانے لگا۔ نئے انتخاب میں فرہنگ بھی تھی۔ مشفق خواجہ نے اسے موضوع بنایا۔

یہ فرہنگ عام درسی کتابوں کی طرح ناقص الفاظ سے پُر تھی۔ مشفق خواجہ نے عرق ریزی سے ”گر ہمیں مکتب، وہمیں

ملا'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا، جو اطہر صدیقی کے رسالے ''سات رنگ'' کے دو تین شماروں میں شائع ہوا۔ مشفق کا مضمون فرہنگ نگاری کی وسیع معلومات اور شگفتہ بیانی کا خوبصورت نمونہ تھا۔ اس مضمون کی بڑی دھوم مچی اور انہیں داد و تحسین ملی۔

ایک طرف تو انہیں داد ملی، لیکن شعبہ اردو اور یونی ورسٹی سے مشفق خواجہ کے تعلقات خراب ہوگئے اور کافی عرصے تک خراب ہی رہے۔ اردو کی نئی کتاب مرتب ہوگئی جو پہلی دونوں کتابوں کے مقابلے میں انتخابی عدم صلاحیت کا شکار تھی۔ بہرحال اس مضمون سے مشفق خواجہ کے نام کی دھاک بیٹھ گئی۔ وہ ادبی حلقوں میں روشناس ہوگئے۔

☆......☆

مشفق خواجہ کی شادی 1964ء میں آمنہ صدیقی سے ہوئی۔ شادی کے بعد ان کا نام آمنہ مشفق ہوگیا۔ وہ لکھنؤ کی رہنے والی تھیں۔ ان کے خاندان کے کچھ افراد اب بھی وہیں رہ رہے ہیں۔ وہ کراچی کے سرسید گرلز کالج میں اردو کی لیکچرار تھیں اور خود بھی ادیب تھیں۔ ان کی ایک کتاب ''افکار عبد الحق'' شادی سے پہلے شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ ہندوستان میں اس کے جعلی ایڈیشن شائع ہوئے۔

ان کے ایک قریبی دوست شادی کا قصہ یوں بیان کرتے ہیں۔ شادی کا شور اٹھا تو پتا چلا کہ کسی مہاجر لڑکی سے شادی کررہے ہیں جب کہ خود کشمیری پنجابی تھے۔ وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔ ''ہمارے صدر صاحب مہاجروں کو سمندر میں پھینکنے والے ہیں۔ چنانچہ ایک کو تو میں نے پناہ میں لے لیا ہے۔''

ان کی سالی کا کہنا ہے۔ ''رخصتی ہو رہی تھی تو ہم سب باجی کے لیے رونے لگے۔ انہیں نہ جانے کیا سوجھی کہ خود بھی بھوں بھوں کر کے رونے لگے۔ جیسے باجی کو نہیں، انہیں رخصت کیا جارہا ہو۔''

بیوی کا اعتراف ہے کہ نہایت فرماں بردار شوہر تھے۔ وہ لاہور میں پیدا ہوئے، لیکن طور طریق، رہن سہن اور خاص طور پر گفتگو کا انداز اور تلفظ لکھنؤ والوں کی طرح تھا۔ اقبال کو واقعی ''اقبال'' کہتے تھے۔ اور نہایت شستہ اور شفاف اردو بولتے تھے۔ جب اپنوں میں ہوتے تھے تو زبان کا ذائقہ بدلنے کے لیے پنجابی بھی بولتے تھے۔

دولہا بننے کے بعد ایک صاف ستھری اور شان دار تقریب ہوئی۔ گل رعنا کلب میں ولیمہ ہوا۔ کراچی کے تقریباً سب ہی اہل قلم وہاں موجود تھے۔ ولیمے میں ڈاکٹر احسن فاروقی نے پھلجھڑی چھوڑ دی۔ مشفق کو مبارک باد دینے کے بعد کہنے لگے۔ ''اب اردو آپ کی مادری زبان ہوگئی۔'' بڑے قہقہے لگے اور مشفق اپنا منہ رومال سے چھپائے بیٹھے رہے۔

احسن فاروقی نے ایک اور پھلجھڑی چھوڑ دی۔ ''ایک صاحب مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ انجمن میں تو ایک بابائے اردو ہوتے تھے، اب کرتا دھرتا مشفق خواجہ ہیں، انہیں کیا کہا جاتا ہے۔'' تو میں نے جواب دیا۔ ''یہ داماد اردو ہیں۔'' اس بات پر زبردست قہقہہ لگا اور لوگ دیر تک محظوظ ہوتے رہے۔

شادی کے بعد ہندوستان سے ایک ادیب ان سے ملاقات کرنے آئے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے کہا۔ ''مجھے آپ کی گفتگو سے قطعی اندازہ نہ ہوا کہ آپ پنجابی ہیں۔''

مشفق نے کہا۔ ''کچھ دیر تشریف رکھیے۔ آپ کو میری حرکتوں سے پتا چل جائے گا کہ میں پنجابی ہوں۔''

☆......☆

اختر انصاری اکبر آبادی کا انتقال 1985ء میں ہوا۔ دوستوں کو خبر دی گئی اور اخبارات میں خبر بھیجی گئی۔ پھر یہ طے ہوا کہ کچھ لوگ ان کی تدفین میں شریک ہونے کے لیے حیدر آباد جائیں۔ وہاں پہنچنے پر حیدر آباد کے ایک شاعر وسیم صابر نے انتظامات کی ساری ذمے داری اپنے سر لے لی۔ قبرستان سے واپس آکر مشفق کے علاوہ دوسرے لوگ وسیم کے ہاں بیٹھ گئے۔ مزاح نگار عطا الحق کے بڑے بھائی ضیاء الحق قاسمی جو وسیم کے پڑوس میں رہتے تھے اپنی مرتب کی ہوئی کتاب ''ضیاء حق'' سب لوگوں کو دینے آئے۔ اس کتاب میں صدر ضیاء الحق کی تعریف میں مختلف شعرا کی نظمیں اکٹھا کی گئی تھیں۔ انہوں نے سب سے پہلے کتاب مشفق کو پیش کی۔ مشفق نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا۔ ''معاف کیجیے، ہم سے ایک دن میں دو جنازے نہیں اٹھائے جائیں گے۔''

1990-91 کی بات ہے۔ شرف آباد کلب میں قائم بیدل لائبریری میں وہ پابندی سے شام کو آتے اور اپنی ٹیبل پر کتابوں کا ڈھیر لگا کر بیٹھ جاتے۔ لائبریری کے عقب میں ایک معروف ڈائجسٹ کا دفتر تھا۔ اتفاقاً ایک روز اس کے مدیر پرویز بلگرامی لائبریری آگئے۔ لائبریرین نے تعارف کرایا۔ ''خواجہ صاحب یہ پرویز بلگرامی ہیں۔''

''جی ہاں میں جانتا ہوں۔ یہ تو تو میں میں ہیں۔''

کہہ کر مشفق خواجہ نے سر جھکا لیا۔ پرویز بلگرامی کا رنگ فق کہ انہوں نے یہ کیا کہہ دیا۔ تبھی خواجہ صاحب نے سر اٹھایا اور کہا۔ ''ان کے لکھے شعرا کی حالات زندگی میں پڑھتا رہتا ہوں۔ یہ

تو تو سے شروع کرتے ہیں اور میں میں تک کہانی کو پہنچا دیتے ہیں۔ ویسے لکھتے اچھا ہیں۔"

اب جا کر پرویز بلگرامی کے چہرے پر ہنسی آئی اور وہ بولے۔"آپ جیسے نقاد بھی میری تحریر پڑھتے ہیں تو میں فخر محسوس کر رہا ہوں۔"

"نقاد، کون نقاد؟" مشفق خواجہ نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔"میں اپنی بات کر رہا ہوں۔"

"میں آپ ہی کی بات کر رہا ہوں۔"

"لیکن آپ نے نقاد کہا۔ میں تو نقاد نہیں، بس لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

یہ تھی مشفق خواجہ کی کسر نفسی۔

حس مزاح ان میں بہت تھی۔ کسی لڑکی نے رات بارہ بجے فون کیا اور اظہار محبت شروع کر دیا۔ ان کی اہلیہ قریب ہی کھڑی تھیں، انہوں نے مسکرا کر ریسیور انہیں دے دیا۔ تھوڑی دیر بعد ان سے ریسیور لے لیا اور لڑکی سے پوچھا۔"آپ کس سے باتیں کر رہی تھیں؟"

اس نے کہا۔"آپ سے۔"

ہنس کر کہنے لگے۔"آپ کو غلط فہمی ہوئی وہ میری بیوی تھیں۔"

جواب میں فون پٹخنے کی آواز آئی۔

اسی طرح ایک صاحبہ نے بڑی عاجزی، انکسار اور محبت کے ساتھ کہا میں فلاں فلاں ہوں اور آپ کو عرصے سے پڑھ رہی ہوں۔ آپ سے سچ مچ ایک طرح کی محبت اور یگانگت ہوگئی ہے۔ مشفق نے کہا۔"محترمہ! میں آپ کے والد کے برابر ہوں۔"

دوسری طرف سے آواز آئی۔"چل جھوٹے کہیں کے۔"

مشفق جس کمرے میں بیٹھ کر لکھتے تھے اس کے سامنے زینہ تھا۔ زینے کے اوپر دروازے پر ایک تختی لگی تھی جس پر درج تھا۔"برائے مہربانی بغیر اطلاع کے زحمت نہ فرمائیں۔"

اتفاق سے ایک صاحبہ زینے چڑھ کر اوپر آگئیں۔ دستک دے دی۔ ان کے پیچھے مشفق کی اہلیہ آمنہ بھی آگئیں۔ ان صاحبہ نے خواجہ صاحب کو دروازے پر آیا دیکھ کر کہا۔"معاف کیجیے گا میں نے تختی نہیں دیکھی تھی۔"

مشفق کہنے لگے۔"یہ تختی میں نے آپ کے لیے نہیں بلکہ اپنی بیوی کے لیے لگائی ہے۔" وہ کھسیا کر رہ گئیں۔

☆......☆

ڈاکٹر عائشہ عثمان کہتی ہیں۔ ان کے گھر کے باہر ایک بورڈ آویزاں تھا جس پر لکھا تھا۔"کاشانۂ رحمت" مجھے کئی بار ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ ان کے گھر کا زینہ بہت دشوار تھا۔ بالکل اوپر اٹھا ہوا۔ ایک بار احمد فراز کے ساتھ ان کے گھر گئی تو فراز سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولے۔"یہ کاشانۂ رحمت کیسے ہوگیا، یہاں تو کاشانۂ زحمت لکھا ہونا چاہیے تھا۔"

☆......☆

طاہر مسعود کہتے ہیں۔"مشفق نے میری شادی سے کچھ دن پہلے بتایا کہ میری بیگم، ہمانے کہلوایا ہے کہ آپ طاہر کو بتا دیجیے کہ میں چشمہ لگاتی ہوں۔" اتنا کہنے کے بعد مشفق صاحب رکے اور اپنے مخصوص انداز میں کہا۔"فکر مند نہ ہوں، آپ کی ہونے والی بیگم تو صرف چشمہ لگاتی ہیں، میری بیگم تو شادی سے پہلے دوربین لگاتی تھیں۔"

☆......☆

ایک صاحبہ جو تھوڑا بہت نام رکھتی تھیں۔ ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھیں۔ مشفق میز پر بیٹھے کام کر رہے تھے۔ کالج سے کسی سلسلے میں ان کی بیوی آمنہ گھر آگئیں۔ وہ خاتون آہٹ سنتے ہی گھبرا گئیں اور انہوں نے ڈرائنگ روم کا دروازہ بھیڑ دیا۔ مشفق خواجہ نے بیوی سے کہا کہ ڈرائنگ روم میں جاؤ اور ان سے ملاقات کرو۔

بیوی نے جواب دیا کہ خوا مخواہ پریشان ہوجائے گی۔ میں تو ایک کتاب لینے کے لیے کالج سے آئی تھی۔

وہ صاحبہ یہ سن کر حیران ہوکر مشفق خواجہ کی طرف دیکھنے لگیں۔ مشفق خواجہ نے کہا کہ ہم دونوں محض میاں بیوی نہیں ہیں دوست بھی ہیں اور ایک دوسرے پر بھروسا کرتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ ہم سانس بھی لیں تو ایک دوسرے کو پتا چل جاتا ہے۔

کئی خواتین اپنی پی ایچ ڈی کی تھیسس کے لیے مشفق خواجہ کے پاس آتی تھیں۔ بہت سی اپنی شاعری کی درستگی کے لیے آتی تھیں اور وہ درست بھی کر دیا کرتے تھے۔ مشفق خواجہ بہت اسمارٹ، خوب صورت اور اچھی پرسنالٹی کے مالک تھے۔ پھر یہ کہ عالم بھی تھے، اس لیے لڑکیاں فطری طور پر ان سے متاثر ہوجایا کرتی تھیں۔ کسی کا فون آتا کسی لفظ کے معنی بتا دیجیے۔ وہ لغت دیکھے بغیر بتا دیتے تھے۔ ایک بار احمد علی اور ہاجرہ مسرور نے فون کیا کہ فلاں لفظ کے معنی بتا دیں، لغت میں نہیں ہے۔ انہوں نے اس کے بھی معنی بتا دیے۔

ان کے بارے میں مشہور تھا کہ یوں ہی کسی شعر کے بارے میں پوچھ لیجیے کہ ''شاہنامہ فردوسی'' میں ہے یا نہیں۔ مشفق اس کے بارے میں فوراً بتا دیتے تھے اور اگر شاہنامہ فردوسی میں نہیں ہے تو پھر کس مثنوی میں ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ صرف حافظ قرآن نہیں، حافظ اشعار فارسی بھی ہیں۔ برج اور راجھستانی بولیوں پر بھی ان کی خاص نظر تھی۔

ادبی معاملات میں مشفق کی رائے زیادہ تر وہی تھی جو انہوں نے اپنے زمانے کے اردو اساتذہ سے حاصل کی تھی۔ وہ ذہین تھے اور اپنی رائے دینے میں آزاد، لیکن اس کے باوجود وہ بزرگوں کی رائے پر چلنا پسند کرتے تھے۔ جدید شعرا میں ن۔ م راشد کے بارے میں ان کی رائے بہت اچھی نہیں تھی۔ راشد کے بعد کے شعرا کو وہ یاوہ گو سمجھتے تھے۔ انہیں میر سے زیادہ غالب پسند تھے۔ یگانہ کو وہ بہت بڑا شاعر نہیں سمجھتے تھے، لیکن کہتے تھے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

☆......☆

ان کے معمولات کچھ یوں تھے کہ صبح دیر سے ہوتی تھی، لیکن دس یا ساڑھے دس بجے تک ناشتا کر کے کام کرنے بیٹھ جاتے۔ جس کرسی پر بیٹھ کر وہ لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے، اس کے دائیں جانب رکھی لوہے کی الماری میں والدہ مرحومہ کے کپڑوں کا ایک جوڑا رکھا تھا۔ جسے دیکھ کر اور چھو کر وہ کام کا آغاز کرتے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ قیلولہ کرتے پھر تازہ دم ہوکر اپنے تحقیقی کاموں میں مصروف ہوجاتے۔ رات ساڑھے دس بجے وہ کھانا کھاتے۔ اس کے بعد نیند آنے تک تازہ آنے والی کتابیں اور خطوط کا مطالعہ کرتے۔ عام طور پر رات ایک یا دو بجے سو جایا کرتے تھے۔

اتوار کو دن کے گیارہ بجے ان کے دوست احباب گھر میں جمع ہوجاتے جو بیک وقت ان کی رہائش گاہ، کتب خانہ اور دارالمطالعہ تھا۔ دو ڈھائی بجے دوپہر میں یہ محفل ختم ہوتی۔ صرف ان لوگوں کو روکتے جو دوسرے شہروں سے مہمان کے طور پر آتے تھے۔ اس کے بعد انہیں اپنی پرانی سفید رنگ کی سوزوکی کار میں پینتھر ریستوران میں جاتے اور عمدہ کھانا کھلاتے۔ خود بھی نفیس پرہیزی کھانا کھاتے۔ بل آتا تو چشمہ بدل کر اسے غور سے دیکھتے۔ حساب کتاب میں گڑبڑ ہوتی تو ویٹر سے باز پرس کرتے۔

وہ فیاض تھے، لیکن روپے پیسے کے معاملے میں غیر معتدل مزاج نہیں تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کہاں خرچ کرنا ہے اور کہاں نہیں۔ کوئی بڑا ادیب آتا تو اسے سی دیوا اپارٹمنٹ میں مدعو کرتے جہاں ان کی بڑی ہمشیرہ رہتی تھیں۔ ان دعوتوں میں ان کے ہاتھ میں ایک کیمرا ہوتا جس سے وہ مہمانوں کی تصویریں اتارتے رہتے۔ لیکن کسی کو اپنی تصویر مشکل ہی سے کھینچنے دیتے تھے۔

ان کا معمول تھا کہ چھ دن خوب جٹ کر کام کرتے لیکن اتوار کا دن تفریح کے لیے وقف تھا۔ اس دن شام کو کلفٹن چلے جاتے اور مشتاق احمد یوسفی سے ملاقات کرتے۔ پھر چند بے تکلف دوستوں کے ساتھ ساحل پر ہلا گلا کرتے۔ دن کا قیمتی حصہ وہ کام کرتے ہوئے گزارتے۔ سوائے مخصوص اوقات کے وہ ٹیلی فون بھی خود نہ سنتے بلکہ ان کے واقف کار ناصر جاوید یا عمران جو انہی کے پاس رہتے تھے، ان میں سے کوئی فون سنتا اور اگر مشفق اسے پسند کرتے تو بات کرتے ورنہ ہدایت دیتے کہ ان سے کہہ دو کہ رات ساڑھے دس بجے کے بعد فون کریں۔ جس نوعیت کا وہ کام کرتے تھے وہ بدنظمی یا سارا دن فون سننے سے ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

☆......☆

ان کے مالی حالات اچھے نہیں کہے جاسکتے تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے 1973ء میں انجمن سے علیحدگی اختیار کرلی اور ادبی منصوبوں پر کام کرنے کے لیے غور و فکر کرنے لگے۔ وہ ایک طرح سے گوشہ نشین ہوگئے تھے، جس سے ان کی صحت پر خراب اثر پڑا۔ انہوں نے اپنے پاؤں میں قناعت کی مہندی لگا کر اور اپنے جسم و جاں کو تنہائی کی زنجیروں میں جکڑ دیا تھا:

پہلے ہی تازہ ہوا آتی تھی کم، اس پر ستم
گھر کی دیواروں کو ہم نے اور اونچا کر لیا

مشفق خواجہ نے کہا اگر وہ دولت کمانے یا سرکاری ملازمت کے چکر میں پڑ جاتے تو جو کام انہوں نے کیا ہے خاص کر تحقیق کے میدان میں، وہ رہ جاتا۔ وہ نہایت شریف النفس اور خوددار فرد تھے۔ انہوں نے بتایا کہ کیسے کیسے خوشامدی اور موقع پرست شاعر اور ادیب گریڈ 22،21 کی اسامیوں کے حصول میں کامیاب ہوتے رہے اور بعض تو بقول ان کے ہر دور میں ارباب حل و عقد کے قرب کی خاطر اپنا ضمیر فروش کرتے رہے اور اب بھی کر رہے ہیں۔

مشفق کہتے ہیں کہ اس ضمن میں ایک واقعہ سناتا ہوں: ''جب ایوب خان نے دستور نافذ کیا تو اس کی تائید میں

ادیبوں کی خدمات حاصل کیں۔ ہر ادیب نے بڑھ چڑھ کر اپنی قیمت لگائی اور حکومت کے مطلوبہ مقاصد کے لیے کام کیا۔ بہت کم ایسے ادیب تھے جنہوں نے اس معاملے سے خود کو دور رکھا۔ جب مضامین اخبارات میں شائع ہونے لگے تو ایوب خان نے ان ادیبوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ایوان صدر میں چائے کی دعوت کی۔ ابن انشا نے کہا۔ ''آؤ تمہیں ایک تماشا دکھاتے ہیں۔'' میں ان کے ساتھ ہولیا۔ وہ مجھے ایوان صدر لے گئے۔ وہاں میں نے تقریباً سب ہی مشہور و معروف ادیبوں کو دیکھا۔ اخبارات کے ایڈیٹرز بھی تھے۔ ایک بڑے اخبار کے ایڈیٹر نے ایوب خان کے نزدیک جا کر کہا۔ ''حضور! آپ نے مارشل لاء ہٹا لیا۔ حالانکہ ابھی اس ملک کو دس برس مارشل لا کی اور ضرورت ہے۔''

ایوب خان نے جواب دیا۔ ''آپ یہ بات اپنے کل کے اخبار میں شائع کر دیجیے۔ میں دوبارہ مارشل لا نافذ کر دوں گا۔''

اس سے آپ اندازہ لگالیں کہ ہمارے ادیبوں اور دانشوروں کا کیا کردار رہا ہے۔ اسی طرح ایک اشتراکی ادیب ایک مشہور امریکی ادیب فرینکلین کے لیے بھاری معاوضے پر تراجم کرتے رہے اور ان کتابوں پر دوسروں کے نام چھپتے رہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے ہاں ایسے ادیب کم ہیں جو حکومت کی غلط کاریوں پر اسے ٹوک سکیں۔

☆......☆

انجمن میں کام کرنے کے دوران مسلسل کرسی پر بیٹھنے کی وجہ سے انہیں ذیابیطس ہوگئی۔ انہوں نے مٹھاس کھانا چھوڑ دی۔ مٹھاس نہ کھانے کی تلافی وہ اس طرح سے کرتے کہ اگر کھانے میں رائتہ ہوتا تو اسے ایک گلاس میں بھرتے اور آہستہ آہستہ پینے لگتے۔ ان کی بیگم آمنہ بھی یہی کرتی تھیں۔ بیگم آمنہ کہتی ہیں۔ ''روزانہ کا معمول تھا کہ صحن میں آکر نصف گھنٹا ٹہلتے پھر ڈرائنگ روم میں جا کر کچھ دیر کے لیے لیٹ جاتے پھر اپنی کام کرنے کی میز پر بیٹھ جاتے اور سگریٹ سلگا لیتے۔ وہ چین اسموکر تھے اور سگریٹ سے سگریٹ جلاتے تھے۔ اعتراض کرو تو کہتے یہ تو بچت کے لیے کرتا ہوں۔ ماچس کی بچت ہو جاتی ہے۔ سگریٹ اتنی زیادہ پیتے تھے، لیکن جب ہارٹ اٹیک ہوا تو سگریٹ چھوڑ دی۔ یہ بھی کمال کی بات ہے کہ سگریٹ مسلسل پینے والا اسے ایک دم سے چھوڑ دے۔ اس سے یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ وہ جس کام کو کرنے کے بارے میں سوچ لیتے تھے، کر گزرتے تھے۔ چاہے انہیں کسی بھی تکلیف سے دوچار ہونا پڑے۔ البتہ چائے پینے کی عادت انہوں نے نہ چھوڑی۔ چائے کے مگ کا سائز بہت بڑا ہوتا تھا۔ جب چائے ختم ہو جاتی تو فوراً اپنے ملازم کو آواز دیتے، وہ حاضر ہوتا اور میز پر دوسرا مگ رکھ کر چلا جاتا۔''

وہ ذیابیطس کے مریض تھے اور انہیں اپنے مرض کے بارے میں بے پناہ معلومات حاصل تھیں۔ ڈاکٹر جو دوائیں تجویز کرتے اس پر وہ مکمل تحقیق کرتے یا اپنے بھتیجے ڈاکٹر خسرو سے انٹرنیٹ پر کراتے۔ کھانے پر کسی کے ہاں جاتے تو صرف دال، مچھلی یا کوئی سبزی کھانا پسند کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں سیخ کباب بہت پسند تھے۔ انہیں آس پاس کے سارے ریستورانوں کے بارے میں معلوم تھا کہ کہاں کون سی چیز اچھی ملتی ہے۔ کپڑوں کے معاملے میں زیادہ کروفر کے قائل نہ تھے، سفاری سوٹ پہننا پسند تھا۔

چونکہ ذیابیطس کے مریض تھے، چنانچہ میٹھے سے پرہیز کرتے تھے۔ اس کے باوجود شوگر بڑھ رہی تھی۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ انسولین لگائیں، لیکن اس مشورے پر عمل نہیں کیا۔ اس لیے ستمبر 1997ء میں مرض بہت بڑھ گیا۔ (شوگر زور دکھاتی ہے تو جسم میں کہیں نہ کہیں پھوڑا نکل آتا ہے۔) ان کی ران میں ایک پھوڑا نکل آیا۔ ایک ہفتے کے لیے اسپتال جانا پڑا۔ عمل جراحی سے گزرے اور شفایاب ہوگئے۔ اسپتال سے فارغ کر دیے گئے، لہٰذا گھر آگئے۔ کام کرنا کم کر دیا اور آرام کرنا زیادہ۔ مگر مرض نے پھر پریشان کرنا شروع کر دیا۔ 11 نومبر 2003ء میں حملۂ قلب ہوا۔ جناح اسپتال میں داخل کر دیے گئے۔ بروقت طبی امداد مل گئی۔ کافی دنوں تک علاج ہوتا رہا۔ نئی زندگی مل گئی۔ مگر پھر جانبر نہ ہو سکے۔ دو سال دو ماہ مزید زندہ رہے اور دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ آخر عمر میں اپنے حالات سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ دوستوں کو لکھے جانے والے خطوط میں اپنے دولت کدہ کو ''ظلمت کدہ'' یا ''کلبۂ احزاں'' کہا کرتے تھے۔ شاعری میں تو اس کا اظہار پہلے بھی کیا تھا۔

بجھے ہوئے در و دیوار دیکھنے والو
اسے بھی دیکھو جو ایک عمر یاں گزار گیا

میز پر سارا دن بلکہ رات گیارہ بجے تک بیٹھے لکھتے اور پڑھتے رہنا ان کا معمول تھا۔ میز کے نیچے ایک پٹرا اور کشن رکھا رہتا۔ مسلسل بیٹھنے کی وجہ سے ان کے پاؤں سوج جاتے۔ کسی نے کہا۔ آپ کے پاؤں سوجے رہتے ہیں۔ جواب

دیا۔ ”سوجے نہیں ہیں بلکہ مسلسل میز پر بیٹھنے کی وجہ سے ایسے ہو جاتے ہیں۔“

☆......☆

بزلہ سنجی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ محفلوں کی جان ہوا کرتے تھے۔ لطیفے پر لطیفے، قہقہوں پر قہقہہ۔ ایک محفل میں کافی دیر سے ایک صاحب اپنے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ گفتگو کے دوران انہیں اپنا بچپن یاد آ گیا۔ فرمانے لگے ہمارے بچپن کا زمانہ بہت سستا تھا۔ دایہ بچہ جنوا کر گڑ اور آٹھ آنے لے کر خوش ہو جایا کرتی تھی۔ مشفق ان کی باتیں پچھلی صف میں بیٹھے سن رہے تھے۔ یہ جملہ سنتے ہی ان صاحب سے مخاطب ہوئے۔ ”اور آٹھ آنے میں بچے بھی آپ جیسے پیدا ہوتے تھے۔“

1965ء کی جنگ میں مشفق خواجہ کے جوہر اور کھلے۔

اس جنگ میں ہر پاکستانی اپنی استطاعت کے مطابق شریک تھا۔ شاعروں نے قومی نغمات لکھ لکھ کر ڈھیر لگا دیے تھے۔ مشفق خواجہ نے بھی کالموں کا ایک سلسلہ ”سنا آپ نے؟“ کے عنوان سے ریڈیو کے لیے لکھنا شروع کیا۔ تیز و تند اور کاٹ دار جملے تھے اس کے۔ سب نے پسند کیا۔ یہ ان کے ادبی کالموں کا ابتدائی روپ تھا۔ جنگ ختم ہوئی تو ان کا کالم آنا بھی بند ہو گیا۔ اصل میں یہ کام بدر عالم کے دباؤ ڈالنے پر انہوں نے کیا تھا، جو ان کے دوست اور ہم جماعت تھے، ان دنوں ریڈیو سے وابستہ تھے۔ مشفق نے ان کے زور ڈالنے پر کچھ اور پروگرام لکھ ڈالے لیکن وہ ریڈیو کے آدمی نہیں تھے، لہٰذا انہوں نے یہ مشغلہ ترک کر دیا۔

ریڈیو کے لیے انہوں نے پروگرام۔ ”دیکھتا چلا گیا، مسلمان سیاح“ اور سنا آپ نے“ لکھے۔ سارے پروگرام نشر ہوئے اور انہوں نے مقبولیت حاصل کی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ سارے فیچر وہ گھر بیٹھ کر لکھتے تھے کبھی ریڈیو اسٹیشن نہیں گئے۔ وہ فون کر دیتے تھے اور وہاں سے ایک آدمی آ کر لے جاتا تھا۔

ان کی شخصیت کا دل چسپ پہلو یہ ہے کہ وہ اسلام، پاکستان اور اقبال کے ساتھ ایک غیر متزلزل وابستگی رکھتے تھے اور یہ وابستگی انہیں اپنے والد خواجہ عبد الوحید سے ورثے میں ملی تھی۔ وہ اپنے مخصوص شگفتہ اسلوب میں اشتراکیت، اباحیت، الحاد اور آمریت پر تنقید کرتے۔ علمی و ادبی دنیا میں جعل سازی اور بناوٹی رویوں پر خوب خوب چوٹ کرتے۔

ٹریڈ مارک

رجسٹری شدہ الفاظ یا نشان جو بنانے والا اپنی مصنوعات کے لیے مقرر کرتا ہے۔ یہ نشان یا علامت ایک ہی قسم کی مختلف مصنوعات میں تمیز پیدا کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ رجسٹری کرا لینے سے نقل کا اندیشہ نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ ٹریڈ مارک مال کی تشہیر میں بھی مدد دیتا ہے۔ کارخانے کی شہرت کے ساتھ ساتھ یہ نشان مصنوعات کی عمدگی اور نفاست کا بھی ضامن ہوتا ہے اور اس طرح تجارتی شہرت کا ایک اہم جزو تصور کیا جاتا ہے۔ ٹریڈ مارک کے مالکانہ حقوق اس ادارے کو ملتے ہیں جو سب سے پہلے حکومت کے متعلقہ محکمے سے اس کی اجازت حاصل کر لے۔

ٹریڈ یونین

کسی صنعت کے مزدوروں کی انجمن جو ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے قائم کی جائے، اسے لیبر یونین بھی کہتے ہیں۔ اس کا مقصد مزدوروں کی اجرت بڑھوانا اور کام کے حالات درست کرنا ہے۔ یہ صحت، تعلیم، بیمے، اوقات کار، حالات کار اور دیگر سہولتوں اور مراعات کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ ٹریڈ یونین مختلف شکلوں میں قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ ازمنہ وسطیٰ کے گلڈ فی درحقیقت ٹریڈ یونین ہی تھے۔ شروع میں اس قسم کی مزدور انجمن کی رکنیت کو سیاسی طور پر بہت خطرناک سمجھا جاتا تھا اکثر عمر قید اور موت کی سزا دی جاتی تھی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں صنعتی انقلاب کے رونما ہونے کے بعد حالات بدل گئے اور ٹریڈ یونین نے رفتہ رفتہ صنعتی ممالک کی معاشی ترقی میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ پاکستان میں بھی مختلف ناموں کے ساتھ ٹریڈ یونین اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔

مرسلہ: احمد کمال، کمالیہ

☆......☆

پاکستان نے فن کالم نگاری میں بہت ترقی کی۔ دل چسپ بات یہ کہ مشفق خواجہ جو تحقیق اور جستجو کا انتہائی خشک کام کیا کرتے تھے، کالم بھی لکھنے لگے۔ ان کا شمار پاکستان کے دو تین بلند پایہ کالم نگاروں میں ہوتا ہے۔ ہندوستان میں وہ محقق کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، لیکن عام طور پر لوگ انہیں مزاحیہ کالم ہی سمجھتے ہیں۔ وہ پاکستان کے واحد کالم نگار تھے جن کے کالم ہندوستان میں شائع ہوتے تھے۔

ان کا کالم نگار بننا محض اتفاق تھا۔ وہ کتابوں پر تبصرے کرتے تھے۔ ان میں طنز و مزاح کی چاشنی ہوتی تھی۔ اردو ڈائجسٹ کے مدیر الطاف حسن قریشی نے ان تبصروں کو پڑھ کر اندازہ لگایا کہ ان میں ایک بہترین کالم نگار چھپا ہوا ہے۔ انہوں نے جب کراچی سے روزنامہ جسارت شائع کرنا شروع کیا تو ان سے کالم لکھنے کی فرمائش کی۔ مشفق خواجہ پہلے تو رضامند نہیں ہوئے، لیکن پھر قریشی صاحب کے اصرار پر انہوں نے لکھنا شروع کر دیا۔ یہ کالم بہت مقبول ہوا۔ ڈیڑھ دو برس تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ مصروفیات بڑھ جانے کی وجہ سے مشفق خواجہ نے کالم نگاری چھوڑ دی۔ جب صلاح الدین روزنامہ ''جسارت'' کے مدیر مقرر ہوئے تو انہوں نے اصرار کر کے ان سے کالم لکھوائے۔ اس بار روزانہ کے بجائے ہفتے میں تین دن، پھر دو دن اور بالآخر ہفتے میں ایک بار۔ صلاح الدین نے ہفت روزہ ''تکبیر'' شائع کرنا شروع کیا تو تکبیر کے لیے کالم لکھنے لگے۔ ان کی اس مشق سے لوگوں میں خوامخواہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ وہ جماعت اسلامی کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں اور ترقی پسندی کے خلاف ہیں، حالانکہ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

ان کا پہلا کالم ہفت روزہ ''زندگی'' میں 14 فروری 1971ء میں شائع ہوا۔ ان کے کالم کا عنوان ''ورق ناخواندہ'' تھا۔ اور یہ کالم وہ ''خامہ بگوش'' کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ آخری کالم 9 مئی 1971ء کو شائع ہوا تھا۔

ایک بار کسی نے سوال کیا کہ تحقیق، شاعری اور کالم نگاری یہ تینوں کام ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد ہیں۔ ایک ساتھ یہ تینوں کام آپ کیسے کر لیتے ہیں؟

جواب دیا۔ ''میں تحقیق کے ذریعے بزرگوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ شاعری کرتا ہوں، تاکہ خود اپنی ذات کو سمجھ سکوں۔ کالم نگاری اس لیے کرتا ہوں کہ اپنے عہد کے ادیبوں اور ان کی تخلیقات کی سچائیاں بیان کر سکوں۔''

انہوں نے اخبارات اور تکبیر کے لیے دو ہزار کالم لکھے۔ جو کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے۔

خامہ بگوش کے قلم سے۔ سخن ہائے گفتنی۔ سخن در سخن۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے قلمی نام کیوں اختیار کیا تھا؟ ان کا جواب یہ تھا۔ ''قلمی نام اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ طنز و مزاح کے کالموں میں بعض غلط چیزوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اصل نام سے لکھنے میں خرابی یہ ہے کہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ کیا لکھا ہے، بلکہ اس پر توجہ دیتے ہیں کہ کس نے کیا لکھا ہے۔ چونکہ میرے پیش نظر مقصد اہم تھا اس لیے میں نے فرضی نام اختیار کر لیا۔ اب یہ میری بد قسمتی ہے کہ کالموں کی اشاعت کے بعد لوگ اس تحقیق میں پڑ گئے کہ لکھنے والا کون ہے۔ اس اقتباس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قلمی نام سے لکھنے میں نہ صرف اظہار کی آزادی مل جاتی ہے، بلکہ لکھنے والے کے بارے میں تحیر بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جب تک نام پردہ راز میں رہتا ہے، قلمی نام سے لکھنے والا اپنے اہداف کے جوابی ردعمل سے جو شدید منفی بھی ہو سکتا ہے محفوظ رہتا ہے۔ چنانچہ وقفے وقفے سے میں نے کئی نام تبدیل کیے۔''

انہوں نے روزنامہ انجام کراچی میں تبصرے ''ابن مخطوط'' کے قلمی نام سے۔ روزنامہ صداقت کراچی میں ''ادبی اور سیاسی کالم'' ہفت روزہ زندگی لاہور میں ''میر جملہ'' کے نام سے اور روزنامہ جسارت کراچی میں سیاسی کالم ''غریب شہر'' اور ادبی کالم پہلے ''حاشیہ نگار'' اور پھر ''خامہ بگوش'' کے نام سے لکھا۔ مؤخر الذکر کالم کا نام ''سخن در سخن'' تھا جو روزنامہ جسارت میں شائع ہوئے۔

مشفق خواجہ اس صورت حال سے خوش نہیں تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اتنا تخلیقی کام کیا۔ ایک کتاب دس جلدوں میں لکھی، شعر کہے، تنقیدی مضامین لکھے کوئی ان کا ذکر نہیں کرتا۔ ہر جگہ فرضی نام سے لکھے ہوئے کالموں کا ذکر ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خامہ بگوش کے کالم کی صداقت کو قبول کرنے اور طنز و مزاح کا لطف اٹھانے کے لیے اعلیٰ ظرف وسیع النظری کی ضرورت تھی جو ادبی معاشرے میں کمیاب ہوتی جا رہی تھی، چنانچہ جب کوئی شخص ناراضی کا اظہار کرتا تو مشفق خواجہ اس سے معذرت کر لیتے۔ مثال کے طور پر احمد ندیم قاسمی نے ان کے کالموں پر سخت ری ایکشن کا اظہار کیا۔ مشفق خواجہ نے معافی مانگ لی۔ باقر مہدی اور مظہر امام سے معافی مانگنے

کی مثال دی جاسکتی ہے۔ جب کہ مشفق خواجہ کا یہ حال تھا کہ اپنے کتاب کے کالموں پر تبصرہ کراتے اور اسے ''کتاب نما'' دہلی میں شائع کراتے۔

☆......☆

خامہ بگوش کی تحریروں کی ایک صفت اختصار اور جامعیت ہے۔ وہ الفاظ کے استعمال میں فضول خرچی نہیں کرتے تھے۔ ایک ایک لفظ بہت سوچ سمجھ کر کرتے تھے۔ ان کے جملوں سے کوئی ایک لفظ حذف کرنا ممکن نہیں۔ وہ لفظ کی حرمت کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک لفظ متحرک اور جان دار ہوتے ہیں۔ ایک کالم میں وہ لکھتے ہیں۔ ''لفظ بھی انسانوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں، جیتے ہیں اور مرجاتے ہیں۔ انسانوں ہی کی طرح انہیں عزت ملتی ہے اور ذلت بھی۔ کبھی یہ معمولی حیثیت سے ترقی کرکے بلند رارج تک پہنچ جاتے ہیں اور کبھی بلند مدارج سے گر کر معمولی حیثیت اختیار کرجاتے ہیں۔''

کسے معلوم تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ جن کتابوں کا شائع ہونا نہ ہونا برابر ہے تو ان کا چرچا ہوگا اور جو کتابیں کسی نہ کسی اعتبار سے اہمیت رکھتی ہیں، ان کے نام سے بھی کسی کو واقفیت نہ ہوگی۔ ایسی ایسی کتابوں کی رونمائیاں ہوتی ہیں جو اگر کسی مہذب معاشرے میں شائع ہوں تو ان کے مصنف منہ چھپاتے پھریں۔ مگر اب زمانہ ایسا ہے کہ منہ چھپانے والے سر اٹھا کر چلتے ہیں کہ انہوں نے کتابیں شائع کرکے اپنا وقت اور پیسا ضائع کیا۔

واقعہ اور لطیفے کے ساتھ ساتھ خامہ بگوش کی تحریروں میں افسانوی عناصر کی نشاندہی بھی کی جاسکتی ہے۔ وہ موضوع کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے بعض اوقات ایک افسانوی ماحول اور فضا ترتیب دیتے ہیں لیکن اس عمل میں بھی اپنی روایتی زندہ دلی اور شگفتگی برقرار رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا ایک اقتباس ہے: ایک محفل میں فیض احمد فیض کے کمالات پر گفتگو ہورہی تھی۔ ہم بھی وہاں موجود تھے۔ ایک ضرورت سے زیادہ ترقی پسند نے فرمایا۔ ''فیض صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اردو زبان کو بہت سے ایسے اشعار دیے ہیں جو ضرب المثل بن گئے ہیں۔'' اس کے بعد انہوں نے دو اشعار سنائے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

......☆......

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تک بھی ستم کی سیاہ رات چلے

اہل محفل ان شعروں پر جھومنے لگے، مگر میرا سر گھومنے لگا۔ میں نے گزارش کی کہ یہ شعر فیض کے نہیں ہیں۔ اس پر نقاد موصوف نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تو کیا آپ کے ہیں؟'' دوسرے صاحب نے ان کی تائید کی کہ تمام سیاسی جلوسوں میں یہ شعر فیض کے نام سے پڑھے جاتے ہیں۔ تیسرے صاحب نے کہا۔ ''لوگ اب فیض کی مخالفت میں اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ ان کے شعروں کو بھی ان کے شعر ماننے کے لیے تیار نہیں۔''

اگرچہ میرا خاموش رہنا بہتر تھا، لیکن ہم نے ہمت سے کام لے کر عرض کیا۔ ''بلاشبہ فیض بڑے شاعر ہیں۔ لیکن ہر اچھا شعر تو ان کا نہیں ہوسکتا۔ دوسروں نے بھی اچھے اشعار کہے ہیں۔ جو شعر آپ نے سنائے ہیں وہ فیض کے نہیں مجروح سلطان پوری کے ہیں۔''

مزاحیہ کردار مزاح نگاری کا ایک خاص حربہ ہے۔ اکثر شگفتہ نگار تخلیق مزاح کے لیے کوئی نہ کوئی مزاحیہ کردار تخلیق کرتے ہیں۔ مشتاق یوسفی کا مرزا عبدالودود بیگ اور خالد اختر کا چچا عبدالباقی ایسے ہی مضحک کردار ہیں۔ خامہ بگوش نے بھی ایک ایسا ہی کردار تخلیق کر رکھا ہے جس کا نام لاغر مراد آبادی ہے۔ اس کے نام سے ظاہر ہے کہ وہ ایک ادبی کردار ہے۔ اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ان کے کالم ادبی نوعیت کے ہیں۔ ناقدین نے اگرچہ لاغر مراد آبادی کو چچا چھکن اور خوجی کے مماثل قرار دیا ہے۔ تاہم یہ کردار ذاتی خصوصیات کی بنا پر اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ لاغر مراد آبادی کسی احمق کردار کا نام نہیں وہ ایک بت طناز ہے۔ وہ ادبی معاشرے کی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں پر ایک سخت نقاد کی طرح تبصرہ کرتا ہے۔

لاغر صاحب کی طرف سے لکھتے ہیں۔ ''ایسی خبروں کا کیا فائدہ جس سے ادیبوں کی عزت میں کوئی اضافہ نہ ہو۔ پچھلے دنوں ایک شاعر کے بارے میں ایک خبر شائع ہوئی تھی کہ ایک جیب کترے نے ان کی جیب سے بیاض اڑالی اور پھر ڈاک سے واپس بھیج دی۔ بیاض کے ساتھ اس مضمون کا خط بھی تھا۔ ''میں نے اس بیاض کو بٹوا سمجھ کر نکالا تھا لیکن اسے تو کوئی کباڑی بھی خریدنے پر تیار نہیں۔''

اس خبر کی اشاعت سے مشہور شاعر کی جو رسوائی ہوئی اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔ اس قسم کی خبریں تو آپ نے دیکھی ہوں گی کہ فلاں شاعر کے ماموں زاد بھائی کے نواسے

کی سالگرہ پر تہنیتی مشاعرہ ہوا۔ جس میں نواسے نے بھی کلام سنایا۔

☆......☆

پچھلے دنوں ایک مشہور شاعر سے ہماری ملاقات ہوئی۔ ہم نے یوں ہی اخلاقاً ان سے پوچھ لیا۔ ''بہت دنوں سے آپ کی کوئی تخلیق نظروں سے نہیں گزری۔''

انہوں نے ہمیں یوں گھور کر دیکھا جیسے ہم نے کسی بد اخلاقی کا ارتکاب کیا ہو۔ پھر قدرے غصے سے فرمایا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ اخبارات، آپ کی نظروں سے نہیں گزرتے۔''

ہم خاموش رہے۔ انہوں نے ہماری خاموشی کو لاعلمی تصور کرتے ہوئے اس کے ازالے کے لیے فرمایا۔ ''اگر آپ اخبارات دیکھتے تو معلوم ہوتا کہ اس سال سب سے زیادہ تخلیقی کام میں نے کیا ہے۔ میرے سات انٹرویو چھپے ہیں، بائیس خبریں میرے حوالے سے چھپی ہیں اور بے شمار رپورٹوں میں میرا ذکر ہوا ہے۔''

اب ہمارا خاموش رہنا ممکن نہ تھا، عرض کیا۔ ''یہ تو سب ٹھیک ہے، لیکن یہ بتایئے کہ آپ کی کوئی نظم یا غزل شائع ہوئی یا نہیں؟''

انہوں نے فرمایا۔ ''نظم یا غزل کی اشاعت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اصل چیز یہ ہے کہ خود شاعر شائع ہو، سب سے بڑا تخلیقی کام یہی ہے۔'' بات سچی تھی اس لیے ہم نے بحث کو آگے نہ بڑھایا۔

خامہ بگوش کے اسلوب کی ایک انفرادیت جملہ سازی بھی ہے۔ وہ انتخاب الفاظ اور شوخی خیال سے ایسا جملہ ترتیب دیتے ہیں جو قاری کو ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے جملوں میں یاد رہ جانے والے عناصر شامل ہوتے ہیں اچھے اشعار کی طرح یہ بھی حافظے کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔

محققوں کو زندہ ادیبوں سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی، لیکن جونہی کوئی ادیب فوت ہوتا ہے اس کے حالات جمع کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک بار ہم نے ایک علامۂ تحقیق سے پوچھا۔ ''حضرت! آپ کسی زندہ ادیب پر تحقیق کیوں نہیں کرتے؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''زندہ ادیب پر تحقیق کی جائے تو ممکن ہے وہ ہمارے نتائج تحقیق کی تردید کر دے۔ مردہ ادیب دخل در معقولات کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔''

اس پر ہم نے عرض کیا۔ ''یہ تحقیق کیا ہوئی مُردوں پر مٹی ڈالنے کا کام ہوا۔''

انہوں نے فرمایا۔ ''جی ہاں۔ نقاد زندوں پر مٹی ڈالتے ہیں اور ہم مُردوں پر۔''

خامہ بگوش کے مزاحیہ اسلوب کی بنیاد شائستگی، شرافت اور وضعداری پر ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں دوسروں پر پھبتی کستے، فقرہ چست کرتے اور تمسخر اڑاتے تھے، مگر ان نازک لمحات میں بھی وہ بے ہودہ گوئی یا سوقیانہ پن سے گریز کرتے تھے۔ وہ اپنی متانت کو ہر قیمت پر برقرار رکھتے تھے۔ خامہ بگوش کے ہاں اخلاقی اقدار کی پاسداری پائی جاتی ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

''شاعروں کے لیے نثر لکھنا واقعی مشکل کام ہے۔ بس ایک غالب ہیں جو نظم و نثر دونوں پر قادر ہیں ورنہ باقی تو خدا جانے کیا لکھتے ہیں۔ علامہ اقبال کے خطوط پڑھ جایئے یقین ہی نہیں آتا کہ ''مسجد قرطبہ'' کا خالق ایسی روکھی پھیکی نثر بھی لکھ سکتا ہے۔ جوش صاحب کی شاعری میں جو الفاظ دل میں گھر کر لیتے ہیں ان کی نثر میں وہی الفاظ قاری کے سر سے پتھر کی طرح ٹکراتے ہیں۔ فیض صاحب کا ہر مصرع زبان زد خاص و عام ہے، لیکن نثر کا ایک جملہ بھی انہوں نے ایسا نہیں لکھا جو ان کے کسی خراب سے خراب شعر کی طرح یاد رہ جائے۔''

ایک ماہر طنز نگار کی حیثیت سے خامہ بگوش کا وار اکثر کاری ثابت ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا طنز، مزاح اور اصلاح کے امتزاج سے جنم لیتا تھا۔ خامہ بگوش کے طنز میں فکری اصلاح کا پہلو نمایاں تھا اور یہ مزاح سے بے نیاز بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے اوروں کی طرف پھول اور اس کے ساتھ خار جلال بھی پھینکتے تھے کہ ایک کامیاب کالم نگار کے گلشن کا کاروبار انہی کے دم سے چلتا ہے۔

اپنے ایک کالم میں انہوں نے کہا تھا کہ ڈاکٹر عالیہ امام کی کتاب کا نام اگرچہ ''شاخ ہری اور پیلے پھول'' ہے لیکن یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں کوئی ہری شاخ نظر نہیں آتی نہ کوئی پیلا پھول۔ اگر کچھ دکھائی دیتا ہے تو غیر متعلق باتوں کا جھنکاڑ۔ کہیں موسیقی کی تاریخ اس طرح بیان کی جا رہی ہے کہ اگر پڑھنے والے کو موسیقی سے دل چسپی ہو تو یہ دل چسپی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ کہیں اشتراکیت پر صفحے کے صفحے اس طرح سے سیاہ کیے گئے ہیں کہ سیاہ و سفید کا فرق مٹ گیا ہے۔

خامہ بگوش کا طنزیہ و مزاحیہ اسلوب تحریر کی سادگی، سلاست اور روانی پر مبنی تھا۔ یہ اسلوب بظاہر سادہ دکھائی دیتا تھا مگر اس میں کمال درجے کی پُرکاری پائی جاتی تھی۔ خامہ بگوش

سادہ زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے اور دشوار الفاظ استعمال نہیں کرتے تھے۔وہ صحیح اور معیاری زبان لکھتے ہیں اس معاملے میں وہ درست املا کا بھی خیال رکھتے ہیں۔لہٰذا ان کی زبان خالص اردو کی ترجمان قرار دی جاسکتی ہے۔

قمر علی عباسی کے سفر نامے ''برطانیہ چلیں'' اور ''نیل کے ساحل'' کا فلیپ مشفق خواجہ نے لکھا چنانچہ وہ خامہ بگوش کی زد میں یوں آتے ہیں:

''فلیپ پر ایک رائے مشفق خواجہ کی بھی ہے۔خدا جھوٹ نہ بلوائے تو پچھلے پانچ برسوں میں تقریباً پانچ درجن کتابوں پر موصوف کے فلیپ اور دیباچے نظر سے گزرے ہیں جن میں لفظوں کی مینا کاری یا بے سروپا مدح سرائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔فلیپ عموماً ان لوگوں کے لیے لکھوائے جاتے ہیں جن کے نام دیکھ کر لوگ کتابیں خرید لیتے ہیں۔مشفق خواجہ کے نام سے خود ان کی کتابیں نہیں بکتیں تو دوسروں کی کیا فروخت ہوں گی۔ایک کروڑ کی آبادی والے شہر میں ان کی کتاب ''تحقیق نامہ'' کے صرف سترہ نسخے فروخت ہوئے۔ہمیں حیرت ہے کہ اتنے نسخے بھی کیسے فروخت ہوگئے۔یقیناً موصوف نے خود ہی خرید لیے ہوں گے۔''

خامہ بگوش کی خوبی یہ تھی کہ وہ پامال لطائف سے گریز کرتے تھے۔وہ تازہ لطائف کو بروقت اور برمحل استعمال کرنے کے ہنر سے واقف تھے۔مثلاً شمس الرحمٰن فاروقی نے گوپی چند نارنگ سے مخاطب ہونے پر لکھا تھا: جب آپ کی کوئی اچھی تحریر دیکھتا ہوں تو رشک آتا ہے کہ کاش یہ میں نے لکھی ہوتی۔کبھی میری بھی کوئی ٹوٹی پھوٹی تحریر دیکھ کر آپ کا بھی دل للچاتا ہوگا۔اس موقع پر خامہ بگوش لطیفہ چست کرتے ہیں:

ایک بار حبیب جالب نے ناصر کاظمی سے کہا۔''جب کبھی آپ کی کوئی غزل کسی رسالے میں دیکھتا ہوں تو دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش یہ غزل میرے نام سے چھپی ہوتی۔ناصر کاظمی نے شکریہ ادا کیا۔کچھ دیر بعد جالب نے پوچھا۔میری غزل دیکھ کر آپ کا کیا ردِعمل ہوتا ہے؟ کاظمی نے کہا۔''خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ غزل آپ ہی کے نام سے چھپی۔''

ان کے چند جملے ملاحظہ فرمائیے:

☆بعض شاعروں کا کلام ان کے مجموعے کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتا ہے۔

☆ان کی آدھی زندگی مشاعرے پڑھنے میں اور آدھی کچھ نہ پڑھنے میں گزری۔

☆انشائیہ پڑھنے سے دنیا اور انشائیہ پر تنقید پڑھنے سے عاقبت خراب ہوتی ہے۔

☆بعض کتابیں پڑھنے سے ہماری شرح ناخواندگی میں اضافہ ہوتا ہے۔

☆آج کل کتاب کی قیمت مصنف کی قیمت سے بڑھ گئی ہے۔

جب ان کے کالموں کی کتاب شائع ہونے لگی تو انہوں نے لکھا۔''خود اپنی کتاب پر دیباچہ لکھنا بہت دشوار ہے۔کسی دوسرے کی کتاب پر لکھنے میں یہ آسانی ہوتی ہے کہ پڑھے بغیر اس میں وہ خوبیاں تلاش کرلی جاتی ہیں جو اس میں نہیں ہوتیں۔اپنی کتاب کی جھوٹی تعریف تو ایک طرف رہی سچی تعریف بھی نہیں کی جاسکتی۔کیونکہ اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ اسے بھی جھوٹ سمجھا جائے گا۔

مثال کے طور پر اگر ہم یہ عرض کریں کہ جو کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے ایک سنجیدہ کتاب ہے تو غیر سنجیدہ کتاب کسے کہا جائے گا۔خدا لگتی کہنے میں اگر کوئی امر مانع نہ ہو رہا ہو تو یہ فرمائیے کہ کیا یہ کتاب ویسی ہی نہیں ہے جیسی عام طور پر اردو میں تنقیدی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔فرق صرف یہ ہے کہ اردو کی تنقیدی کتابوں کے مصنفوں کے بارے میں یہ نہیں معلوم کہ وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ہم نے جو لکھا ہے وہ نہ صرف یہ کہ کسی غیر ملکی زبان سے ترجمہ نہیں۔دو اور دو چار کی طرح واضح ہے۔

ہمارے ہاں تنقید کم لکھی جاتی اور گھوڑوں پر داؤ زیادہ لگایا جاتا ہے۔گھوڑوں پر داؤ لگانے سے کبھی نفع ہوتا ہے اور کبھی نقصان۔مگر ہم جو لکھتے ہیں وہ سراسر خسارے کا سودا ہے۔اس لیے کہ لوگ عموماً ہم سے ناراض ہوجاتے ہیں۔جن کو موضوع بنا کر ہم اظہار خیال کی جرأت کرتے ہیں۔ہم نے جو کچھ لکھا ہے نیک نیتی سے لکھا ہے۔مگر آج کل لوگ نیت کو کہاں دیکھتے ہیں،صرف وہی دیکھتے ہیں جو کاغذ پر لکھا ہوتا ہے۔کیا زمانہ آگیا ہے کہ لکھنے والے کو غلط سمجھا جائے اور اس کی تحریر کو درست۔

بہر حال اب جبکہ کالموں کا انتخاب کتابی صورت میں ہو رہا ہے۔ہم یہ بات واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جن ادیبوں پر ہم نے لکھا ان سب کے لیے ہمارے دل میں احترام ہے اور محبت بھی۔چونکہ محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے اس لیے کتاب میں ایسی بھی باتیں آگئی ہیں جنہیں غالب کے لفظوں میں ''سخن گسترانہ'' کہا جاسکتا ہے۔اُمید ہے کہ

ہماری یہ سخن گستری آیندہ کے خوشگو ار تعلقات کی راہ میں رکاوٹ ثابت نہیں ہوگی۔

کالموں کا انتخاب شائع کرانے کا ہمارا کوئی ارادہ نہ تھا۔کیونکہ ہمارا خیال تھا کہ جس معاشرے میں سب ہی صاحب کتاب ہوں وہاں ایک آدھ کتاب خواں کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ کتابوں کی اشاعت بے جواز نہ ٹھہرے۔ہمارے پبلشر شاہد علی خاں کا خیال ہے کہ اگر ہمارے کالم کتابی صورت میں شائع نہیں ہوں گے تو ضائع ہوجائیں گے۔

خاں صاحب بڑے تجربے کار ناشر ہیں اور دوسروں سے زیادہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ بعض تحریریں کتابی صورت میں شائع ہونے ہی کی وجہ سے ضائع ہوجاتی ہیں۔ہم نے بہت سے ایسے شاعر دیکھے ہیں جو زندگی بھر مشاعرہ لوٹتے رہے اور جب ان کا دیوان شائع ہوا تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود لٹ گئے۔

کالم نگاری ہم بہت عرصے سے کر رہے ہیں۔خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہمارے کالموں کی مجموعی ضخامت ممتاز مفتی کے ناول ''علی پور کا ایلی'' سے کم نہ ہوگی۔اتنے بہت سے کالم پڑھ کر انتخاب کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔مشتاق احمد یوسفی نے لکھا ہے کہ حشر کے دن گناہ گار عورتوں کو یہ سزا ملے گی کہ انہیں صرف وہی کھانے کھلائے جائیں گے جو انہوں نے خود پکائے ہوں گے۔اسی طرح سے کسی لکھنے والے کو بڑی سے بڑی سزا یہ دی جاسکتی ہے کہ اسے وہی تحریریں پڑھوائی جائیں جو اس نے خود لکھی ہیں۔ہم اس سزا کو بھگتنے کے لیے خود کو آمادہ نہ کرسکے۔چنانچہ ہمارے رفیق کار مظفر علی سید نے ہماری مدد کی۔

مشہور صحافی طاہر مسعود نے ان سے سوال کیا۔''آپ کے ادبی کالموں میں مزاح کے مقابلے میں طنز کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔اس لیے آپ جن شخصیات اور کتابوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں ان کی جانب سے خفگی کا اظہار کیا جاتا ہے۔اس نوعیت کے تاثرات پر آپ کا کیا ردّعمل ہوتا ہے؟''

خواجہ نے جواب دیا۔''جن ادیبوں کے متعلق میں نے کالم لکھے،ان میں سے بعض بے حد حساس تھے۔ان کا خیال تھا کہ میں نے کسی خاص وجہ سے ان کے خلاف کالم لکھے ہیں۔حالانکہ میں نہ کسی کے خلاف کالم لکھتا ہوں اور نہ اس میں کوئی مصلحت کارفرما ہوتی ہے۔اگر کسی کتاب میں مجھے کوئی مضحکہ خیز بات نظر آتی ہے تو میں اس کی طرف اشارہ کردیتا ہوں۔اس کا ذاتیات سے کوئی تعلق نہیں۔اگر کسی غلط رجحان کی مذمت کرتا ہوں تو کیا برا کرتا ہوں؟

میں نے تقریبات رونمائی کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔کیونکہ میں اسے ادب اور ادیب کے لیے مضر سمجھتا ہوں۔اسی طرح سے میں نے اداروں مثلاً اکامی ادبیات کے خلاف لکھا۔میری رائے میں اس ادارے نے ادیبوں کی خدمت نہیں کی۔کیونکہ اس ادارے نے ادیبوں میں یہ خیال پیدا کیا کہ غیر ادبی ذرائع سے نام ونمود کس طرح پیدا کیا جائے۔میں نے ان سرکاری افسران کو نشانہ بنایا ہے جو اپنی شہرت کے لیے عہدے کا استعمال کرتے ہیں۔ایسا شخص جو 112 نقادوں کا صرف اپنے عہدے کی وجہ سے ممدوح بن جاتا ہے۔اسی شخص سے اس کا عہدہ چھین لیا جائے تو 112 نقاد تو ایک طرف رہے،اس کے پاس ایک نوحہ گر نہ ہو۔اگر میں نے اس شخص کو اس کی حقیقت بتائی تو کیا غلط کیا؟میں اپنے کالموں سے مطمئن ہوں۔اس لیے کہ میں نے کبھی بدنیتی سے نہیں لکھا ہے۔''

☆......☆

مشفق خواجہ کی ذاتی لائبریری میں چالیس ہزار کے لگ بھگ کتابیں ہیں۔ان میں سے کچھ کتابیں تو انہیں اپنے دادا اور والد مرحوم سے ورثے میں ملیں اور باقی انہوں نے خود جمع کی تھیں۔انہیں پرانے اور قیمتی سکے بھی جمع کرنے کا شوق تھا۔ان کے پاس بیس کلو سکے تھے۔ادبی رسائل کے بے شمار فائل ہیں۔ان کے پاس ایسی کتابیں تقریباً دو ہزار کے لگ بھگ تھیں جن پر مصنفین نے دستخط کرکے پیش کی تھیں۔مشفق کی لائبریری میں بڑی تعداد میں شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں تراشے بھی محفوظ ہیں۔ان تراشوں کا انڈیکس اس طرح سے انہوں نے بنایا تھا کہ ایک منٹ میں مطلوبہ تراشا مل جاتا تھا۔ان کے گھر میں گیارہ کمرے ہیں جس میں کتابیں رہتی ہیں۔جب کہ خود ان کے لیے ایک کمرا تھا۔اس لائبریری میں کتابیں ترتیب سے رکھنے کے لیے پانچ افراد مقرر تھے۔

کتابوں کے علاوہ ان کے پاس بہت سی نایاب چیزیں بھی تھیں۔انہوں نے ایک بار سلطان جمیل نسیم کو ایک بریف کیس دکھایا اور بتایا کہ اس کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ جب مولانا محمد علی جوہر پر مقدمہ چلا تھا تو وہ کراچی کے خالق دینا ہال میں اسی بریف کیس میں کچھ کاغذات لے کر آئے تھے۔

ان کا حافظہ کمپیوٹر کی طرح تھا۔خود انہیں مطلوبہ کتاب

تلاش کرنے میں قطعی وقت نہیں لگتا تھا۔بس ایک سیکنڈ کے لیے وہ اپنی پیشانی کو ہاتھ لگاتے پھر دوسرے ہی لمحے وہ اس کتاب تک پہنچ جاتے۔بلکہ وہ صفحہ بھی نکال لیتے جہاں ضروری حوالہ موجود ہوتا۔یوں محسوس ہوتا تھا کہ بے جان کتابیں ان کی خدمات میں سر بہ سجود، دست بستہ اور حکم کی بجا آوری کی منتظر کھڑی ہیں۔

ایک کمرے میں بیوی کے ساتھ رہتے تھے۔کوئی اولاد نہیں تھی، ان کی اولاد ان کی کتابیں تھیں۔وہ کہتے تھے کہ بچے کبھی خلف بھی نکلتے ہیں، لیکن کتابیں ناخلف نہیں ہوتیں۔

☆......☆

ان میں تنظیمی صلاحیتیں بہت تھیں۔ادارہ یادگار غالب' فیض احمد فیض اور مرزا ظفر الحسن کے تعاون واشتراک سے قائم ہوا۔مرزا نے اسے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔انہوں نے غالب لائبریری کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔معلوم نہیں کیسے اور کہاں کہاں سے انہوں نے کتابیں جمع کیں۔وہ جب یونی ورسٹی جاتے تو ڈاکٹر اسلم فرخی کے مکان پر رک جاتے۔اور وہاں طالب علم جتنی کتابیں جمع کر جاتے وہ گاڑی میں بھر لیتے۔ان کا یہ رویہ سب دوستوں کے ساتھ تھا۔اس رویے کے دو نتیجے نکلے۔ایک یہ کہ غالب لائبریری ایک محترم ادارہ بن گئی۔اور مرزا ظفر الحسن دل کے مریض ہوگئے۔لائبریری کے کاموں کو انہوں نے اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا، اس لیے ان کے دل پر دباؤ پڑنے لگا۔اور اسی میں انتقال کر گئے۔لیکن ان کی زندۂ جاوید غالب لائبریری اب بھی موجود ہے۔

غالب لائبریری کا عہد زریں وہ عرصہ تھا جب مشفق خواجہ یہاں اپنی شامیں گزارا کرتے تھے۔ان کا گھر لائبریری سے کوئی دو کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔وہ دن بھر اپنا کام کرنے کے بعد مغرب کے بعد پیدل چلتے ہوئے لائبریری آجاتے۔پیدل چلنا انہوں نے اپنے لیے لازم اس لیے کر لیا تھا کہ 1979ء میں انہیں پتا چل گیا تھا کہ انہیں ذیابیطس ہوگیا ہے۔چنانچہ وہ پیدل آتے اور پیدل ہی واپس جاتے۔راستے میں ان کی سسرال تھی، جہاں ان کی بیگم دن گزارنے آجاتی تھیں۔مشفق انہیں سسرال سے گھر لے جاتے چاہے انہیں کتنی ہی دیر ہو جاتی۔

مرزا صاحب کے بعد مشفق خواجہ نے ادارہ یادگار غالب اور غالب لائبریری کے کام کو سنبھالا۔انہوں نے کوئی عہدہ قبول نہیں کیا، بس کام کرتے رہے، خاموشی اور لگن کے ساتھ۔تحقیق کرنے والوں اور طلبہ کی رہنمائی کے لیے لائق افراد لائبریری میں رکھے۔مرزا صاحب کے دور میں اشاعتی پروگرام نہیں تھا، لیکن مشفق نے رسالہ "غالب" اور ادارے کی طرف سے علمی اور ادبی کتابیں شائع کرنا شروع کر دیں۔جس سے ادارہ فعال ہوگیا۔جو کتابیں ادارے سے شائع ہوئیں ان میں درج ذیل شامل ہیں:

جائزہ مخطوطات اردو۔فرمان سلیمانی۔کلیات پروانہ۔مثنوی لیلیٰ مجنوں۔کلیات ناسخ۔دیوان ہوس۔کلیات یگانہ۔

☆......☆

ابیات مشفق کا شعری مجموعہ ہے جس سے ان کا شعری ذوق جھلکتا ہے۔وہ 1978ء میں شائع ہوا جس میں 1952ء سے لے کر 1978ء تک کا کلام ہے۔ان کی بے نیازی کا عالم یہ تھا کہ اس کتاب پر کسی کو تقریظ نما مضمون لکھنے کی اجازت نہ دی۔جو مضامین نقادوں نے خود لکھے وہ شائع نہ ہونے دیے۔یہ مضامین ان کے کمرے میں ایک پلندے کی شکل میں پڑے رہتے تھے۔انہوں نے شاعری کے فن میں کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی۔وہ فطری شاعر تھے اور ان کا مطالعہ اور ذوق ہی ان کا رہنما تھا۔اس کے علاوہ انہوں نے اپنا کلام کسی کو اصلاح کے لیے نہیں دکھایا۔انہوں نے اپنا کلام کسی مشاعرے میں پیش نہیں کیا۔ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا۔"تحقیق نے ان کی شاعری کو دبا دیا ہے۔اگر محقق نہ ہوتے تو اردو کے اچھے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا۔"

ابیات کے بعد ان کی شاعری برائے بیت رہ گئی تھی۔نثر کی رعنائی اور تحقیق کی گتھیاں سلجھانے کے بعد انہوں نے شاعری کو پس پشت ڈال دیا۔وہ مشاعروں میں شریک ہونا تو دور کی بات ذاتی محفلوں میں بھی شعر نہیں سناتے تھے۔ایک بار البتہ انہیں شعر سناتے دیکھا گیا ہے۔وہ محفل جمیل جالبی کے گھر پر تھی۔جہاں کھانے کے بعد سب نے شعر سنائے تو انہوں نے بھی چند اشعار سنا ڈالے۔

ان کی جامع ادبی بصیرت کا اظہار بڑی حد تک ان کی شاعری میں بھی ہوا ہے۔معلوم نہیں کیوں مشفق خواجہ کو شاعر کی حیثیت سے وہ شہرت حاصل نہ ہوئی جس کے وہ مستحق ہوئے۔حقیقت یہ ہے کہ ان کی شاعری اس سے زیادہ درجے کی مستحق ہے جو انہیں دیا گیا۔یہ اہل نظر کا کام تھا کہ وہ ان کی شاعری کے یاد رہ جانے والے حصوں کی

جانب توجہ دلائیں۔
مشفق خواجہ کو میر و غالب سے ہمسری کا دعوا نہیں ہے، مگر ان کی شاعری ایسا آئینۂ جمال ہے کہ اس میں جمالیات تغزل کی رنگ آفرینی بھی ملتی ہے۔ان کے غزل کے مجموعے میں مختلف النوع کیفیات کی آمیزش ہے۔انہیں غزل کا ایک اچھا شاعر کہا جاسکتا ہے۔
مشفق خواجہ کی شاعری جو ان کی تخلیقی لہر کا حصہ ہے، روایات غزل جمالیات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔لیکن اسے ان کے تخلیقی کاموں اور ان کی شگفتہ نگاری سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا کہ ایک پر دوسرے کے اثرات مرتسم ہوئے ہیں۔اور اس میں فرد کی تنہائی کا دکھ شامل ہوگیا ہے۔ابیات کا آغاز اس خوب صورت شعر سے ہوا ہے۔

کمال بے ہنری بھی ہنر سے کم تو نہیں
مرا شمار کہیں ہو مجھے یہ غم تو نہیں

ابیات کے دیباچے کے طور پر وہ کہتے ہیں:

یہی غزل مری محرومیوں کا نوحۂ غم
یہی غزل ترا آئینۂ جمال بھی ہے
جو پاسکا نہ تجھے میں تو کھو دیا خود کو
یہ میرا عجز بھی ہے یہ مرا کمال بھی ہے

جہاں تک ان کی شاعری کے آئینۂ جمال ہونے کا تعلق ہے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

چشم خوباں کے اشاروں پہ تھا جینا مرنا
روز بنتے تھے بگڑتے تھے مقدر کیا کیا

جو مثل باد صبا پاس سے گزر جائے
کبھی ہمیں بھی وہ پہچان کے ٹھہر جائے

تو میرے دل میں مثل چمن مہکتا ہے
میں سانس لوں تری خوشبو بکھر بکھر جائے

صرف ایک ترے خیال کے آنے کی دیر تھی
رنگینیوں میں ڈوب گئی ساری کائنات

ہم نے دل و نظر کی حکایت کہی تو ہے
ہم پر بھی کوئی چشم عنایت رہی تو ہے

مجھ کو کھویا تو دل زار یہ نکتہ سمجھا
آئینہ بن کے ہر اک عکس کو اپنا سمجھا

مشفق خواجہ نے نہایت معروف اور کارآمد زندگی گزاری ہے لیکن بڑی حد تک وہ معاشرے سے دور رہے۔معاشرتی زندگی کے درمیان ان کے کلام اور ان کی شخصیت کے ایسے داخلی شواہد بھی ملتے ہیں کہ وہ خود کو انبوہ میں شامل نہیں کرتے بلکہ اس ہجوم سے الگ پاتے ہیں۔دراصل خارجی اور داخلی زندگی دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا شاید اسی لیے مشفق کی شخصیت میں انسانی ہمدردی اور ان کے شاعرانہ تخیل میں انسانی دردمندی کا احساس ملتا ہے۔
مشفق کی شاعری میں جو غم کی لہر ملتی ہے۔اس میں ذات کی نفی کے باوجود خودداری بھی شامل رہی ہے۔
مشفق کو اپنا شاعر ہونا انہیں اپنے مرتبے سے فروتر نظر آئے، لیکن شاعری ان کا ساتھ چھوڑنے کو تیار نہیں۔انہوں نے اصناف سخن میں صرف غزل سے سروکار رکھا ہے۔ابیات صرف غزلوں پر ہی مشتمل ہے۔ان کی غزل ان کے ذاتی تجربات کی روداد سناتی ہے۔ان تجربات کے دائرے میں ناکام محبت کے تجربے سے لے کر ایک خوب صورت زندگی کے خوابوں کی شکست و ریخت، اس شکست و ریخت پر دور و نزدیک کے لوگوں کی سفاکانہ بے حسی اور اس بے حسی کے ردِعمل کے طور پر شاعر کے وجود کو ہمیشہ کے لیے گھیر لینے والی تنہائی کا تجربہ شامل ہے۔یہ ساری سرگزشت مشفق نے ایسے لہجے میں سنائی ہے جو نیا ہوتے ہوئے بھی نامانوس نہیں۔سنجیدگی و متانت، دردمندی اس لہجے کے اجزائے ترکیبی ہیں جو دھیمی آواز پر سفر کرتے ہوئے مخاطب کو بھی اپنا شریکِ سفر بنا لیتے ہیں۔یہاں مشفق کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

نقش گزرے ہوئے لمحوں کے ہیں دل پر کیا کیا
مڑ کے دیکھوں تو نظر آتے ہیں منظر کیا کیا

......☆......

گزرتے وقت کی ہر چاپ سے میں ڈرتا ہوں
نہ جانے کون سا لمحہ اداس کر جائے

......☆......

تنہائی نے دیواروں پر وہ نقش گری کی
لگتا ہے کسی اور کا گھر،اب تو گھر اپنا

......☆......

فقیر گوشہ نشیں اپنی ذات میں گم ہے
اب ایک اور ہی عالم نظر میں رہتا ہے

......☆......

ہر راستے کی ہے ایک منزل
اور گمرہی بھی اک راستہ ہے

☆......

خود سے بھی توڑ چکا ہوں میں تعلق اپنا
اب مری راہ میں حائل کوئی دیوار نہیں

ابیات میں کچھ غزلیں ایسی بھی ہیں جنہیں غزل مسلسل کہا جاسکتا ہے۔ یہ غزل نہیں شاعر کی جذباتی اور ذہنی سرگزشت، اس کے ماضی و حال کی کیفیات اور آنے والے دنوں کے بارے میں اس کے اندیشہ ہائے گوناگوں کی طرف قدرے واضح اشارے کرتی ہے۔ ایسی دو غزلوں کے چند اشعار آپ بھی دیکھیں گے:

اب مشفق من اس حال میں تم کس طرح بسر فرماؤ گے
انجان بنے چپ بیٹھو گے اور جان کے دھوکے کھاؤ گے
تم اپنے گھر کے اندھیرے میں کیا دیکھتے ہو دیواروں کو
یہ شمع کی صورت جلنا کیا، آئے گی ہوا بجھ جاؤ گے
جن جھوٹے سچے خوابوں کی تعبیر غم تنہائی ہے
اب جھوٹے سچے خوابوں سے تم کب تک دل بہلاؤ گے
ان دیدہ و دل کی راہوں پر تم کس کی تلاش میں پھرتے ہو
جو کھونا تھا سو کھو بیٹھے، کیا ڈھونڈو گے کیا پاؤ گے
تم خلوت غم سے نکلو گے تو اس شہر میں ایسے لوگ بھی ہیں
اک بار جو ان کو دیکھو گے تو دیکھتے ہی رہ جاؤ گے

☆☆☆

کیوں خلوت غم میں رہتے ہو کیوں گوشہ نشیں بیکار ہوئے
آخر تمہیں صدمہ کیا پہنچا، کیا سوچ کے خود آزار ہوئے
کیوں راستہ چھوڑ کے چلتے ہو، کیوں لوگوں سے کتراتے ہو
کیوں چلتے پھرتے اپنے لیے تم آپ ہی اک دیوار ہوئے
کیا اٹھتے بیٹھتے سوچتے ہو، کیا لکھتے پڑھتے رہتے ہو
اس عمر میں یہ بے کیفی کیوں، کس واسطے نیک اطوار ہوئے
کیوں ایسے سفر پر نکلے ہو، منزل نہیں جس کی کوئی بھی
کیوں ایسی راہ پہ چلتے ہو، سائے بھی جہاں دیوار ہوئے
کیوں ترک علائق کو تم نے سمجھا ہے علاج غم آخر
دیکھو تو ولی صوفی بھی یہاں کس ٹھاٹ کے دنیا دار ہوئے
اس کوچے کی راہ تو سمجھاؤ جس کوچے میں جانا مشکل ہے
اس شخص کا نام تو بتلاؤ تم جس کے لیے بیمار ہوئے

☆......☆

اپنی عمر کے آخری دس یا بارہ برس انہوں نے ناگفتہ بہ حالت میں گزارے۔ بیشتر وقت انہوں نے گھر پر ہی گزارا۔ آخری بار جب انہوں نے خون تھوکا تو ایک ملازم لڑکے عرفان کے سوا ان کے نزدیک کوئی نہ تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی نے بارہا ان سے التجا کی کہ وہ ان کے فلیٹ میں منتقل ہوجائیں جو ان کی باجی کے فلیٹ کے اوپر تھا۔ یہ یقین دہانی بھی کردی کہ ابھی وہ امریکا جارہے ہیں، لیکن جب واپس آئیں گے تو اپنے لیے کوئی اور بندوبست کرلیں گے۔ یہ سن کر وہ خوش ہوئے مگر اپنے کتب خانے کی طرف سے پریشان تھے۔ لیکن وہ منتقل نہ ہوسکا۔ چنانچہ وہ اسی پراگندہ ماحول میں گزر بسر کرتے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی جاں سے گزر گئے۔

ہر چند کہ مشفق اپنی ذہنی اور جسمانی پریشانیوں کے بوجھ تلے دبے رہتے تھے، لیکن انہوں نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ کوئی حرف شکایت زباں پر نہیں لائے۔ ان کے جو احباب ان سے بے حد قریب تھے وہ بھی اس حقیقت سے واقف نہیں تھے کہ ہر لحظہ ہنسنے ہنسانے والے شخص نے اپنی روح کے ساتھ کیسے کیسے روگ پال رکھے ہیں۔ وہ قناعت اور تقویٰ کے اس عہدے پر فائز تھے جو صرف اولیاؤں کے لیے مخصوص تھا۔ وہ ہر حال میں اللہ کا شکر بجالاتے۔ غالباً اسی لیے دوست

انسانی دل

دل ٹھیک سے کام نہیں کرتا، تو ہم خود اس کے ذمہ دار ہیں۔ بے تحاشا چکنائی کا استعمال، یہ چکنائی خون کی نالیوں میں جمع ہوتی رہتی ہے۔ بلڈ پریشر لاحق ہوجاتا ہے، خون میں چربی شامل ہونا شروع ہوجاتی ہے۔ موٹاپا ہوجاتا ہے۔ شوگر کا مرض لگ جاتا ہے۔ یہ بیماری انسانی صبر کے لیے دیمک ہے، اندر ہی اندر سارے نظام کو بڑی صفائی سے چاٹ جاتا ہے۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ اندر کیا ہورہا ہے۔ جب پتا چلتا ہے تو ہم بستر پر لیٹے ہوتے ہیں۔ چلیے اس خطرے سے نمٹنے کے لیے ہر صبح سیر کے لیے جائیں گے کم از کم ایک میل پیدل چلیں۔ سگریٹ چھوڑ دیں اگر چھوڑ دیں گے مر نہیں جائیں گے، نہیں چھوڑیں گے تو سسک سسک کر مریں گے۔ زندگی میں بہت عیاشی کرلی، اب ہم تمام بوڑھے اپنے لواحقین پر رحم کریں اپنے بچوں، پوتوں، نواسوں پر رحم کریں۔ زندہ رہ کر خوشیاں بانٹیں اور سمیٹو۔

نادان جوانی کو زمانہ گزر گیا
اب آ گیا بڑھاپا سدھر جانا چاہیے

عبدالعظیم صدیقی۔ کراچی

احباب انہیں ''کراچی کا قطب'' کہا کرتے تھے۔

تصویر کھینچنے کا بہت شوق تھا۔ ہر وقت دو کیمرے ان کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک سادہ تصویر کھینچنے اور دوسرا سادہ تصویروں کے لیے۔ برصغیر ہند و پاک کے تقریباً ہر شاعر اور ادیب کی تصویر ان کے پاس تھی۔ کہتے تھے کہ فیض احمد فیض کی تصویریں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔

مشفق خواجہ زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے مگر جو بھی بات کرتے نپی تلی کرتے۔ دو یا دو سے زیادہ افراد کے درمیان کوئی مسئلہ زیر بحث ہوتو خاموشی سے سنتے رہتے۔ جب احساس ہوتا کہ اب گفتگو سے مسئلہ حل ہوجائے گا تو ایسی کوئی بات کہہ دیتے کہ فریقین پھر سے بحث کرنے لگتے۔

وہ 1973ء میں انجمن سے علیحدہ تو ہوگئے تھے، لیکن انہوں نے بابائے اردو سے علیحدگی اختیار نہیں کی۔ اس لیے کہ انہیں دونوں سے عشق تھا۔ اس کے بعد ان کے عشق کا دائرہ جب وسیع ہوگیا تو اس میں غالب لائبریری بھی شامل ہوگئی۔ مرزا ظفر الحسن کے ساتھ جس کی بنیاد رکھنے کے بعد انہوں نے اس کی جڑیں مضبوط کرنے میں ساری تگ و دو صرف کر دی۔ حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے اپنی ذاتی زندگی کے مقاصد کے حصول کے لیے کوئی کام نہیں کیا۔

انہیں حکومت پاکستان نے 1994ء میں پرائڈ آف پرفارمنس سے نوازا۔ استغنا کا یہ عالم تھا کہ حکومت نے پرائڈ آف پرفارمنس کے لیے نامزد کیا تو کراچی میں ان کے اعزاز میں دوست احباب نے تقریب منعقد کی، لیکن مشفق خواجہ اس تقریب میں شریک نہ ہوئے۔

مرتے دم تک جن اداروں سے وہ وابستہ رہے وہ درج ذیل ہیں:

1۔ رکن گورننگ باڈی مقتدرہ قومی زبان۔ اسلام آباد
2۔ رکن گورننگ باڈی، اقبال اکیڈمی۔ اسلام آباد
3۔ رکن گورننگ باڈی مجلس ترقی ادب، لاہور
4۔ ممتحن برائے مقالات پی ایچ ڈی، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور
5۔ منصف اقبال ایوارڈ، حکومت پاکستان
6۔ رکن گورننگ باڈی، انجمن ترقی اردو، کراچی

ان مصروفیات کے علاوہ ساری دنیا کی ساری یونی ورسٹیوں سے گذشتہ پچیس اور تیس سال سے پی ایچ ڈی کرنے والوں نے مشفق سے رہنمائی حاصل کی تھی اور ان کے کتب خانے سے استفادہ کیا تھا۔ (وہ طالب علموں کو اس کے کہنے پر کتابوں اور مضامین کی فوٹو اسٹیٹ کاپی کرا کے بھیج دیتے تھے اور سلسلے میں جو خرچا آتا اسے خود ہی برداشت کر لیتے۔)

اس کے علاوہ وہ معذور اور مفلس ادیبوں اور شاعروں کی مدد کرتے۔ بلکہ مرحومین کے لواحقین کی مدد بھی کرتے۔ یہ سب کچھ وہ اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر کرتے۔ ان کے گھر میں زندگی کی وہ آسائشیں بھی موجود نہیں تھیں جو غربت اور مفلسی کی لکیر سے نیچے رہنے والوں کی ہوتی ہیں۔ انہیں اس کا افسوس ہی نہیں تھا اور وہ آسائشوں کے متمنی بھی نہیں تھے۔ جن اصحاب کی مدد وہ خود نہ کر پاتے تو اپنے مخیر دوستوں سے ذکر کر کے حاجت روائی کراتے۔ دل چسپ بات ہے کہ ایک ادارے نے مشفق کا دس ہزار روپے وظیفہ مقرر کیا ہوا تھا۔ ادارے کا ایک کارکن ہر چھ ماہ بعد رقم لاکر ان کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ اس کے جانے کے بعد وہ اپنی بنائی ہوئی فہرست نکالتے اور یہ روپیا مستحق دوستوں میں تقسیم کر دیتے، جو بچ رہتا اس سے کتابیں خرید لیتے۔ پھر ان کتابوں کو ہندوستان بھی بھیج دیتے۔ وہ اس عمل کو ثواب جاریہ سمجھتے تھے۔

مشتاق احمد یوسفی سے ان کا گہرا یارانہ تھا۔ ان کی غیر موجودگی میں بھی ان کا تذکرہ ادب سے کرتے۔ ان کے بارے میں مشفق خواجہ کا خیال تھا۔ ''یوسفی ایک بہت بڑے ادیب ہی نہیں، بڑے نیک انسان بھی ہیں۔ ایسے لوگ تو اب خال خال ہی نظر آتے ہیں۔''

مشفق خواجہ نے طالب علمی کے دور ہی میں شاعری کے ساتھ ترجمہ اور تصنیف و تالیف کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے روسو کی سوانح عمری کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کی نظر ثانی وہ نہ کر سکے تھے، لہٰذا وہ اشاعت کے مراحل نہ کر سکی۔ جب وہ کالج کے تیسرے سال میں تھے تو انہوں نے ''تاریخ فرشتہ'' کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔

☆......☆

مشفق کی موت کہاں اور کن حالات میں ہوئی، اس بارے میں ان کے خادم نے بتایا۔ ''19 فروری 2005ء کی رات نو بجے کے قریب انہیں دس پندرہ الٹیاں ہوئیں۔ اس وقت صرف میں ہی وہاں موجود تھا۔ انہوں نے مجھے سختی سے منع کر دیا کہ کسی کو نہ بتاؤں اور نہ ایمبولینس بلاؤں۔ دو الٹیاں انہیں خون کی بھی آئیں۔ رفع حاجت کے ساتھ خون بھی آیا۔ تقریباً دو گھنٹے بے ہوشی کے عالم میں ٹوائلٹ میں پڑے رہے۔

ان کی حالت دیکھ کر میں نے ایمبولینس منگوالی۔ سیڑھیاں بہت تنگ تھیں اس لیے اسٹریچر اوپر نہ جا سکا۔ میں

نے ایک پڑوسی کی مدد سے انہیں نیچے اتارا۔ نقاہت اتنی تھی کہ ان سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ ایک بجے کے قریب آغا خان اسپتال میں داخل کرایا گیا۔

ان کے چھوٹے بھائی صبح ساڑھے آٹھ بجے اسپتال پہنچے۔ صاحب (مشفق) نے ساری تفصیلات انہیں بتائیں اور کہا کہ گھبراہٹ اور بے چینی محسوس ہو رہی ہے۔ پھر بستر کو پکڑ کر اچھلے اور بے سدھ ہو کر پڑ گئے۔ اسی کشمکش میں وقت گزرا۔ دل کی دھڑکن بار بار بند ہو رہی تھی۔ ساڑھے نو بجے رات کو فرشتۂ اجل نے انہیں آلیا۔ نماز عصر کے بعد نماز جنازہ ادا کی گئی۔ اس کے بعد انہیں سوسائٹی کے قبرستان میں 21 فروری 2005ء کو 69 برس کی عمر میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ گزشتہ چند برسوں سے انہیں عارضۂ قلب کی شکایت تھی بالآخر گردوں نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

ان کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد تقریباً بارہ ہے:

خوش معرکہ زیبا۔ پرانے شاعر نیا کلام۔ ابیات (مجموعہ کلام) اقبال۔ تخلیقی ادب۔ جائزہ مخطوطات اردو۔ غالب اور صفیر بلگرامی۔ تحقیق نامہ۔ کلیات یگانہ۔ انتخاب کلام میر۔ انہوں نے دو درجن سے زیادہ تحقیقی مقالات لکھے اور ریڈیو پاکستان کے لیے پانچ سو کے قریب فیچر تحریر کیے۔ (جب وہ خوش معرکہ زیبا لکھ رہے تھے تو ان کے ایک بہت پڑھے لکھے دوست نے پوچھا۔ ''یہ تحقیق کرتے کرتے تمہیں کیا سوجھی کہ تم زیبا محمد علی پر کتاب لکھنے لگے؟'')

☆......☆

ان کی وفات کے بعد لائبریری، ریسرچ سینٹر میں تبدیل ہو چکی ہے۔ جہاں محقق حضرات اس سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ اس ریسرچ سینٹر کے ایگزیکٹیو ڈائرکٹر جناب ناصر جاوید ہیں جو مشفق خواجہ کے رفیق ہیں۔ مشفق تحقیق کرنے والوں پر مشفق تھے۔ انہوں نے جن چند حضرات کو بلا روک ٹوک اپنے کتب خانے سے استفادہ کرنے کی اجازت دے رکھی تھی ان میں مبین مرزا، رفیق احمد نقش اور ڈاکٹر رؤف پاریکھ شامل تھے۔

مشفق کی وفات کے بعد ان کا کتب خانہ ان کے اہل خانہ سے یونی ورسٹی آف شکاگو نے اردو ریسرچ لائبریری کنسورشیم کے لیے حاصل کر لیا۔ پاکستان کے ثقافتی اور ادبی ورثے کے تحفظ کے لیے یونی ورسٹی آف شکاگو کام کر رہی ہے اور اس نے مشفق خواجہ کے کتب خانے کو باقاعدہ قانونی طور پر حاصل کر کے اسے ''مشفق خواجہ کتب خانہ و مرکز تحقیق'' میں تبدیل کر دیا۔ چند برس پیشتر ایک ٹرسٹ تشکیل دیا گیا تاکہ اس مرکز تحقیق کی سرگرمیوں میں اضافہ کیا جا سکے۔ اس ٹرسٹ کے اراکین کے نام یہ ہیں:

ڈاکٹر منظور احمد۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ڈاکٹر کلیم اللہ لاشاری اور مشتاق احمد یوسفی۔

اس ٹرسٹ کی کاوش یہ ہے کہ پاکستانی ادب اور زبانوں سے متعلق جو نادر دستاویز اہل علم کے لیے معاون ثابت ہو سکتا ہے اس کو شناخت کیا جائے۔ اس کا اندراج کیا جائے اور اسے محفوظ کیا جائے۔ کتب خانے کی کتابوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کی مجموعی تعداد چالیس ہزار ہو چکی ہے۔ اس ذخیرے کی فہرست سازی اور اشاریہ سازی ہو رہی ہے۔ اس کتب خانے کی فہرستوں اور اشاریوں کا خاصا بڑا حصہ کمپیوٹر پر محفوظ کیا جا چکا ہے مشفق کو اپنے کتب خانے کی نادر کتابوں کے تحفظ کی ہر وقت فکر رہتی تھی۔ ان کی دیرینہ خواہش تھی کہ یہ کتب خانہ کراچی ہی میں رہے۔ اسے اقبال اکیڈمی، ادارہ تحقیق اسلامی اور نیشنل لائبریری کی طرح لاہور یا اسلام آباد نہ منتقل کر دیا جائے۔ اس حوالے سے انہوں نے ایک کالم میں لکھا:

''کراچی کی ہر اچھی چیز کو لاہور منتقل کر دینے کا کام عرصے سے جاری ہے۔ سب سے پہلے دارالحکومت پر ہاتھ صاف کیا گیا اور اسے اسلام آباد منتقل کر کے کراچی کی اہمیت کم کر دی گئی۔ پھر اقبال اکیڈمی کو کراچی بدر کر کے سپرد لاہور کر دیا گیا۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس شہر میں علامہ اقبال کا مزار پہلے سے موجود تھا۔ اقبال اکیڈمی کی وجہ سے ایک ہی شہر میں علامہ کے دو مزار بن گئے۔ یہی سلوک مقتدرہ قومی زبان کے ساتھ کیا گیا اور یہ ادارہ کراچی سے اسلام آباد پہنچا دیا گیا۔''

جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا

پاکستان کی 100 نامور شخصیات۔ سیارہ ڈائجسٹ، اگست 1998ء......متعلقات مشفق خواجہ۔ ساحر شیوی۔ صابر ارشاد عثمانی۔ سید معراج جامی......مشفق خواجہ نمبر۔ قومی زبان 2006ء...... پاکستانیکا۔ سید قاسم محمود......مشفق خواجہ۔ فن اور شخصیت۔ محمد اسلام نشتر......یہ صورت گر کچھ خوابوں کے۔ ڈاکٹر طاہر مسعود......مشفق خواجہ۔ ایک مطالعہ۔ ڈاکٹر خلیق انجم......مشفق خواجہ۔ ڈاکٹر سیّد نعمان الحق



فلم نگری

جینیس

انور فرہان

فلمی دنیا ایک ایسی دنیا ہے جس میں ٹیلنٹ ہی آگے بڑھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ وہ بھی جینیس تھا۔ اسے جب جب موقع ملا اس نے خود کو منوایا لیکن قسمت نے آگے بڑھا کر اپنا وار کیا اور وہ پھر سے پہلی سیڑھی پر آگیا۔ اس کی لکھی ہوئی فلموں نے کامیابی کے ریکارڈ قائم کیے لیکن اب وہ گمنامی کے اندھیرے میں ہے۔ نئی نسل تو اس کے نام سے بھی واقف نہیں۔

اپنے دور کے ایک کامیاب مصنف کی کہی ان کہی کی باتیں

رب رحیم و کریم کی بے پناہ نعمتوں میں ایک نعمت ذہانت و فطانت ہے۔ ایک صاحب کے بارے میں مشہور تھا۔ ''اللہ کا دیا ان کے پاس سب کچھ ہے سوائے.....''

''سوائے..... کس کے...؟''

''سوائے عقل و دانش..... فہم و فراست کے.....''

حقیقت یہ ہے کہ کچھ لوگ بہت لکھ پڑھ لیتے ہیں لیکن ان کا اپر چیمبر خالی رہتا ہے۔ بقول شاعر:

لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

ذہانت و فطانت کا ذکر اس لیے چھیڑا ہے کہ آج کی نشست میں ایک بے حد ذہین اور فطین شخص کے بارے میں آپ کی معلومات میں اضافے کا ارادہ ہے۔

جس کے بارے میں معلومات کے دریچے کھولنے والا ہوں، وہ ایک قلم کار ہے۔ ایک لیکھک ہے۔ ایک رائٹر ہے، جینیس رائٹر جس کا تعلق شوبز سے رہا ہے۔

پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آنے کا محاورہ لوگوں نے سنا تھا مگر نقی مصطفیٰ کے روپ میں جاگتی آنکھوں سے دیکھا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔ ''ابھی کھیلو۔ یہ لوجھنجھنا....'' کہنے کو جی چاہتا تھا۔ ابھی یونیورسٹی سے فارغ بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کی پہلی فلم بطور فلم رائٹر ''بندھن'' ریلیز ہوئی اور ہٹ ہوگئی۔ اس وقت وہ دبلا پتلا اور کمسن لڑکا نظر آتا تھا۔

''بندھن'' کے ہدایت کار نے ایک شخص سے اس کا تعارف کرایا۔

''یہ میری پہلی اردو فلم ''بندھن'' کا اسکرپٹ رائٹر ہے۔''

''کیوں مذاق کررہے ہیں قاضی صاحب.....؟''

''مذاق نہیں کررہا ہوں برادر!'' قاضی ظہیر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہی ینگ مین میری اس ہٹ اردو فلم کا رائٹر ہے۔''

قاضی صاحب برا مت ماننا۔ ''یہ تو ابھی صحیح طور پر ینگ بھی نظر نہیں آتے۔ اس عمر کے لڑکے فلموں میں کلیپ تو دے سکتے ہیں، آرٹسٹوں کو پانی تو پلا سکتے ہیں اور.....''

''اور فلموں کا کامیاب اسکرپٹ بھی لکھ سکتے ہیں۔'' قاضی ظہیر نے مسکراتے ہوئے جملہ پورا کیا۔

مخاطب کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے قاضی صاحب بولے۔ ''آپ کو اگر میں یہ بتاؤں کہ یہ ینگ مین محض ایک ذہین رائٹر ہی نہیں، ایک بہت اچھا اسسٹنٹ ڈائریکٹر بھی ہے تو آپ کو اور تعجب ہوگا۔ اس نے میرے پرانے اور تجربہ کار معاون ہدایت کاروں کے مقابلے میں مجھے زیادہ بہتر طور پر اسسٹنٹ کیا ہے۔ اس میں ایک اچھے ڈائریکٹر کی صلاحیتیں بھی موجود ہیں۔''

یہ 1963ء کی کہانی ہے جب نقی مصطفیٰ پر بھرپور انداز میں جوانی بھی نہیں آئی تھی۔ اس کے باوجود ان کے ''لچھن'' کچھ اچھے نہیں تھے۔ اسکول اور کالج کے زمانے سے ہی ادیبوں، شاعروں اور قلم کاروں سے میل جول تھی۔ ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے، اور وقت گزارتے تھے۔ اس صحبت کا نتیجہ جو ہونا چاہیے تھا ہوا۔ کچھ لکھنے لکھانے لگے۔ کچھ کہنے لگے اور پھر اس لکھنے پڑھنے کے حوالے سے ہی صحافت کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ نیم پر کریلے کی بھی سواری ہوگئی۔ ایک طرف تعلیم کا بوجھ، دوسری طرف غیر تعلیمی سرگرمیاں۔ نہ اسے چھوڑ سکتے تھے۔ نہ اُسے۔

گھرانا بہت عالمانہ تھا۔ بے حد پڑھا لکھا۔ باپ ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے اپنی اولادوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دے رکھی تھی۔ کوئی انجینئر تھا، کوئی ڈاکٹر۔ کوئی ایجوکیشنسٹ۔ کوئی فوج کا اعلیٰ افسر۔ جبکہ ان کی (نقی مصطفیٰ کی) ذہانت اور متانت۔ ان کے بڑوں کے خیال کے مطابق غلط راہوں پر گامزن تھی۔ اماں باوا اور بڑے بھائیوں کی خوشنودی کے لیے تعلیم جاری رکھنا ضروری تھا۔ اور فلمی سرگرمیاں جاری رکھنا ان کی اپنی ضرورت تھی۔ کالج سے یونیورسٹی تک پہنچنے کا سفر اسی دوران ہوا۔ سوشیالوجی (عمرانیات) کے ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ لیا۔ عجیب آپا دھاپی کا دور تھا۔ کلاسوں میں بھی حاضری لگاتے رہے۔ ادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ اور...... اور فلمیں بھی لکھتے رہے اور ان کی ڈائریکشن کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

''ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی''

والی کیفیت تھی۔ اسی عالم تگ ودو میں 1965ء میں ڈھاکا یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان پاس کیا اور روزی روٹی کے حصول کے لیے فلم انڈسٹری کا ہی شعبہ اپنے لیے متعین کرلیا۔ یعنی کل وقتی مکالمہ نویس بن گئے۔ یہ بتانے سے پہلے کہ انہوں نے ''بندھن'' کے بعد مزید کن فلموں کے لیے مکالمہ نویسی کی، یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان کی ادبی آبیاری کیسے ہوئی۔ وہ کون سے لوگ تھے یا کیا مواقع تھے جن کی آگ میں جل کر وہ کندن بنے۔

نقی مصطفیٰ کی ادبی زندگی کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ 1958ء میں چاٹگام سے میٹرک پاس کرکے ڈھاکا آئے اور کالج میں داخلہ لیا اور ادبی حلقوں تک رسائی حاصل کی اور ''انجمن ادب'' سے وابستہ ہوئے۔ ''انجمن ادب'' ابھرتے ہوئے نئے ادیبوں اور شاعروں کی ایک ادبی تنظیم تھی جس کی سرپرستی سینئر ادیب و شاعر کیا کرتے تھے۔ یہاں انہیں (نقی مصطفیٰ کو) صلاح الدین محمد، سرور بارہ بنکوی، احسن احمد اشک، پروفیسر نظیر صدیقی، نوشاد نوری،

عطاالرحمٰن جمیل، امراء امارہ، بانو اختر شہود، حسن سعید، محبوب خزاں، احمد زین الدین، عقیل پرویز، احمد الیاس اور مرغوب الرحمٰن اور مجھ غریب جیسے سینئر اور جونیئر ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔

1960ء میں پاکستان رائٹرز گلڈ کی پہلی سالگرہ ڈھاکے میں منائی گئی۔ پاکستان کے چیدہ چیدہ ادیب و شاعر اس چار روزہ تقریب میں شریک ہوئے جن میں قدرت اللہ شہاب، جمیل الدین عالی، شاہد احمد دہلوی، محسن بھوپالی، ابراہیم جلیس، حمایت علی شاعر، منیر نیازی، فارغ بخاری، غلام عباس، ناصر کاظمی، احمد راہی، ڈاکٹر جاوید اقبال وغیرہ مغربی پاکستان (جو اس وقت موجودہ پاکستان ہے) اور مشرقی پاکستان کے نامور اور بنگالی زبان کے تمام چھوٹے بڑے ادیب و شاعر شامل تھے۔ مہمان قلم کاروں کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک والینٹیر کی ٹیم ترتیب دی گئی تھی جس میں نقی مصطفیٰ بھی موجود تھے۔ مغربی پاکستان سے آنے والے ادیبوں اور شاعروں کو ہوٹل سے جلسہ گاہ تک لانے لے جانے، ان کی سیر و تفریح اور شاپنگ وغیرہ کروانے کی ساری ذمہ داری نقی مصطفیٰ کو سونپی گئی تھی۔ اس طرح انہیں اتنے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کو بہت قریب سے دیکھنے اور جاننے کا موقع اور تجربہ حاصل ہوا۔

کالج کا دور ختم ہونے پر نقی مصطفیٰ نے ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ عمرانیات میں داخلہ لیا۔ پھر 1961ء میں ڈھاکے میں بین الاقوامی فلم فیسٹیول کا انعقاد ہوا تو یہاں بھی نقی مصطفیٰ اپنی کمسنی کے باوجود ریسپشن کمیٹی کے ممبر بنے۔ اس موقع پر انہیں مقامی فلمسازوں، ہدایت کاروں، تکنیک کاروں اور فنکاروں سے ملنے ملانے کا بہترین موقع ملا۔

یہ وہ عوامل ہیں جنہوں نے ذہین نقی مصطفیٰ کو ادب اور ثقافت سے دلچسپی لینے اور اس فیلڈ میں اپنے آپ کو ڈھالنے اور سنوارنے پر مائل کیا۔ ان کی عمر ان دنوں حقیقتاً بہت کم تھی مگر اپنی عمر سے کہیں زیادہ ان کی صلاحیتیں ان میں موجود تھیں۔ ان کے اندر یہ وہ روشنی تھی جو باہر آنے کے لیے بے چین تھی اور موقع محل ڈھونڈنے کے بہانے تلاش کر رہی تھی۔ زمانۂ طالب علمی سے ہی ان میں فنی شعور اجاگر ہونے لگا تھا۔ وہ جب کوئی فلم دیکھتے تو انہیں ایسا معلوم ہوتا جیسے اس منظر کو اگر اس طرح فلمانے کی بجائے دوسری طرح فلمایا جاتا تو بہتر ہوتا۔ وہ جو کہتے ہیں ناکہ

حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

قدرت اس کے لیے بہت پہلے سے تیاریاں کرتی رہتی ہے۔ کسی کو کچھ بنانے کے لیے اس کے مضمرات بہت پہلے سے پیدا کیے جانے لگتے ہیں۔

آپ کو یقیناً اس بات کی جستجو ہوگی کہ نقی صاحب ادبی دنیا سے چھلانگ لگا کر آخر فلمی دنیا تک کیسے پہنچے؟ یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔

ڈھاکے میں فلمسازی شروع ہوئی تو صرف بنگالی فلمیں بننے لگیں۔ بہت جلد بنگالی فلم میکروں نے اچھی، معیاری اور دلچسپ فلمیں بنانا شروع کر دیں مگر ان کا کاروباری سرکٹ مشرقی پاکستان تک محدود تھا۔ کچھ دنوں بعد انہیں خیال آیا کہ اگر ہم لوگ اردو زبان میں فلمیں بنائیں تو ہمیں یہ فائدہ ہوگا کہ وہ پورے پاکستان میں دیکھی جا سکیں گی اور جس طرح لاہور اور کراچی کی فلمیں کماتی ہیں ہماری فلموں کو بھی اسی طرح بھرپور کمائی کا موقع ملے گا۔ اس سوچ کے نتیجے میں سب سے پہلے بے بی اسلام نے اپنی اردو فلم ''تنہا'' شروع کی۔ اگرچہ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ بنگال میں اردو فلمیں بنانا آسان نہیں۔ بے بی اسلام اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ''تنہا'' بن کر تیار ہوگئی اور نمائش کے مرحلے میں تھی کہ فلمساز کیپٹن احتشام اور ان کے بھائی مستفیض نے بھی اردو فلم بنانے کا عزم و ارادہ کرلیا اور بنگالی آرٹسٹوں کو لے کر ایک فلم آناً فاناً بنا کر تیار کرلی جس کا نام ''چندا'' رکھا۔ اس موقع پر انہوں نے کاروباری رقابت یہ کی کہ اپنے اثر و رسوخ سے ''تنہا'' کی نمائش کو التوا کا شکار بنا دیا اور اپنی فلم مختصر مدت میں بنا کر ریلیز کردی اور ''تنہا'' کی بجائے ''چندا'' کو پہلی مشرقی پاکستان کی اردو فلم کا کریڈٹ دلوا دیا۔

''تنہا'' کے اسکرپٹ رائٹر اور نغمہ نگار ڈھاکے کے معروف شاعر سرور بارہ بنکوی تھے۔ احتشام نے سرور صاحب سے ہی ''چندا'' لکھوائی اور نغمہ نگار کی حیثیت سے بھی ان کی خدمات حاصل کیں۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ''چندا'' نہ صرف مشرقی پاکستان میں بلکہ مغربی پاکستان میں بھی ہٹ ہوگئی۔ اگرچہ اس دور کی لاہور یا کراچی کی فلموں کے معیار کی فلم نہیں تھی مگر نئے آرٹسٹوں اور اپنی سادگی کی وجہ سے پسند کی گئی۔ اس کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے احتشام کے بھائی ہدایت کار مستفیض نے دوسری اردو فلم ''تلاش'' ریکارڈ ٹائم میں بنا کر سلور اسکرین کی زینت بنا دی۔ ''تلاش'' ''چندا'' کے مقابلے میں زیادہ بہتر فلم تھی اس نے ''چندا'' سے زیادہ

اچھا بزنس کیا۔

فلم والے کہیں کے ہوں، بھیڑ چال کے شکار ہوتے ہیں۔ "چندا" اور "تلاش" کی سپر ہٹ کامیابی کو دیکھ کر ڈھاکے کے تمام فلم میکرز نے اردو فلمیں بنانا شروع کردیں۔ اس دور میں چندا اور تلاش کی یونٹوں سے وابستہ لوگوں کی ڈیمانڈ بڑھ گئی جن میں سرفہرست سرور بارہ بنکوی تھے جنہوں نے متذکرہ دونوں فلموں کے اسکرپٹ لکھے تھے اور نغمہ نگاری کی تھی۔ اس لیے نئی فلمیں بنانے والوں کی پہلی چوائس سرور صاحب ہی ہوتے تھے۔ ایسے میں سرور صاحب پریشان ہوگئے کہ کتنی فلموں کی ذمہ داری لیں؟

ایک دن سرور صاحب نے مجھ سے کہا۔ "انور تم قاضی ظہیر کو جانتے ہونا؟"

"جی ہاں، بہت اچھی طرح۔ بہت سلجھا ہوا اور باصلاحیت ہدایت کار ہے۔ اس نے کئی اچھی اور کامیاب بنگالی فلمیں بنائی ہیں۔"

"اب وہ ایک اردو فلم بنانا چاہتا ہے اور بضد ہے کہ میں اس کا اسکرپٹ لکھوں۔"

"تو لکھ دیجئے نا۔"

"یار! میرے پاس پہلے ہی بہت فلمیں ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم اس کا کام کردو۔ بطور فلم جرنلسٹ کے وہ تمہیں بھی جانتا ہوگا؟"

"بہت اچھی طرح۔"

"تو پھر کرلو نا اس کی فلم۔ میں اسے بتادوں گا کہ تم میرے آدمی ہو اور اطمینان بخش کام کروگے۔"

"میں سوچ کر جواب دوں گا۔ ایک دو دن کی مجھے مہلت دیجیے۔"

اور ایک دو دن ہی میں الجھن میں رہا پھر ایک فیصلے پر پہنچ گیا کہ یہ کام مجھ سے بہتر نقی مصطفیٰ کرسکے گا۔ اور جب میں نے اس سے کہا تو وہ مجھ پر چڑھ دوڑا۔

"یار! سرور صاحب نے تم سے کہا ہے۔ اور تم مجھ سے کہہ رہے ہو۔ سرور صاحب نے کچھ سوچ کر ہی تم سے کہا ہوگا۔"

"کیا سوچ کر کہا ہوگا؟"

"یہی کہ قاضی ظہیر ایک اچھا ہدایت کار ہے۔ اس کی فلم ضرور ہٹ ہوگی۔ اور اس کے ساتھ تم بھی ہٹ ہوجاؤ گے۔ اور دو ٹکے کی فلمی صحافت سے تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔"

"مگر میں چاہتا ہوں کہ اس فلم کے ہٹ ہونے سے میرا یار ہٹ ہوجائے۔"

کچھ دیر کی بحث بازی کے بعد میں نے یہ کہہ کر اسے قائل کرلیا کہ مجھے فلمی دنیا کا ماحول پسند نہیں۔ میں فلم والوں کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں ہوسکوں گا۔

اور جب سرور صاحب کو میں نے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو انہیں دکھ ہوا۔ میں نے کہا۔

"نقی مصطفیٰ مجھ سے بہتر کام کرسکے گا۔"

"چلو اسی کو قاضی ظہیر کے پاس بھیج دو۔ میں اس کے بارے میں قاضی ظہیر کو بتادوں گا۔"

"بندھن" بن کر ریلیز ہوئی اور ہٹ بھی ہوگئی۔ اس کی نمائش کے بعد کی بات ہے۔ ایک دن میں نے قاضی ظہیر سے پوچھا۔

"قاضی صاحب! آپ کا اسکرپٹ رائٹر نقی مصطفیٰ جب آپ سے پہلی مرتبہ ملا تو آپ کے کیا تاثرات تھے؟"

پہلے وہ زور سے ہنسے پھر بالکل سنجیدہ ہوگئے اور پھر بولے۔ "جب اس۔ نے مجھ سے میرے دفتر میں مل کر مجھ سے کہا۔ "مجھے سرور صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیوں بھیجا ہے؟"

"آپ کی اردو فلم کا اسکرپٹ لکھنے کے لیے۔"

تو میں نے اسے گھور کر سر سے پاؤں تک دیکھا اور دل ہی دل میں کہا۔ سرور صاحب نے میری فلم لکھنے سے انکار کردیا۔ چلو، یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ مگر ایک کمسن لڑکے کو اسکرپٹ رائٹر کے طور پر میرے پاس بھیج کر اچھا مذاق کیا ہے۔

آنے والا مجھے سوچتا ہوا دیکھ کر دھیرے سے مسکرایا۔ پھر بولا۔ "شاید آپ سوچ رہے ہیں کہ یہ کیا لکھ سکے گا کسی فلم کا اسکرپٹ..؟ آپ کو سوچنا بھی چاہیے۔ مگر میں آپ سے عرض کروں گا کہ مجھے آزما کر تو دیکھیں۔ اگر میں آپ کے معیار پر پورا نہ اتروں تو بے شک آپ مجھے ریجیکٹ کردیں۔"

اس نے چند جملے بنگالی میں کہے۔ پھر انگریزی میں اپنا مافی الضمیر ظاہر کرنے لگا۔ انگریزی وہ بڑے فراٹے سے بول رہا تھا۔ میں اس کی انگریزی سے قدرے متاثر ہوا اور کہا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ کل آئیں۔ ہم کل سے کام شروع کریں گے۔"

''اور پھر کل کیا ہوا؟'' میں نے پُراشتیاق انداز میں پوچھا۔

''اگلے روز وہ وقت مقررہ پر آیا۔ اور ہم نے کہانی پر کام کی ابتدا کر دی۔ میں نے اسے ''بندھن'' کی کہانی سنائی۔ وہ سنتا رہا اور سامنے رکھے کاغذ پر نوٹ کرتا رہا۔ اس دوران وہ کئی جگہ مجھے ٹوکتا رہا۔ ''قاضی صاحب! یہ اگر اس طرح ہو تو کیسا رہے گا؟''

پہلے دن جب ہم اپنا کام کر کے اٹھے تو میں قدرے مطمئن تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ بہت ذہین لڑکا ہے۔ اسے فلم کی شدھ بدھ ہے اور مجھے مایوس نہیں کرے گا۔ اور اس کے بارے میں میری یہ سوچ غلط نہیں تھی۔ روز بروز اس کی فنی صلاحیتیں اس طرح سامنے آتی جا رہی تھیں جیسے پیاز کی تہیں۔ ایک کے اوپر ایک۔ جیسے جیسے اسکرپٹ نگاری آگے بڑھتی گئی، اس کی...... میرا مطلب ہے اس کمسن لڑکے کی صلاحیتیں زیادہ سے زیادہ اجاگر ہو کر سامنے آنے لگیں۔ میں اپنی بنگالی فلموں کی اسکرپٹ رائٹنگ کے وقت ان کے رائٹرز کے ساتھ رہتا ہوں مگر میں نے کسی بڑے سے بڑے اور تجربہ کار اسکرپٹ رائٹر کو اس قدر روشن دماغ محسوس نہیں کیا جتنا یہ کمسن رائٹر اپنی روشن خیالی کا مظاہرہ کرتا دکھائی دیتا تھا۔

''قاضی صاحب! اس سین کا تقاضا تو یہ ہے کہ اسے یوں نہیں، یوں پیش کیا جائے۔'' میں اس کی بات پر غور کرتا تو اس کا مشورہ زیادہ مناسب نظر آتا۔ اس سے پہلے میری دی ہوئی لائن کی مخالفت کسی رائٹر نے نہیں کی۔ میری بات رد ہونے پر مجھے فطری طور پر پہلے تو غصہ آتا تھا مگر جب میں اس کے اعتراض پر غور کرتا تو اس کی بات میری بات سے زیادہ وزنی نظر آتی۔''

''آپ تو مجھے جانتے ہیں۔'' قاضی ظہیر نے کہا۔ ''میں بڑا ابلنٹ اور دوٹوک آدمی ہوں۔ میں سچ کو ہر حال میں سچ مانتا ہوں۔ اپنی غلطیوں کا بھی اعتراف کرتا ہوں۔ میں اس بات کا بھی اعتراف کرتا ہوں کہ میری پہلی اردو فلم ''بندھن'' کی کامیابی میں بڑا حصہ نقی مصطفیٰ کا ہے۔ شاید کوئی اور اس فلم کا اسکرپٹ رائٹر ہوتا تو اس طرح میری رہنمائی نہیں کرتا۔ میں آپ لوگوں کی صحبت میں اردو بول تو لیتا ہوں، سمجھ بھی لیتا ہوں لیکن لکھنے پڑھنے کے معاملے میں اردو زبان کی کوئی شدھ بدھ مجھ میں نہیں۔ ایسے عالم میں اس لڑکے نے میری جو رہنمائی کی اس سے اس فلم کو بڑا فائدہ

زندگی نامہ

نام: نقی مصطفیٰ
ادبی نام: ممتاز نقی مصطفیٰ
والد گرامی: ڈاکٹر مصطفیٰ
(مشرقی پاکستان ریلوے میں چیف میڈیکل آفیسر رہے)
پیدائش: 25 دسمبر 1942ء
مقام پیدائش: گوہاٹی (صوبہ آسام، بھارت)
تعلیم: میٹرک 1958ء میں چاٹگام انٹر بورڈ سے پاس کیا۔ اس کے بعد ڈھاکے آ کر کالج میں داخلہ لیا۔ آئی ایس سی (انٹر سائنس) تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد بی اے آنرز اور ماسٹر آف آرٹس سوشیالوجی میں ڈھاکا یونیورسٹی سے پاس کیا۔ (1965ء میں)۔
فلمی کیریئر: پہلی فلم بطور مکالمہ نویس بندھن۔ آخری فلم چاہت، نواب سراج الدولہ کی مکالمہ نگاری پر نگار ایوارڈ حاصل کیا۔ ڈھاکے کی فلموں کے بعد لاہور کی فلموں میں بھی مکالمہ نویسی کے علاوہ نائب ہدایت کاری بھی کی۔
اولاد: دو بیٹیاں، ایک بیٹا۔
شعری مجموعہ: اندر سمندر۔ اشاعت جنوری 2015ء میں ہوئی۔

ضیا محی الدین کے ساتھ

بین الاقوامی شہرت یافتہ اداکار ضیا محی الدین نے جس پاکستانی فلم میں پہلی بار اداکاری کی اس کا نام ''سہاگ'' تھا۔ نقی مصطفیٰ اس فلم کے نہ صرف اسکرپٹ رائٹر تھے بلکہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر بھی تھے۔ نقی مصطفیٰ کو اس بات کا کریڈٹ بھی حاصل ہے کہ انہوں نے ضیا محی الدین کے ساتھ پر فارم کیا۔

فلم نگاری کیوں چھوڑی؟

نقی مصطفیٰ نے فلم نگاری کیوں چھوڑی؟ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ ان کی آخری فلم رحمٰن کی ''چاہت'' تھی جو باکس آفس پر کامیاب ہوئی۔ مگر یہ فلم بھارتی فلم ''گیت'' کا چربہ تھی۔ اس فلم کی کامیابی کو دیکھ کر ہر فلمساز یہی کہتا تھا کہ کسی کامیاب بھارتی فلم کو پاکستانی بنا کر لکھ دو۔ نقی کا کہنا تھا کہ رحمٰن نے جس کہانی پر مجھ سے مکالمے لکھوائے، میرے علم میں نہیں تھا کہ یہ کسی بھارتی فلم کی کہانی ہے۔ لہٰذا میں نے اس کا اسکرپٹ لکھ دیا مگر میں جان بوجھ کر چربہ نگاری نہیں کر سکتا۔ لہٰذا میں نے اس صورت حال میں فلم نگاری ہی ترک کر دی۔

ہوا۔ میں فلم میکنگ کے بارے میں اپنے آپ میں کوئی کمی محسوس نہیں کرتا مگر اردو فلم کے حوالے سے میری معلومات صفر تھیں۔ ہر زبان کا اپنا ایک موڈ مزاج ہوتا ہے۔ ایک کلچر اور انداز ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں میرے ینگ رائٹر نے میری جس طرح معاونت کی، اس کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی، ناانصافی ہوگی۔''

قاضی ظہیر فطرتاً بہت کم گو آدمی تھے۔ مگر اس وقت بولے چلے جا رہے تھے۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد مسکراتے ہوئے بولے۔ آپ کو ایک بات بتا رہا ہوں جو میں نے کسی اور کو نہیں بتائی۔ اور وہ یہ بات ہے کہ جب بندھن کا اسکرپٹ تقریباً آدھا لکھا جا چکا تو میں نے اپنی تسلی کے لیے اپنے جاننے والے اردو کے ایک پروفیسر کو اپنا اسکرپٹ دکھا کر کہا۔

''پروفیسر صاحب! ذرا اسے پڑھ کر بتایئے۔ یہ زبان و بیان کے لحاظ سے کیسا لکھا گیا ہے؟''

پروفیسر صاحب نے اسکرپٹ کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد کہا۔ ''اسے کسی خاصے پڑھے لکھے آدمی نے لکھا ہے۔ زبان و بیان کی غلطی تو مجھے کہیں نظر نہیں آئی البتہ اس کی اس خوبی نے مجھے بہت متاثر کیا کہ بہت صاف، سیدھی اور رواں انداز میں لکھا گیا ہے۔ شاید لکھنے والے کو آپ نے یہ تاکید کردی ہوگی کہ آپ کی فلم کے سارے آرٹسٹ بنگالی ہیں۔ اس لیے ڈائیلاگز آسان اور عام بول چال کی زبان میں ہوں۔''

اگرچہ میں نے ایسی کوئی تاکید نہیں کی تھی اس کے باوجود پروفیسر سے کہہ دیا۔ ''جی ہاں، میں نے ان سے ایسا ہی کہا تھا۔''

اور دل ہی دل میں نقی مصطفیٰ کی دور اندیشی اور وژن کی تعریف کرنے لگا کہ میرے کہنے یا بتانے کے بغیر اس نے از خود اس بات کا خیال رکھا۔ پروفیسر صاحب نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مکالمے چھوٹے چھوٹے جملوں پر مشتمل ہیں۔ اس لیے ان کی ادائیگی میں بنگالی آرٹسٹوں کو کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔''

پروفیسر صاحب کی رائے معلوم کرکے دلی مسرت حاصل ہوئی۔ میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر بھی ادا کیا کہ اس نے اردو فلم بنانے کی آزمائش میں پورا اترنے کے لیے ایک بہت اچھے اور قابل رائٹر کا بندوبست کرلیا۔

پھر جب ہم دونوں اگلے روز کہانی پر بیٹھے تو اسے دیکھ کر مجھے بار بار ہنسی آجاتی تھی۔

''کیا بات ہے قاضی صاحب! کیا آج میں بہت مضحکہ خیز نظر آرہا ہوں؟ میرے سر پر سینگ تو نہیں نکل آئی ہے؟ آپ مجھے دیکھ دیکھ کر اس طرح مسکرا کیوں رہے ہیں؟''

''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ کچھ اور بات ہے۔''

''اور جو بات تھی۔ میں اس کا برملا اظہار نہیں کرسکتا تھا۔ اس سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ تم جو نظر آتے ہو وہ ہو نہیں۔ تم اپنے قد کاٹھ سے بہت بڑے ہو۔ بہت بلند ہو۔''

میں نے قاضی صاحب کی بات سن کر کہا۔ ''آپ کی بات کی ترجمانی اس شعر سے ہوتی ہے:

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

''میں کچھ سمجھا نہیں۔'' قاضی صاحب بولے۔ تب میں نے اس شعر کا مطلب انہیں سمجھایا۔

''ہاں ہاں۔ بالکل یہی بات۔''

''آپ سے نقی مصطفیٰ کا معاہدہ تو غالباً اسکرپٹ رائٹنگ کا ہوا تھا۔'' میں نے قاضی ظہیر سے کہا۔ ''یہ اس سے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کروانے کی نوبت کیسے آگئی؟''

''اسکرپٹ فائنل ہونے کے بعد۔ میں نے نقی سے کہا۔ ''دیکھو یار! تم اگر یہ سمجھ رہے ہو کہ تمہارا کام مکمل ہوگیا ہے تو درست نہیں۔ اگلا مرحلہ جو آنے والا ہے اس میں تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔''

''آپ غالباً شوٹنگ کے مرحلے کی بات کر رہے ہیں؟'' نقی نے کہا۔

''ہاں بھئی۔ تمہیں آرٹسٹوں سے درست طریقے پر ڈائیلاگ ڈلیوری کروانی ہوگی۔ بنگالی اداکاروں اور اداکاراؤں سے اردو مکالمے بالکل صحیح انداز میں ادا کروانے ہوں گے۔ یہ کام تم سے بہتر کوئی اور نہیں کروا سکتا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''اس کے پیسے میں تمہیں الگ سے دوں گا۔''

''پیسے کی کوئی بات نہیں۔ اس موقع پر مجھے آپ سے سیکھنے کو بہت کچھ ملے گا۔''

''گڈ۔ اچھے رائٹر کے لیے فلم میکنگ سے واقف ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔''

اور انور صاحب! نقی نے نہ صرف ڈائیلاگ ڈلیوری

بڑے اچھے طریقے پر کروائی بلکہ ایک اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے طور پر میری معاونت بھی بڑی خوبی کے ساتھ کرائی۔

''بندھن'' کی نمائش 1963ء میں ہوئی۔ اگلے سال اس نے پاکستان ٹیلی وژن سینٹر ڈھاکا سے منسلک ہو کر ہفتہ وار پروگرام ''اردو بنگالی بول چال'' کی اسکرپٹ اور کمپیئرنگ کی ذمہ داری سنبھال لی۔ یہاں تک رسائی ان کے دوست پروڈیوسر مرغوب الرحمٰن کی وساطت سے ہوئی تھی۔ تقریباً چار سال تک وہ یہ پروگرام پابندی سے کرتے رہے۔

''چندا'' اور ''تلاش'' کی فقید المثال کامیابی کے بعد جب ڈھاکا فلم انڈسٹری میں اردو فلموں کا سیلاب آیا تو ڈھاکے کے سب سے بڑے بنگالی فلمی اخبار ''چترالی'' کے مالکان نے یہ فیصلہ کیا کہ ''چترالی'' کا اردو ایڈیشن بھی شائع کیا جائے۔ ''چترالی'' جو ہفت روزہ اخبار تھا، انگریزی روزنامہ پاکستان آبزرور کے زیر اہتمام نکلتا تھا اور اس کے ایڈیٹر انچیف ہدایت کار ایس ایم پرویز تھے۔ یہ ادب اور آرٹ کے ہر شعبہ کو کور کرتا تھا، فلم، ٹیلی وژن، تھیٹر، مصوری، رقص و موسیقی اور ادب پر بھرپور کوریج کی جاتی تھی۔ یہ جہازی سائز کے بارہ یا سولہ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ لاہور، کراچی، ڈھاکے کے علاوہ بھارتی فلموں اور فنکاروں سے متعلق تحریریں ہوتی تھیں۔ اردو چترالی کا اجرا ہوا تو اس میں بھی وہی سب کچھ ہوتا جو بنگال چترالی میں ہوتا تھا۔ ہر شعبہ کے لیے ایک سب ایڈیٹر رکھا گیا۔ نقی مصطفیٰ بھی ایک پیج کے انچارج مقرر ہوئے۔

اس دھان پان سے نوجوان کی ہمت حوصلے اور انرجی دیکھیے۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فلم کی مکالمہ نویسی، ٹی وی کمپیئرنگ، اخبار کی ایڈیٹری جاری رکھی۔ کسی شعبہ میں اپنی کارکردگی پر آنچ آنے نہیں دی۔ نہ دن کو دن دیکھا نہ رات کو رات۔ نہایت دیانت داری کے ساتھ اپنی ہر ذمہ داری پوری کی۔ 1962ء میں سوشیالوجی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد کل وقتی طور پر فلموں کی مکالمہ نویسی پر توجہ مبذول کر دی اور 1969ء تک فلمساز و ہدایت کار کمال احمد کی فلم پروانہ، فلمساز و ہدایت کار احتشام کی فلم ''چاند اور چاندنی''، مستفیض کی فلم ''قلی'' اور ''چھوٹے صاحب'' خان عطا الرحمٰن کی فلم ''نواب سراج الدولہ'' اور ''سوئے ندیا جاگے پانی'' کے مکالمے لکھنے کے علاوہ بنگلہ فلموں ''سابت بھائی چمپا'' اور ''اورون بورون کیرون مالا''

''بندھن'' کی کامیابی سے نقی کو یہ کامیابی نصیب ہوئی کہ بطور مکالمہ نویس اور اسکرپٹ رائٹر اسے بڑے اور مستحکم فلمسازوں کی فلمیں ملنے لگیں۔ اس سلسلے میں کمال احمد کی فلم ''پروانہ''، کیپٹن احتشام کی فلم ''چاند اور چاندنی''، مستفیض کی فلم ''قلی'' اور ''چھوٹے صاحب'' اور خان عطاء الرحمٰن کی فلم ''نواب سراج الدولہ''، ''سوئے ندیا جاگے پانی'' قابل ذکر فلمیں ہیں۔ ''نواب سراج الدولہ'' کی مکالمہ نگاری پر اسے بہترین مکالمہ نگار کا نگار ایوارڈ بھی ملا۔

☆☆☆

خان عطاء الرحمٰن کی حیثیت ورسٹائل فنکار کی تھی۔ وہ نہ صرف ایک اچھا اداکار تھا بلکہ خوب صورت دھنیں ترتیب دینے والا موسیقار بھی تھا اور بے پناہ فنی صلاحیتوں سے مالا مال ہدایت کار بھی۔ نقی اس کے پروڈکشن ہاؤس سے وابستہ ہوا تو پھر اسی کا ہو رہا۔ نقی نے اس سے بہت کچھ سیکھا۔ اس کی فلموں کے اسکرپٹ رائٹنگ کے علاوہ اس کی کئی بنگلہ فلموں میں نائب ہدایت کار کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دیے۔ 1970ء میں مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات خراب ہوئے تو نقی مصطفیٰ کو ڈھاکے کو خیر باد کہہ کر لاہور آنا پڑا۔

☆☆☆

شوبز کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہاں کا ماحول کچھ ایسا ہوتا ہے کہ بہت کم لوگ اپنے آپ کو سنبھال کر رکھ سکتے ہیں۔ ان کے لیے یہ بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ نقی مصطفیٰ بھی ان ہی لوگوں میں ہے جس نے ایک عرصے تک اس ماحول میں رہنے کے باوجود اپنے تشخص کو مجروح ہونے نہیں دیا۔ اس کی شوخی اور شرارت آج بھی اس کی شخصیت کا حصہ ہے مگر اس کی اعلیٰ ظرفی، بلند اخلاقی، ٹوٹ کر چاہنے پیار کرنے کی اہلیت اور خلوص و محبت کا ایک سمندر اس کے اندر موجزن ہے۔ اس کی پُرخلوص محبت کا اظہار میں اپنے الفاظ میں کرنے سے قاصر ہوں۔ میں اپنے آپ کو بے حد خوش قسمت سمجھتا ہوں جسے ایسا چاہنے والا دوست ملا ہے۔ بقول سرور بارہ بنکوی:

جن سے مل کر زندگی سے پیار ہو جائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں، مگر ایسے بھی

اور ''جوار بھاٹا'' میں نائب ہدایت کار کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔

میں نے 1969ء تک کی بات یوں کی ہے کہ اس کے بعد نقی مصطفیٰ ڈھاکا فلم انڈسٹری سے وابستہ نہیں رہے کیونکہ وہاں کے سیاسی حالات میں بڑی انقلابی تبدیلی آچکی تھی جس کے نتیجے میں اردو فلموں کی ساکھ پر بھی منفی اثر پڑا تھا۔ اس کی وجہ اردو بولنے والوں سے نفرت تھی۔ ان کا جینا دوبھر کیا جارہا تھا۔ ایسے حالات میں دوربین نقی مصطفیٰ نے فیصلہ کیا کہ اب یہاں رہنا نہیں چاہیے۔ اور اس خیال کے تحت وہ ڈھاکے سے لاہور منتقل ہوگئے۔

اس سے پہلے کہ لاہور میں نقی مصطفیٰ کے شب و روز کے بارے میں کچھ بتاؤں ڈھاکے میں انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے، اس کی کچھ روداد آپ کو سنادوں۔

ڈھاکے کی اردو فلمیں، پروانہ، چاند اور چاندنی، قلی اور چھوٹے صاحب مکالمہ نویس کی حیثیت سے نقی مصطفیٰ کی کامیاب فلمیں تھیں۔ مگر ان فلموں سے اسے وہ شہرت اور پذیرائی نہیں ملی جو خان عطا الرحمٰن کی کامیاب تاریخی اردو فلم ''نواب سراج الدولہ'' سے حاصل ہوئی۔ اس فلم میں نقی مصطفیٰ کا فن عروج پر نظر آیا۔ نقی کہتے ہیں کہ مجھے عطا بھائی سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ خان عطا الرحمٰن فن فلمسازی کے سمندر تھے۔ اداکاری، ہدایت کاری، موسیقی، نغمہ نگاری اور دیگر تکنیکی شعبوں میں ان کی صلاحیتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

انہوں نے نقی مصطفیٰ کی صلاحیتوں کو دیکھا، پرکھا اور آزمایا تو اس پر بھرپور اعتماد کرنے لگے۔ اسے اپنی بنگالی فلموں کی نائب ہدایت کاری کی ذمہ داری بھی سونپی۔ اور اپنی اردو فلموں ''نواب سراج الدولہ'' اور ''سوئے ندیا جاگے پانی'' کی اسکرپٹ رائٹنگ کی ذمہ داری بھی تفویض کی۔ چونکہ وہ نقی کی رائٹنگ کو اچھی طرح آزما چکے تھے اس لیے اپنی پرسٹیج فلم ''نواب سراج الدولہ'' میں فری ہینڈ دے دیا کہ وہ اس فلم اور اس کے سبجیکٹ کے مطابق اس کے مکالمے تحریر کریں۔

نواب سراج الدولہ کی نمائش سے قبل مغربی پاکستان کے فلم بینوں اور ناقدوں کا خیال تھا کہ مشرقی پاکستان میں اچھے اور پُرشکوہ مکالمے لکھنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس لیے مشرقی پاکستان کی زیادہ تر فلموں کے مکالمے پُرجوش اور زوردار نہیں ہوتے ہیں۔

اس خیال کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ایسا سوچنے والے یہ لوگ مشرقی پاکستان کی اردو فلمی صنعت کی عملی دشواریوں اور رکاوٹوں سے ناواقف تھے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ یہاں اردو فلموں کے مکالمے لکھتے وقت کتنی دشواریوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ سوائے سرور بارہ بنکوی کے، ڈھاکے کے تمام فلمساز و ہدایت کار بنگالی تھے، جو اردو زبان کے مزاج اور اسلوب سے قطعی نابلد تھے۔ اس لیے مکالمہ نگار کو مکالمے لکھتے وقت عام طور پر فلمساز، ہدایت کار اور اداکار کی سہولتوں کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ اور مکالموں میں ایسی سہل اور رواں زبان استعمال کرنی پڑتی تھی جسے بنگالی فلمساز و ہدایت کار سمجھ سکیں اور اداکار باآسانی ادا کرسکیں۔ اس لیے مشرقی پاکستان میں ریاض شاہد طرز کے مکالمے لکھنے کی نہ کوئی گنجائش تھی نہ ہی آزادی۔ ان حالات میں سوال پیدا ہوتا ہے۔

''تو پھر نواب سراج الدولہ'' جیسی تاریخی فلم کے پرجوش و پرشکوہ مکالمے کیونکر لکھے گئے؟ اور کس طرح ادا کیے گئے؟''

فلم بینوں کو شاید نہیں معلوم کہ اس فلم کے مکالمے کی ادائیگی کے لیے ہدایت کار اور مکالمہ نگار کو کتنی محنت کرنی پڑی اور ہدایت کار خان عطا الرحمٰن نے مکالمہ نگار نقی مصطفیٰ پر کس حد تک اعتماد کیا۔

''نواب سراج الدولہ'' نقی مصطفیٰ کی اہم ترین فلم ہے جس کے مکالموں کو مغربی پاکستان کے فلم بینوں اور ناقدین فن نے بہت پسند کیا۔ اس فلم نے مغربی پاکستان کے بعض لوگوں کے اس خیال کو غلط ثابت کردیا کہ مشرقی پاکستان میں اچھے مکالمہ نگاروں کا فقدان ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس فلم کی کامیابی کی بڑی وجہ اس کے پرشکوہ اور شاندار مکالمے ہیں تو شاید غلط نہ ہو۔

''نواب سراج الدولہ'' کی شاندار کامیابی کے باوجود نقی مصطفیٰ نے ''نواب سراج الدولہ'' کے طرز کی مکالمہ نگاری کو اپنا اسٹائل نہیں بنایا۔ نہ ہی ریاض شاہد کے طرز مکالمہ نگاری کو اختیار کیا۔ اس کی آیندہ فلم ''سوئے ندیا جاگے پانی'' کے مکالموں کا انداز ''نواب سراج الدولہ'' سے قطعی مختلف تھا۔

''نواب سراج الدولہ'' کے مکالمے لکھ کر نقی مصطفیٰ کو سال کے بہترین مکالمہ نویس کا نگار ایوارڈ ملا۔ اگرچہ اس سال کئی بڑے اور مستند مکالمہ نگار بھی مدمقابل تھے۔

میرا خیال ہے کہ نقی مصطفیٰ نے جس عمر میں نگار ایوارڈ حاصل کیا۔ اس عمر میں کسی بھی شعبہ میں کسی اور نے

نگار ایوارڈ حاصل نہیں کیا۔ یہ بھی نقی کا ایک اعزاز ہے۔

وہ جب نگار ایوارڈ حاصل کرنے مغربی پاکستان آئے تھے تو بہت سے فلمسازوں اور ہدایت کاروں نے انہیں لاہور آنے کی دعوت دی تھی۔ اس وقت تو وہ نہیں گئے مگر جب 1970ء میں وہ ڈھاکے کی فلمی صنعت سے اپنا ناطہ توڑ کر لاہور گئے تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی۔ اس موقع پر انہیں کسی نے گھاس نہیں ڈالی۔ دو سال تک انہیں بیکاری اور بے روزگاری کا عذاب جھیلنا پڑا۔ اس کے بعد ان کی ملاقات ہدایت کار فرید احمد سے ہوئی تو انہوں نے ان کی فنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کیا۔ اور اپنی فلم ''انگارے'' میں بطور اسکرپٹ رائٹر اور نائب ہدایت کار ان سے کام لیا۔ اس فلم کے دوران نقی مصطفیٰ نے جس طرح فرید احمد کا ساتھ دیا اس سے فرید احمد بہت متاثر ہوئے اور اپنی اگلی فلموں ''زیب النسا'' ''سہاگ'' اور ''خواب اور زندگی'' کے اسکرپٹ نقی سے لکھوائے بلکہ بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر بھی ان کی خدمات حاصل کیں۔

لاہور میں نقی مصطفیٰ کی آخری فلم اداکار و ہدایت کار رحمٰن کی فلم ''چاہت'' تھی۔ اس کے بعد نقی مصطفیٰ نے فرید احمد کے ساتھ نیف ڈیک میں شمولیت اختیار کرلی۔ اس دوران اس نے نیف ڈیک کے تعاون سے بننے والی ایک برطانوی فلم اور ایک امریکی فلم کی پاکستان میں آؤٹ ڈور شوٹنگز میں حصہ لیا۔

دو سال تک نیف ڈیک کے فلم انسٹی ٹیوٹ میں کام کیا۔ لاہور میں نیف ڈیک کے زیر اہتمام چلنے والے سنیما الفلاح کے منیجر رہے۔ اس کے بعد 1981ء سے نیف ڈیک سے علیحدگی اختیار کرلی اور فرید احمد کے ساتھ ہی لاہور کو خیر باد کہہ کر کراچی آگئے۔

کراچی آنے کے بعد دونوں نے کیسٹ کہانی کا اجرا کیا۔ کیسٹ پر بچوں کے لیے کہانی سنانے کا تجربہ نیا تھا مگر کامیاب ہوا۔ 14 والیوم تک یہ پروجیکٹ بڑی کامیابی کے ساتھ چلا۔ بعد ازاں چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر یہ کام ختم کرنا پڑا۔

اس کے بعد نقی مصطفیٰ کو کئی طرح کی ملازمتیں کرنی پڑیں جن میں آخری ملازمت ٹی وی چینل سماء نیوز کی تھی جس سے وہ بطور سینئر اسکرپٹ رائٹر وابستہ ہوئے اور کم و بیش آٹھ سال تک اپنی خدمات انجام دینے کے بعد وہاں سے ریٹائرمنٹ لے کر گھر بیٹھ گئے ہیں۔

نقی مصطفیٰ ایک حساس طبیعت کے مالک ہیں۔ وہ بہت چاہنے والے انسان دوست ہیں۔ ابتدا ہی سے بہت شوخی اور شرارت ان کی شخصیت کا حصہ رہی ہے۔ ان کے حالات کیسے ہی گمبھیر نہ رہے ہوں ہمیشہ ہنستے، مسکراتے اور شرارتیں کرتے رہتے ہیں۔ ان کی طبیعت کا چلبلا پن پہلے کی طرح آج بھی موجود ہے۔ اب اگرچہ عمر

غزل

آنکھ میں ہے خمار سا کل کا
نشہ باقی ہے اب بھی جل تھل کا

تیری بانہوں کا مرمریں احساس
آج بھی ہے گمان صندل کا

تیری آنکھوں میں ڈوب جانے کو
دل مچلتا ہے حسن کی ملکہ

کیسی کیسی ہیں خواہشیں میری
مت برا مان مجھ سے پاگل کا

میں خطاوار ہوں شرارت کا
تیرا آنچل ہی اس طرح ڈھلکا

تیری یادیں بہت ستاتی ہیں
رو کے کرتا ہوں دل کو میں ہلکا

تجھ سے ملنا ملانا کیا چھوٹا
حال اپنا ہے اڑتے بادل کا

شہر کے سارے رستے بھول گیا
جب سے باسی ہوا ہوں جنگل کا

تم مقدر کے ہو دھنی ممتاز
مل گیا سایہ ان کے آنچل کا

.....

کے سنجیدہ اسٹیج پر پہنچ چکے ہیں اس کے باوجود اگر پرانے دور کے سنگی ساتھی مل جاتے ہیں تو چھیڑ چھاڑ اور شرارتیں کرنے سے بعض نہیں آتے۔

ان کی صحافت، فلم نگاری اور ہدایت کاری کے بارے میں تو بہت سے لوگوں کو بہت کچھ معلوم ہے مگر شاید ان کے بہت سے جاننے والوں کو اس بات کی جانکاری نہیں ہوگی کہ وہ ایک شاعر بھی ہیں۔ صاحب دیوان شاعر۔ ان کی شاعری کا مجموعہ ''اندر سمندر'' جنوری 2015ء میں شائع ہو چکا ہے۔ حمایت علی شاعر کے فرزند ارجمند پروفیسر اوج کمال کے ادارہ ''دنیائے ادب'' کے زیر اہتمام یہ مجموعۂ کلام منصۂ شہود میں آچکا ہے۔ نقی مصطفیٰ ممتاز تخلص کرتے ہیں مگر جس طرح کچھ لوگ سید یا شیخ اپنے نام کے شروع میں لکھنے کی بجائے نام کے آخر میں لکھتے ہیں اس طرح نقی اپنا تخلص اپنے نام کے شروع میں لکھتے ہیں۔

ان کے شعری مجموعہ میں بھی ان کا نام کچھ یوں چھپا ہے۔ ممتاز نقی مصطفیٰ۔ اس لیے کچھ لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں کہ یہ ''نواب سراج الدولہ'' فیم نقی مصطفیٰ نہیں، کوئی اور ہیں۔ ایسے سارے لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ صد فیصد یہ وہی نقی مصطفیٰ ہیں جنہوں نے ڈھاکے اور لاہور میں متعدد فلموں کی اسکرپٹ رائٹنگ کی ہے۔ جن میں ''نواب سراج الدولہ'' بھی شامل ہے۔

ان کی شاعری کا قصہ کچھ یوں ہے کہ وہ ڈھاکے میں کالج کے طالب علم تھے اور اس دور میں ابھرتے ہوئے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی تنظیم ''انجمن ادب'' کی ادبی نشستوں میں شریک ہوا کرتے تھے تو انہیں بھی شعر گوئی کا شوق چرایا اور انہوں نے کبھی کبھار شعر کہنے شروع کر دیے پھر جب ان کی صحافتی، ادبی اور فلمی سرگرمیاں بڑھیں تو انہیں شاعری کی طرف توجہ دینے کا موقع کم ملا۔ ان کے قریبی ساتھیوں اور دوستوں نے یہی سمجھا کہ ان کی شاعری دیگر مصروفیات کی وجہ سے ختم ہوگئی ہے مگر ایک طویل عرصے کے بعد جب ان کا شعری مجموعہ ''اندر سمندر'' منظر عام پر آیا تو یہ راز افشا ہوا کہ ان کے اندر شاعری کا جو خزانہ تھا وہ ڈوبا نہیں تھا، غرقاب نہیں ہوا تھا۔ جب جب انہیں موقع ملتا تھا وہ اپنے احساسات و جذبات شعروں کی شکل میں ڈھال میں محفوظ کر لیتے تھے، اس سلسلے میں انہوں نے کسی کو کچھ بتایا نہیں۔ نہ اپنی نظمیں، غزلیں کسی کو دکھائیں، نہ کہیں اشاعت کی غرض سے بھیجا۔ قریبی دوستوں تک کو اپنے اشعار نہیں سنائے اور جب بہت سی فکروں سے آزاد ہوگئے تو انہیں اپنے شعری افکار کا خیال آیا۔ اور پھر کچھ دنوں کے بعد وہ شعری مجموعہ کی شکل میں سامنے آگئے۔

''اندر سمندر'' کے مطالعہ کے بعد یہ کہا جائے کہ ممتاز نقی مصطفیٰ کی شاعری تمثیلی ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا کیونکہ ان کی نظموں اور غزلوں میں نمایاں طور پر کسی نہ کسی کتھا کہانی کی نشاندہی ہوتی ہے۔ مثلاً ان اشعار کو دیکھیے:

ان کے بچوں میرے بچوں چاروں میں ہے پیار بہت
ٹوٹے رشتے پھر سے جوڑیں، اس پر ہے انکار بہت
ان کے ڈیڈی، میرے بابا، دونوں کی ہیں عمریں ایک
میرے بابا ہٹے کٹے، ان کے ڈیڈی بیمار بہت

یہ غزل کے اشعار ہیں مگر ان میں بڑے واضح طور پر حالات کی عکاسی کی گئی ہے۔ پہلے شعر میں ماضی کے ناکام عشق کو نئے سرے سے کامیاب بنانے مگر حال میں بھی کامیاب نہ ہونے کا احوال ہے۔ دوسرے شعر میں محبت کے دونوں شیدائیوں کے اسٹیٹس اور سماجی فرق کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔

اس غزل میں یہ شعر بھی موجود ہے:

مانا میرا چھوٹا ہے اور ان کا گھر محلوں جیسا
پیار کے رشتے میں ہوتی ہیں یہ باتیں بیکار بہت

جس سے دونوں فریق کے درمیان سماجی خلیج کی وضاحت میں مزید مدد ملتی ہے۔ مگر شاعر یہ کہہ کر اس فرق کو مسترد کر دیتا ہے کہ پیار کرنے والوں کے لیے ایسی باتیں بیکار اور بکواس ہوتی ہیں۔

اسی طرح ان کی نظم ''آخری سفر'' کے آخری بند ہیں۔ سچ اور جھوٹ سے بھری اس دنیا میں جو لوگ انسان اور انسانیت کے مقصد کو فراموش کر کے بھول جاتے ہیں کہ یہ سب کچھ یہیں چھوڑ کر جانا پڑے گا۔ دیکھیے اس حقیقت کو ممتاز نقی نے کیسے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے:

مال و دولت کے لگاتے تھے جو انبار بہت
جن کو انساں سے نہیں، پیسوں سے تھا پیار بہت
ان کو لے جاتے ہیں کاندھوں پہ اٹھا کر کچھ لوگ
کرتے تھے جو اپنی رعونت کا جو اظہار بہت

اگرچہ مکمل طور پر ممتاز نقی مصطفیٰ نے روایت سے انحراف نہیں کیا مگر ان کی یہ کوشش رہی کہ جہاں تک ممکن ہوسکے ان

کے کہنے کا انداز عام روش سے ہٹ کر ہو۔

مندرجہ ذیل اشعار سے میری اس بات کی وضاحت بہتر طریقے پر ہوگی۔

کھڑکی کھولی، اندر جھانکا، کوئی نظر نہ آیا
دروازے کے پاس پڑی تھی یادوں کی زنجیر

....

دور کہیں جنگل میں دیکھا میں نے جلتا ایک الاؤ
پاس گیا معلوم ہوا کہ یہ تو ہے مٹی پر گھاؤ

....

امن کی شاخیں سجاؤ، فاختے لاتا ہوں میں
ان غریبوں کو تو مل جائے ہمارے گھر اماں

....

گر بصارت چاہیے، اپنی بصیرت کو جگا
تجھ کو ہر شے میں نظر آجائیں گے اللہ میاں

....

دل کی وادی میں تم آؤ اوڑھ کے چادر پھولوں کی
خوشبو بھنورا بن کے تمہاری ناچے گی دھڑکن دھڑکن

....

ممتاز نقی کی تمثیل نگاری کی بات کی جائے تو ان کی کچھ نظمیں اس کی خوبصورت عکاسی کرتی ہیں۔ ان نظموں میں سہاگ رات، گونگے بہرے، ناکامی، سب سے بہتر، خوشبو، امید کی کرن، آستین کا سانپ، آج کے بچے اور آمنے سامنے قابل ذکر ہیں۔

اپنی نظموں کے موضوع کا انتخاب بھی وہ ذرا ہٹ کر کرتے ہیں۔ ان کی ایک نظم کا عنوان ہے ''میں اور ہم'' اس کے چند بند دیکھیے:

میرے اندر بھی ''میں'' چھپا ہے کہیں
جس کا احساس ہم کو ہوتا نہیں
دل کی دھڑکن سے بھی قریب ہے جو
جیسے نس نس میں بس گیا ہے وہ
جیسے ہستی کا کوئی حصہ ہو

....

وہ سمجھتا ہے عقل کی دولت
صرف اس کو ملی ہے یہ نعمت
پھر کسی کو نہ مل سکی تا حال
عقل کل ہے جو وہ ہے اس کا کمال

....

نقی کی برطانوی اور امریکی فلمیں

نقی مصطفیٰ نے نیف ڈیک کے تعاون سے بننے والی جس برطانوی فلم کی آؤٹ ڈور شوٹنگ میں حصہ لیا اس کا نام Conduct Unbecoming تھا جبکہ امریکی فلم کا نام Force ten from Novar one تھا۔ اس فلم میں بھی نقی مصطفیٰ نے بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر پرفارم کیا تھا۔

ملازمتیں

کیسٹ کہانی کے پروجیکٹ ختم ہونے کے بعد نقی مصطفیٰ کو روزی روٹی کے حصول کے لیے کئی ملازمتیں کرنا پڑیں۔ جمیل الدین عالی صاحب کی سفارش پر پی آئی اے کی سمسی ڈری یعنی آئی اے ایل میں ملازمت ملی۔ وہاں چار سال کام کرنے کے بعد نقی کا تبادلہ ڈیوٹی فری شاپ میں ہوگیا جہاں نقی نے 1998ء تک کام کیا۔ پھر چھ ماہ کے عرصے کے لیے ای لیٹ پریس میں رہے۔ تین سال تک طاہر اے خان کی ایڈورٹائزنگ کمپنی انٹرفلو سے منسلک رہے۔ جہاں ابتدائی ڈیڑھ سال کے عرصے میں حکومت پاکستان سے معاہدے کے تحت ''نادرا'' کے بی ہاف پر غیر ملکی پاکستانیوں کے لیے قومی شناختی کارڈ برائے بیرونِ ملک کا اجرا کیا۔ جب حکومت نے معاہدے کی توثیق نہ کی تو ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس کے بعد تقریباً تین سال تک سی اے ایس اسکول کے ایڈمن ڈیپارٹمنٹ میں رہے مگر جب حالات راس نہ آئے تو دو سال تک ذے بسٹ یونیورسٹی کے شعبۂ میڈیا سائنس میں اسکرپٹ رائٹر کی کلاسز لیں۔ اس کے بعد ٹی وی چینل سماء نیوز میں سینئر اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے کوئی آٹھ سال تک خدمات انجام دیں۔ چکی کی اس مشقت کے بارے میں نقی کا شعر کچھ یوں ہے:

مت پوچھو ممتاز نقی سے
کب کب تھا کس کس کا ملازم

یہی ''میں'' ہے جو ہے فساد کی جڑ
''ہم'' سے کہتا ہے، کیسا خوف اور ڈر
تو بھی ''میں'' کو جگا کے بن جا نڈر
شروع ہوتی یہیں سے ہے گڑبڑ

....

کب تک اس ''میں'' کے ہم غلام رہیں
کیوں نہ اس ''میں'' کو ''ہم'' میں ضم کردیں

اس نظم میں انانیت کی فسوں کاری کی جو عکاسی کی گئی ہے اس میں ان کا بڑا سیدھا سادا اور عوامی اسلوب ہے اور آخر میں:

کیوں نہ اس ''میں'' کو ''ہم'' میں ضم کردیں

کہہ کر انہوں نے اس فساد کو ختم کرنے کی نشاندہی بھی کردی ہے۔

ممتاز نقی کی دیگر نظموں میں ''سب سے بہتر'' ''خوشبو'' ''خوبی خامی'' ''خود احتسابی'' ''آخری سفر'' ''آمنے سامنے'' ''سیانا کوا'' ''آج کے بچے'' ''تڑپ'' ''مجھے انسان بننا ہے'' موضوع اور معنویت کے لحاظ سے مختلف رنگوں سے مزین ہیں۔ ہر نظم کا ایک اپنا موڈ، ایک اپنا انداز، اپنی چاشنی ہے۔

چند نظموں کے منتخب اشعار سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ممتاز نقی اپنی بات کس سلیقے سے کہتے ہیں:

یہ خاکی بشر دونوں مرکب سے بنا ہے
ان دونوں میں حصہ کبھی یکساں بھی رہا ہے
خوبی ہو اگر زیادہ تو بنتا ہے وہ انسان
خامی ہو اگر زیادہ تو کہلاتا ہے شیطان

(خوبی اور خامی)

سوچتا ہوں دیار فانی سے
جاتے جاتے حساب کرجاؤں
کتنے پھولوں کو تازگی بخشی
رس بھرے کن پھلوں میں چاہت کے
کتنے کھیتوں کی آبیاری کی
دشمنی کس سے کس سے یاری کی
آج بے باق سب حساب کردوں
آج خود اپنا احتساب کروں

(خود احتسابی)

تم نے کہا تھا درد کا رشتہ ہے لازوال
دنیا ہمارے رشتے کی دے گی کبھی مثال
تم نے کہا تھا لوٹ کے جانا ہے اب محال
لیکن یہ کیسے جیت کی بازی پلٹ گئی؟
سب وعدے اور عہد کی کشتی الٹ گئی
پوچھو نہ مجھ سے تم ہی خود اس کا جواب دو
آئینے کے قریب تو اس وقت تم ہی ہو

(آمنے سامنے)

اس دنیا میں جو بھی آیا ہے
اپنی اپنی بولی لایا
سب سے اچھی ہے وہ زبان
پیار کی جس میں ہو پہچان
پیار نہ ہو تو بولی کیسی
روکھی سوکھی روٹی جیسی

(سیانا کوا)

ممتاز نقی کی غزلیں بھی یوں تو اپنے مخصوص انداز میں پیار محبت اور امن و آشتی کی رنگین کرنیں بکھیرتی ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ زندگی کی دیگر حقائق کی عکاسی میں بھی وہ چوکتے نہیں ہیں۔ اشعار ملاحظہ فرمایئے:

انسانوں کی آبادی میں ایسے لوگ بھی بستے ہیں
مہنگائی کے دور میں بھی جو سب سے زیادہ سستے ہیں
سچ تو یہ ہے ہم زہریلے سانپوں سے بھی بدتر ہیں
جب بھی موقع پاتے ہیں ہم اپنوں ہی کو ڈستے ہیں

....

خدمت تری، عادت مری، یہ بوجھ نہیں ہے
اپنی اسی فطرت سے تو کہلاتا ہوں انسان

....

میں ہوں امن کی فاختہ، مجھ سے کسی کو کیا گلہ
نوچ کر میرے پروں کو ظالموں کو کیا ملا؟
ایک جھلسی لاش کے پہلو میں اک گڑیا پڑی
دیکھتی تھی پھاڑ کر آنکھیں یہ آخر کیا ہوا؟
کھا گئی کس کی نظر اس پیارے پیارے شہر کو
کس نے جاری کردیا ہے ظلم کا پھر سلسلہ؟

....

تم کو کیا معلوم کہ کتنے دکھ جھیلے ممتاز نقی نے
ساتھی چھوٹا، ملک بھی ٹوٹا، روٹھ گئی تقدیر

دنیا داری ہے عیاری، اصلی دولت یار کی یاری
سب کے منہ پر کہہ سکتا ہوں، لاکھ چلیں شمشیر

....

کرچیاں آنکھوں میں کاجل بن گئی ہیں ان دنوں سانس میں چبھنے لگا ہے نفروں کا اب دھواں ممتاز نقی مصطفیٰ کسی ازم کا شکار نہیں۔ اس کی شاعری پیار، محبت کے حصار میں رہتی ہے۔ کبھی ماں کی محبت میں، کبھی وطن کی محبت میں اور کبھی اپنی چاہت میں اس کی شاعری کا دل دھڑکتا ہے۔ مگر وہ دھڑکن جو اس کی ذات سے وابستہ ہو، اس کی شاعری میں یوں سنائی دیتی ہے۔

دیکھا تم نے آنسو کیسے موتی بن کر بکھر گئے
اک تصویر بناؤ تم بھی، نام رکھو دیوانہ پن
ممتاز نقی کو دیکھا ہے تو جانو بھی پہچانو بھی
اس کی ہستی، پیار ترستی، پھر بھی مستی میں جیوں

....

ہم کہاں اور تم کہاں، ملنے کی اب صورت نہیں
قرب ہے یادوں کا ہی ان فاصلوں کے درمیاں

....

کیسی کیسی ہیں خواہشیں میری
مت برا مان مجھ سے پاگل کا
تجھ سے ملنا ملانا کیا چھوٹا
حال اپنا ہے اڑتے بادل کا
میں بھی کچھ کم پاگل نہیں۔

ایک فلم کار کی قلم کاری کا ذکر کرتے کرتے ایسا بہکا کہ اس کی شعرو شاعری پر اتنا کچھ لکھ گیا جس کی شناخت فلم ہے۔ فلم نویسی ہے۔ مکالمہ نویسی، اسکرین پلے رائٹنگ اور کہانیوں اور ناولوں کو فلم کے روپ میں ڈھالنا رہا ہے۔ اس لیے اس تحریر کے اختتامی مرحلے میں اس کے فنی افکار کے بارے میں بتاتا چلوں کہ نقی مصطفیٰ فلم آرٹ کے سلسلے میں بڑا باشعور رہا ہے۔ اس لیے مکالمہ کو فلم میں ثانوی حیثیت اور بصری تصویر (Visual Images) کو اولیت دیتا تھا۔ وہ کہتا تھا اسکرین پلے رائٹر کو فلم میں کم مکالمہ استعمال کرنا چاہیے اور مافی الضمیر اور فلم کی کہانی متحرک تصویروں کے ذریعہ بیان کرنی چاہیے۔ ایک اچھے اسکرین پلے کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اسے پڑھ کر ظاہری طور پر یہ نہ سمجھا جائے کہ کرداروں کی زبان اپنی نہیں بلکہ الفاظ کسی اور نے لکھے ہیں۔ فلم کی کامیابی کا انحصار اچھے اور ب... ت اسکرین پلے پر ہوتا ہے۔ ایک اچھے اسکرین پلے کی مدد سے ایک ادنیٰ ہدایت کار ایک اچھی فلم بنا سکتا ہے لیکن ایک کمزور اسکرین پلے کے ذریعے ایک بڑا ہدایت کار اچھی فلم نہیں بنا سکتا۔

نقی مصطفیٰ فلم کو صرف کمرشل آرٹ نہیں، خالص آرٹ سمجھتا ہے لیکن اس کا خیال تھا کہ اس وقت اچے کاردار اور احمد بشیر کی طرح کوئی نیا اور انقلابی تجربہ کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ اس وقت فلمی صنعت پر سرمایہ کاروں (انویسٹرز اور ڈسٹری بیوٹرز) کا فلم ٹریڈ پر قبضہ ہے جن کا مقصد فلم آرٹ کی خدمت نہیں بلکہ حصول زر اور صرف حصول زر ہے۔

نقی مصطفیٰ کا کہنا تھا اس وقت آرٹ اور کمرشل ازم کے درمیان زبردست کشمکش جاری ہے۔ ایک بڑا طبقہ ہے جو فن فلم سازی کو محض منافع خوری کا ذریعہ سمجھتا ہے جبکہ دوسرا طبقہ جو زیادہ تر فنکاروں اور دانشوروں پر مشتمل ہے فلم کو خالص فن تصور کرتا ہے۔ جن کا مقصد صرف حصول زر نہیں بلکہ انسان کی فنی اور جمالیاتی ذوق کی تسکین اور فنکار کی تخلیقی خواہش کی تکمیل ہے۔ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں ان دو متضاد نظریوں کے درمیان کشمکش جاری ہے۔ ان میں مصالحت کی کوئی امید نہیں۔

نقی مصطفیٰ درمیانی راہ کا قائل ہے۔ وہ کہتا تھا۔ گو ہم مقبول عام موضوعات پر (مثلاً مقبول داستان، ناول، افسانہ یا ڈراما) کو لیں اور اس کے ٹریٹمنٹ، انداز اور پیشکش میں نیا اور انوکھا تجربہ کریں اور اسے زیادہ سے زیادہ فنکارانہ مہارت سے پیش کریں تو ہوسکتا ہے ہم بیک وقت فلم کے فنی اور تجارتی تقاضے پورے کرنے میں کامیاب ہوں۔

قیاس اغلب ہے کہ اپنے انہی سوچ اور وژن کے تحت اس نے مختصر مدت کے بعد فلم نگاری سے توبہ کرلی۔ وہ جس انداز اور ڈھب کی فلموں کی تخلیق کا خواہاں تھا، ویسے فلمساز و ہدایت کار اسے ملے نہیں۔ محض اپنے کچن کے اخراجات کے لیے اس نے اپنے وژن اور افکار کا خون نہیں کیا۔ میر سے معذرت کے ساتھ:

پیدا کہاں ہیں ایسے اعلیٰ طبع لوگ
افسوس تم کو نقی سے محبت نہیں رہی

اعتراف

عزیز میرٹھی

پاکستانی فلمی صنعت میں عزیز میرٹھی کا شمار ان قلم کاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے ایسی بہت سی فلمیں لکھیں جو باکس آفس پر کامیابی کی ضمانت ٹھہریں۔ وہ نہ صرف ایک اچھے قلمکار تھے بلکہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ ہروقت ہنستے مسکراتے رہتے تھے مگر ان کی زندگی میں کسی نے جھانکنے کی کوشش نہیں کی کہ شگفتہ جملوں سے فلم بینوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لا دینے والے قلمکار کے دل میں کس طرح دکھ بھرا ہوا ہے۔

ایک معروف قلم کار کے قلم سے خود اپنا نثری مرثیہ

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مرجھا گئے۔ یہ جرم تو خیر موسمِ خزاں کا تھا جو قانونِ قدرت بھی ہے اور جسے بدلنا انسان کے بس میں نہیں لیکن ماتم ان غنچوں کا جنھیں بے رحم انسان نے اپنے ہاتھوں سے مسل کر پیروں تلے کچل ڈالا۔ یہ ماتم اس وقت اور بھی زیادہ شدت کا متقاضی ہوجاتا ہے جب جرم کسی مجنون ومخبوط الحواس یا نادان بچے سے سرزد ہونے کی بجائے' کوئی دانا بینا اور باشعور وباحواس انسان ایسے بہیمانہ جرم کا مرتکب ہوا ہو۔ ایسے مجرم کے لیے اپنی صفائی میں اس کے سوا اور کچھ کہنے کی گنجائش نہیں کہ یہ جرم مجھ سے غیر ارادی طور پر ہوگیا۔ میں بے قصور ہوں۔ میں نے دانستہ قتل نہیں کیا۔ بقول شاعر آ گئی ایسی موج کہ ساحل چھوٹ گیا۔ ورنہ اپنی کشتی کون ڈبوتا ہے؟

کاش کسی دانشور کا قول صادق اور مندرجہ ذیل چشم کشا تحریر اس حادثہ فاجعہ کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے میری نظر سے گزر چکے ہوتے۔ ''غصہ حماقت سے شروع ہوکر ندامت پر ختم ہوتا ہے' تو غیظ وغضب اور طیش وتمرد کی جگہ تحمل و برداشت اور عفو ودرگزر کا سبق دیتی یہ بے مثال تحریر۔

[illegible] چالان کرتا ہے۔ عظیم موجد اور مشہور سائنس داں اسحاق نیوٹن' ناشتے سے فارغ ہوتے ہی اپنی لائبریری میں کاغذ قلم تھام کر بیٹھ گئے اور چندے غور وفکر کے بعد کشش ثقل کی تھیوری پر مضمون تحریر کرنے میں اس قدر محو ومنہمک ہوئے کہ دوپہر کا کھانا تک یاد نہ رہا۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہوگیا۔ ایسے عالم میں نوکر چاکر بھی مداخلت کرنے سے کتراتے تھے۔ مبادا ان کی ناراضی کا باعث بنیں۔ یوں بھی مصروفیت کے وقت بلا اجازت کسی کو کمرے میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ صفحۂ قرطاس پر لفظ نظروں سے اوجھل ہونے لگے تو وہ حالتِ استغراق سے چونکے' میز پر رکھی شمع روشن کی اور دوبارہ اپنے کام میں پہلی سی توجہ کے ساتھ مصروف ہوگئے اور مضمون کو ختم کرکے ہی دم لیا۔ ہاتھ سے قلم رکھ کر انگلیاں چٹخائیں اور اطمینان کا سانس لیا تو آنتوں نے قل ھو اللہ پڑھ کر شدید بھوک کا احساس دلایا۔ اور وہ بے تابی سے لپکے ہوئے باورچی خانے کی طرف چلے گئے۔ کھانے سے فارغ ہوکر دوبارہ لائبریری میں آئے تو ان کا پالتو کتا ڈبی انہیں دیکھتے ہی میز سے چھلانگ لگا کر ان کے اردگرد چکر کاٹنے لگا۔ وہ میز کی طرف بڑھے تو دھک سے رہ گئے۔ ان کی دن بھر کی محنت کا حاصل جل کر راکھ ہوچکا تھا۔



ہوا دراصل یہ تھا کہ جاتے وقت وہ جلدی میں شمع گل کرنا بھول گئے تھے۔ ڈینی نے پنجہ مار کر شمع مسودے پر گرادی۔ آبنوسی میز تو جلنے سے بچ گئی۔ البتہ ان کے تحریر کردہ تمام کاغذات جل بجھے تھے۔ نیوٹن صاحب نے انتہائی تکلیف دہ انداز میں دل شکستگی سے میز پر پڑی کاغذوں کی راکھ کو انگوٹھے اور انگلیوں سے مسل کر ڈینی کی طرف دیکھا جو پیار سے دم ہلاتا، ان کی ٹانگوں سے یوں لپٹ رہا تھا جیسے کوئی کارنامہ سرانجام دینے کے بعد انعام کا مستحق ہو۔ انہوں نے جھک کر ڈینی کو گود میں لے لیا اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے ہی دکھی لہجے میں کہا ''ڈینی، مائی ڈیئر! یہ تم نے کیا، کیا؟ کاش تم جان سکتے۔ میرا کتنا بڑا نقصان کردیا اور مجھے کتنی تکلیف پہنچائی ہے تم نے۔'' پھر کتے کو گود سے اتارا اور دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''چلو بھاگو یہاں سے شریر کہیں کے۔''

کہتے ہیں ہر کام میں اللہ سبحانہ، تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ یہاں مجھے ایک مختصر سی حکایت یاد آتی ہے۔ جس کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ روسی دارالخلافہ ماسکو کے ایک قصبے میں گھوڑوں کا ایک سوداگر رہتا تھا، ایک روز ٹھنڈ لگ جانے سے اس کا اکلوتا نوجوان بیٹا شدید بیمار ہوگیا۔ اس کے ہمسائے لڑکے کی عیادت اور اظہارِ افسوس کرنے آئے تو سوداگر نے کہا۔

''اس میں افسوس کی کیا بات ہے؟ بیماری اور تندرستی تو زندگی کا حصہ ہیں۔''

لوگ یہ کورا جواب سن کر اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ چند روز کے علاج معالجے سے لڑکا تندرست ہوگیا تو ہمسائے اور عزیز واقربا پھر مبارک باد دینے کے لیے جمع ہوئے اور بیٹے کی شفایابی پر خوشی کا اظہار کرکے کہنے لگے۔

''اس خوشی کے موقع پر آپ کو مٹھائی تقسیم کرنی چاہیے۔''

''بیٹا، میرا تندرست ہوا ہے اور خوشی آپ کو ہو رہی ہے تو مٹھائی بھی آپ ہی بانٹیے، میرے لیے تو یہ معمول کی بات ہے۔'' سوداگر نے کہا۔

بجائے شکریہ ادا کرنے اور اظہارِ ممنونیت کے سوداگر کی سردمہری اور بے مروتی سے مایوس ہوکر لوگ اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

چند روز بعد سوداگر کا بڑا ہی چہیتا مشکی گھوڑا چوری

ہوگیا۔ اہلِ محلّہ کو پتا چلا تو وہ پھر سوداگر سے افسوس اور اظہارِ ہمدردی کرنے چلے آئے۔

سوداگر نے حسبِ عادت جواب دیا ''ملک میں روزانہ ہزاروں کی تعداد میں ڈاکے پڑتے ہیں' ایک میرا گھوڑا چوری ہوگیا تو کیا قیامت آ گئی؟'' (زندگی کی بابت بالکل یہی رویّہ والد مرحوم کا تھا)

ہمسائے پھر اپنا سا منہ لے کر لوٹ گئے۔ ایک ہفتے بعد ہی سوداگر کا مشکی گھوڑا کئی دوسرے گھوڑوں کو ساتھ لیے اپنے اصطبل میں آ پہنچا۔ لوگ دوڑے ہوئے نئے گھوڑوں کو دیکھنے آئے اور سوداگر کی خوش قسمتی کے گن گانے لگے۔

''دوستو! نہ گھوڑے کا چوری ہونا میری بدنصیبی تھی' نہ اس کا مع چند دوسرے گھوڑوں کے گھر لوٹ آنا میری خوش نصیبی ہے۔''

ظاہر ہے سوداگر کا یہ خشک جواب اور تلخ رویّہ لوگوں کو پسند نہ آیا۔

ایک روز سوداگر کا بیٹا' مشکی گھوڑے پر سوار ہو کر سیر کرنے کے لیے گھر سے نکلا۔ راستے میں ایک کوبرا سانپ کو پھن پھیلائے' پھنکارتے دیکھ کر گھوڑا بدک کر الف ہوگیا۔ سوار سنبھل نہ سکا اور گھوڑے کی پیٹھ سے زمین پر آ پڑا جس سے اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ وہ زخمی ٹانگ لیے بہ مشکل گھر پہنچا تو اہلِ خانہ میں کہرام مچ گیا۔ شور ماتم سن کر ہمسائے اور عزیز واقربا پھر اکٹھے ہو کر سوداگر سے افسوس اور بڑھ چڑھ کر اظہارِ ہمدردی کر کے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔

سوداگر نے ان کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''بھائیو' بہنو اور دوستو! آرام سے اپنے گھروں کو جاؤ۔ مجھے اس حادثے کا کوئی دکھ نہیں کیونکہ گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں' وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے۔ نیز میں سمجھتا ہوں' یہ مصلحتِ وقت ہے۔ جس میں میری بھلائی پوشیدہ ہے۔ ذرا سوچو' ٹانگ کی بجائے گھوڑے سے گر کر میرے بچے کی گردن بھی ٹوٹ سکتی تھی۔ ٹانگ تو دو چار ماہ میں ٹھیک ہو جائے گی لیکن اگر وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا تو اسے دوبارہ زندگی کون دیتا؟''

سوداگر کی اس مدلل تقریر پر ہمدردی جتانے والوں کے ردِعمل کا ذکر کرنا باعثِ تکرار اور بے سود ہوگا۔ لڑکے کی ٹانگ پر پلستر چڑھا دیا گیا اور وہ کچھ عرصے کے لیے بستر پر پڑ گیا۔ انہی دنوں ملک میں جنگ چھڑ گئی۔ فوج کی نفری میں اضافہ کرنے کے لیے ہر خاندان سے ایک ایک نوجوان لڑکے کو زبردستی بھرتی کر کے گولیوں اور توپوں کی خوراک بننے کے لیے محاذِ جنگ پر بھیج دیا گیا لیکن سوداگر کا بیٹا معذور ہونے کی وجہ سے فوجی افسران کی دستبرد سے محفوظ رہا۔

ذکر نیوٹن کا ہو رہا تھا۔ تو راوی لکھتا ہے' پہلا مضمون نذرِ آتش ہو جانے کے بعد نیوٹن نے پہلے مضمون سے کہیں زیادہ بہتر مضمون سپردِ قلم کر لیا اور ڈیمی کو پیار سے دودھ پلاتے ہوئے کہا ''ڈیمی! نئے مضمون کا سہرا تمہارے سر ہے۔'' اسی موضوع سے متعلق مشہور ڈراما نگار آغا حشر کاشمیری کا بھی ایک شعر زبان زدِ عام ہے۔

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

یہ سب کچھ اپنی جگہ مگر ایک عقدا آج تک حل نہ ہو سکا کہ مجھ پر ٹوٹی خودساختہ آفت بلکہ قیامت میں خدائے ذوالجلالِ والاکرام کی کیا مصلحت پوشیدہ تھی۔ میری کیا بھلائی ذاتِ باری تعالیٰ کو منظور ومقصود تھی' کاش اس عظیم موجد کی زندگی کا یہ سبق آموز واقعہ میں نے پہلے پڑھا ہوتا تو یقیناً اس روح فرسا صدمے سے دوچار نہ ہونا پڑتا جو آدھی صدی گزر جانے کے باوجود مجھے آج بھی خون کے آنسو رلاتا ہے۔ اس حادثے سے جو زخم دل وجگر پر لگے ہیں' کبھی مندمل نہ ہوں گے۔ زندگی کے آخری سانس تک رستے رہیں گے۔

کہاں ایک جانور کے لیے نیوٹن کا یہ جذبۂ رحم وشفقت اور کہاں ایک معصوم جان کے لیے میرا وہ غضبناک طیش اور قساوتِ قلبی۔ اور معصوم بھی کون؟ اپنے ہی دل کا ٹکڑا' اپنا ہی نورِ عین۔

جون کا مہینا تھا۔ گرمی اپنے شباب پر تھی۔ آگ برساتا سورج نصف النہار پر تھا۔ چلچلاتی دھوپ ٹھہری ہوئی تھی اور ہوا بند' زمان ومکاں تنور کی طرح تپ رہے تھے۔ قبلہ' جوش کی زبان میں وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ۔

میں اپنے کمرے میں چٹائی پر بیٹھا پسینے میں شرابور ایک فلم کا اسکرین پلے لکھنے میں معروف تھا کہ اچانک پورے صفحے پر پانی کے چھینٹے آ کر پڑے اور پوری عبارت ایبسٹریکٹ آرٹ کا نمونہ بن گئی۔ میں نے یکا یک سر اٹھا کر دیکھا تو ننھا اعظم جس کی عمر اس وقت بہ مشکل ساڑھے تین سال ہوگی۔ ململ کا کرتہ اور لٹھے کا پاجامہ پہنے سر تا پا پانی میں بھیگا میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے گلابی گال شبنم پڑے تازہ گلابوں کی طرح دہکے ہوئے تھے۔ اس کے گھونگھریالے بالوں سے پانی کے قطرے مسلسل اس کے چہرے پر ٹپک

اور ڈھلے ہوئے پیازی رنگ بھرے بھرے لبوں پر ہنسی رہی تھی۔ وہ گرمی سے گھبرا کر یا یونہی پانی سے کھیلنے کے کپڑوں سمیت نہ جانے کب سے نلکے کے نیچے کھڑا تھا۔ اب کھیل سے اکتا کر اسی حالت میں میرے پاس چلا آیا ۔ نہ جانے وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتا تھا۔ مگر میں نے آؤ دیکھا رجسٹر پر پانی کے چھینٹے گرتے ہی پورے زور سے ایک اس کے نرم و نازک گال پر جڑ دیا۔ جہاں فوراً ہی پانچ کے نشان ابھر آئے۔ طمانچہ کھا کر وہ رویا نہیں، بلکہ سہم رہ گیا۔ اور خوف و دہشت سے آنکھیں پھاڑے میری دیکھنے لگا۔ شاید وہ اپنی زبانِ بے زبانی سے یہ پوچھنا تا تھا کہ اسے کس جرم کی سزا دی گئی ہے۔ اب اس کی سیاہ پلکوں پر آنسوؤں کے دو قطرے سیپ سے جھانکتے سچے تیوں کی مانند جھلملانے لگے۔ میں نے سختی سے ڈانٹ کر ۔ ''جاؤ، اپنے کپڑے سکھاؤ۔''

وہ سسکیاں لیتا آہستہ آہستہ کمرے سے نکل گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا، یہ ایک طمانچہ میرے معصوم لختِ جگر کی موت کا بن جائے گا۔ کاش یہ منحوس ہاتھ اس پر اٹھنے سے پہلے لوج ہو جاتا۔ سمجھ میں نہیں آتا، قلم تھامنے والا ہاتھ تشدد کے کیسے اٹھا اور تشدد بھی اپنے سب سے لاڈلے اور سب سے زیادہ خوبصورت نورِ نظر پر...... ہائے، وہ کیا لمحہ تھا شیطان لعین نے میری عقل پر غفلت کا پردہ ڈال دیا اور دستِ جور و ستم اپنے دل کے تندرست و توانا ٹکڑے پر اس دردی سے عتاب آزما ہوا۔ وہ ساڑھے تین سال کی عمر پانچ سال کا نظر آتا تھا۔ تم (اشارہ اپنی بیوی کی طرف ۔ خود نوشت سوانح حیات ''عکسِ ماضی'' میں نے اپنی بہتر سیدہ سعیدہ خاتون کی وفات کے 3 سال بعد، اس یادوں کو تازہ کرنے کے لیے تحریر کرنا شروع کی تھی) تم نظرِ بد سے بچانے کے لیے، نہلا دھلا کر اس کی آنکھوں سرمہ اور چمکتے ماتھے پر توے کی سیاہی لگا دیا کرتیں اور میں توہم پرستی پر تمہیں تمسخر کا نشانہ بناتا تو تم بڑے یقین سے ہیں۔

''آپ کیا جانیں، بری نظر تو پتھر کو پھاڑ دیتی ہے۔'' تو واقعی ہمارے اعظم کو کسی دشمن کی نظرِ بد کھا گئی؟ نہیں، اس معصوم کی ہلاکت کا ذمے دار میں ہوں، صرف میں۔ اگر چہ وقت میں نے تمہیں اصل بات سے آگاہ نہیں کیا تھا لیکن جب کہ تم اس دنیا میں نہیں ہو، میں دل کی گہرائیوں سے گناہ کا اعتراف کرتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں، قیامت جب داورِ محشر میرے گناہوں کا حساب کرے گا تو میرا یہ گناہ کبیرہ سرفہرست ہوگا۔ میری جان! میں تمہاری روح سے شرمندہ ہوں، کیا تم میرا یہ قصور جو مجھ سے غیر ارادی طور پر سرزد ہوا معاف کر دو گی؟ اگر چہ میں معافی کا مستحق نہیں لیکن امید رکھتا ہوں کہ تم میرے عرقِ انفعال کو اپنے دامنِ التفات میں سمیٹ لو گی۔

اعظم کمرے سے نکل گیا تو میں ضائع شدہ اوراق کو رجسٹر سے پھاڑ کر ازسرِنو لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ مغرب کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ حمید نظامی کی بیوی آمنہ جو رشتے میں میری سالی بھی تھی، کوٹھے کی منڈیروں اور الگنی پر سوکھے کپڑے اکٹھے کرنے آئی تو چیخ اٹھی ''باجی...... باجی! دیکھو تو تیرے اعظم کو کیا ہوا؟''

تم اس وقت گھر پر موجود نہ تھیں۔ آمنہ کی چیخیں مجھے سنائی دیں تو اٹھ کر بھاگا۔ کوٹھے پر جا کر دیکھا تو آمنہ بے ہوش اعظم کو گود میں لیے، اس کا نام لے لے کر پکار رہی تھی اور ہوش میں لانے کے لیے جھنجوڑ رہی تھی۔ اس کے کپڑے خشک ہو کر بدن سے چپکے ہوئے تھے، وہ نادان میرا طمانچہ کھانے کے بعد بھیگے ہوئے بدن اور کپڑوں سمیت چلچلاتی دھوپ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ غالباً کچھ دیر بعد چکرا کر توے کی طرح تپتی ہوئی چھت پر گر پڑا اور بے ہوشی کی حالت میں سورج غروب ہونے تک وہیں پڑا رہا۔ اس نادان کو کیا معلوم تھا کہ گیلے کپڑے بدن سے اتار کر سکھائے جاتے ہیں۔ اس کے چہرے اور جسم پر جگہ جگہ نیلے اور سرخ رنگ کے دھبے پڑے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے جگہ جگہ رگوں میں خون جم گیا ہو۔ میں اسے فوراً ہی مصری شاہ میں ڈاکٹر سلیم فاروقی کے پاس لے گیا اور من و عن سارا ماجرا اس کے گوش گزار کر دیا۔ ڈاکٹر نے کہا ''بچے کو سرسام ہو گیا ہے۔'' مہینوں اس کا علاج ہوتا رہا۔ مگر کوئی افاقہ ہونے کی بجائے مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ روز بہ روز اس کی صحت گرتی گئی۔ ایک دن صبح کے وقت باورچی خانے میں تم گرم گرم چپاتیاں توے سے اتار رہی تھیں اور میں ان پر دیسی گھی چپڑ رہا تھا۔ اعظم میرے پاس تپائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ معلوم نہیں اس کا خون پانی ہو گیا تھا یا کیا کہ بدن پر جس جگہ بھی وہ اپنے ہاتھ کا دبا ڈالتا، وہ حصہ چاک پر چڑھی نرم مٹی کی طرح دب کر رہ جاتا اور دیر تک ابھر کر گوشت اپنی اصل حالت میں نہ آتا۔ گزشتہ رات کو تم نے کھجریلا بنایا تھا اور میرے لیے ایک پلیٹ بچا کر رکھ دی تھی۔ ناشتے کے ساتھ تم نے وہ پلیٹ بھی میرے سامنے رکھ دی۔ اعظم کھجریلا کھانے کے لیے کبھی آنکھوں سے اور کبھی ہاتھ سے اشارہ کر رہا تھا کہ تم نے دیکھ لیا اور فوراً ہی مجھ سے

کہا۔
''اسے نہ دینا کجریلا ٹھنڈا ہوتا ہے۔ کہیں نقصان نہ دے جائے۔''
کجریلا کیا نقصان دے گا؟ بقول تمہارے کہیں مجھے نظر ہی نہ لگا دے۔ میں نے چھیڑا تو تم ہنس پڑیں۔ وہی ہنسی جس پر میں دل و جان سے فدا تھا۔ میں کجریلا کھاتے ہوئے کبھی کبھی آدھی پنجی اس کے منہ میں بھی دے دیتا' اچانک تم تڑپ اٹھیں۔
''ہائے میں مرگئی' ذرا دیکھو تو۔'' میں نے گھبرا کر دیکھا تو تمام کجریلا جو میں نے اسے کھلایا تھا۔ اس نے اپنے سامنے چٹائی پر اگلا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ ماتھے پر پسینے کے باریک باریک قطرے اور آنکھوں کی پتلیاں چڑھی ہوئی تھیں۔
''ارے' اسے کیا ہوا؟'' میں نے سخت پریشانی کے عالم میں قریب پڑے کھٹولے پر لٹانے کے لیے اپنے بازوؤں میں اٹھایا۔ چشم زدن میں اعظم کے بجائے اپنے ہاتھوں میں برف کی ایک سل پکڑی محسوس کی۔ اس نے دل چیر دینے والی نظروں سے مجھے دیکھا اور بھک سے اس کی زندگی کا چراغ بجھ گیا۔ کھٹولے تک پہنچنے سے پہلے ہی اس نے میرے ہاتوں میں دم توڑ دیا۔ اعظم کی موت پر تمہارا جو حال ہوا' اسے بیان کرنے کی مجھ میں سکت نہیں لیکن اہلِ درد بیان کیے بغیر ہی خوب اندازہ لگا سکتے ہیں۔ غم دراصل کیا ہوتا ہے اس کا اندازہ اس روز مجھے پہلی بار ہوا۔ اس سے پیشتر میں یونہی معمولی معمولی باتوں پر رنجیدہ ہو جایا کرتا تھا۔ یہ پہلا زخم دل تھا جس نے مجھے حقیقی غم سے آشنا کیا۔ اس کے بعد تو جیسے زخموں نے گھر دیکھ لیا۔ تین کمسن بیٹوں کو اپنے ہاتھوں سے کفن پہنایا۔ پیارے ابا جان کے سائے سے محروم ہوا۔ سال بعد ہی شفیق ماں کی جدائی کا صدمہ سہنا پڑا۔ خاندان کے بہت سے قریبی عزیزوں اور خونی رشتوں کے علاوہ 90ء میں اپنے لائق اور نامور بیٹے صحافی اکرم کامل کا جنازہ عین عالمِ شباب میں اپنے نحیف و نزار کاندھوں پر اٹھا کر' لرزتے وجود اور ڈگمگاتے قدموں سے قبرستان تک لے گیا۔ چار سالہ پوتا ریحان کامل میرا دامن تھامے' باپ کے جنازے کے ہمراہ تھا۔ برادرم بیدار سرمدی نے روزنامہ نوائے وقت میں ''کتاب سے قبرستان تک'' کے عنوان سے اپنے دوست کی بے وقت وفات پر بڑا دردناک اور پُراثر مضمون سپردِ قلم کر کے حقِ دوستی ادا کیا۔ بھائی عبدالحمید' عبداللطیف' محمد حنیف ایک ایک کر کے داغ مفارقت دے گئے۔ آخر کار سروس اسپتال کے زنانہ وارڈ میں' اکتوبر 79ء کی سرد رات کو میری بے نیازیوں' بے پروائیوں اور عدم توجہی کا گلہ شکوہ کیے بغیر تم نے بھی اس سوختہ جاں سے ہمیشہ کے لیے منہ چھپا لیا۔ اور پاک و ہند میں دور دور تک اپنے چاہنے والے عزیزوں کی آنکھوں میں آنسو اور دلوں میں دکھ بھری یادیں چھوڑ گئیں۔ عمر کے آخری ایام میں چار نواسوں اور دو پوتوں کے علاوہ بڑی بیٹی راشدہ بانو کو بیوگی کا داغ بھی لگتے دیکھا۔ میں سمجھتا ہوں طویل عمر بھی کسی دردناک عذاب سے کم نہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ دل کی حالت بقول شاعر کچھ ایسی ہوگئی ہے۔

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

ابھی ہماری آنکھوں سے آنسو خشک نہ ہوئے تھے۔ دل کے زخموں سے تازہ تازہ خون رسنا ہنوز بند نہ ہوا تھا کہ 14 اکتوبر 50ء کو پاکستان کے پہلے وزیراعظم' قائداعظم کے ساتھی لیاقت علی خان کے شہید ہونے کی خبر ریڈیو پر سنی۔ یہ خبر اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ پوری پاکستانی قوم پر سکتے کا عالم طاری ہوگیا۔ کچھ دیر کے لیے تو ہم اپنے اعظم کا غم فراموش کر بیٹھے۔ خبر میں بتایا گیا کہ وزیراعظم لیاقت علی خان راولپنڈی کے لیاقت باغ میں ایک ہجوم کے سامنے تقریر کر رہے تھے کہ سید اکبر نامی ایک شخص نے ان پر مسلسل گولیاں چلائیں۔ زخموں کی تاب نہ لا کر وہ اسٹیج پر گرے اور موقعے پر ہی اپنی جان' جان آفریں کے سپرد کر دی۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ان ساٹھ برسوں میں کتنی حکومتیں آئیں اور کتنی گئیں۔ لیکن آج تک شہیدِ ملت کے قتل کی سازش سے کوئی بھی پردہ نہ اٹھا سکا یا دانستہ اپنے عوام کو اس گھناؤنی سازش سے آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھا گیا کہ امورِ مملکت خویش خسروان دانند' شاید قتل کے اس واقعے میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہوں...... اور اس کے بعد تو جیسے مملکت خداداد پاکستان کی یہ ریت ہی بن گئی۔ مشہور ادیب امتیاز علی تاج قتل ہوئے۔ مشہور ہدایت کار خلیل قیصر کو ان کے گھر پر خنجروں کے وار کر کے موت کی ابدی نیند سلا دیا گیا۔ لیجنڈ اداکار سلطان راہی ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے گئے۔ آج تک قانون مجرموں کو پکڑنے سے قاصر اور سماج دشمن عناصر کا قلع قمع کرنے سے معذور نظر آتا ہے۔



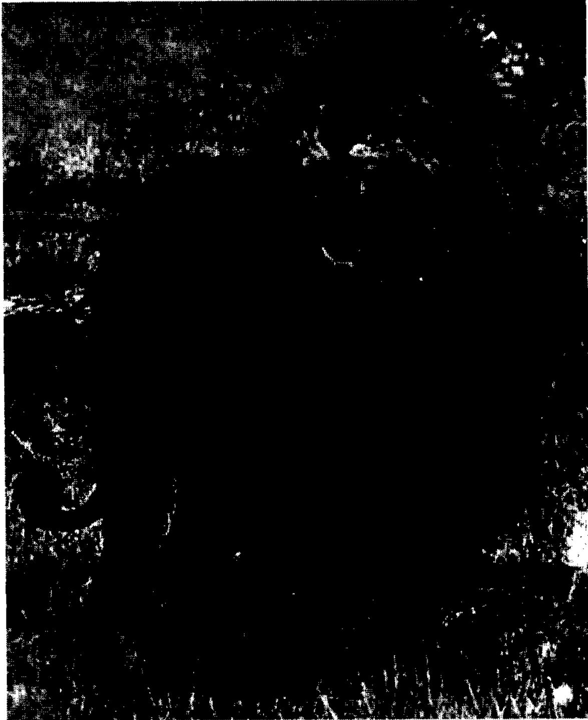
این گونگ کا آدم خور

خالد قریشی

شکار اور وہ بھی شیر کا شکار جسم و جاں میں سنسنی سی دوڑا دیتا ہے لیکن وہ شیر اگر آدم خور ہو تو اور بھی زیادہ ہیجان خیزی پیدا کردیتا ہے۔ اس شوق کا ایک اپنا ہی مزہ ہے۔

شکاریات پڑھنے والوں کے لیے ایک تحفہ

کیون ہلینون ڈینش اپنی کتاب ''آؤٹ آف افریقا'' میں خوفناک شیروں اور ان کے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے جانوروں کے متعلق لکھتا ہے کہ درندوں کی جانب سے انسانوں پر بڑھتے ہوئے حملوں کا جواز انسانی آبادی کا تیزی سے پھیلاؤ اور درندوں کے رہائشی علاقوں پر قبضہ ہے۔ کینیا کے این گونگ ٹاؤن میں پہاڑوں کی طرف بڑھتے ہوئے چائے کے کھیت جو کینیا کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان خاص علاقوں میں



وارداتیں بڑھ گئی ہیں۔ وہاں جہاں جنگلی حیات وزرعی ضروریات متاثر ہورہی ہیں۔ اورآئے دن انسان پر حملے کی خبریں گردش کرتی ہوئی سنی جاسکتی ہیں۔ انہی میں سے ایک آفت آدم خور شیر کی صورت میں این گونگ ٹاؤن پر نازل ہوئی۔ اس کے نازل ہونے کی وجہ پہلے پہل صرف انتقام کی حد تک محدود تھی۔ کیونکہ ٹاؤن کے رہائشی شیروں کے مخصوص علاقے میں گھسنے کے مرتکب تھے ان کو شکار کرلینے کے بعد شیروں کا حوصلہ بڑھ گیا اور وہ ان کے لذیذ گوشت کے شوق میں آدم خوری کی عادت میں مبتلا ہوگئے۔ مجھے شیروں کے آدم خوری میں مبتلا ہونے کی اطلاع اپنے دیرینہ دوست باسکو کے خط کے ذریعے موصول ہوئی۔ جس میں اس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں ٹاؤن والوں کو آدم خور کی چیرہ دستیوں سے نجات دلوانے کے لیے این گونگ چلا آؤں۔

چائے کی پتیوں کی چنائی کا وقت گزرتا جارہا ہے اور باغ میں چنائی کرنے والی عورتیں کام کے لیے کسی صورت بھی آمادہ نہیں ہورہی ہیں۔ ان کا مطالبہ ہے کہ جب تک کوئی باقاعدہ شکاری ہاتھوں میں رائفل تھامے ان کی نگرانی پر معمور نہیں ہوگا، تب تک وہ باغ میں چنائی نہیں کریں گی۔ خط پڑھنے کے بعد میں نے اپنا مختصر سامان باندھا اور پہلی فرصت میں این گونگ چلا آیا۔ ٹاؤن کے ماحول پر آسیب کا سایہ سا مسلط تھا۔ لوگوں نے دن کے وقت بھی گھروں سے نکلنا ترک کردیا تھا۔ قصبے کے رہائشی بری طرح خوف میں مبتلا تھے۔ آدم خور اب تک پندرہ کے قریب رہائشیوں کو لقمۂ اجل بنا چکا تھا۔ میرا پہلا دن ٹاؤن کے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے گزر گیا۔

دوسرے دن، رات کو کھانا کھانے کے بعد باسکو نے مجھے چھوٹے سے تھرماس میں کافی بھر دی اور میں رائفل تھامے گھر سے باہر نکل آیا۔ بازار کا مختصر چکر لگانے کے بعد میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر کافی پینے لگا۔ میری رائفل کے سرے پر ٹارچ نصب تھی۔ میں حسبِ ضرورت اسے آن اور آف کرسکتا تھا۔ کچھ دیر بعد پہاڑوں کے پیچھے سے چاند نمودار ہوا اور دھندلایا ہوا منظر واضح ہوگیا۔ میں نے ابھی کافی کی پیالی ختم کی ہی تھی کہ مجھے دور پہاڑی ڈھلوانوں کی جانب سے کسی انسان کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے سرعت سے کافی کی پیالی اور تھرماس کو کپڑے کے تھیلے میں ڈال کر تھیلے کو کندھے پر لٹکایا اور رائفل تھامے اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے انسانی آواز کی سمت کا تعین کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ آواز کا رخ جنوب میں چائے کے باغات کے اوپر کی طرف تھا۔ چونکہ ہوا میری طرف چل رہی تھی اس لیے اتنی دور سے بھی آواز مجھ تک باآسانی پہنچ گئی تھی۔ میں نے کان آواز پر لگا کر ذہن کو مستحکم کیا۔ کچھ دیر کے لیے آواز رک گئی۔ پھر نہایت واضح سنائی دینے لگی۔ وہ کسی لڑکی کی آواز تھی جو گانے کی دھن پر گلا پھاڑ کر طبع آزمائی کررہی تھی۔ میں نے ہاتھ پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ باسکو کے کہنے کے مطابق آدم خور کی پے درپے وارداتوں کے بعد ٹاؤن والوں نے رات کو تو درکنار دن کو بھی باہر نکلنا ترک کردیا تھا لیکن مجھے رات کے اس پہر لڑکی کی آواز نہایت واضح سنائی دے رہی تھی۔ وہ اب بھونڈے انداز میں گانا گارہی تھی۔ کچھ توہمانہ خیالات نے میرے دماغ کا محاصرہ کرنے کی کوشش کی۔ کہیں بدروح وغیرہ کا چکر تو نہیں تھا۔ میں نے فوراً خیال کو جھٹک کر دل کو تسلی دی۔ روحیں گانا نہیں گاتیں۔ میں ٹاؤن کے بازار سے نکل کر آواز کے تعاقب میں پتی کے باغات کی طرف چلا آیا۔ انسانی آواز ہر قدم کے ساتھ قریب آنے لگی۔ وہ کوئی بچی تھی جو نہایت انہماک کے ساتھ گانا گاتے ہوئے ٹاؤن کی طرف آرہی تھی۔ پتی کے باغات کے قریب پہنچنے کے بعد میں ایک بڑے درخت کے تنے کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہوگیا۔ میرے بالکل سامنے باغات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ اس بدروح کو انہی باغات سے نکل کر ٹاؤن میں داخل ہونا تھا۔ دور کہیں ککر چلایا۔ جنگلی لنگور اور ککر شیر کی پوشیدگی کا راز نہایت تفصیل کے ساتھ اجاگر کردیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ شیر میدانی علاقوں کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ اس وقت وہ شکار کی تلاش میں کہیں قریب ہی تھا۔ لڑکی کی آواز بہت نزدیک آگئی تھی۔ آواز سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس کی عمر دس سے پندرہ سال کے درمیان تھی۔ بچی کے گانے کی آواز شیر کو اپنی جانب متوجہ کررہی تھی۔ لڑکی کا وجود شدید خطرے میں گھرا ہوا تھا۔ اس نے اب گانا ترک کرنے کے بعد سیٹی بجانی شروع کردی تھی۔ میں درخت کے پیچھے سے نکل کر بھاگتے ہوئے پتی کے باغات کے پاس آکھڑا ہوا اور چلاتے ہوئے سیٹی بجانے والی لڑکی کو مخاطب کیا۔

"باغ میں جو بھی ہے، احتیاط کرے۔ آدم خور بھی باغ میں چھپا ہوا ہے۔" سیٹی کی آواز یکلخت رک گئی۔ پھر چند

لمحے خاموشی طاری رہنے کے بعد دوبارہ سنائی دی۔
''یہاں آدم خور نہیں ہے۔ میں اطراف کا جائزہ لے چکی ہوں۔ تم یقیناً آدم خور کی تلاش میں آنے والے شکاری ہو۔ ٹھہرو میں وہیں آرہی ہوں۔''
ایک دفعہ پھر خاموشی طاری ہوگئی۔ مجھے لڑکی کی بے وقوفی پر رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔ اگر یوں ہی جائزہ لینے سے آدم خوری میں مبتلا عیار شیر کی پوشیدگی کا راز عیاں ہوسکتا تھا تب پھر شکاریوں کو جنگلوں میں جھک مارنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ ٹاؤن والے مل کر نہایت آسانی کے ساتھ اس کا خاتمہ بالخیر کرسکتے تھے۔ مجھے قدموں کی آواز قریب آتی ہوئی سنائی دی۔ پھر لڑکی کا ہیولا دکھائی دیا۔ میرے اندازے کے عین مطابق وہ دس سے بارہ سالہ لڑکی کا سایہ تھا جو اندھیرے میں ہونے کی وجہ سے غیر واضح تھا۔ میں نے بندوق کے اوپر لگی ہوئی ٹارچ کا بٹن آن کردیا۔ روشنی کا سیلاب پھوٹا اور لڑکی کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس کے اردگرد کا کافی حصہ روشنی کی بدولت منور ہوا۔ اب نہ جانے یہ میرا واہمہ تھا یا پھر حقیقت...... میں نے کسی جانور کے سائے کو پھرتی کے ساتھ جھاڑیوں میں چھپتے ہوئے دیکھا۔ اس اثنا میں لڑکی باغ سے باہر نکل کر کھلے علاقے میں آگئی۔ میں نے لڑکی کے سراپے کا جائزہ لینے کی کوشش کی لیکن اس کا موقع میسر نہیں آسکا۔ باغات سے باہر نکلتے ہی وہ تیر کی طرح آگے بڑھی اور میری ٹانگوں کے ساتھ لپٹ گئی۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹا لیکن اس کی گرفت مضبوط تھی اور وہ جذباتی انداز میں بول رہی تھی۔
''تمہیں ایک سپاہی کی لڑکی کا سلام قبول ہو۔ میں رات کے اس پہر صرف تم سے ملنے کے لیے ٹاؤن تک آئی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ دن کی روشنی میں ایسا ممکن نہیں۔ وہاں پہرہ ہوتا ہے۔ کسی بھی پاگل کا باہر نکلنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن میں نے کر دکھایا۔'' وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوئی، تب میں نے جھٹکا دے کر اسے اپنی ٹانگوں سے علیحدہ کیا اور ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر ڈالی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ پھر چہرے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے تمہاری شرارت پسند آئی۔ لیکن اب اسے بند کردو۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔''
میں نے طویل سانس لیتے ہوئے ٹارچ کو بند کیا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے درخت کے نیچے لے آیا۔ اس کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا اور جسم میں وقفے وقفے کے ساتھ کپکپی کی وجہ سے لرزش پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے جسم پر پہنا ہوا کوٹ اتارا اور اسے پہنا دیا۔ وہ تشکر آمیز لہجے میں بولی۔ ''میں تمہارے احسان کو تمام عمر فراموش نہیں کر پاؤں گی۔ مجھے شدت کے ساتھ سردی کا احساس ہو رہا تھا۔''
میں نے جواب دیئے بغیر کمر کے ساتھ لٹکا ہوا کپڑے کا تھیلا نیچے اتارا اور کافی کی پیالی بھر کر لڑکی کے ہاتھوں میں تھما دی۔ اس نے ایک دفعہ پھر تشکر آمیز نگاہوں کے ساتھ میری طرف دیکھا اور کافی پینے لگی۔ میں نے چاند کی روشنی میں اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ مخلوط نسل کی سیاہ فام لڑکی تھی۔ اس کے بال عام سیاہ فاموں کی طرح گھنگریالے نہیں تھے بلکہ سیاہ اور لمبے تھے۔ آنکھیں بھینگی تھیں، ہونٹ پتلے تھے، ناک کچھ بھدی تھی، لیکن اس کے باوجود بھی وہ پرکشش دکھائی دیتی تھی۔ میں نے پہلی دفعہ اس کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔
''کیا تم پاگل خانے سے بھاگ کر آئی ہو؟''
اس نے کافی کی چسکی بھرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''ہاں.... کیا تم یقین کرسکتے ہو کہ میں پاگل ہوں۔''
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ پُرجوش لہجے میں بولی۔ ''کوئی بھی یقین نہیں کرتا لیکن ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ میں پاگل ہوں۔ میرا دل کرتا ہے کہ میں ان کی عقلوں پر ماتم کروں لیکن مجبور ہوں۔ کچھ بھی نہیں کرسکتی ہوں۔''
اس نے کافی ختم کرنے کے بعد پیالی میرے ہاتھوں میں تھما دی۔ میں نے پوچھا۔ ''اور پیو گی؟''
اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''نہیں، شکریہ..... تم سے ملاقات ہوگئی میرے لیے یہی کسی اعزاز سے کم نہیں ہے۔ اب میں واپس پاگل خانے کی طرف جاتی ہوں۔ اگر انہیں میرے فرار کے متعلق معلوم ہوگیا تب وہ میرے علاج کی مدت میں توسیع کردیں گے۔''
میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور درخت کے نیچے سے نکل کر باغات کی طرف چل دیا۔ باغات کے پاس پہنچنے کے بعد میں نے رائفل پر لگی ہوئی ٹارچ کا بٹن آن کردیا۔ پھر لڑکی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے رائفل کو کاندھے کے ساتھ لٹکا کر باغ میں داخل ہوگیا۔ وہ نہایت فرمانبرداری کے ساتھ میرے پیچھے چلی آرہی تھی۔ میں نے اونچی آواز میں پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''
''روز میری۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''پاگل خانے سے باہر کیسے چلی آئیں۔ کیا وہاں پہرہ نہیں ہوتا۔''

روز میری فخریہ لہجے میں بولی۔ ''جوزف شراب پینے کے بعد اپنے کمرے میں بے ہوش پڑا رہتا ہے۔ اس کی جیب سے چابیاں نکال کر پاگل خانے سے باہر نکلنا مشکل نہیں ہے۔''

میرے ہاتھ پاؤں سن ہونے لگے۔ روز میری جو کچھ کہہ رہی تھی اگر وہ درست تھا تب پھر یہ غیر ذمہ داری کی انتہا تھی۔ آدم خور شیر ٹاؤن کے گرد منڈلاتا پھر رہا تھا۔ اگر ایسے عالم میں کوئی بھی پاگل خانے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا تب پھر اس کا زندہ سلامت واپس جانا ممکن نہیں تھا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد روز میری دوبارہ بولی۔ ''اصولاً مجھے تم سے ملاقات کے لیے صبح آنا چاہیے تھا، لیکن جوزف دن کے وقت شراب نہیں پیتا۔ اس لیے مجبوراً مجھے رات کا انتخاب کرنا پڑا۔''

میں نے اس کی بات درمیان میں کاٹتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہیں میرے متعلق کہاں سے معلوم ہوا؟''

وہ بولی۔ ''صبح پاگل خانے کے تمام ڈاکٹرز کمرے میں چائے پیتے ہوئے تمہارے متعلق باتیں چیت کررہے تھے۔ وہ تمہیں بہترین شکاری مانتے ہیں۔ میرے والد بھی شکاری تھے۔ ایک سپاہی اور شکاری میں فرق ہی کتنا ہوتا ہے۔ دونوں رائفل کا استعمال باخوبی جانتے ہیں۔ تم یقیناً میرے والد جیسے ہی ہو۔''

میرے تیزی کے ساتھ اٹھتے ہوئے قدم جہاں تھے وہیں جم کر رہ گئے۔ وہ بولے چلی جارہی تھی۔ ''شام کے وقت میں نے تم سے ملاقات کا فیصلہ کیا اور رات کو جوزف کے شراب پینے کے بعد پاگل خانے کا دروازہ کھول کر باہر چلی آئی۔ میں ایسا پہلے بھی کئی دفعہ کرچکی ہوں۔ یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ میں تمام زندگی پاگل خانے میں ہی تو نہیں گزار سکتی ہوں۔ اکثر میرا باہر جانے کا دل کرتا ہے۔ دن کے وقت ایسا ممکن نہیں۔ لیکن رات کو میں ممکن بنالیتی ہوں۔''

میں نے پیچھے مڑتے ہوئے اسے کاندھے کے پاس سے تھاما اور سرد لہجے میں کہا۔ ''آج کے بعد تم ایسا نہیں کروگی۔ باہر آدم خور دندناتا پھر رہا ہے۔ ایسے عالم میں جو بھی باہر ہوگا وہ اسے چیر پھاڑ کر رکھ دے گا اور میں بالکل بھی نہیں چاہتا ہوں کہ وہ تمہیں نقصان پہنچائے۔ اب مجھے بتاؤ پاگل خانے کی عمارت کہاں ہے؟''

اس نے باغ کے اختتام کے دوسری طرف ڈھلوان کی جانب اشارہ کیا۔ میں نے نیچے کی طرف نگاہ دوڑائی۔ بہت نیچے گہرائی میں کسی عمارت کا ہیولا دکھائی دے رہا تھا۔ میں رائفل تھامے نیچے کی طرف اترنے لگا۔

پاگل خانے کی عمارت پختہ اور ایک منزلہ تھی۔ گیٹ پر چوکیدار نہیں تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر کی طرف مختصر لان بنا ہوا تھا۔ لان کے ساتھ پاگل خانے کے محافظ کا کمرا تھا۔ وہ واقعی شراب کے نشے میں دھت میز پر سر رکھے دنیا و مافیہا سے بے گانہ پڑا تھا۔ مجھے اس کی غفلت کو دیکھ کر بے تحاشا غصہ آنے لگا اور میں نے دل میں پکا تہیہ کرلیا کہ دوسرے دن پہلی فرصت میں پاگل خانے کے سرکردہ افراد سے ملاقات کرنے کے بعد انہیں جوزف کی غیر ذمہ داری کے متعلق تفصیل کے ساتھ بتاؤں گا۔ روز میری میرے پیچھے کھڑی ہوئی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے دروازے کو اندر سے لاک کرنے کے لیے کہا اور خود واپس ٹاؤن کی طرف چلا آیا۔ باقی ماندہ رات بغیر کسی حادثے کے گزر گئی۔

صبح ناشتے کے بعد میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔ تمام رات کا جاگا ہوا تھا اس لیے خوب نیند آئی۔ دو بجے کے قریب میری آنکھ کھلی، کھانا کھانے کا موڈ نہیں تھا۔ میں نے کافی کا ایک کپ حلق سے اتارا اور باسکو کے ساتھ گھر سے باہر نکل آیا۔ ٹاؤن کی عورتیں میری منتظر تھیں۔ ہم دونوں ان کے ساتھ باغات کی طرف چلے آئے۔ باغ کے قریب لگے ہوئے تناور درخت کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے گزشتہ شب کے واقعات یاد آئے۔ میں نے اپنے پیچھے آتی ہوئی عورتوں کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور باسکو کو ساتھ لے کر باغ کے اندر چلا آیا۔ پچھلی رات روز میری جہاں سے نمودار ہوئی تھی میں نے وہاں سے پیچھے کی طرف زمین پر نشانات چیک کیے۔ یہاں زمین بھربھری تو نہیں تھی ہاں اوس کی بدولت گیلی ضرور تھی۔ وہاں روز میری کے قدموں کے نشانات واضح تھے۔ ان نشانات سے چند گز پیچھے جانے کے فوراً بعد مجھے آدم خور کے قدموں کے نشانات دکھائی دیے۔ وہ روز میری کے تعاقب میں باغ کی طرف آیا تھا۔ مجھے اپنے جسم میں کپکپی کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے گزشتہ رات کی تمام صورتِ حال سے باسکو کو مطلع کیا اور اس سے آج کے دن کام کرنے سے معذرت کرلی۔ پھر نشانات کے

تعاقب میں پہاڑی کے اوپر کی طرف چلنا شروع کیا۔ میری موجودگی سے باخبر ہونے کے فوراً بعد آدم خور نے پہاڑی کی پچھلی طرف جنگلات کا رخ کیا۔ میرا ارادہ ان نشانات کے تعاقب میں جنگلات کی طرف جانے کا تھا۔ لیکن پہاڑی کا سلسلہ جہاں ختم ہو رہا تھا اور جہاں سے روز میری اور میں نے ڈھلوان سے نیچے اترتے ہوئے پاگل خانے کی طرف رخ کیا تھا وہاں سے آدم خور نے ایک دفعہ پھر ہم دونوں کا تعاقب شروع کیا۔ وہ نہایت خاموشی کے ساتھ ہمارے پیچھے پاگل خانے کی عمارت تک آیا اور ہم دونوں کے عمارت میں چلے جانے کے بعد عمارت کے گرد چکر لگا کر واپس جنگلات کی طرف چلا گیا۔ اس کا یوں ہمارا تعاقب کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے پریشان ہو کر پاگل خانے کے دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی کو بجادیا۔ تھوڑی دیر بعد جوزف نے باہر جھانکا۔ میں نے اسے اپنے متعلق بتانے کے بعد کسی بڑے ڈاکٹر سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ جوزف نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور میرے آگے چلتا ہوا عمارت کے برآمدے میں داخل ہو گیا۔ ایک کمرے کے پاس پہنچ کر اس نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی۔

"کون ہے؟" جوزف نے میری آمد کے متعلق ڈاکٹر کو آگاہ کیا تب ڈاکٹر نے مجھے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ میں نے دروازہ کھولا اور کمرے میں قدم رکھ دیا۔ دروازے کے بالکل سامنے ٹیبل رکھی تھی جس کے دوسری طرف ڈاکٹر بیٹھا تھا۔ مجھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ پھرتی کے ساتھ کھڑا ہوا اور آگے بڑھ کر نہایت گرم جوشی کے عالم میں میرے ساتھ بغلگیر ہو گیا۔ سلام دعا کے بعد میں نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔ آنکھوں پر گول شیشے والی عینک لگی ہوئی تھی۔ بال تیل لگا کر پیچھے کی طرف کیے گئے تھے، ناک ستواں اور ہونٹ پتلے تھے۔ وہ نہایت پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ نام دریافت کرنے پر اس نے ڈاکٹر ڈین بتایا اور مجھ سے پاگل خانے میں آنے کی وجہ دریافت کی۔ میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بات چیت کا سلسلہ کچھ یوں شروع کیا۔

"ڈاکٹر ڈین! آپ این گونگ کی موجودہ صورت حال سے آگاہ ہیں۔ آدم خور پندرہ کے قریب لوگوں کو لقمۂ اجل بنا چکا ہے۔ میری ٹاؤن میں آمد کا مقصد اس آدم خور کو ہلاک کرنا ہے۔" بات درمیان میں رہ گئی اور کمرے کا دروازہ کھول کر پاگل خانے کا نوکر اندر داخل ہوا۔ اس نے چائے کی پیالی میرے اور ڈاکٹر کے سامنے رکھ دی۔ پھر خاموشی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ میں نے کپ اٹھایا اور چسکی لیتے ہوئے ہمکلام ہوا۔

"آپ کو یہ جان کر حیرت کا شدید جھٹکا لگے گا کہ گزشتہ روز ٹاؤن کے گرد چکر لگاتے ہوئے میری ملاقات پاگل خانے کی چھوٹی سی بچی کے ساتھ ہوئی۔"

ڈاکٹر ڈین کے ہاتھوں سے چائے کی پیالی نیچے گرتے گرتے بچی۔ اس نے فوراً کپ کو میز پر رکھ دیا۔ پھر حیرت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ "لڑکی کا نام روز میری ہے اور میری پوچھ گچھ پر اس نے سیکیورٹی کے متعلق جو باتیں بتائیں ہیں ان کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ پاگل خانے میں سیکیورٹی کا انتظام نہایت غیر تسلی بخش ہے۔ ایک عدد سیکیورٹی گارڈ جو گیٹ پر متعین ہے، وہ رات کو شراب کے نشے میں دھت ہو کر اپنے کمرے میں پڑا رہتا ہے۔ اس کا ہونا یا نہ ہونا پاگل خانے کی حفاظت کے لیے کچھ معنی نہیں رکھتا۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ اسے فوراً سے بیشتر سیکیورٹی کے عہدے سے برطرف کرتے ہوئے مزید اہلکار کا انتظام کیجیے۔"

میرے خاموش ہونے پر ڈاکٹر بولا۔ "مجھے جوزف کی شراب نوشی کے متعلق ایک دو اور ورکروں نے بھی مطلع کیا ہے۔ میں اس کی جواب طلبی کے متعلق غور کر ہی رہا تھا کہ آپ نے بھی اطلاع دے دی۔ میں اسے آج ہی سیکیورٹی کے عہدے سے ہٹا کر کسی ذمہ دار شخص کو پاگل خانے کی حفاظت پر معمور کیے دیتا ہوں۔ آج کے بعد یہ غفلت دوبارہ نہیں ہوگی۔ جہاں تک روز میری کی بات ہے تو اسے اگلے مہینے پاگل خانے سے چھٹی ملنے والی ہے۔ روز میری کے علاوہ مزید پاگلوں کے آزاد گھومنے پر پابندی عائد ہے اس لیے وہ باہر نہیں جا سکتے۔"

میں نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ "آج سے یہ پابندی روز میری پر بھی عائد ہو جانی چاہیے۔ کل رات کو آدم خور نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ میری موجودگی سے باخبر ہونے کے بعد اس نے حملہ نہیں کیا لیکن اسے پاگل خانے کی عمارت کا پتا لگ گیا ہے۔ وہ یقیناً اب عمارت کے گرد منڈلاتا رہے گا اور غفلت کے مارے کسی بھی شخص کو اپنا شکار بنانے کی حتی الوسع کوششیں کرے گا۔ مہربانی

کر کے ایسا ہونے سے قبل ہی اپنے سیکورٹی پلان پر نظر ثانی کر لیجیے بصورت دیگر آپ کو اور پاگل خانے میں رہنے والے افراد کو ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑے گا۔"

ڈاکٹر ڈین بیچارگی کے عالم میں بولا۔ "افسوسناک بات یہی ہے کہ پاگل خانے میں سیکورٹی پر مشتمل افراد کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ جوزف کے علاوہ کل ملا کر تجربہ کار دو افراد ایسے ہیں جنہیں سیکورٹی کے لیے منتخب کیا جاسکتا ہے لیکن اسلحے کے بغیر وہ بھی کسی کام کے نہیں ہیں۔ میں ایک دفعہ پہلے پاگل خانے کے ڈائریکٹرز سے عملہ بڑھانے کی اپیل کر چکا ہوں لیکن انہوں نے میری اپیل کو نظر انداز کر دیا۔ آپ کے اصرار پر میں ایک دفعہ پھر انہیں مطلع کیے دیتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "اگر ایسا جلد از جلد ہو جائے تو آپ سب کے حق میں بہتر ہوگا ورنہ مجھے ٹاؤن کی حفاظت کے علاوہ پاگل خانے کی نگرانی بھی کرنا ہوگی اور دو محاذوں پر بیک وقت لڑنا میرے لیے مشکلات پیدا کر دے گا۔"

ڈاکٹر شرمندہ لہجے میں بولا۔ "میں آپ کی مشکلات کا باخوبی اندازہ لگا سکتا ہوں۔ آج کے دن میرے لیے کچھ کرنا ممکن نہیں ہے لیکن کل صبح میں پہلی فرصت میں شہر جانے کی کوشش کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میری آمد انہیں مسئلے کی سنگینی کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دے گی۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور عمارت سے باہر نکل آیا۔ مجھے جنگلات کے درمیان میں پاگل خانے کی عمارت بنائے جانے کی وجہ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ کیا شہر کے درمیان میں مختصر اراضی زمین کا ٹکڑا دستیاب نہیں تھا جہاں پاگل خانے کی عمارت بنائی جاسکتی۔ اگر جنگل کے درمیان بحالت مجبوری بنانی بھی پڑی تب اسے لاوارثوں کی طرح کیوں چھوڑ دیا گیا۔ باغات کے پاس باسکو میرا منتظر تھا۔ باقی کا دن چنائی کے دوران گزر گیا۔ رات کو بھی کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ آدم خور کو انسانی شکار کیے ہوئے تیسرا دن بھی گزر گیا۔ چوتھا روز اس کے شکار کے لیے نہایت اہم تھا۔ دن کا آغاز ہوا۔ میں نے باسکو کو ساتھ لیا اور ٹاؤن کی عورتوں کے ساتھ پتی کے باغات کی طرف چلا آیا۔ عورتیں چنائی کرتی رہیں اور میں باسکو کے ساتھ ہاتھ میں رائفل تھامے ان کی نگرانی کرتا رہا۔ بارہ بجے سے کچھ پہلے ڈاکٹر ڈین شہر کی طرف چلا گیا۔ اس کے روانہ ہونے کے آدھے گھنٹے کے بعد مجھے پتی کے باغات کی طرف سے سیٹی کی آواز سنائی دی۔ میں اس سیٹی کی دھن کو باآسانی پہچان سکتا تھا۔ روز میری دوبارہ پاگل خانے کی عمارت سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ میں نے جھنجلاہٹ کے عالم میں سر پیٹ لیا اور باسکو کو درخت کے پاس کھڑا رہنے کی ہدایت دینے کے بعد پتی کے باغات کی طرف چل دیا۔ اس نے سیٹی بجانی ترک کر دی تھی اور اب گلا پھاڑ کر بے سری آواز میں کوئی واہیات سا گانا گانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے دور ہی سے اسے دیکھ کر پہچان لیا۔ وہ سرخ اور سفید فراک پہنے ہوئے تھی۔ یہ وہ رنگ تھے جو باآسانی آدم خور کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا باعث بن سکتے تھے۔ پھر اس کا گلا پھاڑ کر گانا گانا۔ وہ لڑکی اپنے آپ کو قربانی کی بھینٹ چڑھانے کی مکمل کوششوں میں مصروف تھی۔ اس کی گزشتہ اور موجودہ حماقتوں کے متعلق سوچ کر مجھے شدید غصہ آنے لگا۔ وہ اب کافی حد تک قریب آگئی تھی اور اس نے مجھے چائے کے باغ میں کھڑے ہوئے دیکھ لیا تھا اس لیے گانے کو ترک کرنے کے بعد اچانک ہی پُرجوش انداز میں میری طرف بھاگنے لگی۔ اس کے والہانہ پن کو دیکھ کر مجھے اپنی بارہ سالہ لڑکی یاد آنے لگی۔ میں جب بھی گھر جاتا تھا تب وہ یونہی بھاگ کر مجھ سے لپٹنے کی کوششیں کرتی تھی۔ روز میری نے بھی کی۔ لیکن میں نے بے اختیار اسے چٹیا کے پاس سے تھاما اور کھینچتے ہوئے پاگل خانے کی طرف لے جانے لگا۔۔ اس نے احتجاج کی کوشش کی لیکن میں نے اس کی چٹیا کو نہیں چھوڑا۔ تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔ میں نے توجہ نہیں دی اور اسے عمارت کی طرف کھینچتا رہا۔ اگر اس کی جگہ میری لڑکی ..... ہوتی تب بھی میں اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا۔ اس نے اب جدوجہد کی کوششیں ترک کر دی تھیں اور مجھے گندی گالیوں سے نوازنے کے سلسلے کا آغاز کر دیا تھا۔ لیکن جب مجھ پر گالیوں نے بھی اثر انداز ہونے کی کوششیں نہیں کیں تب آخری اور کارگر حربہ استعمال کرتے ہوئے وہ زہر خند لہجے میں بولی۔ "مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی جو میں نے تمہیں اپنے باپ جیسا سمجھنے کی حماقت کی۔ تم اس جیسے ہو ہی نہیں سکتے۔ وہ ایک سپاہی ہونے کے باوجود بھی نرم دل کا مالک تھا لیکن تم سنگدل اور گنوار شکاری ہو۔"

اس کی بات میرے دل کو لگی اور میں نے اس کی چٹیا کو چھوڑ دیا۔ وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔ "تم نے میرا دل توڑ دیا ہے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی باشعور انسان ایسا بھی کر سکتا ہے۔ تم واپس چلے جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ

بات چیت نہیں کرنا چاہتی ہوں۔'' آخری الفاظ کے دوران اس نے غصے کے عالم میں چیخنا چلّانا شروع کردیا۔ میں نے بے اختیار ہنستے ہوئے اسے گلے سے لگانے کی کوشش کی لیکن اس نے غصے کے ساتھ میرے ہاتھ کو پرے جھٹک دیا اور بپھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ایک سپاہی اور شکاری کی فطرت میں یہی فرق ہوتا ہے۔ سپاہی انسان سے پیار کرتا ہے لیکن شکاری صرف اذیت دینا جانتا ہے۔ اس کی نگاہوں میں کسی کے محبت بھرے جذبات کی رتی برابر بھی اہمیت نہیں ہوتی۔''

میں نے حیرت بھری نگاہوں سے روزمیری کی طرف دیکھا۔ پاگل دکھائی دینے والی وہ لڑکی اس وقت نہایت دانشمندانہ اور پرفہم باتیں کررہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر گالوں کو تر کررہے تھے۔ مجھے اپنے رویے پر ندامت محسوس ہونے لگی۔ مجھے اتنی سنگدلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے پاگل خانے سے باہر صرف اس لیے آئی تھی کہ میری شکل وصورت اس کے مرحوم باپ سے ملتی تھی۔ میں نے واقعی نادانستگی کے عالم میں اس کا دل توڑ دیا تھا۔ وہ میرے سامنے کھڑی روتی چلی جارہی تھی۔ میں نے محبت بھرے انداز میں آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ پھر شرمندہ لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔'' مجھے معاف کردو روز میری.... لیکن اگر میری جگہ تمہارا باپ بھی ہوتا تو وہ بھی ایسا ہی کرتا۔ تمہیں پاگل خانے کی عمارت سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ باہر آدم خور پھر رہا ہے۔ وہ تمہیں نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔''

روزمیری، میری بات کو درمیان میں کاٹتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولی۔'' وہ جنگل میں نہیں بلکہ پاگل خانے کی عمارت میں گھومتا پھر رہا ہے۔ میرا یہاں آنے کا مقصد صرف تمہیں یہی اطلاع پہنچانا تھا تاکہ تم اسے ہلاک کردو۔''

بات کے اختتام پر اس نے پاؤں پٹخے اور عمارت کی طرف بھاگ گئی۔ تھوڑی دیر تک اسے نیچے کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھتے رہنے کے بعد میں نے رائفل سنبھالی اور واپس ٹاؤن کی طرف چلنے لگا۔ تب بالکل اچانک ہی میری نگاہ زمین پر بنے ہوئے آدم خور شیر کے قدموں پر پڑی۔ میں نے پھرتی کے ساتھ جھکتے ہوئے ان نشانات کا معائنہ کیا۔ تب یہ جان کر مجھے اپنے جسم میں خوف کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ نشانات بالکل تازہ تھے اور ان کا رخ پاگل خانے کی عمارت کی طرف تھا۔ میں نے روزمیری کی طرف دیکھا۔ وہ عمارت کے گیٹ تک پہنچ گئی تھی۔ میں نے چلّاتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ پھر کوئی بھی جواب دیئے بغیر گیٹ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ میں نے پھرتی کے ساتھ رائفل کو کاندھے سے نیچے اتارا اور اس کی نال کا رخ پاگل خانے کی عمارت کی طرف کرتے ہوئے پتی کے باغات سے نیچے اترنے لگا۔ شیر کے قدموں کے نشانات میری رہنمائی کررہے تھے۔ عمارت کے قریب پہنچنے کے بعد آدم خور نے اس کے گرد چکر لگایا۔ پھر گیٹ کے پاس سے دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوگیا۔ میں نے آگے بڑھ کر گیٹ کو کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ عمارت میں گھمبیر خاموشی طاری تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں کوئی زندہ وجود نہ ہو۔ میں نے عجلت کے عالم میں رائفل کو کاندھے کے ساتھ لٹکایا اور اچھل کر اوپر چڑھ گیا۔ عمارت کے اندر جھانکنے پر مجھے اپنے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ فرش پر جابجا خون بکھرا ہوا تھا۔ قریب ہی جوزف کی لاش پڑی تھی۔ اسے گردن سے دبوچ کر ہلاک کیا گیا تھا۔ تاہم آدم خور نے اسے کھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لینے کے بعد نیچے چھلانگ لگادی۔ زمین پر قدم رکھتے ہی میں نے نہایت پھرتی کے ساتھ کاندھے سے لٹکی ہوئی رائفل کو اتارا اور نال کا رخ کمروں کی طرف کردیا۔ فرش پر خون سے بھرے ہوئے شیر کے قدموں کے نشانات واضح تھے اور وہ برآمدے سے ہوتے ہوئے کمروں کی طرف جارہے تھے۔ میرے خیال کے مطابق جب آدم خور نے پاگل خانے کی عمارت میں گھسنے کی کوشش کی ہوگی تو سلاخوں کے پیچھے رہے پاگلوں نے شور مچادیا ہوگا۔ اس افراتفری کے دوران روزمیری کو عمارت سے باہر نکلنے کا موقع میسر آگیا ہوگا اور وہ مجھے اس کی موجودگی سے باخبر کرنے کے لیے پتی کے باغات کی طرف چلی آئی۔ لیکن میں نے اسے دھتکار دیا۔

یہ سب کچھ قیاس آرائیوں پر مبنی تھا۔ حقیقت کے متعلق تو کسی زندہ وجود کے ذریعے ہی معلوم ہوسکتا تھا۔ میں نے رہائشی عمارت کا رخ کیا۔ یہاں سبز گھاس کے قالین بچھے ہوئے تھے اس لیے شیر کے قدموں کے نشانات مفقود ہوگئے۔ کچھ آگے جاکر مجھے پاگل خانے میں زیر علاج مریضوں کے کمرے دکھائی دیئے۔ چونکہ ان کے کمروں کے آگے سلاخیں لگی ہوئی تھیں اس لیے وہ سب

محفوظ تھے۔ تاہم ان کے چہروں پر خوف کے تاثرات نہیں تھے۔ ان کے کمرے سے آگے اسٹاف روم بنا ہوا تھا۔ یہاں ایک ڈاکٹر کی لاش پڑی تھی۔ اس کے جسم سے گوشت ادھیڑنے کی ناکام کوشش کی گئی تھی لیکن روز میری وہاں نہیں تھی۔ کچھ ہی دیر میں، میں نے پاگل خانے کے سامنے والا حصہ چھان مارا۔ ہاں جگہ جگہ لاشوں کے چیتھڑے بکھرے تھے۔ زندہ وجود پاگل خانے سے باہر جنگلات کی طرف فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ عمارت کا پچھواڑا جہاں مختصر باغ بنا ہوا تھا، مجھے قوی امید تھی کہ آدم خور وہیں چھپا ہوگا۔ میں نے عمارت کے ساتھ بنی ہوئی پتلی گلی کا رخ کیا جو عمارت کے اگلے حصے کو پچھلے سے ملاتی تھی۔ یہاں سرخ رنگ کے کپڑے کی چند دھجیاں مجھے ملیں۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ سرخ فراک روز میری پہنے ہوئے تھی۔ میں نے عجلت کے عالم میں بھاگتے ہوئے گلی کو عبور کیا اور عمارت کے پچھلے حصے میں داخل ہوگیا۔ باغ نہایت خستہ خالت سے دوچار تھا۔ گھاس خشک ہوگئی تھی اور درخت ٹنڈ منڈ تھے۔ وہاں کوئی بھی ذی روح موجود نہیں تھا۔ شیر روز میری کو ہلاک کر کے دیوار پھلانگنے کے بعد جنگل کی طرف لے گیا تھا۔ میرے خیال کے مطابق جب روز میری نے پاگل خانے کی عمارت میں داخل ہونے کے بعد گیٹ کو بند کیا تب شور وغل سے پریشان ہونے والے آدم خور نے اسے ہلاک کر دیا اور عمارت کے پچھواڑے کی دیوار کو عبور کر کے اسے جنگل میں لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے باغ کی دیوار کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وہ زیادہ اونچی نہیں تھی۔ ایک سوکھا ہوا درخت قریب ہی لگا ہوا تھا جس پر چڑھ کر دیوار کو باآسانی پھلانگا جاسکتا تھا۔ میں ابھی دیوار کا صحیح معنوں میں جائزہ بھی نہیں لینے پایا تھا کہ اچانک مجھے ہڈی چٹخنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے ہڑبڑا کر اوپر کی طرف دیکھا۔ آواز پاگل خانے کی چھت کی طرف سے آئی تھی۔ مجھے اپنے قوت سماعت پر مکمل بھروسا تھا۔ آدم خور پاگل خانے کی چھت پر تھا۔ چھت پر جانے کا کوئی باضابطہ راستہ وہاں نہیں تھا اس لیے میں نے رائفل کو کاندھے کے ساتھ لٹکایا اور ٹنڈ منڈ درخت پر چڑھ گیا۔ اوپر چڑھنے کے بعد میں نے ایک ایسی موٹی شاخ کا انتخاب کیا جو درخت کے درمیان سے ہوتی ہوئی چھت کی طرف جارہی تھی۔ میں اس شاخ پر سے ہوتا ہوا باآسانی دیوار تک چلا آیا۔ دیوار پر قدم رکھنے کے بعد میں نے چند فٹ اونچی اس چھت کی طرف قدم بڑھانے شروع کیے جہاں آدم خور چھپا بیٹھا تھا۔ چھت کے قریب پہنچ کر میں نے کاندھے کے ساتھ لٹکی ہوئی رائفل کو ہاتھوں میں تھاما اور سیفٹی کیچ ہٹا کر نال کا رخ چھت کی طرف کر دیا۔ پھر سر کو اونچا کر کے چھت کا جائزہ لیا۔ چھت پر چار دیواری نہیں تھی۔ وہاں پاگل خانے کا تلف شدہ سامان بکھرا ہوا تھا۔ اس سامان سے کچھ ہٹ کر آدم خور زمین پر بیٹھا تھا۔ اس کے بالکل سامنے سرخ رنگ کی گٹھڑی پڑی تھی جس کے اردگرد خون بکھرا ہوا تھا۔ آدم خور کی نگاہوں کا ہدف میری رائفل کی نال تھی۔ میرا دماغ چند لمحوں کے لیے سن ہو کر رہ گیا۔ آدم خور شیر کے منہ سے ہلکی تنبیہہ نما غراہٹ نمودار ہوئی اور میرے جسم کی تمام حسیات بیدار ہوگئیں۔ میں نے پھرتی کے ساتھ رائفل کو سیدھا کیا۔ اس نے خطرے کو بھانپتے ہوئے غضبناک انداز میں دھاڑ کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے اس کی آنکھوں کے درمیان کے مختصر حصے کا نشانہ لے کر فائر داغ دیا۔ ہوا میں اچھلتا ہوا آدم خور قلابازی کھا کر روز میری کے مردہ جسم کے پاس گر گیا۔ مجھے دوسری گولی چلانے کا موقع نہیں ملا۔ وہ چند لمحے تڑپتے رہنے کے بعد عالم فانی سے کوچ کر گیا۔ میں نے طویل سانس لیتے ہوئے ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کو ہتھیلی کی مدد سے پونچھا اور بوجھل قدموں کے ساتھ چھت کے اوپر چڑھ کر روز میری کی لاش کے قریب آبیٹھا۔ اس کا اوپر کا جسم محفوظ تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ گہری نیند سو رہی ہو۔ نچلے جسم کو آدم خور نے ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں نے بے اختیار اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ میں عام شکاریوں کی طرح سنگدل اور خود غرض نہیں تھا۔ میرے سینے میں بھی اس کے مرحوم سپاہی باپ کی طرح پیار کرنے والا دل موجود تھا۔ اگر نہ ہوتا تو شاید اس کی ناگہانی موت پر میری آنکھیں یوں اشکبار نہ ہوتیں۔ چند لمحے آنسو بہانے کے بعد میں نے ہتھیلی کی مدد سے انہیں پونچھا اور چھت سے اتر کر پاگل خانے کی عمارت سے باہر نکل آیا تا کہ باسکو کو آدم خور کی ہلاکت سے باخبر کرسکوں۔ وہ ٹاؤن کے درخت کے نیچے میرا منتظر تھا۔

شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر وکوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔ لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔



ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ سفر کہانی کا بیسواں حصہ

مفتی کی گھبراہٹ نے مجھے بھی گھبرا دیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ دماغ اتنا الجھ گیا تھا کہ میں چاہ کر بھی یہ پوچھ نہ سکا کہ سعد نے بتایا کیا ہے۔ بس میں نے جلد بازی میں کپڑے تبدیل کیے اور باہر نکل آیا۔

نسرین کے گھر میں کس طرح پہنچا... یہ میں ہی جانتا ہوں۔ شہباز نے کوئی سوال کرنے کی بجائے مجھے فوراً جانے کو کہہ دیا تھا۔ اور میں نے بھاگتے دوڑتے راستہ طے کیا تھا۔ گھر سے نکلنے اور یہاں تک آنے کے درمیان جو وقفہ آیا

تھا اسی وقفہ میں نہ جانے کیسے کیسے عجیب وغریب خیالات میرے دماغ میں آئے تھے۔ مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ میں نسرین کے بڑھتے قدم کو روکنے میں ناکام رہا ہوں۔ میری خاموشی نے ہی اسے حوصلہ دیا ہے اور اب وہ اتنا آگے آچکی ہے کہ اسے پیچھے دھکیلنا ناممکن ہو چکا ہے۔ میرے تمام حالات وواقعات سے آگاہ ہونے کے باوجود وہ آگے بڑھتی آرہی ہے۔ اب تو وہ اتنا آگے آچکی ہے کہ اسے روکنا ناممکن ہوگیا ہے۔ وہ ڈپریشن کا شکار تو پہلے ہی تھی اب تو وہ نیم پاگل ہو چکی ہوگی۔ اس حالت میں کچھ بھی، کوئی بھی قدم اٹھا سکتی ہے۔ شاید وہ اٹھا چکی ہے۔ تبھی تو سعد نے فون کیا ہے۔

یہی کچھ سوچتا ہوا میں اس کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے کال بیل بجانے کی بجائے دستک دیا۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔ سامنے سعد کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ مسکراہٹ نے سمجھا دیا کہ میری سوچ غلط تھی۔ میں نے پہلا سوال کیا۔ ''مما کہاں ہیں؟''

''وہ تو اپنے کمرے میں ہوں گی۔''

''جاؤ انہیں بتاؤ کہ میں آگیا ہوں۔'' میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

سعد کو جانے کی ضرورت نہ پڑی۔ شاید نسرین نے میری آواز سن لی تھی۔ وہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑی حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''آپ......آپ بغیر اطلاع کے کیسے آگئے؟'' نسرین نے پوچھا۔

میں نے سوچا کہ اگر سعد کا نام بتا دوں تو اس کی سرزنش ہوگی۔ اس لیے میں نے کہا۔ ''ادھر سے گزر رہا تھا سوچا تم سے ملتا چلوں۔''

''زہے نصیب کہ آپ کو میں یاد رہی۔''

سعد کچھ دیر تک تو سہا سہا رہا پھر وہ میرے قریب آکر مجھ سے لگ کر بیٹھ گیا۔

''چائے پئیں گے؟'' نسرین نے پوچھا اور اٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

نسرین کے جاتے ہی میں نے سعد سے پوچھا۔ ''تم نے فون کیا تھا؟''

''جی ہاں۔ کئی روز ہو گئے اور آپ آئے نہیں اس لیے بلالیا۔''

''تم نے فون پر کہا کیا تھا؟''

''آپ آنے میں دیر کرتے اسی لیے میں نے انکل سے کہا کہ آپ کو جلد بھیج دیں۔''

''اور بھی کچھ کہا تھا؟''

''ہاں آپ میرے بلانے پر آتے نہیں اس لیے کہا تھا کہ مما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ ہوا کیا ہے۔ میرے تمام دوست احباب اس بات سے واقف ہیں کہ نسرین اور میں، دونوں ہی ذہنی دباؤ میں ہیں۔ اس حالت میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے مفتی گھبرا اٹھا تھا جو ہونا تھا ہو چکا تھا اب مجھے خاموشی ہی رہنا تھا کہ میرے آنے سے سعد کھل اٹھا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک میں وہاں رہا پھر گھر لوٹ آیا۔

گھر آتے ہی مفتی اور سرجی نے مجھے گھیر لیا۔ شاید میرے جانے کے بعد سے وہ لوگ میرے ہی بارے میں باتیں کرتے رہے تھے کیونکہ ان کے چہروں سے فکرمندی جھلک رہی تھی۔ صرف ایک شہباز تھا جو کوچ پر لیٹا ہانپ رہا تھا۔ گویا وہ بھی پریشان ہوا تھا کیونکہ وہ جب بھی کسی سوچ یا فکر میں ہوتا تھا اس کی سانسیں تیز ہو جاتی تھی۔ میں نے اس پر ایک نظر ڈالی سعد کی شرارت بتادی۔ یہ سنتے ہی سرجی نے کہا۔ ''آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔'' پھر سانس لے کر بولے۔ ''محبت کرنے والی تو مل ہی رہی ہے۔ ساتھ میں محبت کرنے والا بچہ بھی مل رہا ہے۔''

''سرجی! آپ غلط کہہ گئے۔'' شہباز بولا۔ ''اس نے تو میری طبیعت خراب کرادی۔ کوئی ایسی شرارت کرتا ہے۔''

''بچے کا دماغ بچے جیسا ہوتا ہے۔ اس نے جو صحیح سمجھا وہ کیا۔'' کہہ کر میں دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اگلے دن میں اپنی ڈیوٹی پر ہولڈنگ سینٹر پہنچا تو ہولڈنگ سینٹر میں سب قیدی لنچ روم میں جمع تھے اور اسٹاف دیوار کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھے قیدیوں کو اپنی نظر میں رکھے ہوئے تھے۔ ہیری ہیڈ گارڈ کی کرسی پر بیٹھا سوچوں میں گم تھا۔ مجھے دیکھا تو مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور بولا۔ ''آج پریشان سے لگ رہے ہو، خیر تو ہے نا؟'' پھر ساتھ بیٹھے اسلام بٹ کو اٹھا کر دور بٹھایا اور پھر مجھ سے پوچھنے لگا۔ ''کیا بات ہے باؤ کن سوچوں میں گم ہو؟''

میں نے فیملی کے میڈیکل ٹیسٹ کے بارے میں بتایا کہ دس ماہ پہلے کروایا تھا، ایک سال اس کی میعاد ہوتی ہے اور ایمیسی والے کہتے ہیں کہ میڈیکل دوبارہ کروائیں۔

یہ سن کر وہ بولا۔ ''باؤ پریشان ہونے کی کیا ضرورت

ہے۔ بیدی حل بھی بتا دے گا۔“
میں نے پوچھا۔ ”وہ کیا ہے؟“
وہ بولا۔ ”پہلے نیچے جاؤ آج سنیچر ہے، ایمیگریشن آفیسر آیا ہوا ہے۔ اس سے اسلام آباد میں کینیڈا ہائی کمیشن ایمیگریشن کونسلر کا نام بمع خون اور ٹیسٹ نمبر لے آؤ۔“
میں سمجھ گیا تھا کہ بیدی کے دماغ میں میرے مسئلے کا کیا حل ہے۔ میں ایمیگریشن کے آفس میں آیا تو ایک گورا آفیسر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے مدعا بیان کیا اور اپنے کیس کی بابت بھی بتایا تو اس نے ایک آفیشل بکس سے کونسلر کے سارے قواعد دے دیے۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسے قواعد ہر ایک کو آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دوبارہ سے بیدی کے پاس آیا۔ اس نے پھر اسلام بٹ کو اٹھا دیا اور مجھے سامنے بٹھا کر حل بتانے لگا۔
میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ کینیڈا کی حکومت بچوں کے معاملے میں بہت حساس ہے۔ بیدی بتا رہا تھا کہ ایک لیٹر کونسلر کو اسلام آباد فیکس کرو جس میں اپنی ساری تشویش لکھو اور آخر میں یہ بھی لکھو کہ بچے اپنے باپ کی کمی شدت سے محسوس کرتے ہیں اور باپ بھی بچوں اور بچوں کی ماں کو دل کی گہرائیوں سے یاد کرتا ہے۔ پھر ایسا ہی ملتا جلتا لیٹر بنا کر اپنے علاقے کے ممبر اور پارلیمنٹ کو بھی فیکس کردو۔
میں نے ایسا ہی کیا۔ ایک لیٹر کینیڈین ہائی کمیشن اسلام آباد میں ایمیگریشن کونسلر کو فیکس کر دیا اور اپنے علاقے کے ممبر آف پارلیمنٹ کو بھیج دیا۔ پھر پاکستان فون کر کے اپنی بیوی سمیعہ سے کہا کہ اب وہ انتظار کرے۔ وہ کہنے لگی کہ میں پھر بھی پشاور جا کر اپنے اور بچوں کا میڈیکل ٹیسٹ کروالیتی ہوں اور وہ دوسرے دن ڈیرہ اسماعیل خان سے پشاور روانہ ہوگئی۔
پھر میں اپنی جاب میں مصروف ہوگیا۔ تین چار دن بعد میں نے پشاور فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بچوں سمیت اسلام آباد چلی گئی ہے۔ میں نے اسلام آباد کال کی تو اس نے حیرت انگیز کہانی سنائی۔
وہ مجھے بتا رہی تھی اور میں حیرانگی سے سن رہا تھا۔ ایمبیسی والوں کا ڈیرہ میں فون آیا اور وہ اس کا پوچھ رہے تھے۔ انہیں بتایا گیا کہ وہ تو پشاور میڈیکل ٹیسٹ کروانے چلی گئی ہے۔ انہوں نے پشاور کا نمبر لیا اور اسی لمحے اسے فون ملایا وہاں بتایا گیا کہ وہ اپنا میڈیکل ٹیسٹ کروا کر چلی گئی ہے۔ انہوں نے اسلام آباد کا نمبر مانگا اور پھر اسے اسلام آباد کے نمبر پر کال کی۔ وہاں ایمبیسی والوں کی میری بیوی سے بات ہوئی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ابھی آپ کے پچھلے میڈیکل ٹیسٹ کی میعاد باقی ہے۔ انہوں نے دوبارہ میڈیکل کروانے کو اپنی کوتاہی تسلیم کیا اور بہت معذرت کی پھر اس سے بولے کہ یہ غلطی ان سے ہوئی ہے اور وہ معذرت خواہ ہیں پھر یہ خبر بھی سنائی کہ چند دنوں میں آپ کو لینڈنگ پیپر مل جائیں گے۔ فون بند کرنے سے پہلے انہوں نے دوبارہ معافی مانگی۔
میں حیران اس لیے تھا کہ انہوں نے کھلے دل سے اپنی غلطی تسلیم کی تھی، ورنہ یہاں کون طاقت ور اپنی غلطی مانتا ہے۔ یہاں کے مضبوط لوگ تو اپنی طاقت کا احساس دلانے کے لیے ہمارے سامنے جرم کرتے رہتے ہیں اور یہ جتلاتے ہیں کہ ہے کسی میں اتنی ہمت جو ہماری روک ٹوک کر سکے۔ میں ابھی تک یہ بھی نہ جان سکا کہ ان کو اپنی غلطی کا احساس دلانے میں میرے فیکس نے یا ممبر یا پارلیمنٹ کے کسی ایکشن نے کام کیا تھا۔ مجھے اس کی فکر نہ تھی کہ نشانہ کس کا لگا مجھے تسلی یہ تھی کہ نشانہ فٹ لگا۔
میں جب بھی بس اسٹاپ پر کھڑا ہوتا تو نظریں پارک کے بیچ اس درخت پر ہوتیں جو بالکل تنہا کھڑا تھا۔ آس پاس کچھ جھولے تھے مگر دوسرے درخت کناروں پر تھے۔ میں اس درخت کو اپنے جیسا محسوس کرتا تھا۔ ہر انسان اپنی ذات میں تنہا ہے۔ کچھ لوگ زیادہ بھیڑ میں بھی اور زیادہ اکیلے ہوجاتے ہیں۔ میں نے اس درخت کو ٹورنٹو کی سخت سردی میں بھی دیکھا اور برف باری میں سرد اور سفید چادر اوڑھے بھی دیکھا تھا۔ بارشوں میں تنہا بھیگتے بھی اور تیز ہواؤں میں لرزتے بھی۔ میں جب بھی اسٹاپ پر ہوتا تو نظریں اسی درخت پر ہوتیں جس کے تلے کی زمین سوکھی اور زرد تھی۔ اس میں کوئی جان نہ تھی۔ اس درخت کی ٹہنیاں بے ثمر اور بے برگ تھیں مگر وہ امیدوں کے سہارے کھڑا تھا۔ اس نے آس نہ چھوڑی اور موسموں نے بھی تیور بدلے۔ کرختگی ان کی ختم ہوئی اور درخت کی بے آباد شاخیں مسکرانے لگیں، اور کونپلیں پھوٹنے لگی، جس شجر کو پہلے میں دیکھ کر اداس ہوجاتا تھا اب اسے دیکھ کر بے اختیار مسکرا اٹھتا تھا۔ میرا یہ یقین بڑھ گیا تھا جو بھی ثابت قدم رہتا ہے اور زمانے کی سرد گرم ہواؤں کا مقابلہ کرتا ہے تو وہ اپنا مقدر ضرور پاتا ہے۔ پچھلے سات مہینوں میں اس شجر نے مجھے کئی سبق دیے تھے۔ وہ میرا ایک طرح کا استاد تھا جو مجھے زمانے سے برتنا سکھا رہا تھا۔ وہ

میرا ساتھی تھا اور میں نے اس کا نام بھی ساتھی رکھا ہوا تھا۔ اس نے ٹوٹتے بکھرتے حوصلے کو قوت دے دی تھی کیونکہ میں نے اُمید کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔

مطیع اللہ کی ہیمو سال میں جاب آفس کی تھی۔ وہ آپریشن میں نہ تھا۔ وہ صبح نو بجے جاتا اور پانچ بجے واپس آتا۔ وہ ہماری والی بلڈنگ میں بھی نہیں تھا بلکہ ہیمو سال کی دوسری عمارت جو پارکنگ لاٹ سے دوسرے کنارے پر تھی اس میں بیٹھتا تھا۔ پانچ بجے آتا تو اردو اخبارات میں چھپے کالم کمپیوٹر سے پرنٹ کر کے لاتا اور پھر اپنا تبصرہ بھی کرتا تھا۔ سیاسی خبریں اور ٹاک شو میرے لیے اب بے اثر ہو گئے ہیں کیونکہ بہت کم سچ میں نے ان کے اندر دیکھا۔ جھوٹ کی آمیزش زیادہ ہونے لگی تو لوگ طیش میں رہنے لگے۔ پھر سوشل میڈیا نے لوگوں کو زیادہ آگہی دی۔ وہ بھی اپنے دل کی بھڑاس نکالنے لگے پھر دیکھتے ہی دیکھتے میڈیا کا بادشاہ گر کا رول ختم ہونے لگا ہے۔ پچھلے سال امریکا کے شہر میں پورا امریکی اور یورپی میڈیا ٹرمپ کے خلاف تھا ایک بھرپور مہم جاری تھی مگر لوگوں نے ووٹ ٹرمپ کو دیے۔ میڈیا کی حقیقت کا پتا تب چلتا ہے جب الیکشن صاف اور شفاف ہوں۔ جہاں صاف پانی نہ ملے وہاں شفاف انتخاب کیسے ہوں گے؟

بات ہو رہی تھی مطیع اللہ کے لائے ہوئے ان اخباری کالم کی جو وہ ہر روز لاتا تھا۔ میں اس کے آنے سے پہلے اپارٹمنٹ پہنچ جاتا تھا جب مجھے صبح کی شفٹ میں جانا ہوتا تھا۔ آج میں اور میرا ساتھی درخت اکھٹے باتیں کر رہے تھے اور اس لیے مجھے دیر ہو گئی۔ میں اپارٹمنٹ پہنچا تو مطیع اللہ آیا ہوا تھا۔ سرجی بھی جاب سے آچکے تھے اور مطیع اللہ سے کہہ رہے تھے کہ کپڑے تبدیل کرنے سے پہلے سبزی کاٹ دو۔

مطیع اللہ دونوں ہاتھ اپنے سر کے پیچھے باندھے ہوئے مفتی کے میٹرس سے ٹیک لگائے بیٹھا اطمینان سے سرجی کو کہہ رہا تھا۔ ''مرد گھر میں آئے تو پہلے اسے چائے پیش کرتے ہیں۔''

سرجی بگڑ گئے اور یہ کہنے لگے۔ ''یہ کیسا مرد ہے جس کی آواز عورتوں جیسی ہے۔''

میں اندر داخل ہوا سلام کرنے کے بعد سرجی سے بولا۔ ''پہلے اسے کپڑے تو تبدیل کرنے دیں۔''

مجھے دیکھ کر مطیع اللہ نے موضوع بدلا اور بولا۔ ''تم اتنی دیر سے کیوں آئی ہو؟ معشوق سے ملنے تو نہیں گئی تھیں۔''

سرجی نے مطیع اللہ کو سنا تو کچن سے نکل آئے۔ مجھ سے کہنے لگے۔ ''نسرین کے پاس گئے تھے، ماشاء اللہ۔''

مطیع اللہ ابھی نسرین کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ وہ کریدنے لگا تو سرجی بولے۔ ''ندیم بھائی کی کلاس فیلو ہے اور ایران سے ہے۔'' پھر گنگنا کر بولے۔ ''ماشاء اللہ شادی شدہ بھی ہے اور ایک بیٹا بھی ہے۔''

مطیع اللہ بولا۔ ''اچھا! تو چوری چوری کسی کو کلاس فیلو بھی بنا لیا۔''

میں نے کہا۔ ''کلاس فیلو نہیں بلکہ دوست بنا لیا۔'' اور پھر مطیع اللہ کی تصحیح کی۔ ''چوری چوری نہیں بلکہ سرجی کے سامنے ہی دوست بنایا ہے۔''

مطیع اللہ تیزی سے کمرے کی جانب گیا اور میں نے یہ سنا۔ ''میں ابھی تبدیل کر کے آتی ہوں، پھر آرام سے ساری اسٹوری سنتی ہوں۔''

سرجی معلوم نہیں کیوں خفا لگ رہے تھے، بولے۔ ''پیار کرتے ہیں مگر پیاز نہیں کاٹتے۔''

مجھے پیار اور پیاز میں کوئی مماثلت نظر نہیں آئی تھی اور سرجی نے پیار بنایا ہوا تھا۔ میں جتنا انہیں سمجھاتا تو وہ زیادہ سے زیادہ اس کا تذکرہ کرتے تھے اس لیے میں نے وضاحتیں دینا بھی بند کر دی تھیں۔

مطیع اللہ کپڑے تبدیل کر کے واپس آیا۔ میں نے اخباری کالم مانگے تو بولا۔ ''پہلے معشوق کے قصے تو سناؤ۔''

میں نے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔''

وہ بولا۔ ''تو جو ہے وہ ہی سناؤ۔''

سرجی کچن کی کھڑکی سے مجھے جھوٹا ثابت کرنے کے لیے قسمیں کھا رہے تھے۔

اتنے میں فون بجا تو سرجی فون کی جانب لپکتے ہوئے بولے۔ ''اللہ کرے نسرین باجی کا ہو۔'' اور وہ واقعی نسرین کا تھا۔ اب مطیع اللہ کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ اور سرجی مطیع اللہ سے کہہ رہے تھے۔ ''میں نا کہتا تھا کہ یہ پیار سچا ہے۔ ابھی یاد ہی کیا اور وہ چلی آئی۔''

میں نے ریسیور سرجی سے چھینا اور انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں خاموش تو تھے مگر توجہ میری ہی جانب تھی۔ حال احوال جاننے کے بعد بولی۔ ''میں سمجھی تھی کہ موسم بدلنے کے بعد شاید تم بھی بدل جاؤ۔''

میں نے اس بات کی وضاحت مانگی تو بولی۔ ''میں

لگی کہ بہار شروع ہونے کی خوشی میں فون کرو گے۔"

میں ان دنوں ساتوں دن کام کر رہا تھا۔ مجھے ایک دن کی فرصت نہ تھی۔ کہیں آنا جانا بھی رہ گیا تھا۔ میں خود بھی تھک چکا تھا۔ کبھی سوچتا ویک اینڈ پر ایک دن چھٹی کرلوں مگر ہولڈنگ سینٹر والے دو دن سے کم کی جاب نہیں دیتے تھے۔ دو دن میں دو سو چالیس ڈالر کا لالچ تھا۔ کیوں کہ یہ رقم یہاں بہت بڑی رقم تھی۔ خاص کر یہ کہ جہاں کچن کا خرچ میرا ایک ماہ کا ساٹھ ڈالر تھا تو یہ دو سو ڈالر کا ٹھکرانا آسان نہ تھا۔ میں نے نسرین سے یہ ہی بات کی تو اس کے جواب نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ کوئی بھی پیسے سے انکار نہیں کرتا۔ جتنا آئے اسے کم سمجھتا ہے۔ کہنے لگی کہ کمانے کا گر آنا چاہیے تو کبھی کبھی اس سے انکار کرو۔ بے زاری ظاہر کرنے کی بھی ہمت ہونی چاہیے۔ اس کی باتیں مجھے اچھی لگ رہی تھیں کہ آپ کے پاس ضروریات کے لیے مناسب رقم ہے تو ارد گرد اپنے لوگوں کی ترقی دیکھ لو اور ایسا نہ ہو کہ کوئی آپ کی توجہ کے انتظار میں بیٹھا ہو اور وہ مایوس ہو کر چلا جائے۔

اسکول سے سنتے آئے تھے کہ قناعت بہت بڑی نعمت ہے۔ لوگ کمانے کے لیے زندہ ہیں اور کچھ زندہ رہنے کے لیے کماتے ہیں۔ میں نے یہاں گوروں کو دیکھا ہے کہ اوور ٹائم سے انہیں چڑ ہوتی ہے۔ حالانکہ اس میں ڈیڑھ گنا زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ وہ انکار کردیتے ہیں کہ یہ ہماری فیملی کا ٹائم ہے۔ وہ پانچ منٹ بھی زیادہ رکنا پسند نہیں کرتے۔ ہمارے مرحوم اداکار یوسف خان کی طرح جو ٹائم ختم ہونے پر سیٹ پر مونچھ اتار کر گھر چلے جاتے تھے۔ اضافی رقم لینے سے انکار بہت بڑی جرأت کا کام ہے۔

اور پھر میں نے جرأت سے کام لیا اور دو دن بعد سنیچر کو اس سے ملنے کا وعدہ کرلیا، اسے کہا کہ فون کر کے پروگرام بتادوں گا۔ میرے فون رکھنے سے پہلے وہ کہہ رہی تھی۔ "ایسا لگتا ہے کہ اب میری باتیں آہستہ آہستہ ماننے لگے ہو۔"

میں نے فون رکھا تو مطیع اللہ بولا۔ "اگلی سنیچر پر کہاں جا رہی ہو؟"

میں نے کہا۔ "اب کی بار اور ہر بار میں جا رہا ہوں اور کبھی بھی نہیں جا رہی ہوں۔"

وہ بولا۔ "میں بھی تو یہ کہہ رہی ہوں۔"

سرجی کچن کی کھڑکی سے چہکے۔ "پٹھان بھائی کو گرامر کے چکر میں نہ پھنسائیں اور ٹھیک ٹھیک بتائیں کہ کہاں جا

ٹوبہ ٹیک سنگھ

صوبہ پنجاب کا ایک ضلع اور ضلعی صدر مقام۔ اس کا رقبہ 3252 مربع کلومیٹر۔ اس کے شمال میں ضلع جھنگ ہے۔ مشرقی اور جنوب مشرقی سرحد پر ضلع فیصل آباد کے ساتھ ملتی ہیں۔ جنوب کی طرف ضلع ملتان کا کچھ حصہ اس کی سرحد کے ساتھ واقع ہے۔ جنوب کی طرف ضلع ملتان کا کچھ حصہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کی سرحد کے ساتھ واقع ہے۔ دریائے راوی جنوبی اور جنوب مشرقی سرحد کے ساتھ ساتھ بہتا ہے۔ دریا کے پار ساہیوال اور ملتان کے اضلاع ہیں۔ یہ ضلع گوجرہ، کمالیہ اور ٹوبہ ٹیک سنگھ تحصیلوں پر مشتمل ہے۔ یہ ضلع پنجاب کے ہموار میدانی علاقے کا حصہ ہے۔ نہر لوئر چناب، جھنگ برانچ، لوئر گوگیرہ برانچ اور مرالہ برانچ ضلع کی اراضی کو سیراب کرتی ہیں۔ گندم، کپاس، گنا، چاول اور مکئی اس ضلع کی اہم فصلیں ہیں۔ یہاں نیلی راوی نسل کی بھینسیں بھی پائی جاتی ہیں۔ ضلع میں چینی (کمالیہ شوگر ملز، سمندری گوجرہ شوگر ملز) روئی بیلنے، سوتی کپڑا بنانے (گوجرہ) آٹا پیسنے کے کارخانے ہیں۔ کھڈی پر کھدر، کھیس اور قالین بھی بنائے جاتے ہیں۔ کمالیہ، پیر محل گوجرہ اور ٹوبہ ٹیک سنگھ میں مٹی کے برتن بھی بنتے ہیں۔ کمالیہ، سمندری، گوجرہ اور ٹوبہ ٹیک سنگھ میں زرعی آلات بنانے کے کارخانے ہیں۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ بذریعہ ریل اور سڑک کمشنری کے صدر مقام فیصل آباد اور دیگر شہروں سے مربوط ہے۔ تحریک پاکستان کے اہم کارکن ڈاکٹر فرید بخش کا تعلق بھی اسی ضلع سے ہے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ اگرچہ نیا ضلع ہے، تاہم اس کی تاریخ بڑی پرانی ہے۔ پہلے پہل اس علاقے کو ساندل بار کہا جاتا تھا۔ محمد بن قاسم کی برصغیر میں آمد سے قبل یہاں ہندو بستے تھے۔ سلطان محمود غزنوی پہلا مسلمان بادشاہ تھا، جو پاکستان کے علاقے میں آیا اور یہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی، پھر یہاں مغلوں کی حکومت رہی۔ مغلوں کے بعد راجا رنجیت سنگھ نے قبضہ کرلیا تو ٹوبہ ٹیک سنگھ بھی اس کی عملداری میں آگیا۔ رنجیت سنگھ کے بعد انگریزوں نے سکھوں کو شکست دے کر پنجاب پر قبضہ کرلیا اس علاقے پر تقریباً ایک سو سال تک حکومت کی۔

مرسلہ: عبدالخالق بھٹی، اللہ آباد

رہے ہیں۔"
مطیع اللہ نے خلاف توقع سرجی کی خبر لے لی ....
"تم کو کیا پڑی ہے مرد بچہ ہے کہیں بھی جائے۔ معشوق کے ساتھ جانا چاہتی ہے تو جائے۔"
سرجی بڑبڑا کر چولہے میں لگ گئے۔ "اس پٹھان کے ساتھ تو کوئی نیکی نہیں کرنی چاہیے۔"
مطیع اللہ سے اخباری کالم مانگے تو اس نے سرجی کی ضد میں فوری طور پر اپنی جیکٹ کی جیب سے نکال کر مجھے تھما دیے۔ میرا پہلا تجربہ تھا کہ بجائے اخبار کے میں انٹرنیٹ سے پرنٹ کروا کر اخبار اور کالم پڑھ رہا تھا۔ جو مزہ اخبار پڑھنے کا ہے وہ کمپیوٹر کے پرنٹ شدہ مواد کے پڑھنے میں نہیں ہے۔ خبر تو وہ ہی ہوتی ہے مگر اخبار میں ارد گرد کی دوسری خبروں میں کوئی ایک خبر مرچ مصالحہ بن جاتی ہے۔ اخبار کے صفحات پلٹنے اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر خبریں نکال کر کھنگالنے کا اپنا ایک مزہ ہوتا ہے۔ آج بیٹھا کالم پڑھ رہا تھا تو کالم نگاروں میں سے بیشتر پر اعتبار ختم ہو چکا تھا۔ ایک بڑے کالم نگار پچھلے بیس سال سے یہ لکھ رہے تھے کہ ملک کی سلامتی پر آخری ضرب خدا نا خواستہ پڑنے والی ہے اور وہ صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ ایک اور مشہور کالم نگار کی نفسیات یہ تھی کہ وہ ہر اس سیاست دان کو کونوں کھدروں سے ڈھونڈ نکالتا جو ملک کے خلاف بیان دیتا تھا۔ وہ صاحب ان کو بہت معروف اور مقبول بنا کر اس کا انٹرویو چھاپتے پھر کالم لکھتے اور اس کے بعد مفید مشورے سے نوازتے۔ اس کے بعد کئی ایک گمنام سیاست دانوں نے مشہور ہونے کے لیے ملک کے خلاف کھلم کھلا باتیں اور بیان دینا شروع کر دیے تھے۔ وہ صاحب پھر بھاگ بھاگ کر ان کے انٹرویو کرنے لگے۔ سیاست بھی مر کھپ گئی اور وہ کالم نگار بھی منوں مٹی تلے جا سوئے اور گمنام ہو گئے۔ پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں ہر ایک کو ملک کے خلاف سر عام بولنے کی اجازت ہے۔ میں کئی ملکوں میں گیا اور کہیں بھی اس جیسی روایت نہیں دیکھی۔ چھوٹے تھے تو ایک افسانہ پڑھا کرتے تھے۔ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ۔" اب بڑے ہو گئے ہیں تو کہتے ہیں۔ "مجھے میرے کالم نگاروں سے بچاؤ۔"
میرا جو کمرا جو چند ماہ پہلے قبر کی طرح محسوس ہوتا تھا وہ اب معطر اور خوشگوار ہواؤں سے بھرا رہتا تھا۔ جس کمرے میں لیٹتے ہوئے میرا دم گھٹتا تھا وہاں پر سوتے وقت ایک راحت ملنے لگی تھی۔ اللہ کی نعمتیں ہر ایک پر بے انتہا ہیں اور مجھ پر بھی کرم تھا اور ابھی بھی ہے۔ اچھی جاب مل چکی تھی۔ فیملی جلد کینیڈا پہنچنے والی تھی اور بہار پھر پورے جوبن کے ساتھ آئی تھی۔ بہار کے رنگ زمین پر پھولوں اور پتیوں کی صورت بکھرے تھے۔ سرسبز گھانس زمین سے باہر جھانکنے لگی تھی۔ درخت سبحان اللہ کا ورد کرتے محسوس ہوتے تھے۔ ماحول نے مسکرانا شروع کیا تو چہرے بھی پھولوں کی طرح کھل اٹھے۔ سرجی، مفتی، شہباز، مطیع اللہ اور میں جب بھی اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے تو پہلے کی طرح تھکاوٹ، سردی اور اکڑے پٹھوں کا واویلا نہیں کرتے تھے بلکہ ہم مسکراتے اور گنگناتے داخل ہوتے۔ مفتی جیسا بے رونق انسان بھی چہرے پر مسکراہٹیں سجائے ملتا تھا۔ سرجی اکثر گنگناتے پائے جاتے۔ مطیع اللہ کی آنکھوں میں اب تھکاوٹ کے بجائے شرارتیں ہوتی۔ شہباز اب سرجی کی عزت کرنے لگا تھا۔ پتا نہیں یہ بہار کا اثر تھا یا مطمئن دماغ کا؟ مگر میں نے اپنا جو امیج بنایا ہوا تھا وہی اب میرے آڑے آ رہا تھا۔ میں کچھ دیکھنے بیٹھتا تو سب مجھے حیرت سے دیکھنے لگتے۔ میں جب غصے میں بگڑنے لگتا تو سب مجھے میرے پرانے "اقوال زریں" دھرا دھرا کر یاد دلاتے۔ میں انہیں یہ یاد دلاتا کہ آخر میں بھی انسان ہوں تو سب یہ کہتے کہ آپ بھی انسان ہیں ہم تو نہیں تھے۔
ایک بار ٹی وی پر ایک پروگرام لگا تھا جس میں تبت سے لڑکے اور لڑکیاں اپنی پہلی محبت کے اولین تجربوں کو کرارے الفاظوں میں بیان کر رہے تھے۔ میں بھی بیٹھا یہ تجربے اپنے تجربوں سے ملا رہا تھا کہ سرجی مجھے دیکھ کر بولے۔ "پیٹ میں پڑا اچار اتو کودنے لگا بے چارہ۔"
اس کا مطلب نہ مجھے پوچھنے کی ضرورت تھی اور نہ ہی ہمت۔ شہباز بلا وجہ اس معاملے پر بے انتہا ہنسا مطیع اللہ شرارت بھرے لہجے میں میری جانب رخ کر کے بولا۔
"ہمارے ہاں پشتو میں کہتے ہیں کہ دل دیاں لگیاں نوں کونا جان دا۔" صرف مفتی ہی میری سائیڈ لے رہا تھا اور بولا۔
"اگر کوئی بھٹکنا چاہتا ہے تو ہم کون ہوتے ہیں اس کو روکنے والے۔ آج تو ہر ایک مجھے رگیدے جا رہا تھا۔ میں نے غصے سے بھری سرخ آنکھوں سے سب کو گھورا وضو کیا۔ جائے نماز بچھائی اور نماز کے لیے کھڑے ہو کر زور سے کہا۔ "اللہ اکبر" میں کمرے میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا اور لیونگ روم میں سب ٹی وی بند کیے خاموش بیٹھے تھے بعد میں اس بات پر سخت شرمندہ ہوا کہ میری یہ نماز خالص اللہ کے لیے تو نہ تھی بلکہ

اپنے دوستوں کو چپ کرانے کے لیے تھی۔
کسی نہ کسی طرح نماز تمام کی اور باہر آ کر شرمندہ شرمندہ سا ایک جانب بیٹھ گیا۔

☆☆☆☆

ان دنوں یہ خبر اخباروں میں نمایاں تھی کہ پانچ پولیس والے دوران ڈیوٹی شراب کے نشے میں دھت پکڑے گئے ہیں۔ ان کو پکڑنے والے بھی پولیس والے تھے۔ انہیں گرفتار کر کے جج کے سامنے لایا گیا۔ ملزموں کے وکیل نے کہا کہ دوران ڈیوٹی اگر انہوں نے تھوڑی سی پی لی ہے تو اس میں حرج کیا ہے اور اتنی سخت ڈیوٹی میں کچھ پینا ناجائز بھی نہیں ہے۔

عدالت میں جج نے کہا کہ ابھی ان کی نوکری بحال رہے گی مگر تفتیش جاری رہے گی۔ مکمل تفتیش کے بعد چالان پیش کیا جائے کیونکہ نشے کی حالت میں پولیس والا اپنے فرائض کیسے سرانجام دے سکتا ہے۔

یہ خبر شاید عام سی ہو مگر اس خبر نے میرے ذہن میں ایک واقعہ تازہ کر دیا۔ میں مارٹن گرو اور ڈکسن روڈ کے چوراہے پر کھڑا سڑک پار کرنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جمعہ کا دن تھا اور رات ہو چکی تھی۔ سگنل سبز ہوا اور میں روڈ کراس کرنے لگا۔ میں بیچ سڑک پر تھا کہ پولیس کی ایک تیز رفتار گاڑی سگنل توڑتی ہوئی میری جانب لپکی۔ میں جان بچانے کے لیے سڑک کو تقسیم کرنے والی چھوٹی سی دیوار پر بھاگ کر چڑھا اور اس کار نے مجھے بچانے کے لیے اسی دیوار کا رخ کیا۔ میں چھلانگ لگا کر دوسری جانب کود گیا اور گاڑی دیوار سے ٹکرائی اور اس کے آگے کا حصہ پاش پاش ہو گیا۔ میں تھر تھر کانپنے کی تیاری کر رہا تھا کہ اتنے میں پولیس والا خود تھر تھر کانپتا گاڑی کا دروازہ بمشکل کھول کر باہر نکلا۔ مجھے دیکھا، گاڑی کو دیکھا اور اپنی ٹنڈ پر بایاں ہاتھ پھیرنے لگا۔ میں نے اس کا حال پوچھا تو اس کے جواب سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ نشے میں ہے۔ اتنے میں پولیس کی دوسری گاڑیاں بھی پہنچیں کیونکہ پول پر لگے کیمروں نے حادثے کا عکس کنٹرول روم میں منعکس کر دیا ہوگا اور وہاں سے تمام پیٹرولنگ پارٹیوں کو ہدایت جاری کر دی گئی ہوگی۔ بس آناً فاناً پیٹرول کاریں پہنچ گئیں۔ انہوں نے اپنی کارروائی شروع کر دی اور بعد میں اسے پکڑ کر لے گئے۔

دراصل طارق نے ایک بار نیویارک سے مجھے فون کر کے بتایا تھا کہ یہاں پولیس والے ویک اینڈ کی راتوں کو خود ڈرنک ہوتے ہیں اور مجھے نصیحت کی تھی کہ اپنے آپ کو ہمیشہ پولیس کی گاڑیوں سے بچایا کرو۔

میں نے اپارٹمنٹ پہنچ کر پہلے طارق کو نیویارک فون ملا کر صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس نے بغور میری گفتگو سنی اور پھر ایک زوردار چھینک مارنے کے بعد پھٹ پڑا اور بولا میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ یہ پولیس والے ویک اینڈ پر ڈرنک ہوتے ہیں۔ اس نے مجھے بولنے کا موقع نہ دیا اور خود اپنی چھینکیں اور بات جاری رکھی ایک تو تم میری سنتے نہیں ہو اپنے آپ کو فلاسفر سمجھتے ہو۔ معلوم نہیں یہاں کیسے رہو گے۔ میرا تجربہ تم سے زیادہ ہے یہاں میں نے برف ہٹائی ہیں کالنگ کارڈ بیچے ہیں کوئی چھولے نہیں بیچے وہ تب رکا جب تھک گیا۔ اس وقفے کا میں نے فائدہ اٹھایا اور کہا کہ تمہاری اسی ہدایت اور نصیحت کی وجہ سے تو میری جان بچی ہے۔

میری بات سن کر وہ ایک لمحے کے لیے شاید سوچ میں پڑ گیا تھا کہ میں واقعی اس کی تعریف ہی کر رہا ہوں یا پھر وہ اپنی سوچ کو صحیح جان کر خوش ہو گیا اور مجھے ہلکی پھلکی چند اور نصیحتیں کر دیں پھر جب دوبارہ چھینکنے کا وقفہ آیا تو میں نے دوبارہ اس وقفے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فون کاٹ دیا۔

میری فون پر ہوئی گفتگو کو اپارٹمنٹ میں رہنے والے سارے لوگ سن رہے تھے۔ کچھ نے حال احوال پوچھا، کچھ نے تشویش کا اظہار کیا اور کچھ میرا منہ سونگھنے لگے۔ شہباز نے اٹھ کر خان کو فون ملا دیا۔ میں کپڑے تبدیل کر کے آیا تو خان بھی شور مچاتا ہوا آ پہنچا۔ آتے ہی مجھے کوسنے لگا۔ سخت برا بھلا کہا۔ سب اس بات پر حیران تھے کہ وہ میرے بچ جانے پر مجھ ہی کو کیوں کوس رہا ہے۔

میں نے سرجی سے کہا۔ ”ذرا اٹھ کر ان کا منہ تو سونگھو مجھے کچھ شک ہو رہا ہے یہ الٹی سیدھی باتیں کیوں کر رہا ہے۔“

سرجی تو گویا اسی تاک میں تھے وہ واقعی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھ خان کی تیوری پر بل آ گئے۔ اس کی ایک جھڑکی پر سرجی وہیں دبک گئے پھر شہباز کو گالی دی اور اس سے جواباً گالی سنی۔ مینڈ ھا برابر کی ٹکر کا ہو تو مینڈ ھا راہی توجہ دوسری طرف کر لیتا ہے، خان نے بھی ادھر سے توجہ ہٹا کر میری طرف دیکھا پھر کہا۔ ”اگر تھوڑے سے زخمی ہو جاتے تو تمہارا کیا جاتا؟“

میں خان کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ تبھی شہباز نے سرجی کو مخاطب کیا۔ ”سرجی حوصلہ کرو آؤ ہم دونوں مل کر اس

کا منہ سونگھتے ہیں۔‘‘

خان نے ان دونوں کو اشارے سے بیٹھنے کو کہا پھر اپنی بات سمجھائی۔ ’’اگر ندیم ہلکا سا بھی زخمی ہوجاتا اور پھر بہانہ کرلیتا کہ مجھے بیک انجری ہوئی ہے تو اس کے وارے نیارے ہوجاتے کیونکہ...... ایک تو گاڑی پولیس کی تھی اور پولیس والا ڈیوٹی پر تھا۔ اسے انشورنس اور پولیس ڈپارٹمنٹ سے دو تین بلین ڈالر ہرجانے کے مل جاتے، اس کے علاوہ تمام عمر ہر ماہ اس کا سارا خرچا انشورنس کمپنی یا کوئی اور دیتا۔‘‘

خان کی بات سن کر سب مجھے ایسے دیکھنے لگے جیسے میں دنیا کا احمق ترین انسان ہوں۔ سرجی کے ساتھ ساتھ شہباز اور مفتی بھی کف افسوس مل رہے تھے۔ میں نے خان سے سوال کیا۔ ’’وہ طریقہ بھی بتادو جس سے گاڑی کے نیچے آنے سے بندہ ہلکا سا زخمی ہوتا ہے۔‘‘

سوال سن کر خان سوچ میں پڑ گیا اور جواب نہ ہونے کی وجہ سے سوچ میں ہی ڈوبا رہا۔ تبھی سرجی دوبارہ اٹھے اور اس کا منہ سونگھنے کے لیے بڑھے۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر خان گرجا اور وہ پھر دبک گئے۔

کل ویک اینڈ شروع ہو رہا تھا میں نے ہولڈنگ سینٹر فون کر کے اس ویک اینڈ پر جاب کرنے سے معذرت کرلی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ نسرین سے ملاقات کرلی جائے کیونکہ میں اس سے وعدہ کرچکا تھا۔ صبح اٹھا اور ناشتا کرنے کے بعد اسے فون ملایا۔

فون اس کے بیٹے سعد نے اٹھایا۔ میری آواز سن کر ہی وہ مجھے پہچان گیا۔ وہ مجھ سے بہت قریب ہوگیا تھا۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ مجھے پہچان کر وہ پُرجوش ہوگیا۔ بلند آواز میں کہنے لگا۔ ’’انکل! مما کہہ رہی تھیں کہ آج ہم سب کہیں پکنک منانے چلیں گے۔‘‘

میں نے ابھی تک نسرین سے پکنک وغیرہ کا کوئی پروگرام ڈسکس نہیں کیا تھا مگر شاید وہ اپنی جانب سے کچھ شیڈول کرچکی تھی۔ میں نے سعد سے پوچھا کہ واقعی اس کی مما نے اس سے کہا ہے۔ وہ توتلے لہجے میں بولا۔ ’’ہاں! اور مما نے سینڈوچ اور ڈرنکس بھی تیار کی ہیں۔‘‘

اس دوران نسرین نے اس کے ہاتھوں سے ریسیور لے لیا اور بولی۔ ’’یہ میرے بیٹے سے میرے بارے میں کیا پوچھ رہے ہو؟‘‘

’’میں پوچھ رہا ہوں کہ تمہاری مما کیسی لگ رہی ہے۔‘‘ میں نے بات بنائی۔

’’میرے اچھا لگنے یا نہ لگنے سے تم کو کوئی فرق پڑتا ہے؟‘‘

میں بھی موج میں تھا تو بولا۔ ’’مجھے اگر نہیں تو موسموں کو تو پڑتا ہے۔‘‘

وہ ہنس کر بولی۔ ’’اتنے رومانٹک تو کبھی نہ تھے...... سب ٹھیک ہے نا۔‘‘

’’بہار کا اثر ہے۔ موسم کھلا تو سوچا کہ میں بھی ذرا سا کھل جاؤں۔‘‘

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھاگئی۔ وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ’’وہ بھی دیکھ لیں گے۔ پہلے بتاؤ کب آرہے ہو؟‘‘

میں نے سوال کو نظرانداز کر کے پوچھا۔ ’’سعد بتارہا تھا کہ مما نے پکنک کا پروگرام بنایا ہے۔‘‘

وہ بولی۔ ’’اب ہائی پارک جانے کا وقت آگیا ہے بہار میں جانے کا وعدہ تم سے کیا تھا ناں!‘‘

’’وہ وعدہ تو سردیوں میں کین سینٹر کے باہر ہوا تھا۔ وہ پھر خاموش ہوئی اور دوبارہ سے بولی۔ ’’یاد ہے نا۔‘‘

واقعی یہ موسم کہیں باہر بیٹھنے کا تھا۔ بہار کا ایک بھرپور دن آج طلوع ہوا تھا۔ دھیرے دھیرے بہتی معطر ہوائیں بدن میں سرشاری بھر رہی تھیں۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ’’میری یادداشت کو کبھی چیلنج نہ کرنا۔‘‘

’’چیلنج تو جنگ اور لڑائی میں کیا جاتا ہے۔ دوستی میں تو سرنڈر ہوتے ہیں۔‘‘ پھر وہ رکی، سانس لے کر کہنے لگی۔ ساری باتیں کیا فون پر کرنی ہیں؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’مجھے کیا کچھ لے کر آنا ہے؟‘‘

اس نے منع کردیا، بولی۔ ’’ہائی پارک کے لیے ہم لوگ آدھے گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔‘‘

مجھے بھی آدھا گھنٹا لگتا، اگر اسی وقت نکلتا تو اس نے ہائی پارک کے کیل اسٹیشن کے سامنے والے گیٹ کے اندر ملنے کا کہا اور فون بند کردیا۔

میں کیل (Kele) سب وے سے باہر نکلا تو چمکتی دھوپ ہر جانب پھیلی تھی۔

نیلا آسمان خالی نہ تھا، بادل کہیں کہیں ٹھہر گئے تھے۔ بہت سے لوگ دائیں جانب چلے جارہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ پارک کا مین گیٹ ادھر ہی ہوگا۔ میں بھی تھوڑی دیر دائیں جانب چلا تو سڑک کے بائیں جانب دور دور تک پھیلا ہائی پارک تھا۔ مین گیٹ ذرا چل کر نظر آیا۔ ہجوم اندر

داخل ہو رہا تھا۔ آج کا دن لوگوں کے لیے نایاب تھا اس لیے ویک اینڈ پر چمکتا سورج لوگوں کو سال میں کبھی کبھی نصیب ہوتا ہے اور اس کے تذکرے دنوں چلتے ہیں۔ ٹورنٹو کے آسمان پر بادلوں کی آمدورفت زوروں پر رہتی ہے نامعلوم ٹورنٹو میں انہیں دیکھنے کو کیا ملتا ہے کہ ہر وقت ہی جھانکتے رہتے ہیں۔ کبھی کم تو کبھی زیادہ۔

میں بھی لوگوں کے ساتھ لوہے کی سلاخوں سے بنے ایک بڑے سے گیٹ میں داخل ہو گیا۔ دور دور تک سرسبز گھاس کے قطعوں کے بیچ پختہ راستے تھے۔ ان راستوں پر رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس مرد، عورتیں اور بچے تھے۔ جگہ جگہ درخت، جھولے، سلائڈز اور چھوٹی جھیلیں تھیں۔ بینچ اور میزیں تھیں۔ فوڈ کورٹ بھی بدنظر رہے تھے۔ میری نظریں ہر طرف پھر رہی تھیں جن کو تلاش کر رہی تھیں، شاید وہ ابھی نہیں آئے تھے۔ میں ایک بینچ پر جو درخت تلے رکھا تھا۔ اس پر بیٹھ گیا اور گیٹ کی جانب دیکھنے لگا، ایسا کہ جب وہ آئیں تو مجھے نظر آ جائے۔ اتنے میں پارک کی جانب سے سعد بھاگتا ہوا آیا اور میرا بازو پکڑ کر ہنسنے لگا۔ وہ لوگ شاید پہلے آ چکے تھے۔ بائیں جانب دیکھا تو نسرین کھڑی ہنس رہی تھی۔

وہ مجھے بہت دیر سے دیکھ رہے تھے کہ میں انہیں ڈھونڈھ رہا ہوں۔ وہ ہنستی ہوئی قریب آئی تو میں نے پوچھا۔ ''اتنی دیر سے میں آیا ہوا ہوں اور تم مجھے دیکھتے ہوئے بھی سامنے نہیں آئیں۔ مزے لے رہی تھیں۔''

''میں نے سوچا کہ تمہیں بھی ذرا احساس ہو جائے کہ انتظار کیا ہوتا ہے۔''

''وہ تو مجھے معلوم ہے کہ انتظار کی لذت اور تڑپ کیا ہوتی ہے۔''

''کیا بہت زیادہ انتظار کیا ہے کسی کا؟''

''نہیں! کسی کا انتظار نہیں کیا بلکہ زندگی خود انتظار کرتے گزری ہے۔''

''میں بھی نہیں۔''

''تم میری بات کو نہیں سمجھی اور میں زندگی کو۔'' میں نے پھر سے سعد کا ہاتھ تھاما اور بولا۔ ''تمہاری مما تو باتوں میں دن گزار دیں گی...... چلو کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' وہ بھی ایک بیگ اور تھرمس اٹھائے ساتھ ساتھ چل پڑی۔ تھرمس میں نے اس سے لے لیا۔ پھر میں نے...... دیکھا کہ کوئی اداسی سی اس کی گہری آنکھوں میں جھلک رہی ہے۔

ٹورنٹو

صوبہ آنٹیریو کا صدر مقام۔ آبادی 40,00000 یہاں دنیا کی مختلف قومیتوں کے افراد آباد ہیں۔ کینیڈا میں مقیم چینیوں کی سب سے بڑی تعداد اسی شہر میں رہتی ہے۔ اسی طرح اطالویوں کی بھی بہت بڑی تعداد ٹورنٹوں میں مقیم ہے۔ ٹورنٹو کا آن ٹاور یہاں کی بہترین عمارت ہے اس کی سب سے اوپر کی منزل سے پورے شہر کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ 555 میٹر (یا 1820 فٹ) بلند یہ ٹاور بغیر کسی سہارے کے کھڑا دنیا کا بلند ترین ٹاور ہے۔

یہ شہر شمالی امریکا کا ایک اہم سیاحتی مرکز بھی ہے۔ اسے کینیڈا کی اقتصادی و معاشی سرگرمیوں کا مرکز ہونے کا شرف حاصل ہے۔ چائنا ٹاؤن کے علاقے میں وکٹورین طرز کے مکانات بنے ہوئے ہیں۔ ٹاور سے کچھ فاصلے پر فورٹ پارک ہے، جس میں برطانوی فوج کے انیسویں گریژن رہتی تھی فنون لطیفہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک آرٹ گیلری بھی ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں ٹورنٹو ان تین قلعوں کے نام کے طور پر استعمال ہوتا تھا، جنہیں فرانسیسیوں نے تعمیر کرایا تھا، تا کہ ریڈ انڈینز کے ساتھ اپنی تجارت کو انگریزوں اور دوسری یورپی اقوام کی طرف سے کسی خطرے سے محفوظ بنایا جا سکے۔ جب 1759ء میں فرانسیسیوں کو شکست ہوئی تو قلعے مسمار کر دیے گئے۔ یہاں ایک بندرگاہ بھی ہے۔ وکٹورین کیتھڈرل، سینٹ لارنس ہال، یونیورسٹی کالج کی عمارات انتہائی دیدنی ہیں۔ یہ کینیڈا کا سب سے بڑا ثقافتی مرکز ہے۔ یہاں کا سمفنی آرکسٹرا بڑا مشہور ہے۔

ٹورنٹو کی شاہراہوں اور عمارتوں کے نیچے ایک زیرزمین شہر ہے جہاں ریستوران، بینک، ہوٹل، دفاتر اور تجارتی ادارے ہیں۔ تین میل طویل سرنگوں اور زیر زمین راستوں کے ذریعے یہ شہر کے دوسرے علاقوں سے مربوط ہے۔ شہر میں دو یونیورسٹیاں ہیں ایک کا قیام 1827ء میں جبکہ دوسری کا قیام 1959ء میں عمل میں آیا، یہ بیس بال کھیل کا ایک بڑا مرکز ہے۔

نسرین ذوالقرنین، کوہاٹ

چار سوا ایکڑ میں پھیلا ٹورنٹو کا سب سے بڑا اور ایک قدیم پارک میرے سامنے تھا۔ وہ ہموار زمین پر نہ تھا بلکہ اوپر نیچے بل کھاتی پہاڑیاں سی بن گئی تھیں۔ مجھے اس پارک کو دیکھنے کا شوق کینیڈا آنے سے پہلے کا تھا۔

اس کا ذکر علی سفیان آفاقی نے بھی اپنے کینیڈا کے سفرنامے میں کیا تھا۔ آج میں پہلی بار اس پارک میں آیا تھا۔ وسیع رقبے میں پھیلا یہ نیچرل پارک ہے۔

ہم پختہ راستوں پر بڑھتے ہوئے آگے جا رہے تھے۔ یہاں زیادہ تر فیملیز تھیں۔ بچے قلانچیں بھرتے پھر رہے تھے۔ میرے دونوں جانب گھاس بچھی ہوئی تھی۔ درختوں پر کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ دھوپ سے گھاس چمک رہی تھی۔ آگے بہت سارے بچے نظر آئے جو جھولوں اور سلائڈوں پر شور مچاتے ہوئے چڑھ رہے تھے، اتر رہے تھے۔ سعد تیر کی طرح ان کی جانب لپکا مگر میں نے اسے تھام لیا۔ ہم قریب پہنچے تو ساتھ رکھی بینچوں پر سے ایک پر ہمیں جگہ ملی۔ میں ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور نسرین اپنے بیٹے کو جھولوں کی جانب لے گئی۔

مجھے سگریٹ کی طلب محسوس ہوئی، میں نے ڈبیا نکالی تو یاد آیا کہ پارک میں سگریٹ ممنوع ہے۔ مجبوراً بے بسی سے ڈبیا واپس جیکٹ کی جیب میں رکھ لی۔

سورج چمک رہا تھا مگر اس کی دھوپ میں پیار تھا نرمی تھی، میں نیلے آسمان تلے رکے سفید بادلوں کو دیکھ رہا تھا جن کے نیچے بہت نیچے پرندے پرواز کر رہے تھے۔ میں ایک خوشگوار دن میں خوب صورت لوگوں کے بیچ ایک خوشگوار موڈ میں بیٹھا آسمان کے شفاف نیلے رنگ کو دیکھ رہا تھا۔

نسرین سعد کو جھولوں کے قریب دیگر بچوں کے پاس چھوڑ کر میری جانب آئی۔ مجھے سوچوں میں گم دیکھ کر خاموشی سے بیٹھ گئی پھر اس نے بیگ سے چائے کے دو مگ نکالے۔ تھرمس سے ان میں چائے بھری اور ایک کپ میری جانب بڑھایا۔

چائے کا گھونٹ بھر کر میں بولا۔ ”یہ ایرانیوں نے کب سے پاکستانی چائے بنانا سیکھ لی؟“

وہ ہنس کر بولی۔ ”جب پاکستان کے پاکستانی دوست بن جائیں تو پاکستان کی ہر چیز بنانی آسان ہوجاتی ہے۔“ پھر اس نے بیگ کھولا اور بولی۔ ”سینڈوچ کھاؤ گے؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں۔“ تو اس نے بیگ دوبارہ بند کر دیا۔

ہم پھر سے سامنے کھیلتے بچوں کو دیکھنے لگے۔ سعد بھی بچوں کے درمیان تھا۔ بچے بہت جلد ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں۔ سعد بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ کھیل رہا تھا۔ کبھی وہ کسی سلائڈ سے نیچے آرہے تھے۔ تو کبھی اوپر چڑھتے نظر آتے۔ جب کبھی وہ لکڑی کی بنی بھول بھلیوں میں گم ہوجاتے تو نسرین بے چین ہوجاتی۔ جھولوں تلے کی زمین پر آسٹروٹرف بچھا تھا کہ کہیں بچے گر کر زخمی نہ ہوجائیں۔

نسرین خاموش تھی ایسے کہ جس طرح اس کی روح پر گہری اداسی چھائی ہو۔ میں نے اس کی جانب دیکھا تو اس کی اداس آنکھیں میری جانب اٹھیں۔ دونوں کی نظریں ایک ساعت کو آپس میں ملیں اور پھر اس کی نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگیں۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ آج اس کے حسن میں حزن تھا۔ اس کے سیاہ بال ہمیشہ کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ وہ خیالوں میں کھوئی ہوئی لگ رہی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ”آج تمہیں کیا ہوا ہے؟“

میرے سوال پر اس نے مجھے غور سے دیکھا اور ایک مختلف سوال کر دیا۔ ”تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟“

میں پہلے تو سوال سن کر چپ رہا اس نے پھر سے اپنا سوال دہرایا اس طرح کہ جیسے جواب لیے بغیر اپنے سوال سے دستبردار نہ ہوگی۔

میں نے کہا۔ ”میں نے کئی لوگوں سے بہت سی محبت کی ہے۔“

”کیا مطلب؟ بہت سی محبت؟“

”میرے پاس اتنی زیادہ محبت تھی کہ اپنے پاس رکھ کر برباد نہیں کر سکتا تھا لہٰذا بانٹ دی۔“ میں نے ہنس کر جواب دیا۔

”کیا سب کی سب بانٹ دی۔“

”ہاں! سب کی سب بانٹ دی مگر صلے میں اس سے دوگنی ملی۔“

”اسے بھی بانٹ دو ناں۔“

میں نے اس کی جانب دیکھا اور پھر نظروں کی تاب نہ لا کر خلاؤں میں دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں مجھے میری نگاہ میں مجرم بنا رہی تھیں۔ وہ ٹورنٹو میں تن تنہا تھی اور ایک خوب صورت بیٹے کی ذمہ داری بھی اس کے ناتواں کندھوں پہ

تھی۔ اسے محبت کی تلاش تھی یا وہ کسی خوف میں مبتلا تھی کسی انجانے خوف میں ۔ جیسے کوئی ایک دھڑکا لگا ہو کہ میرے ساتھ کل کیا ہوگا۔ میں اس سے کبھی بے زار نہ ہوا اس کی قربت سے ہمیشہ ہی ایک طرح کے نشے میں رہتا تھا۔ اس کی رفاقت میرے لیے نہایت دلآویز تھی، اس کی دودھ میں دھلی رنگت اور گہری، سیاہ اور اداس آنکھوں کے سامنے میں زمین پر نہیں بلکہ اس سے کچھ اوپر بھٹک رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ نہ میں اسے چھوڑوں اور نہ کوئی اسے میلا کرے۔ میں ایک طرح سے اس کا نگہبان بن بیٹھا تھا اور وہ بھی مجھے اپنا نگران بنانا چاہتی تھی۔ مگر وہ جو چاہتی تھی اسے میں پورا نہیں کرسکتا تھا اور میں کیا چاہتا تھا اس کا اندازہ مجھے بھی نہ تھا۔

میں نے اس کا دودھ اور شہد سے دھلا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا۔ ''اگر اپنی محبت تم میں بانٹ دوں تو کیا کرو گی؟''

''جو تم نے کہا ہے وہی کروں گی۔''

''کیا؟''

''واپس ایران چلی جاؤں گی۔'' اس کے لہجے میں مضبوطی تھی اور نگاہوں میں اعتماد اور سچائی کا سمندر تھا۔

اس کے جواب نے مجھے ہلا دیا، میں تو سمجھا تھا کہ وہ محبت مانگ کر مجھے قید کرنا چاہتی ہے۔ کیا معلوم تھا کہ وہ یہ سب لے کر مجھے آزاد کردینا چاہتی ہے۔ میرے اندازے تڑخ گئے، ٹوٹ گئے۔ میں بے حیثیت ہوگیا۔ میں ہار گیا اور وہ جیت رہی تھی۔ میں خود غرض بنا بیٹھا تھا اور وہ ایثار میں ڈوبی بیٹھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں جو اپنے آپ کو دیوتا سمجھ رہا تھا، میرا بت مٹی میں پڑا تھا۔ وہ دیوی بنی اپنے تخت پر بیٹھی تھی۔ وہ میری محبت پا کر واپس جانا چاہتی تھی مگر نامراد بھی نہیں ہونا چاہتی تھی۔

وہ نامراد نہ ہوئی اور میں نادار بن گیا۔ میری آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔ دو قطرے میری آنکھوں میں اترے اور اس نے اپنے ہاتھ سے انہیں صاف کردیا مگر اس کے بعد میری آنکھیں بہنے لگیں اور میں نے انہیں صاف نہ ہونے دیا۔ وہ میرے کندھے پر اپنا سر لگا کر بولی۔ ''مجھے وہ سب مل گیا ہے جو چاہیے تھا۔ اس سے زیادہ مجھے نہیں چاہیے۔''

میں نے اس کا ہاتھ دوبارہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ ''میرا سارا پیار تم لے لو۔ میں اسے شاید اپنے پاس رکھنے کے قابل بھی نہیں ہوں۔''

اس کی آنکھوں کی اداسی چھٹ گئی اور وہ شوخی سے مسکرانے لگیں، بولی۔ ''تمہاری فیملی کب آرہی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''دو ڈھائی ماہ تک.... آجائیں گے۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''میں ان کے آنے سے پہلے تم سے بہت دور چلی جاؤں گی۔''

اس کو نئے روپ میں دیکھ کر اس کے ہاتھ کو میں نے پہلی بار چوم لیا۔ یہ میرا پہلا اظہار محبت تھا جو نادانستگی میں سرزد ہوا۔

میں نے بہت سوچا تھا اور آخرکار اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کا واپس ایران اپنے بھائیوں کے پاس چلے جانا مناسب بھی ہے اور ضروری بھی۔ وہ اکیلے چھوٹے بچے کے ساتھ ٹورنٹو کے سرد تھپیڑے نہیں سہہ سکتی تھی۔ اس کے بھائی اب اپنے کیے پر پچھتا رہے تھے اور وہ اکیلی ایک بڑی جائداد کی مالک بھی تھی۔ وہ میرے خالی کہنے پر کبھی نہ جاتی۔ اگر جانا ہوتا تو اپنی خوشی اور مرضی سے جاتی۔ اس نے میرے چند جملوں کے عوض خوشی اور اپنی مرضی سے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو میرے لیے یہ آسان اور سہل ہوگیا۔ پھر بول بولنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہ آئی تھی کیونکہ وہ ان کی حقدار بھی ثابت کرتی رہی تھی۔ وہ چلی جاتی تو میری زندگی بھی سکون سے گزرتی اس لیے کہ نسرین اور سعد کی سلامتی ان کے واپس ایران چلے جانے میں تھی۔ ان کا ٹورنٹو میں رہنا میرے لیے بھی آسان نہ رہتا۔ میں بھی متواتر ذہنی کشمکش میں رہتا اور مجھے سعد کی بھی فکر رہتی۔

وہ جانے پر رضامند نظر آئی تو پتا نہیں کیوں میرے دل میں اداسی بھر گئی۔ وہ میرے ساتھ بینچ پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ یہ اطمینان نجانے کیوں مجھ کو مغلوب کررہا تھا۔ میرے اندر سے ایک کراہ سی ابھری کہ نسرین اور سعد ہمیشہ کے لیے دور بہت دور میری زندگی سے بھی دور جانے والے ہیں تو میری روح تک کرب میں مبتلا ہوگئی۔

میں اپنا ذہن جھٹک رہا تھا مگر سوچوں کی ایک یلغار تھی۔ جو ذہن کو جکڑے ہوئے تھی اسی ایک نکتے پر آکر ختم ہورہے تھے کہ وہ مجھ سے جدا ہورہے ہیں۔ میں اس سے محبت تو نہیں کرتا تھا پھر اتنا اداس کیوں تھا۔ خود سے بار بار یہ سوال کررہا تھا مگر کوئی جواب نہ تھا۔ میں بار بار اپنے آپ سے سوال کرتا اور جوابات نیلے چمکتے آسمان کی وسعتوں میں تلاش کرتا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ اپنی ساری محبتیں تم کو

دے دی ہیں۔ اس نے محبت کا قرض رکھا نہیں بلکہ اس کی آنکھوں نے میری ساری محبتیں سود سمیت مجھے لوٹا دی تھیں۔

میں اپنے خیالوں میں بھٹکتا ہوا کہاں سے کہاں جا پہنچا تھا کہ ساتھ بیٹھی نسرین نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے واپس ہائی پارک میں کھینچ لیا۔ اس نے اپنا سر میرے کندھے پر ٹکایا اور بولی۔ ''میں نے تمہارے سارے الفاظ پورے یقین کے ساتھ اپنے دل پر لکھ لیے ہیں۔ اس یاد کو کبھی مٹنے نہ دینا۔''

میں نے نظریں اس کی آنکھوں میں ڈالیں اور بولا۔ ''جب تمہارا یہ یقین ٹوٹے تو جان لینا۔ میں جھوٹا تھا۔''

''تم جھوٹے نہیں۔ یہ بھی میرا یقین ہے۔ اس لیے میرا پیار میرے یقین کی طرح پائیدار اور سچا ہے۔'' اس نے کہا اور اس لمحے خنک ہوا کا جھونکا اس سے ٹکرا کر آیا اور خوشبوئیں چھوڑ گیا۔

سعد کھیل کھیل کر تھک گیا تھا۔ دوڑتا ہوا آیا اور میرے سینے سے لگ کر ہانپنے لگا۔ میں نے جھک کر اس کا سر چوم لیا۔ اس کے بیٹے کو چومنے کا احساس اس کے گال سرخ کر گئے۔

میں نے سوچا کہ وہاں سے اٹھنا چاہیے۔ تبھی نسرین بولی۔ ''آپ نے ہائی پارک پورا دیکھا ہے؟ چلیے میں آپ کو دکھلا دیتی ہوں۔''

میں نے پوچھا۔ ''اس پارک میں کیا چیز تم مجھے دکھانا چاہتی ہو؟'' تو اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ میں نے گیٹ کے قریب اس پارک کا بروشر لے لیا تھا۔ میں نے سعد سے کہا۔ ''تمہاری مما نے تو یہ پارک ہمیں نہیں دکھانا۔ اب میں تم کو لے چلتا ہوں اور اس بہانے تمہاری مما اور میں بھی کچھ نہ کچھ دیکھ لیں گے۔''

یہ صرف پارک نہیں ہے بلکہ اس میں کھیلوں کے میدان، باغات، چڑیا گھر، تعلیمی اور کلچرل سرگرمیوں کے مراکز ہیں، ایک چھوٹی ٹرین بھی چلتی ہے جو پارک کے مختلف حصوں کی سیر کراتی ہے۔ اوک (OAK) کے درختوں کی اسٹڈی کرنے کے لیے اس پارک کا ایک بہت بڑا حصہ مختص ہے جہاں ان درختوں کا ایک جنگل ہے۔ اس جنگل میں ٹریکس بنے ہوئے ہیں جن پر چل کر آپ یہ محسوس بھی نہیں کر سکتے کہ آپ ٹورنٹو کے وسط میں گھوم رہے ہیں ایسا لگے گا کہ کسی دور دراز کے جنگل میں بھٹک رہے ہیں۔

کیفے، میوزیم اور تھیٹر بھی اس پارک میں موجود ہیں۔ ایک خوب صورت جھیل بھی ہے جہاں کا دلکش نظارہ سحر طاری کر دیتا ہے۔ ٹینس کورٹ، پول، اسپورٹس فیلڈ، نیچرل ٹریل اور پکنک ایریا کے علاوہ ایک جنگل نما حصہ، اپنی قدرتی حالت میں، اس پارک کو ایک شاندار مقام میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ہم اس فسوں ساز ماحول میں آگے بڑھ رہے تھے۔

کچھ دور ایک جگہ سے چھوٹی سی خوب صورت ٹرین جس کا رنگ سرخ و سفید تھا روانہ ہونے والی تھی۔ سعد دوسرے بچوں کی طرح ٹرین کے رنگ برنگے ڈبے دیکھ کر مچلنے لگا۔ نسرین بتانے لگی کہ یہ پہلی بار میرے ساتھ کسی پارک میں آیا ہے۔ چند بار اسکول کے ٹرپ پر گیا تھا۔ شاید اسی لیے سعد آج بہت پُرجوش تھا۔ وہ نرم گھاس پر قلانچیں بھر رہا تھا۔ ٹرین کو دیکھنے کے بعد وہ کبھی میری جیکٹ کھینچتا اور کبھی ماں کا دامن پکڑتا۔ میں نے ٹرین پر بٹھانے کے لیے اسے اٹھایا تو وہ میرے ہاتھوں سے کود کر ٹرین میں چڑھ گیا۔ میں اس کے برابر میں بیٹھا اور نسرین ہنستی ہوئی سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بہت سے بچے اپنے بڑوں کے ہمراہ شوخ رنگ کے کپڑے پہنے بڑے انہماک سے اردگرد دیکھ رہے تھے۔ مجھے یہ ایک سفاری ٹرپ لگ رہا تھا پھر بھی ایسا محسوس نہ ہوتا تھا کہ میں کسی پارک میں ہوں۔ ٹرین کھیلوں کے میدانوں سے گزر کر ریسٹورنٹ کی جانب آئی۔ کچھ اترے اور کچھ سوار ہوئے۔ بچوں کے ساتھ بڑے بھی خوش ہو رہے تھے۔ میں بھی ایک نئے تجربے سے روشناس ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے میں سینٹرل پارک نیویارک میں جا چکا تھا۔ مگر آج ایک نئے جذبے سے سرشار تھا۔ اس ہائی پارک ٹورنٹو میں سیر کا مزہ بالکل الگ تھا۔ اتنے وسیع و عریض پارک اور اس کی خوب صورتی، بناوٹ اور تفریحی سرگرمیاں دیکھ کر میں پُرجوش تھا مگر آج اس بحر کی موجوں میں کوئی اور اضطراب بھی تھا۔

میں ہائی پارک پر بہت کچھ لکھ سکتا تھا مگر شاید کبھی نہ لکھ پاؤں۔ کیونکہ میں اس کے بعد بھی ایک دو بار گیا مگر خالی ہاتھ لوٹ آیا تھا۔ میں لکھنا چاہوں تو صرف نسرین کو لکھ پاؤں گا۔ میرے پڑھنے والے جانتے ہوں گے کہ میں جہاں بھی گیا تو اس مقام کی ہر چیز کو بیان کیا جس کو میں نے اپنی نظروں سے دیکھا۔ مگر ہائی پارک کو میں صرف اپنے احساس کی نظر سے بیان کر پاؤں گا۔

ٹرین میوزیم کے قریب رکی تو ہم اتر آئے۔ میں نے

نسرین سے کہا کہ وہ سعد کو میوزیم دکھلا لائے، میں باہر کچھ دیر تنہا رہنا چاہتا ہوں۔
اس نے میری جانب بغور دیکھا۔ ذہین تھی، سمجھ گئی کہ میں ذہنی طلاطم کا شکار ہوں۔ اس نے اپنا بیگ مجھے پکڑایا اور سعد کو لے کر میوزیم کی طرف چلی گئی۔
میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کی چال میں خوداعتمادی تھی۔ اندر داخل ہونے سے پہلے اس نے مڑ کر دیکھا۔ میں اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ فاتح کی طرح مسکرائی۔ دور سے ہاتھ ہلایا اور اندر داخل ہوگئی۔
مجھے سگریٹ کی شدید طلب ہورہی تھی۔ اردگرد دیکھا تو کوئی اسموکنگ ایریا نظر نہ آیا۔ مجبوراً میں سگریٹ کی طلب کو ضبط کر کے بیٹھ گیا۔ سورج کی دھوپ میں ہلکی سی تمازت تھی اور چلتی خنک ہوا کے لمس میں ایک جادو تھا۔
میں ذہنی طلاطم میں تھا مگر اس طوفان میں ہیجان نہ تھا، ایک کسک تھی۔ ایک ہلکا سا درد تھا۔
میں بینچ پر بیٹھا تھا۔ نظریں سامنے میوزیم کے اس دروازے پر تھیں جہاں سے لوگ باہر نکل رہے تھے۔ کسی دروازے کے باہر انتظار کرنا آپ کے اکیلے پن کو دور کردیتا ہے۔ آپ کی ڈور دروازے کے پار والے کے ہاتھ میں ہوتی ہے یا اس کی ڈور آپ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ آپ کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ میں یہاں سے اٹھوں گا تو تنہا ہوں گا۔ آپ کو یہ مسرت ہوتی ہے کہ دروازے سے جو باہر نکلے گا تو اس کی نظریں آپ کی تلاش میں ہوں گی۔ کتنا خوب صورت احساس ہے جو آپ کو دوستی، محبت یا پھر کسی بھی رشتے سے جوڑے رکھتا ہے۔ یہ احساس بھی بہت فرحت بخش تھا کہ جب آج میں یہاں سے اٹھوں گا تو اکیلا نہ ہوں گا۔ ایک دوست جو اپنے آپ کو ہمدم سمجھتا ہے وہ ہمراہ ہوگا۔ وہ دوست جو میرا خیال رکھتا ہے۔ وہ دوست جس کی بہتری کے لیے میں اسے اپنے سے خود ہی جدا کررہا ہوں۔ لیکن اس کی جدائی یا دوری کا میں سوچ کر بھی بجھ سا جاتا تھا۔ کتنی پُرمسرت لہر تھی جو پاس آنے سے گنگناتی تھی اور دور ہونے پر آہیں بھرتی تھی۔ میں آسمان کی بیکراں وسعتوں میں نظریں گاڑے یہ سوچ رہا تھا کہ وہ دروازے سے باہر نکلے۔
تبھی وہ دروازے سے باہر آتی ہوئی نظر آئی۔ سعد کی نظروں نے مجھے ڈھونڈ لیا۔ وہ وہیں سے دوڑتا ہوا میرے پاس آیا اور ہمیشہ کی طرح گلے سے لٹک گیا۔ جب تک میں اسے پیار نہ کرتا وہ گلے لگا رہتا۔ میں نے بھی تب تک پیار نہ کیا جب تک نسرین قریب نہ پہنچ گئی۔
وہ قریب آئی اور ایک گہرا سانس لے کر بینچ پر میرے ساتھ بیٹھ گئی اور بولی۔ ”یہ بچہ مجھے تھکا دیتا ہے۔“ پھر میری جانب مسکرا کر بولی۔ ”یہ دوسرا بچہ بھی تھکا دیتا ہے۔“
سعد بھی تھک گیا تھا اور ماں کی گود میں سر ڈال کر اونگھنے لگا۔ نسرین نے اس کو ایک سینڈوچ دیا اور وہ اسے کھا کر غنودگی میں ڈوبتا چلا گیا۔ وہ اپنی مخروطی انگلیوں سے اس کے بالوں کو سہلا رہی تھی۔ میں بیٹھا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ ماں کی ممتا اس کی انگلیوں کے پوروں سے ہوکر سعد کے جسم میں جذب ہوئی تو اس کے چہرے پر دنیا جہاں کا سکون آکر ٹھہر گیا۔ معصومیت کی پرچھائیاں اس کے چہرے پر لہروں کی مانند پھیلتی چلی گئی۔ میں اس کے چہرے پر ماں اور بیٹے کے عظیم رشتے کی کرامات دیکھ رہا تھا۔ مجھے محو دیکھ کر بولی۔ ”کہاں کھو گئے ہو تم؟“
میں نے نیلگوں چمکیلے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس بیکراں وسعتوں میں پھیلا سکون زیادہ ہے یا سعد کے چہرے پر؟ میں یہ دیکھ رہا ہوں۔“
”سعد تو میرے ہاتھوں میں ہمیشہ ایسا ہی ہوجاتا ہے مگر جو اطمینان میرے اندر ہے اس کا اندازہ بھی لگالو۔“
”تمہارے چہرے کو تو زیادہ دیر دیکھنے کی تاب بھی نہیں ہے۔“
”میرے چہرے کو نہیں...... میری آنکھوں میں بھی دیکھ لو۔“
”میں ڈوبنا نہیں چاہتا۔“
”میں ڈوبنے نہیں دوں گی...... تمہیں کنارے پر چھوڑ کر خود ڈوب جاؤں گی۔“ وہ روہانسی ہوکر بولی۔ پھر اپنا بایاں ہاتھ میری گردن کے پیچھے رکھا اور میرا چہرہ گھما کر اپنی طرف کرلیا۔
میں نے دیکھا تو اس کی آنکھوں سے دو موتی ڈھلک کر اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔
اس سے ملتجیانہ لہجے میں بولا۔ ”مجھے مقام سے اتنا زیادہ اونچا مت اڑاؤ کہ میرے پر جل جائیں۔“
اس نے پھر اپنا سر میرے کاندھے پر رکھ دیا اور بولی۔ ”چند مہینے کی بات ہے اتنا مجھے برداشت کرلو۔“ پھر سعد کے سر پر رکھے اس کے ہاتھ پر میں نے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا چہرہ گلنار ہوگیا۔
ہم وہاں سے تب اٹھے جب سائے قدرے لمبے ہونا

شروع ہوئے۔ اس دوران سعد کی نیند بھی پوری ہوگئی تھی۔ ہم نے سینڈوچ اور چائے سے اپنے آپ کو تازہ دم کرلیا تھا۔ اب ہرے بھرے سبزہ زار مخمل کی طرح بچھے نظر آتے تھے۔

ہم پارک کے راستوں پر چل رہے تھے۔ نیند کا خمار سعد پر سے اتر گیا تھا اور وہ اب پارے کی طرح کودرہا تھا۔ ہمارے اردگرد لوگ چلے آرہے تھے۔ ہم پارک کے اس کونے کی جانب آئے جہاں ایک چڑیا گھر بنا ہوا تھا۔ یہاں بھی بچوں اور بڑوں کا ہجوم تھا۔ بڑے بچوں کو میلا دکھانے آئے تھے اور خود میلے میں کھو گئے تھے۔ چڑیا گھر کیا تھا ایک جگہ ہرن، بارہ سنگھے، طوطے، بکریاں وغیرہ سب جمع تھے۔ سب انہیں دیکھ کر خوش ہورہے تھے۔ سعد تادیر کسی جانور کو تکتا رہتا اور پھر شور مچا کر ہمیں متوجہ کرتا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے ہم وہاں گھومتے رہے۔

اب ہم تھک چکے تھے۔ میں نے مشورہ دیا کہ کیفے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ کیفے میں ہاٹ ڈاگ فش برگر اور آلو کے قتلے تل رہے تھے جسے لوگ کاؤنٹر سے لے کر ادھر اُدھر بیٹھے بڑی رغبت سے کھا رہے تھے۔ میں نے اور نسرین نے کافی منگوائی۔ سعد فش برگر اور کولڈ ڈرنکس پاکر خوش ہوگیا تھا۔ لوگ کرسیوں پر بیٹھے ستارہے تھے۔ پکنک کا مزہ تب تک نہیں آتا جب تک آپ تھک کر چور نہ ہوجائیں۔ یہی لطف ہے کسی بھی جگہ کی سیر کرنے کا۔ میں گرم کافی کے ہلکے ہلکے گھونٹ لیتا اور آنکھیں موند لیتا تھا۔ نسرین عقل مند تھی جبھی تو مجھے اپنی ذات کے لیے ٹائم دے رہی تھی۔ وہ سعد کے ساتھ معروف رہی اور میں سامنے کرسی پر ٹانگیں رکھے اور آنکھیں بند کیے خمار میں ڈوبا رہا۔ باہر سبزہ زار پر سائے لمبے ہونا شروع ہوگئے تھے۔ آدھے ہرے بھرے میدان سائے میں اور آدھے دھوپ میں تھے۔ دھوپ سنہری ہورہی تھی۔ سورج رکوع سے سجدے کی جانب رواں تھا۔ ہم ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھے دھوپ اور سائے کے علاوہ خنک ہوا سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ میرے سونے جاگنے کے ساتھ ساتھ دھوپ چھاؤں کا کھیل بھی جاری تھا۔ سعد کی کوئی آواز نہ آتی تھی غالباً وہ سوچکا تھا۔ میں بھی غنودگی میں تھا۔ جب میری آنکھیں بند تھیں تبھی مجھے اپنے ہاتھ پر نسرین کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں تو وہ میرے بہت قریب تھی۔ مجھے جاگتے پاکر بولی۔ ”کیا رات یہیں سونے کا پروگرام ہے؟“

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، بھیڑ چھٹ رہی تھی۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ جہاں ابھی سورج تھا وہاں کچھ بادل تھے جن کے کنارے رنگین ہورہے تھے۔ بہار کی معطر ہوائیں خوشبو پھیلاتی ہمارے قریب سے گزر رہی تھیں۔

میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ملیں اور بولا۔ ”شام ہونے کو ہے، ہمیں نکلنا ہوگا۔“

اس کا جواب صرف ”ہوں“ میں آیا۔ اس نے سعد کو بیدار کیا اور وہ حیرت سے اردگرد دیکھنے لگا کہ وہ کہاں پر ہے۔ اس کی ماں نے اس کے بال اپنے ہاتھوں سے بنائے اور اسے پیار کیا۔ میں نے واش روم جاکر ٹھنڈے اور تازہ پانی سے منہ دھویا تو واپس اپنی دنیا میں آگیا۔

پارک میں شام کا سایہ پھیلتا جارہا تھا۔ ہم وہاں سے باہر آگئے۔ سعد بار بار مجھ سے مخاطب ہوکر کہہ رہا تھا۔ ”تھینک یو انکل تھینک یو انکل۔“

میں نے بڑھ کر اسے پیار کیا تو وہ میرے بازو سے لپٹ گیا۔

ہم سب وے کے گیٹ تک آئے انہیں بس سے اپنے اپارٹمنٹ جانا تھا اور مجھے ٹرین پکڑ کر کفلنگ اسٹیشن آنا تھا۔

سب وے کا گیٹ دیکھ کر سعد چونک گیا پھر مجھ سے بولا۔ ”آپ کیا اپنے گھر جارہے ہیں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ ضد کرنے لگا کہ رات ان کے ہاں گزاروں۔ وہ پچھلی رات نہیں بھولا تھا جب مجھ سے لپٹ کر سویا تھا۔ وہ ضد کرنے لگا اور نسرین میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ مجھے جانا ضروری ہے مگر ضد پر اتر آیا تھا کبھی میرا اور کبھی ماں کا بازو پکڑ رہا تھا۔ میں نے نسرین کی جانب دیکھا تو وہ بولی۔ ”آپ کی ویسے بھی کل چھٹی ہے دل کرے تو ہمارے ہاں رک جاؤ۔“

مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ بار بار ان کے گھر ٹھہروں۔ اُدھر سعد نہ جانے کیا سوچ کر اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا اور نسرین کی آنکھیں بتارہی تھیں کہ وہ بھی یہی چاہ رہی ہے۔ مجبوراً میں نے ہامی بھرلی پھر ہم فٹ پاتھ پر بس اسٹینڈ کی جانب چلنے لگے۔ سعد نے میرے ہاتھ کو مضبوطی سے تھامے رکھا ہوا تھا اور نسرین ہمارے پیچھے پیچھے تھی۔

ہم اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ وہ شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ نسرین کے اپارٹمنٹ کو دیکھ کر اس کی نفاست اور ذوق کا اندازہ ہوجاتا تھا۔ جس طرح وہ اپنے آپ کو زیبائش کے ایک معیار پر رکھتی تھی اسی طرح اپنے اپارٹمنٹ کی سجاوٹ کرتی تھی۔ اس نے ناشتے کی میز پر اپنا بیگ رکھا۔ میرے ہاتھ سے چائے کا تھرمس لیا اور اسے کچن میں رکھنے کے بعد لیونگ روم کی کھڑکی کھول دی شام کا اندھیرا چھا رہا تھا اور معطر ہوا نے کمرے کو باہر کی خوشبو سے بھردیا۔

نسرین کے جذبے میں کوئی طاقت تھی۔ میں اس کے ساتھ جس تعلق کو محسوس کر رہا تھا اس میں ہوس کا کوئی پہلو نہ تھا۔ یہ جذبہ اس ہوا کی مانند، نکھرا ہوا اور خوش کن تھا جو کھڑکیوں کی جالیوں سے اندر آرہی تھیں۔ میں ایک سرشاری کو محسوس کرتا ہوا صوفے پر گرسا گیا اور اپنا سر ایک سائیڈ پر ٹکا کر لیٹ گیا وہ سعد کو تبدیل کروانے بیڈروم میں لے گئی۔

کمرے کا دروازہ میرے سامنے تھا۔ میں نے صوفے پر لیٹ کر اپنی آنکھیں موندھ لیں۔ وہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آئی اور میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔ میں سوچ میں گم تھا اس لیے اسے دیکھ نہ سکا کہ وہ کب آکر کھڑی ہوئی۔ اس کا پتا اس وقت چلا جب وہ بولی۔ ''سو گئے کیا؟''

میں نے آنکھیں کھولیں تو حیران رہ گیا۔ اس نے شلوار قمیص زیب تن کیا ہوا تھا۔ شوخ میرون رنگ پر چاندی کے رنگ کی ہلکی سی کشیدہ کاری تھی۔ گلے میں دوپٹا تھا اور چہرے پر مسکراہٹ۔ اس کے گھنے سیاہ بال کھلے ہوئے تھے۔ عطر بیز ہوا کا جھونکا کھڑکی سے آیا تو اس کے بالوں نے چہرے کو ڈھانپ لیا گیا، ایسا لگا کہ روشنی گل ہوگئی ہو۔ اس نے اپنے بال ہٹائے تو چاند روشن ہوگیا۔ اس کی حسین نگاہوں میں محبت کا پیغام تھا۔ اجلا سا اور دھلا ہوا۔ تازہ اور دلنشین۔ میں نے اسے نظر بھر کر دیکھا تو وہ ہنس پڑی اور بولی۔ ''کہاں کھو گئے ہو؟'' میں چونکا اور شرمندہ سا ہوگیا۔

وہ بولی۔ ''دیکھتے رہو اچھا لگ رہا ہے۔''

میرے الفاظ گم ہوچکے تھے میں خاموش رہا۔ وہ میرے پاؤں کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں نے اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں اور ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ تب وہ بولی۔ ''لیٹے رہو۔''

''عورت کا ادب مانع ہے۔''

''ادب سے نہیں پیار سے دیکھو۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر الفاظ ادا کررہی تھی۔

''خوب صورت چہروں کو پیار کے علاوہ ادب اور احترام سے بھی دیکھنا چاہیے۔'' میں نے مرعوب ہوکر کہا۔

''پہلی بار مجھے خوب صورت کہا ہے۔'' اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

''تم نے بھی تو پہلی بار اتنی زیادہ خوب صورتی کے ساتھ اور اتنے پیار سے دیکھا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے بات بدلی اور بولا۔ ''چائے تو پلا دو سر میں درد ہے۔''

وہ مسکرا کر میرے پاس سے گزر کر کچن کی جانب چلی گئی۔ اسی کی قمیص کا کپڑا میرے چہرے سے ٹکرایا اور میں دوبارہ خوشبوؤں میں نہا گیا۔

میں اٹھا اور واش روم میں ہاتھ منہ دھونے چلا گیا۔ فریش ہوکر آیا۔ وہ ابھی تک کچن میں تھی میں بھی اس کے پیچھے کچن میں چلا گیا۔ وہ چائے کے لیے الیکٹرک کیتلی میں پانی گرم کررہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''سعد کہاں ہے؟''

''وہ ذرا سی دیر کے لیے سویا ہے ابھی اٹھ جائے گا۔''

میں خاموش ہوگیا، پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''رات کے کھانے کے لیے میں پیزا کی ڈلیوری کروادیتا ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔''

میں اس کی بات نہیں سمجھا اور کہا۔ ''کیا تمہیں بھوک نہیں ہے؟''

وہ مسکرارہی تھی، بولی۔ ''بھوک تو بہت لگی ہے۔''

''پھر؟''

''تو پھر کھانا کھائیں گے۔''

''تو کیا ابھی بناؤ گی؟'' میں حیران ہورہا تھا۔

وہ میری طرف مڑ کر بولی۔ ''بنا ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اسٹو کو نیچے سے کھولا تو ایلومینیم فائل سے ڈھکے دو برتن نظر آئے۔ اس نے وہ باہر نکالے۔ ایک پر سے فائل ہٹائی تو وہاں پلاؤ تھا اور دوسرے پر گوشت بنا ہوا تھا۔

میں نے پوچھا کہ تم کب سے پلاؤ اور قورمہ کھانے لگی ہو۔

وہ بولی۔ ''تمہارے لیے بنایا ہے۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا تھا کہ میں رات یہیں رکوں گا؟'' میں اسے کریدرہا تھا۔

''مجھے یقین تھا کہ تم رکو گے اس لیے میں نے رات ہی یہ سب بنالیا تھا۔'' وہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

وہ مجھے حیران پریشان کیے جارہی تھی۔ میں خاموش تھا اور یہ خاموشیاں میرے اندر موسیقی بن کر گونج اٹھیں، سر اٹھنے لگے، راگنیاں بجنے لگیں۔ میرا ماضی میرا مستقبل میرے حال میں مدغم ہونے لگا۔ مستقبل اور ماضی یکساں ہو گئے۔

اس کے چہرے پر سرخی اور نظروں میں خمار تھا۔ وہ جھکی نگاہوں سے بولی۔ ''تم بیٹھو میں چائے لاتی ہوں۔''

میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ چائے کے دو کپ لے آئی۔ ان کو کافی ٹیبل پر رکھا اور جا کر ٹی وی آن کیا۔ میں نے جلدی سے کہا کہ اسے بند رہنے دو۔ اس نے اسے بند کر دیا۔ ٹی وی کی چیخ و پکار ماحول کو گدلا کر دیتی۔ اسی لیے بند کرایا تھا۔

میں چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا۔ چائے پیتے ہوئے اس کی نظریں مگ کے اندر تھیں۔ ہمارے الفاظ گم تھے۔ ماحول میں خاموشی کے پردے لہرا رہے تھے۔ میں معلوم نہیں کیسے ان لمحوں میں اتر آیا تھا جن میں زندگی کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ تب اس نے خاموشی کے پردے اٹھائے اور بولی۔ ''کچھ کہو گے نہیں؟''

میں نے جواب میں کہا۔

''تم کیا کچھ سننا چاہتی ہو؟''

''جو سننا تھا وہ تم نے پارک میں بینچ پر بیٹھے ہوئے بول دیا۔'' اس کے بعد پھر سے خاموشی کے پردے گر گئے۔

وہ کمرے سے چلی گئی۔ سعد کو دیکھنے گئی تھی۔ واپس آئی تو سعد بھی ساتھ تھا۔ بتانے لگی کہ اگر سوتا رہتا تو رات کو جلدی اٹھ جاتا۔ سعد آیا تو وہ نیند میں تھا۔ مجھ سے لگ کر دوبارہ اونگھنے لگا۔ وہ دوبارہ کمرے میں گئی اور ایک بیگ لے آئی۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا کرتی پھر رہی ہو؟''

بیگ سے ٹراؤزر اور نائٹ شرٹ نکال کر بولی۔ ''تمہارے لیے لائی ہوں۔ پچھلی بار مجھے لگا تھا کہ تم پینٹ شرٹ میں بے آرام سوئے تھے۔''

اب کی بار میں حیران نہ ہوا اور نہ کوئی الفاظ بولے۔ دونوں چیزیں اٹھا کر واش روم میں چلا گیا۔ جاتے ہوئے یہ کہا کہ تم کھانا لگاؤ میں تبدیل کر کے آتا ہوں۔

باتھ روم میں آیا تو شیشے میں اپنا چہرہ دیکھا اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ہم نے کھانا کھایا۔ خلاف توقع کھانا بہت ہی اچھا تھا۔ ایرانیوں کے کھانوں کے برعکس اس نے مرچ مصالحے ڈالے تھے شاید اسی لیے وہ کم کھا رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ مجھے اور سعد کو کھلا رہی ہو۔ میرے جیسے سخت جان انسان کو وہ بڑی احتیاط اور قرینے سے برت رہی تھی۔ وہ سرتاپا محبت تھی اور سب کچھ مجھ پر اور اپنے بیٹے سعد پر نچھاور کر رہی تھی۔ میں اگر اپنا پایا ہوا سارا پیار بھی اسے دے دیتا تو شاید کم ہوتا۔ اس نے بڑے سلیقے سے اپنے پیار میں باندھ دیا تھا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ بندھ کر رہ گیا تھا۔ اس نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔ وہ بہت ذہین تھی اور بڑی فراست سے مجھے جکڑتی جارہی تھی۔ یہ کیسی بے بسی تھی کہ میں بے بس ہو کر بھی اطمینان اور سکون کی منزلوں پر تھا۔

کھانے کے بعد میں صوفے پر بیٹھا ایرانی قہوہ پی رہا تھا۔ سعد میرے قریب بیٹھا اپنے بلاکس سے کھیل رہا تھا۔ وہ میری بائیں جانب صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس کے دونوں پاؤں کافی ٹیبل پر رکھے ہوئے تھے اور ہاتھ میں قہوہ کا کپ تھا۔ لیونگ روم کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور ہوا کے ساتھ ساتھ چاندنی کی کرنیں بھی اس میں سے آرہی تھیں۔ لیونگ روم میں روشنی ٹیبل لیمپ کے ہلکے سے دودھیا بلب سے نکل رہی تھی۔ پورے کمرے میں دودھیا چمک بلب کے علاوہ اس کے چہرے اور اس کے نازک اور خوب صورت پاؤں سے نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے پاؤں بہت خوب صورت تھے جنہیں میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

میں کبھی کبھی چور نظروں سے اس کے چہرے کی جانب دیکھ لیتا تو وہ میری نظریں بھانپ کر اپنی مسکراہٹیں مجھے عنایت کر دیتی۔ بنانے والے نے ازل سے انسان کے اندر پیار کا جذبہ رکھ دیا ہے۔ آدم اور حوا کے اندر بھی یہ جذبہ تھا اور اسی لیے وہ جنت سے نکالے گئے۔ اللہ کو معلوم تھا کہ یہ جذبہ انسانی فطرت پر غالب رہے گا۔ مرد اور عورتوں کی فطرت میں دو الگ الگ خوبیاں ہیں۔ عورت وفا کی علامت ہے تو مرد پیار کا متلاشی۔ وہ کسی ایک سے پیار کرتا ہے تو یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ پہلے سے دور ہو گیا ہے۔ مرد کے دل میں ہمیشہ جگہ خالی رہتی ہے جب کہ عورت اپنے دل میں پیار رکھ کر اپنے دل کو ڈھانپ لیتی ہے۔ مرد پیار کا پرتو دوسرے چہرے میں دیکھتا ہے اور عورت ایک ہی پیار کو دل میں ہمیشہ کے لیے قید کر دیتی ہے۔

میرے علاوہ نسرین بھی جانتی تھی کہ میں اپنی بیوی اور بچوں سے بے انتہا پیار کرتا ہوں۔ ان کی خاطر کچھ بھی کر

گزروں گا۔ اسی لیے وہ ہمارے بیچ نہیں آئی تھی بلکہ وہ میرے ساتھ چل پڑی تھی۔

آج میں پیار کے اصل روپ کو پہچان رہا تھا۔ یہ مشکل عمل ہے کہ انسان کسی کے پیار میں دوسروں کے لیے اپنے دل کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کردے۔ یہاں میرے فلسفے سے اختلاف کرنے والے بہت ہوں گے اور اختلاف کرنا ان کا حق بھی ہے کیونکہ میں خود ان کے نظریوں سے یہاں اختلاف کررہا ہوں۔

لیونگ روم میں مکمل خاموشی تھی۔ میں سوچوں میں گم تھا۔ نسرین نے اپنے ذہن میں کوئی اپنی ہی دنیا بسائی ہوئی تھی اور وہ بھی اپنی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ میں اپنے اور اس کے تعلق پر غور کررہا تھا۔ ہماری حیثیت اس میں کس قدر بے مائع تھی کہ ہمارا ہونا یا نہ ہونا دنیا کے نظام میں اس طرح تھا کہ کسی سمندر میں دو قطرے پانی کے ڈال دیے جائیں یا پھر نکال دیے جائیں بلکہ اس سے بھی بہت کم اور یہاں ہم جیسے بے حیثیت لوگ اپنی اپنی دنیا علیحدہ بنائے بیٹھے تھے۔ ایک ذرہ ایران سے چلا اور دوسرا پاکستان سے، دونوں ٹورنٹو میں اتفاق سے ملے اور اب ہم دونوں کو بچھڑ جانا تھا، جس طرح اس کائنات میں دو ذرے تھوڑی سی دیر کو آپس میں ٹکرائیں اور اس کی وسعتوں میں ہمیشہ کے لیے کھو جائیں مگر ان حقیر ذروں نے اپنی کئی خوشیاں بھی سوچ رکھی تھیں اور کئی انجانے خوف بھی پال رکھے تھے۔ حسرتوں کے بار بھی پرور کھے تھے اور وسوسوں کے ہنکارے بھی اپنے من میں محسوس کرتے تھے۔ وصل کی چاندنی بھی تھی ہجر کا زہر بھی تھا۔

میں ان سوچوں سے چھٹکارا حاصل نہ کرپاتا اگر وہ بول نہ اٹھتی۔ اس کی مدھم سی آواز آئی۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”ان لمحوں سے لطف اندوز ہورہا ہوں۔“ اتنے میں معطر ہوا کا اک آوارہ جھونکا کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوا، اس کی زلفیں اڑیں تو میں نے پہلی بار چاندی کے جھمکے اس کے کانوں پر لرزتے دیکھے۔ وہ ایک لمحے کو کوندے اور ان پر دوبارہ بالوں کا پردہ گر گیا۔ میرے سامنے نسرین نہ تھی جو مجھے کین سینٹر میں ملی تھی بلکہ وہ یہ تھی جو مجھے ہائی پارک میں ملی تھی۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی اور ..... ”تمہارے ہاں یہاں پر ٹھہرنا مجھے کسی دوسری دنیا کی سحر انگیز کہانی لگ رہی ہے۔“

میری بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ وہ مسکراتی رہی۔ اس کی مسکراہٹ میں غرور تھا۔ ایک تکبر تھا جو اس پر سجتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کے دل کے نہاں خانے سے وہ راز نکل رہے ہیں جو نہ جانے کتنے عرصے سے مدفون تھے۔ اس نے بارہا محبت بھری نظروں سے پیغام بھیجے تھے، جنہیں میں نظر انداز کرتا آرہا تھا۔ جب ان پیاموں کو جگنوؤں کی طرح میں نے اپنی مٹھی میں لے لیا۔ وہ قلوپطرا کی طرح نیل کے اوپر چاندنی راتوں میں بہتے بجرے میں اپنے تخت پر براجمان انجان بنی بیٹھی تھی، مجھے اس کی یہ ادا زیادہ بھلی محسوس ہورہی تھی۔ اب کی بار میں مسکرایا اور وہ حیران نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ آس اور امید کے دیپ اس کی آنکھوں میں جھلملانے لگے۔ میں بھول گیا کہ میرا ایک خاندان ہے بیوی بچوں والا ہوں جو آج کل میں پہنچنے والے ہیں۔

مجھے مسکراتے دیکھ کر اس کی چمک دار سیاہ آنکھوں میں حیرت اتری اور پوچھنے لگی۔ ”تم کیوں مسکرارہے ہو؟“

”کھلتے پھول کو دیکھ کر میں ہمیشہ مسکراتا ہوں۔“ میں اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ یہ سن کر اس کی نگاہیں شرمیلی ہوکر جھک گئیں۔ اب کی بار یہ وہ نسرین نہ تھی جو ٹورنٹو کے سخت حالات میں جدوجہد کررہی تھی۔ شاید وہ نسرین تھی جو اپنی منزل پر پہنچ کر اپنے سنگھاسن پر آسودہ بیٹھی تھی۔

میں اٹھ کر اس کھڑکی کی طرف آیا جہاں سے چاندنی آرہی تھی۔ کھڑکی کے باہر دیکھا تو عجیب و غریب منظر میرے سامنے تھا۔ ایسا نظارہ تھا جیسے پوری کائنات محبت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ پورے دنوں کے چاند کی چمک سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ٹورنٹو کی سڑکوں، عمارتوں، درختوں اور فضا میں نور کا سیلاب امڈ آیا ہے۔ سامنے ایک پارک تھا جس میں سرو کے درخت ایک قطار میں چاند کی چاندنی میں نہائے کھڑے تھے۔ ٹورنٹو ساکن تھا اور ایک پُرسکون سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں یہ نظارہ دیکھ رہا تھا کہ اپنے قریب خوشبو کا احساس ہوا۔ مڑ کر دیکھا تو نسرین تھی۔ حیرت اور خوشی اس کے تاباں چہرے پر نمایاں تھی۔ سامنے پھیلے نظاروں نے شاید اسے بھی مدہوش کردیا تھا، وہ بولی۔ ”میری کھڑکی سے یہ بھی دکھتا ہے؟ میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔“

میں نے کہا۔ ”تم نے شاید اپنے دل کی کھڑکی کبھی کھولی نہیں ہے۔“

اس کا دایاں ہاتھ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ شاید اس کے اندر بھی ایک طلاطم برپا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹ میرے ہاتھوں پر رکھ دیے۔ سعد ہماری نظروں سے اوجھل تھا مگر اندازہ تو تھا کہ وہ پیچھے صوفے پر بیٹھا اپنے کھیل میں مگن ہے۔ شاید اسی لیے ہم دوبارہ اپنی جگہوں پر آبیٹھے۔

وہ بولی۔ ''مجھے تمہاری بیوی پر رشک آتا ہے۔ تم ایک ساحر ہو۔ میں ہراساں پھر رہی تھی مگر تم نے مجھے دوبارہ زندگی کی طرف کھینچ لیا۔ تم اس کا کتنا خیال رکھتے ہو گے، اس کا اندازہ مجھے ہو رہا ہے۔ مجھے معلوم ہے تم اس سے اور اپنے بچوں سے بے پناہ محبت کرتے ہو۔ تم میرے پاس آنے سے ہمیشہ اس لیے انکاری رہے کیونکہ تمہیں اس سے محبت ہے۔''

وہ خاموش ہوئی۔ اس کی بے قرار نگاہیں جیسے میرے اندر کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ جب میں چلی جاؤں گی تو مجھے کتنا یاد کرو گے لیکن میں تم کو کبھی یاد نہیں کروں گی کیونکہ تم ہمیشہ میرے پاس ہو گے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

میں نے اس کی جانب نہیں دیکھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ہوں گے، جو میں دیکھ نہیں سکتا۔

اس نے سعد کی طرف مڑ کر کہا۔ ''بیٹا! اب چلو، سونے کا وقت ہو گیا ہے۔''

وہ کہنے لگا۔ ''میں انکل کے ساتھ سوؤں گا۔''

میں بولا۔ ''جس طرح پچھلی بار صوفے پر میرے ساتھ سویا تھا، آج بھی ایسے ہی سو جائے گا۔''

''نہیں، پہلے بھی تم بے آرام ہوئے تھے۔ تم اور سعد اندر بیڈروم میں سو جاؤ۔ میں صوفے پر سوؤں گی۔''

کافی بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ میں سعد کو اندر بیڈروم میں سلاؤں گا اور جیسے ہی اسے نیند آ جائے گی تو میں باہر آ کر نسرین کو اندر بھیج دوں گا اور خود صوفے پر سو جاؤں گا۔

میں ایک بڑے اور آرام دہ بیڈ پر دائیں جانب لیٹ گیا۔ سعد میرے بائیں جانب میرے بازو پر لیٹا تھا۔ بیڈ کے دائیں جانب نسرین کی ڈریسنگ ٹیبل تھی اور میرے پاؤں کی جانب ایک قد آدم الماری، ساتھ ایک پنکھا رکھا تھا جس کی ٹورنٹو میں ضرورت گرمیوں میں پڑتی ہے۔

سعد سونے کی بجائے مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے سوچا کہ یہ بچہ ابھی سونے والا نہیں ہے تو میں اس کی ماں کے بارے میں اس سے پوچھنے لگا۔ وہ بتا رہا تھا کہ وہ صبح اٹھتی ہیں۔ مجھے تیار کرتی ہیں۔ ناشتا دیتی ہیں اور پھر خود تیار ہوتی ہیں، مجھے اسکول چھوڑ کر خود جاب پر یا کین سینٹر جاتی ہیں۔ اسکول سے مجھے ڈے کیئر پہنچا دیا جاتا ہے۔ مما جاب سے آ کر مجھے لیتی ہیں اور پھر ہم گھر پر ہوتے ہیں۔ وہ یہ بھی بتا رہا تھا کہ مما اکثر اکیلے میں روتی رہتی ہیں لیکن جب مجھے دیکھتی ہیں تو آنسو صاف کر لیتی ہیں۔ فون پر ایران میں رہ رہے میرے ماموں سے بات کرتی ہیں پھر چیخنے لگتی ہیں اور فون بند کرنے کے بعد بہت روتی ہیں۔

اتنے میں نسرین نے بیڈروم کا دروازہ کھولا اور اندر آئی پھر بیٹے سے بولی۔ ''تم خاموشی سے سو جاؤ اور انکل کو بھی سونے دو۔''

سعد نے آنکھیں موند لیں، وہ اسے کچھ دیر دیکھتی رہی اور پھر دروازہ بند کر کے واپس لیونگ روم میں چلی گئی۔

سعد نا معلوم کتنی دیر بولتا رہا تھا۔ اس کی پیاری پیاری باتیں سنتے سنتے میں غنودگی میں آ گیا اور پھر نیند نے دبوچ لیا۔

نہ معلوم کتنی دیر گزری تھی کہ سعد نے کروٹ بدلی اور میرے سینے سے لگ گیا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ سعد میرے ساتھ لگا سو رہا تھا اور نسرین سعد کے بائیں جانب بیڈ پر بیٹھی ہمیں دیکھ رہی تھی۔

میں نے آہستگی سے اپنا بایاں بازو سعد کے سر کے نیچے سے نکالا اور نسرین سے پوچھا۔ ''تم کیوں بیٹھی ہو؟''

وہ خاموش رہی۔

کچھ سوچ رہی تھی ؟ مگر معلوم نہ پڑتا تھا کہ وہ خوشی کے لمحوں میں ہے یا کرب کے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا وقت ٹھہر گیا ہو۔ اس کے احساس منجمد ہو گئے ہوں۔ ساری فضا اپنے مقام پر ٹھہر گئی ہو۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا سوچ رہی ہو؟''

اس نے پلکیں اٹھائیں۔ دو چراغ جلے، روشنی پھوٹی اور وہ بولی۔ ''کتنی دلآویز حقیقت ہے کہ تم...... تم سعد کے ساتھ سوئے ہوئے تھے اس وقت جو سکون اس کے چہرے پر ہے وہ میں نے بہت کم دیکھا ہے۔ تم نے میرے مکان کو گھر بنا دیا ہے۔ آج رات کے لیے ہی سہی۔ یہ بھی بہت ہے۔ اس کا تصور بھی اسی کی طرح خوب صورت ہو گا۔''

میں بستر سے اٹھا اور باہر جانے لگا۔ اس نے پوچھا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''باہر لیونگ روم میں۔''
وہ بولی۔ ''چائے پیو گے؟''
میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں لیونگ روم میں آیا اور کھلی کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک نظر مجھ پر ڈالتی کچن میں چلی گئی۔ میں باہر چاندنی کو درختوں کی شاخوں اور پتوں سے الجھتے دیکھ رہا تھا۔ ہوا میں خنکی تھی اور رات دوسرے پہر میں ڈھل گئی تھی۔ پورا جہان سویا ہوا تھا مگر میرے دل کے نہاں جاگ رہے تھے۔ میں کچھ دیر کھڑا رہا پھر آہٹ ہوئی مڑ کر دیکھا تو وہ چائے لے آئی تھی۔ میں نے کہا کہ چائے ٹیبل پر رکھ دو۔ پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی میرے قریب بیٹھ گئی اور چائے پینے لگی۔

وہ مجھ سے لگ کر بیٹھی تھی۔ میں نے اس کی جانب دیکھا تو آج اس میں غضب کا اعتماد تھا۔ یہ وہ نسرین نہ تھی جو سینٹر میں ہراساں پھرتی تھی۔ آج اس کے قدم زمین پر جمے ہوئے تھے۔ میں اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ بل کھاتی زلفیں سمٹ گئی تھیں جس کی وجہ سے اس کے کانوں میں پڑے چاندی کے آویزے شروع کے چاند کی طرح چمک رہے تھے۔

میری حالت صحرا میں مدتوں سے چلتے اس مسافر کی سی تھی جس کو نخلستان نظر آ گیا ہو اور وہ میٹھے چشمے کے کنارے بیٹھا اس کا ٹھنڈا پانی پی رہا ہو۔ وہ مجھ سے بہار کی معطر ہواؤں کی طرح آ ٹکرائی تھی۔ میں تنہائیوں کی ظلمت میں گھرا تھا اور وہ مجھے وصل کی چاندنی رات نظر آ رہی تھی۔ میں پھر بھی قدم آگے بڑھانے سے رک گیا تھا کہ وہ میری محبت نہیں ہے۔ وہ میری منزل نہیں بلکہ کوئی فرحت بخش پڑاؤ ہے۔ وہ ایک ایسی رفاقت ہے جو جسم میں سروں کی طرح دوڑتی ہے۔

اس نے اپنا مگ ختم کیا۔ دونوں ہاتھ میرے بائیں کندھے پر رکھے اور اپنے ہاتھوں پر سر رکھ دیا۔ وہ خاموش تھی۔ اس کے چہرے کی جگمگاہٹ سے چاندنی پھیکی پڑ گئی تھی۔ اس کا وجود ایسے تھا جیسے مدھم سی سحر انگیز روشنیاں جل رہی ہوں۔

اس کا ساتھ ایک جادو تھا۔ ایک فسوں تھا۔ اس کے لمس سے میرے اندر کے اندھیرے جگمگانے لگے تھے۔ میرا الوژنتو کے سفر کا غیر یقینی پن سرعت سے یقین کی منزل پر آ پہنچا تھا۔ میں جسے اپنے دل میں جگہ دینے سے قاصر تھا اس نے میرے وجود کو جکڑ لیا تھا۔ مگر میں ضمیر کے آگے بے بس تھا جو مجھے بار بار جھنجوڑ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت بھی میرے اندر ایک سرد موسم طاری تھا۔ میں صرف ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ یہ اکیلی کیسے دنیا کا سرد گرم سہے گی۔

میں نے چائے کا خالی کپ ٹیبل پر رکھنا چاہا تو اس نے اپنا سر میرے کندھے سے ہٹا لیا۔ کپ رکھ کر میں نے دوبارہ صوفے سے ٹیک لگائی تو اب اس کا سر دوبارہ سے اپنی جگہ بنا گیا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ یونہی بیٹھی رہے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ یونہی اس کی زلفیں میرے شانے پر رہیں۔ میرا دل چاہتا تھا کہ یونہی اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہے۔ یہ معطر لمحے لافانی ہو جائیں۔ یہ دلآویز مدہوش کن لمحے میرے احساسات کا ہمیشہ کے لیے حصہ بن جائیں۔ تبھی میں نے دیکھا اس کی آنکھیں اشک بار ہیں۔ وہ چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی میں اسے چپ کرواتا کہ وہ بولی، آج انہیں بہنے دو۔ ان کے بہنے سے کسک کم ہو گی۔ اس کا ہاتھ پکڑنے سے میری انگلیوں کے نشانات اس کی سرخ و سپید جلد پر ثبت ہو گئے تھے۔ وہ کہنے لگی۔ ''ایسا ہو سکتا ہے کہ یہ نشانات ہمیشہ یونہی رہیں؟'' اس نے پھر اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا تھا۔

وہ کیسی خود فراموشی کے لمحے تھے کہ میں تا دیر ایسے ہی

ٹیٹوف، گھرمن
(Titov Gherman)

میجر گھرمن سپتانووچ ٹیٹوف، روس کا دوسرا خلا باز، مشرقی سائبیریا کے ایک گاؤں پولکووینی کوف میں پیدا ہوا۔ ثانوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسٹالن گراڈ میں فضائیہ کے تربیتی اسکول میں داخل ہو گیا۔ بعدازاں روسی فضائیہ میں نمایاں کارنامے انجام دیئے اور اعلیٰ کارکردگی پر سرٹیفکیٹ آف میرٹ حاصل کیا۔ 1949ء میں ینگ کیمونسٹ لیگ کا ممبر بنا دیا گیا۔ 17 اگست 1961ء کو خلا میں کامیاب پرواز کی 25 گھنٹے 18 منٹ تک خلا میں رہا اور زمین کے گرد سترہ چکر لگائے۔ اس نے 4 لاکھ چونتیس ہزار نو سو ساٹھ میل کا سفر کیا جو چاند پر جانے اور آنے کے برابر ہے۔ اس کے خلائی جہاز ووستوک دوم کا وزن 4-1/2 ٹن تھا۔ اس جہاز نے زمین کے گرد ہر چکر 88 منٹ میں پورا کیا۔
مرسلہ: اسماعیل، لیہ

بیٹھا رہا اور وہ آنکھیں بند کیے رہی۔ نہ میں تھکا اور نہ اس نے کروٹ بدلی۔ ہم دونوں خاموش تھے اور خاموشی اپنی راگنی گا رہی تھی۔ نسرین واقعی ایک پھول تھی۔ ایسا پھول کہ جس کی خوشبو کو میں ہمیشہ تازہ رکھنا چاہتا تھا۔ میں اس کی قربت میں بھی اپنی معراج پر پہنچا ہوا تھا۔ میں وہ پھل نہ کھانا چاہتا تھا کہ میری محبت مجھ سے کھو جائے۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے تھا اور نہ اس کو اس سے زیادہ کی مجھ سے تمنا تھی۔ ہم ایک عجیب رشتے میں بندھے تھے جس میں نہ کوئی ملاپ تھا اور نہ ہجر کی آزردگی تھی۔ رات کو ٹھہر جانا چاہیے تھا مگر وہ تیزی سے صبح کے اجالے کی طرف بھاگ رہی تھی کہ نہ جانے کیسے میری آنکھ بند ہو گئی۔

صبح اٹھا تو میں صوفے پر لیٹا تھا۔ مجھ پر گرم کمبل پڑا تھا اور لیونگ روم کی کھڑکی بند تھی۔ معلوم نہیں مجھے کب نیند نے آگھیرا تھا۔ مجھے اتنا یاد تھا کہ رات کو میں صوفے پر لیٹ گیا تھا۔ مجھے سوتا دیکھ کر وہ اٹھ کر چلی گئی تھی۔ رات بھر میں ایک مسحور کن خواب دیکھتا رہا تھا۔ میں ایک راستے پر چلا جا رہا ہوں جس کے دونوں جانب خوشنما اور چمکیلے شوخ و شنگ پھول کھلے ہیں۔ میں اکیلا ہوں۔ وہ راستہ بہت لمبا ہے۔ طویل ہے اور تھکا دینے والا ہے۔ عطر بیز ہوائیں چل رہی ہیں اور دور سامنے سے کوئی شبیہہ چلی آ رہی ہے کوئی نسوانی مگر شکل واضح نہیں۔ میرا سفر جاری رہتا ہے اور وہ شبیہہ میرے قریب نہیں پہنچ پاتی ہے۔ یہ خواب یہیں ختم ہوتا ہے اور پھر یہیں سے دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس سفر میں کوئی تھکاوٹ نہیں، کوئی پیاس نہیں اور کوئی بھوک نہیں اور نہ کوئی تشنگی ہے۔

میں نے وال کلاک میں ٹائم دیکھا تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ شاید اپنے بیٹے کے ساتھ اندر سو رہی تھی۔ سعد بھی دیر سے سویا تھا اور دن بھر کا تھکا ہوا بھی تھا۔ اسی لیے وہ بھی سو رہا ہوگا۔ نسرین تو شاید صبح کے وقت اپنے کمرے میں جا کر سوئی ہوگی۔

میں اٹھ کر واش روم میں گیا۔ گرم پانی سے شاور لے کر تازہ دم ہوا۔ کپڑے بدل کر باہر نکلا تو کافی ٹیبل پر گرم چائے کا کپ موجود تھا۔ نیند کے بعد گرم چائے کے بغیر میرا دن شروع نہیں ہوتا اور شاید نسرین کو اس کی خبر تھی۔ وہ بہت چالاک تھی، اسے میری ساری خبریں معلوم تھیں۔ میں کپ لے کر کچن میں آیا تو وہ کھڑی ناشتا بنا رہی تھی۔ اسے دیکھا تو اس کی آنکھیں مخمور تھیں۔ چہرے پر اطمینان اور مسکراہٹ کے بیچ کچھ تھا۔ مجھے دیکھا تو کھل اٹھی۔ میں نے بھی بہتی لہروں کے آگے بند نہ باندھا۔

وہ بولی۔ ”تم کب بیدار ہوئے؟ مجھے اٹھا دیا ہوتا۔ رات نیند تو ٹھیک سے آ گئی؟ سردی تو نہ تھی، اس لیے میں نے کھڑکی بند کر دی تھی۔ تم خاموش کیوں ہو؟ مسکرا کیوں رہے ہو؟ چلو تم بیٹھ کر چائے پیو...... میں آتی ہوں۔“ ایک ہی سانس میں سوالات کا انبار لگا گئی۔

کچھ دیر بعد سعد بھی اٹھ گیا۔ آتے ہی سلام کیا اور میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ پھر ہم نے مل کر ناشتا کیا۔ اس نے ناشتے میں آملیٹ رکھا تھا، ابلے ہوئے انڈے، شہد، دودھ، ڈبل روٹی کے سلائس اور پھل بھی تھے۔ میں ناشتا کرتا رہا اور سعد کے ساتھ باتیں بھی جاری رہیں۔

میں نے سعد سے پوچھا۔ ”تمہارے اسکول گرمیوں کی چھٹیوں کے لیے کب بند ہو رہے ہیں؟“

اس نے مالٹے کے جوس کا گلاس منہ سے ہٹایا اور بولا۔ ”جون کے تیسرے ہفتے بند ہوں گے اور پھر ستمبر میں میرا گریڈ تھری شروع ہوگا۔“ پھر جوس کا ایک گھونٹ بھرا اور اپنی بات جاری رکھی۔ ”میرا اسکول بہت اچھا ہے۔ ستمبر میں آپ کو اپنی نئی ٹیچر سے بھی ملواؤں گا۔“

یہ سن کر میرا دم گھٹنے لگا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اسکول بند ہونے کے بعد وہ واپس ایران جا رہے ہیں۔ نسرین چونک کر میرے چہرے کی جانب دیکھنے لگی۔ وہ بیٹے کی بات سن کر بوکھلا گئی تھی اور لرزتے لہجے میں بولی۔ ”یہ ابھی بچہ ہے۔ اسے میں آہستہ آہستہ سمجھا دوں گی۔“

سعد اٹھ کر صوفے پر جا بیٹھا اور اپنا جوس کا گلاس بھی لے گیا۔ ٹی وی آن کر کے شو دیکھنے لگا۔ نسرین میرے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ وہ بولی۔ ”یہ ابھی بچہ ہے۔ اسے آہستہ آہستہ تیار کرنا پڑے گا۔ بچے جتنی محبت اپنے گھر سے کرتے ہیں اس سے زیادہ اپنے اسکول سے کرتے ہیں۔ ہم دونوں اسے سمجھائیں گے تو سمجھ جائے گا۔“

میں نے مڑ کر سعد کی طرف دیکھا تو وہ بے نیاز بیٹھا شو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ میں نے پھر نسرین کی جانب دیکھا تو وہ مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ میرا ردعمل دیکھنا چاہتی تھی۔ میں نے کوئی ردعمل نہ دیا اور سر جھکائے چائے پیتا رہا۔

سعد کے جواب نے میرے دماغ میں ہلچل مچا دی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں میں نسرین کے واپس جانے کا علم

اس پر صادر تو نہیں کر رہا؟ کیا وہ اپنی خوشی سے واپس جا رہی ہے یا اسے میری مرضی سمجھ رہی ہے؟ کیا یہ سعد کے ساتھ زیادتی نہ ہوگی کہ دنیا کے ترقی یافتہ تعلیمی نظام سے اسے نکال کر ایران کے ایک قصبے میں واپس بھیج دیا جائے۔ تبھی دماغ نے کہا کہ یہ لوگ ایران میں شاید زیادہ محفوظ ہوں گے۔ میں دماغی طور پر کشمکش و پیچ میں تھا مگر چہرے پر کوئی تاثرات نہ تھے۔ میں نے سپاٹ چہرے سے نسرین کو دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ ''یہ تم مجھے گھور کیوں رہی ہو؟''

اس نے بات بدلی اور بولی۔ ''کل ہیوسال میں جاب صبح کی ہے یا شام کی؟''

''شام کی ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''اچھی بات ہے رات آرام سے سو لو گے۔'' پھر مسکراتی آنکھوں سے مجھے دیکھ کر بولی۔ ''کل رات بھی تم ٹھیک سے نہیں سو سکے ہو گے۔''

میں بولا۔ ''میرے جانے کے بعد تم آرام کرنا...... مجھے معلوم ہے کہ تمہاری نیند پوری نہیں ہوئی، تمہاری آنکھیں بھی یہی بتا رہی ہیں۔''

میں اٹھا اور اپنی جیکٹ مانگی۔ وہ الماری سے میری جیکٹ لے آئی۔ میں نے جیکٹ پہنی اور اس نے میرے جوتے برش کر کے کرسی کے آگے رکھ دیے۔ سعد نے مجھے جاتے ہوئے دیکھا تو اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا دایاں ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ''انکل پھر کب آئیں گے۔''

جواب اس کی ماں نے دیا۔ ''تمہارے انکل اب آتے جاتے رہیں گے۔ بس تم انہیں فون پر یاد دلا دیا کرو۔''

وہ بولا۔ ''میں ہر روز فون کروں گا۔''

میں نے کہا۔ ''سعد! اب یاد دلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہارا انکل تم لوگوں کو نہیں بھول سکتا۔'' نسرین کھڑی مسکرا رہی تھی۔

میں سعد سے مل کر باہر آیا تو نسرین بولی۔ ''تمہیں اسٹاپ تک چھوڑ آتی ہوں۔''

''میرے بار بار منع کرنے کے باوجود وہ نہ مانی۔ سعد کو اس نے گھر پر رہنے کو کہا اور ہم سیڑھیاں اتر کر نیچے سڑک پر آگئے۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ہم بس اسٹاپ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ کبھی فون کر کے اپنی مرضی سے بھی آجایا کرو۔ ہر بار میں فون کر کے بلاتی ہوں۔''

میں نے وعدہ کیا تو وہ پھر بولی۔ ''فون پر بھی بات کرتے رہا کرو۔'' مگر اس بار میں نے وعدہ نہ کیا کیونکہ مجھے اپنی عادت کا اور اپنے معروف شیڈول کا پتا تھا کہ اس میں کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔

ہم اسٹاپ پر کھڑے تھے۔ بس فوراً آ پہنچی۔ میں بس میں سوار ہوا۔ بس چلی تو کھڑکی سے دیکھا وہ بس کو دیکھ رہی تھی۔ بس نے موڑ کاٹا اور وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگئی اور میں سوچ میں ڈوب گیا۔

مجھے پتا بھی نہ چلا جب بس میرے اپارٹمنٹ کے سامنے رکی۔ تب بھی میں سوچوں کی لہروں پر بہے چلا جا رہا تھا۔ میں بس سے اترا اور چلتا ہوا اپارٹمنٹ میں دروازہ کھول کر داخل ہوا۔ حسب توقع میرے چاروں دوست مفتی، شہباز، سرجی اور مطیع اللہ لیونگ روم میں سر جوڑے بیٹھے تھے۔ میں نے سلام کیا اور جواب میں میری جانب سب کی سوالیہ نگاہیں اٹھیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہوں گے اور ان کے دماغوں میں میرے لیے کیا کیا سوالات ہوں گے۔ وہ سمجھتے تھے کہ کہیں میں یہاں کی آب و ہوا میں رچ بس نہ جاؤں۔ یعنی کہ کہیں بھٹک نہ جاؤں۔ وہ اصل واقعہ کو نہیں جانتے تھے اور نہ میں چاہتا تھا کہ انہیں خبر ہو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے لیے کسی کے بارے میں بدگمان ہو جائیں۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ ان کی باتوں کو سرسری طور پر لوں گا اور اگر کوئی سوال اٹھے تو مذاق میں انہیں ٹال دوں گا۔

میں نے جیکٹ اتار کر ہاتھ میں پکڑی اور کمپیوٹر ٹیبل کے ساتھ رکھی کرسی پر مسکراتا ہوا بیٹھ گیا۔ پھر سب سے مخاطب ہوا۔ ''یہ کیا کہ آپ لوگ پورا دن کمرے کے اندر بیٹھے رہتے ہیں۔ بہار آگئی ہے، ذرا باہر جا کر اس کے مزے بھی لیں۔''

سب خاموش رہے تو سرجی بولے۔ ''ہم نے کیا گلوں کا رس چوسنا ہے جو باہر باغوں کے چکر لگائیں۔''

چوٹ تو وہ کر گئے تھے مگر ان کی بات مجھے اچھی لگی۔ مگر جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ پھر مفتی نے شہباز کو اشارہ کیا اور شہباز نے مطیع اللہ کو کہنی ماری۔ مطیع اللہ پہلے ہلکا سا کھنکارا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''یہ جو آپ پوری پوری رات غائب رہتی ہے، کہاں گئی تھی؟''

شہباز بیچ میں بولا۔ ''یہ مت کہنا کہ نسرین سے ملنے گیا تھا۔ ہمیں سچ سچ بتاؤ۔''

شہباز ہر بار میری مشکل آسان کر دیتا تھا۔ وہ ہمیشہ

نسرین کو بیچ میں سے نکال کر اپنی سوچوں کو اِدھر اُدھر دوڑاتا رہتا تھا۔
مفتی بولا۔ "ویک اینڈ کی جاب بھی اس ہفتے چھوڑ دی اور پھر بتائے کچھ کل سے غائب ہو۔"
میں نے کہا۔ "کیا آپ لوگوں کو مجھ پر اعتبار نہیں؟"
شہباز نے جواب دیا۔ "بالکل نہیں۔" اس نے اپنی بات جاری رکھی اور بولا۔ "لگتا ہے کہ آپ کوئی نیا سیاپا کھڑا کرنے والے ہیں۔" انہوں نے کچہری لگائی ہوئی تھی اور مجھے کٹہرے میں کھڑا کیا ہوا تھا۔
"میں نے کہا اگر سچ بتاؤں تو سوالات ختم کردو گے؟"
سرجی بولے۔ "انحصار اس پر ہے کہ سچ کیا ہے۔"
میں بولا۔ "رات نسرین کے پاس رکا تھا۔ دیر ہوگئی تھی اس لیے رک گیا۔"
شہباز بولا۔ "اس کا بہانہ مت گڑھو۔ آپ ہر وقت اس کا نام لے کر اپنی من مانی نہیں کر سکتے۔"
اب ان کی باتوں سے مجھے لطف آرہا تھا۔ وہ سچ پر یقین نہیں کرتے تھے اور میں جھوٹ بولنا بھی نہ چاہتا تھا لیکن میں نے یہ بھی دیکھا کہ سرجی کی آنکھوں میں چمک کے ساتھ مسکراہٹ بھی تھی۔ وہ شاید میرا سچ سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے نسرین کا نام گول کرتے ہوئے ایک عمومی تبصرہ کیا۔ "آپ تو پیتے دودھ ہیں اور کھاتے ملائی ہیں، اور ادھر ہم ہیں کہ جن کو دال بھی نصیب نہیں ہوتی۔"
مطلب صاف تھا کہ میں عیش و عشرت میں پڑا ہوں مگر شہباز دال کو لے کر سرجی پر پھٹ پڑا۔ "سرجی! آپ سدا کے ناشکرے ہیں۔ کل رات ہی میں نے مٹر قیمہ بنایا تھا۔ اس وقت تو مزے لے لے کر کھا رہے تھے اور اب کہہ رہے ہیں کہ دال بھی نہیں ملتی۔"
سرجی بولے۔ "یہ وہ والی دال نہیں ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔"
مطیع اللہ بھی بول پڑا۔ "بعد میں جلیبیاں بھی کھائی تھیں مگر یہ تو ہر وقت روتی رہتی ہے۔"
سرجی چلّا کر بولے۔ "آپ لوگ نرے احمق ہیں، پانی پی کر ذات پوچھ رہے ہیں۔ میں بات کیا کر رہا تھا اور آپ لوگ لڑنے مارنے پر تل گئے ہو۔"
مطیع اللہ بولا۔ "احمق ہم ہیں کہ آپ ہیں۔ ہم نے چائے پی ہے اور تم کہتی ہو کہ پانی پیا ہے۔"
سرجی بولے۔ "میرا مطلب تھا کہ بے تکی بات کر رہے ہو۔"
شہباز بولا۔ "بے تکی بات آپ نے کی ہے یا ہم نے؟ چائے کو پانی کہتے ہو اور پانی کو لسی......"
پھر وہ آپس میں الجھ پڑے۔ مطیع اللہ مجھ سے سگریٹ مانگ کر سوٹے لگانے لگا۔ شہباز کراہ کر کوچ پر لیٹ گیا۔ سرجی باقاعدہ روٹھ چکے تھے۔ مفتی دیدے پھاڑ پھاڑ کر کبھی ان کو دیکھتا اور کبھی مجھے، میں آرام سے اٹھا اور کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کیے پھر مسکراتا ہوا لیٹ گیا۔
اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ میرے دوست بھی کتنے اچھے ہیں کہ میرا غم بھی کرتے ہیں اور مجھے ٹھیک سے ستاتے بھی نہیں۔ آج سرجی کے محاوروں نے میری کچہری برخاست کروی تھی۔ کمرے کی ڈوروال ذرا سا سرکائی، ہوا کا جھونکا اندر آیا۔ خوشگوار ہوا نے مجھے کچھ ہی دیر میں نیند کی بانہوں میں لے لیا۔
دو ڈھائی گھنٹے بے فکری کی نیند سے میں جب بیدار ہوا تو دیکھا کہ سرجی میرے قریب ہی گھٹنے اپنے سینے سے لگائے اور اپنے دونوں بازو ان کے گرد حمائل کیے کارپٹ پر بیٹھے ہیں۔ شاید میرے جاگنے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔
کہنے لگے۔ "میں مانتا ہوں کہ ہم میں سے کوئی بھی دودھ کا دھلا ہوا نہیں ہے۔ پر اتنے تر دامن بھی نہیں کہ آنکھیں بند کیے سب کچھ اپنے سامنے ہوتا دیکھتے رہیں اور اپنی عاقبت تباہ کرڈالیں۔"
میں نے تیکھی نظروں سے انہیں دیکھا اور پوچھا۔ "کیا ہوتا دیکھ رہے ہیں، آپ؟"
میرے لہجے سے وہ ذرا سا گڑبڑائے اور بات بدل کر بولے۔ "پریت کی ریت ہی نرالی ہوتی ہے۔ برفیں ہو یا طوفان۔ اس معصوم کے در پر جانا ہی پڑتا ہے۔" سرجی بات تو وہی پوچھ رہے تھے مگر اپنا انداز بدل لیا تھا۔ میں بھی انجان بن گیا اور سرجی سے پوچھا۔ "یہ مفتی وغیرہ میرے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟"
بولے۔ "انہوں نے ایسی ایسی باتیں کیں کہ میرے تو پاؤں میں لگی اور سر میں جا کر بجھی۔"
میں چکرا گیا کہ وہ کیا بول گئے۔ میں نے کہا۔ "کیا آپ آسان الفاظ میں بات نہیں کر سکتے۔ آپ کے فقرے سر پر سے گزر جاتے ہیں۔"
وہ گویا ہوئے۔ "میں کوئی فارسی تو نہیں بول رہا تھا۔ مطلب میرا یہ تھا کہ مجھے شدید غصہ آیا تھا۔" پھر جب میں

ہو کر انہیں دیکھنے لگا تو بولے۔ ''مفتی کہہ رہا تھا کہ اس کے کرتوت نہ بدلے تو میرا فرض بنتا ہے کہ اس کے طارق کو سب روئیداد بتا دوں۔''

میں نے کہا۔ ''سرجی! قسم سے سر میں درد ہونے لگا ہے۔ اگر زحمت نہ ہو تو چائے پلا دیں۔''

انہوں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں واش روم میں گھس گیا۔

میں شاور لے کر تازہ دم ہوا اور لیونگ روم میں آیا۔ سب میری انتظار میں بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ٹکر ٹکر ...... سب کی توجہ میری جانب ہو گئی۔ شاید میں انہیں بتا دوں کہ رات میں کہاں تھا۔ مجھے ان کا اس طرح سے سوالیہ نظروں سے دیکھنا تھوڑا سا بے چین کر گیا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ان سے کیا کہوں۔ سچ بتانا چاہتا تھا اور جھوٹ بولنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

سرجی نے چائے بنائی ہوئی تھی۔ میں نے کپ اٹھایا اور سوالیہ نظروں کے بیچ بیٹھ گیا۔ سب سے بے نیاز آہستگی سے چائے پینے لگا۔

سب خاموش تھے، میں گویا ہوا۔ ''دوستو! پہلے تو میں آپ لوگوں کا مشکور ہوں کہ میرے بارے میں آپ سب فکر مند تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں ایسی کسی جگہ جا سکتا ہوں جس پر آپ لوگ فکر مند ہوں؟''

سب نے پہلے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور پھر مطیع اللہ نے دائیں ہاتھ سے ٹھوڑی کو کھجلایا اور چھت کی جانب مدبرانہ انداز سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں شہباز سے بولی تھی کہ کوئی لڑکی تم سے کہہ کر سیر پر چلو گی تو تم ایک پٹ (فٹافٹ) تیار ہو جائے گی۔ اور کیا قیامت آ گئی جو ندیم بھائی کسی لڑکی کے ساتھ چلی گئی۔''

بے ہوش ہوتا شہباز زور سے سرخ ہوا اور بنیان ٹھیک کرتا ہوا بولا۔ ''مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ یہ سیاپا کرے گا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ندیم بھائی معشوق کے پاس گیا ہوگا اور اب نام میرا لے رہا ہے۔'' پھر شہباز نے سرجی کو گواہ بنانا چاہا اور ان سے بولے۔ ''آپ میرے بڑوں کی جگہ پر ہیں۔ خود انصاف کریں کہ کس نے یہ بات کہی تھی؟''

بڑوں کے رتبے پر پہنچ کر سرجی خوش ہونے کے بجائے الٹا بگڑ گئے اور شہباز کی طرف دیکھ کر اپنی جانب سے بولے۔ ''تم تو ہر وقت ترارے نکالتے رہتے ہو، مگر آج تو ندیم بھائی نے لوٹ لیا ہے۔''

جھگڑا بڑھنے لگا تو مفتی بولا۔ ''آپس میں لڑنے کی بجائے یہ پوچھا جائے کہ وہ گیا کہاں تھا...... اللہ نہ کرے کہ کوئی مشکل اسے پیش نہ آ جائے۔''

شہباز بولا۔ ''یہ کوئی دودھ پیتا بچہ تو نہیں ہے کہ ہماری باتوں سے ہی سمجھے گا۔''

مطیع اللہ بولا۔ ''بالکل ٹھیک کہتی ہے شہباز بھائی! یہ ہماری باتوں سے تو ہرگز نہیں سمجھے گی۔''

سرجی بولے۔ ''میں شہباز کی باتوں سے متفق ہوں۔'' سرجی کو اپنے ساتھ متفق پا کر شہباز خوشی اور حیرت سے انہیں تکنے لگا تھا۔ سرجی نے اپنی بات مکمل کی اور کہا۔ ''شہباز بہت عقل مند انسان ہے۔ اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ اس کے پیٹ میں واڑھی ہے۔''

میں جواب تک خاموش بیٹھا چائے پی رہا تھا کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ شہباز نے پہلے تو سرجی کی مثل کو سمجھنے کی کوشش کی اور جب نہ سمجھ سکا تو سیاپا سیاپا کرتا سرجی کی جانب بڑھا۔ مطیع اللہ نے اسے روکا اور کہا۔ ''فرنگی ہم مسلمانوں کو لڑانا چاہتے ہیں۔ آپ ماشاء اللہ اتنے صحت مند ہیں مگر عقل گائے والی ہے۔''

شہباز دونوں سے بیک وقت نہیں الجھ سکتا تھا اس لیے بے بسی سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے سمجھایا کہ سرجی کا مطلب تھا کہ تم عقل مند ہو۔ اسے میری بات پر یقین نہ آیا اور دوبارہ سے کراہ کر لیٹ گیا۔

یہ معاملہ ختم ہوا اور میں نے ٹی وی لگا دیا۔ ہمارے پاس جو ٹی وی تھا وہ بھی کوئی ستر کی دہائی کا ہوگا۔ اس پر دو تین بڑے بڑے بٹن لگے ہوئے تھے۔ سائز بھی شاید بیس انچ ہوگا یا قدرے کم۔ اوپر کے بٹن کو دائیں بائیں گھمانے سے چینل تبدیل ہوتے تھے۔ نیچے والا والیوم کا تھا۔ میں نے چینل والا بٹن گھمایا تو ماؤنٹ ایورسٹ اسکرین پر نظر آنے لگی۔ میرے ہاتھ وہیں رک گئے۔

اللہ کو تلاش کرنا ہے تو اسے اس کی تخلیقات میں تلاش کرو۔ اڑتے بادلوں میں، چلتی ہواؤں میں، جنگلوں اور بیابانوں میں، اڑتے پرندوں اور چلتے جانوروں کی اقسام اور عادات میں، بہتے دریاؤں اور گرتی آبشاروں میں، بے کراں سمندروں اور لامحدود خلاؤں میں، چاند، سورج اور تاروں میں، چلتے پھرتے انسانوں میں اور ان کی ایجادات کے کرشموں میں اور یا پھر نیلگوں آسمان میں چھید کرتی بلند برفانی چوٹیوں میں۔ میں اللہ کو نجانے کیوں زیادہ تر برفانی

بلندیوں کی وادیوں میں تلاش کرتا رہا تھا۔ اسی لیے میں جب بھی بلند پہاڑوں کی برفیلی اور پتھریلی دیواریں دیکھتا ہوں تو میری روح کی بے چینی بڑھ جاتی ہے۔ ایک ہیجان مجھے جکڑ لیتا ہے۔ میں اپنے آپ کو وہیں موجود پاتا ہوں جہاں تنہائیاں ہوں اور برفانی اہرام بکھرے ہوں۔ کبھی مستاغ پاس میں اور کبھی بابوسر ٹاپ۔ کبھی بالتورو گلیشیئر اور کبھی سپر گلیشیئر۔ کبھی کرومبر لیک اور کبھی سنو لیک اور کبھی بیال کیمپ کی نرم و سبز گھاس پر لیٹا ہوتا ہوں۔ آج ماؤنٹ ایورسٹ کی بلندیاں دیکھیں تو میں وہیں تھا جہاں کینیڈا کی کوہ پیما ٹیم ایورسٹ سر کرنے گئی تھی۔

ان دنوں اخبارات اور ٹی وی پر اس ٹیم کی کارکردگی دکھائی جارہی تھی۔ ٹی وی پر بتارہے تھے کہ ٹیم کیمپ تھری پہنچ چکی ہے۔ ان کے خیمے وہاں دور دور تک لگے تھے۔ ویرانے آباد تھے۔ ٹیم کے ممبران کو فٹ بال کھیلتے میں دیکھ رہا تھا۔ ایک بڑے ٹینٹ میں کچن بنا ہوا تھا۔ سیکڑوں پورٹرز تھے جن کا کام بوجھ اٹھا کر ممبران کو چوٹی کے نیچے تک پہنچانا ہوتا ہے۔ چوٹی سے کچھ نیچے انہیں روک دیا جاتا ہے۔ ٹیم کے ممبران کو صرف چوٹی تک جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ وہ وہاں جھنڈے گاڑتے ہیں۔ چند منٹ رکتے ہیں۔ آکسیجن کی کمی کے باعث وہ فوراً نیچے اترتے ہیں۔ ان ٹیموں کو بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیاں اسپانسر کرتی ہیں۔ ان ٹیموں کے ممبران شوقیہ سے زیادہ پروفیشنل ہوتے ہیں۔

ہم سب اپنی باتیں چھوڑ کر ٹیم کی ویڈیو ٹی وی پر دیکھ رہے تھے۔ ایورسٹ کے کیمپ تھری تک تو لوگ کہتے ہیں کہ راستہ مال روڈ ہے، یعنی کوئی مشکل نہیں ہے۔ ہر کوئی پہنچ سکتا ہے۔ دشوار گزار کھائیاں اور گھاٹیاں کیمپ تھری کے بعد ملتی ہیں۔

سرجی ایورسٹ پر کینیڈین ٹیم کو دیکھ کر بہت خوش ہورہے تھے۔ کہنے لگے۔ ”ماشاء اللہ کتنی خوب صورت جگہ ہے۔ سارا سال بف باری (برف باری) ہوتی رہتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یہاں برفانی چیتے بھی ہوتے ہوں گے۔“

اس پر سرجی، شہباز کی جانب دیکھ کر بولے۔ ”بفانی (برفانی) چیتے ہوں یا ریچھ، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

شہباز بولا۔ ”یہ تمہیں ریچھ دیکھ کر میں کیوں یاد آجاتا ہوں؟“

جواب مطیع اللہ نے دیا۔ ”ریچھ کو دیکھ کر آپ نہیں بلکہ آپ کو دیکھ کر ریچھ یاد آجاتا ہے۔“ شہباز نے ہنستے ہوئے اپنا تکیہ نیچے سے نکالا اور مطیع اللہ کو دے مارا۔ مطیع اللہ جھک گیا اور وہ تکیہ ٹی وی میں محو مفتی کی گردن پر جالگا۔ سب خاموش ہوگئے۔

مفتی خفا ہو کر کہنے لگا۔ ”مجھے معلوم تھا کہ یہ اپارٹمنٹ ایک دن اکھاڑہ بنے گا۔ سب لوگ کمرا چھوڑ کر لیونگ روم سنبھال کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ٹی وی دیکھنے کا مزہ بھی نہیں رہا۔“

کچھ دن بعد اخبار میں خبر چھپی کہ ٹیم نے ماؤنٹ ایورسٹ سر کرلی تھی۔ ہمارے لیے فخر یہ بات تھی کہ پاکستان کا نامور سپوت، ہنزہ کا باسی نذیر صابر بھی اس ٹیم کا حصہ ہے۔ نذیر صابر اس مہم جوئی میں مشہور اس لیے ہوا کہ اس نے دو کینیڈین کوہ پیماؤں کی واپسی پر جان بچائی۔ وہ دونوں راستہ کھو چکے تھے۔ کھانا ختم ہوگیا تھا۔ سلیپنگ بیگ ان کے گر گئے تھے۔ وہ مرنے والے تھے کہ نذیر صابر انہیں بحفاظت کیمپ تھری تک لے آیا۔

نذیر صابر سے میری ملاقات ہنزہ کے دربار ہوٹل میں ایک سال پہلے ہوئی تھی۔ نیلے رنگ کے سوٹ میں اس کا رنگ دمک رہا تھا اور چہرے پر ہمیشہ کی طرح اس کی مخصوص مسکراہٹ تھی۔ نذیر صابر اور اشرف امان جب کے ٹو پر گئے تو سجدے میں گرے دونوں کی تصاویر ان دنوں پاکستان میں بہت مشہور ہوئی تھیں۔

شام کی سیاہی ایک طلسم کے مانند چھا چکی تھی۔ آسمان ابھی تک ہلکا نیلا تھا۔ رنگ مدھم پڑ چکے تھے اور ایک ہلکی دمک پورے ماحول کو گھیرے تھی۔ میں ڈور وال سے باہر کے نظاروں سے الجھا ہوا تھا۔ باہر گھاس کے تختوں پر لاتعداد زرد اور سفید پھول سر اٹھائے مسکرا رہے تھے۔ ہمیشہ کی طرح کچھ اودے بادل ان پھولوں کو دیکھنے کے لیے ذرا نیچے آکر رک گئے تھے۔

اتنے میں فون بجا۔ وہاں شہباز کا کوئی دوست تھا۔ وہ خان قیصر کی بلڈنگ کے پیچھے تین بلند و بالا اپارٹمنٹ بلڈنگز میں سے ایک میں کسی کے پاس پے اینگ گیسٹ تھا۔ جوان عمر تھا مگر لباس معمر لوگوں کا پہنتا تھا۔ چھجے دار ٹوپی، لمبا کالا اوور کوٹ، گلے میں مفلر اور ان ہی کی طرح پھونک پھونک کر چلتا تھا۔ میں نے فون شہباز کو بڑھایا اور وہ اپنا پیٹ کھجلاتا ہوا اٹھا۔ اس کا دوست ہم سب کو بریانی کھانے کی دعوت دے رہا تھا جو اس نے آج خود بنائی تھی۔ وہ اکیلا تھا۔

کہاں سے آیا اور کیا کہہ رہا تھا۔ ہم میں سے کسی کو معلوم نہ تھا۔

سرجی بولے۔ ''میں نے تو حلیم تیار کی ہے۔ وہ کون کھائے گا؟''

مطیع اللہ بولا۔ ''وہ تم کھالو۔ میں تو بریانی کھانے والی گی......'' سرجی منمنائے۔ '' ہمارے پیٹ میں کچھ ہے کی گرہ ہے۔ ہم اتنا کیوں کھا سکتے ہیں۔''

ہم نے تھوڑا سا غور کیا تو مطلب سمجھ آ گیا۔ مفتی نے مشورہ دیا کہ حلیم وہاں لے چلتے ہیں اور بریانی پر ڈال کر کھائیں گے۔ مشورہ قابل عمل تھا۔ سرجی بولے کہ آدمی حلیم لے جاتے ہیں اور آدمی کل کھائیں گے۔ سب نکلنے کے لیے تیار ہونے لگے۔ میں تو پہلے سے تیار تھا۔ صرف لباس تبدیل کیا اور باہر نکل آیا۔

باہر شام کا اندھیرا پھیلا تھا۔ چاند کی چاندنی چہار سو پھیلی تھی اور معطر ہوا جو کل سے چلی تھی اب تک رواں تھی۔ باہر بھی اور میرے اندر بھی۔ میں جب ملتان یونیورسٹی سے اپنی ماسٹر آف فلاسفی کی ڈگری لے رہا تھا تو گرمیوں میں دیکھا کہ ہر روز آندھی آتی ہے۔ ایک ملتانی دوست سے شکر اور شہد میں گندھی سرائیکی زبان میں پوچھا ''یہاں کتنی آندھیاں آتی ہیں؟''

وہ بولا۔ ''صرف ایک......''

میں حیران ہوا اور پوچھا کہ یہاں تو ہر روز آتی ہے تو وہ بولا۔ '' آندھی ایک ہی ہے جو مئی سے اگست تک چلتی ہے۔'' یہاں ٹورنٹو میں اسی طرح خوشبو بھری ٹھنڈی اور تازہ ہوائیں پورے بہار میں چلتی رہتی ہیں۔

میں گھاس کے نرم اور سبز قالینوں پر چلتا ہوا چیڑ کے ایک درخت تلے رکھی بینچ پر بیٹھ گیا۔ گھاس کے قطعے خوب صورتی سے آراستہ کیے گئے تھے۔ چیڑ کے علاوہ سفید پھولوں سے لدے متعدد پیڑ تھے جو ہواؤں سے جھومتے تھے۔ گھاس میں سے زرد اور سفید پھول سر نکالے مسکرا رہے تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ بریانی کھانے کے بعد مارٹن گرو روڈ پر بس اسٹاپ کے ساتھ والے پارک میں وقت گزاروں گا۔ اس دوران میرے دوست لڑتے جھگڑتے بحث کرتے اپارٹمنٹ سے نکلے۔ اس خوب صورت منظر میں بیٹھ کر مجھے بریانی کھانے کا تصور بھی گراں گزر رہا تھا۔

سرجی نے ایک بڑا برتن حلیم سے بھرا اٹھایا ہوا تھا۔ وہ اور شہباز متواتر یہ بحث کرتے آ رہے تھے کہ اسے اب کون اٹھا کر چلے گا۔ مطیع اللہ یہ کہہ رہا تھا کہ میں اٹھانے کو تیار ہوں مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ حلیم گر جائے گا اور اگر گر گیا تو میں ذمہ دار نہیں ہوں گی۔

شہباز نے مطیع اللہ سے کہا، اگر تم سے گر گیا تو میں تمہیں بلڈنگ سے گرادوں گا اور اگر تم مر گئے تو میں ذمہ دار نہیں ہوں گا۔

سرجی شہباز سے بولے۔ ''تم خود بھی کوئی کام نہیں کرتے اور تمہاری خواہش ہوتی ہے کہ پکی بیدی کے بیر کھاؤں۔''

مطیع اللہ نے مجھ سے سوال پوچھا ٹورنٹو میں بیدی کا درخت ہوتا ہے۔

میں نے کہا مفتی یہاں سینیر ہے، اس سے پوچھو۔

مفتی نے کہا۔ ''میں نے ابھی تک نہیں دیکھا۔''

سرجی بولے۔ ''میں نے محاورہ بولا ہے اور اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ شہباز ست الوجود کاہل اور نکما ہے۔''

شہباز پھر سے بگڑا اور سرجی کو دھمکیاں دینے لگا کہ وہ اسے حلیم والے دیگچے میں بند کر دے گا۔

سرجی نے بات بدلی اور مفتی سے بولے۔ ''بیدی کے درخت کے بارے میں بہنوئی صاحب کو فون کر کے پوچھ لیں۔''

مفتی تو پہلے ہی اپنے بہنوئی کے چٹکلوں کا ڈسا ہوا تھا۔ وہ بھپر گیا اور سرجی سے مخاطب ہوا۔ ''میرے ذاتی اور خاندانی معاملات میں کسی کو بھی بولنے کا حق نہیں ہے۔ حلیم بنا کر اپنے آپ کو رنجیت سنگھ کے باورچی مت سمجھو۔''

یہ ہنگامہ تب ختم ہوا جب ہم بلڈنگ کے گیٹ پر پہنچے۔ گیٹ پر دو سیکیورٹی گارڈ ایک خونخوار کتے کو زنجیر سے پکڑے کھڑے تھے۔ کتا اور سیکیورٹی گارڈ ہمیں دیکھ کر چوکنے ہو گئے۔ ان تینوں نے جب سرجی کو سر پر دیگچا اٹھائے دیکھا تو پہلے وہ حیران ہوئے بلکہ کتا زیادہ حیران نظر آتا تھا کیونکہ شاید اس نے سر پر دیگچا رکھے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ تینوں حیران ہونے کے بعد مشکوک ہوئے اور پھر ریڈ الرٹ ہو گئے۔ پہل کتے نے کی اور سرجی کی جانب لپکا اور سرجی دیگچے سمیت الٹے پاؤں بھاگے۔ سرجی نے وہ پھرتی دکھائی کہ دور چیڑ کے درخت تلے چاندنی میں کھڑے ہانپ رہے تھے۔

سرجی مفرور تھے اسی لیے مشکوک ٹھہرے۔ سیکیورٹی گارڈ کو جب بتایا کہ ہم ایک دوست سے ملنے آئے ہیں تو

ایک نے دور کھڑے سرجی کی جانب اشارہ کر کے پوچھا۔ "وہ بھاگا کیوں اور اس نے سر پر کیا باندھ رکھا ہے۔"

میں نے جب یہ بتایا کہ وہ برتن ہے اور اس میں فوڈ ہے تو وہ دونوں گارڈ فوڈ فوڈ کہتے بے یقینی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور کتا سر اٹھا کر باری باری انہیں دیکھتا تھا۔

انہیں سمجھایا گیا کہ ہم کتے کو دیکھ کر بھاگ اٹھتے ہیں یا پھر کتا بھاگ جاتا ہے۔ مغربی کتوں سے تو ہم ویسے بھی بہت متاثر ہیں اور ان کے سامنے آنے پر ان سے بہت مرعوب بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ شہباز پھر سیاپا سیاپا بڑبڑانے لگا اور سرجی کو پکڑ کر بلکہ گھسیٹ کر کتے کے قریب لایا۔ سیکیورٹی گارڈز اور کتے نے دیگچا دیکھ کر اپنی تسلی کی۔ کتے سے ہم نے حلیم تو نہ سنگھوائی مگر اس نے سرجی کو اچھی طرح سے سونگھا۔ سرجی کو سونگھتے وقت شہباز نے سرجی کو جکڑ رکھا تھا اور گارڈز نے کتے کو جب گارڈز اور کتے کو اطمینان ہوا تو ہمیں اندر جانے دیا گیا۔

ہم ایک سجے سجائے لیونگ روم میں بیٹھے تھے۔ قیمتی صوفے اور میزیں سجاوٹ سے رکھی تھیں۔ فرش لکڑی کا تھا اور بیش قیمت قالین سے مزین تھا۔ بڑے سے لیونگ روم میں ایک سائیڈ پر نفیس ڈائننگ ٹیبل اور کرسیاں رکھی تھیں۔ دیوار سے لگے کنسول پر تصویری فریم رکھے تھے۔ ایک میاں بیوی کے جوانی کے ایام کے پُرتکبر اور حسین چہرے اور ساتھ ہی زمانہ حال کی تصویریں جن میں چہروں پر جھریاں، کندھے جھکے ہوئے اور مدد کو پکارتی آنکھیں۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ مالک مکان ہیں اور زائد آمدنی کے حصول کے علاوہ اپنی دیکھ بھال کے لیے انہوں نے شہباز کے دوست کو پے اینگ گیسٹ رکھا ہوا ہے۔ اپارٹمنٹ بڑا تھا اور ابھی بھی اس میں اتنی گنجائش تھی کہ ایک دو اور افراد بھی با آسانی سما سکتے تھے۔

شہباز کا دوست ایک قیمتی ڈنر سیٹ کی پلیٹیں میز پر سجا رہا تھا۔ شہباز نے اس کی مدد کرنا چاہی مگر وہ اسے دور دھکیل کر بولا۔ "بہت قیمتی ہیں اور تمہارے ہاتھ سے پتھر بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔"

سرجی پر سے کتے کا خوف اتر چکا تھا اسی لیے وہ منہ پر ہاتھ رکھے ہنس رہے تھے۔ مفتی اور مطیع اللہ اچانک مدبر بن گئے تھے چہرے پر سنجیدگی اور ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھے تھے۔

اتنے میں ایک عمر رسیدہ خاتون اور لاٹھی ٹیکتے ایک معمر شخص مسکراتے ہوئے لیونگ روم میں تشریف لائے۔ ہم نے با ادب کھڑے ہو کر سلام کیا اور جواب میں دعائیں اور مسکراہٹیں ملیں۔ وہ بیٹھے تو ہم بھی آہستگی سے بیٹھ گئے۔

وہ صاحب بولے۔ "پہلے کھانا کھایا جائے یا باتیں چلیں گی؟"

میں سوچنے لگا کہ کون سی باتیں ہیں جو ہم نے آپس میں کرنی ہوں گی۔ وہ پاکستانی تھے اور ہم زیادہ مؤدب بھی اسی لیے تھے۔ اگر میاں بیوی اکیلے ہوں اور وہ بڑھاپے کی سرحدوں میں عرصہ ہوا داخل بھی ہو چکے ہوں تو انہیں رفاقت کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ میرے دماغ میں یہی خیال آیا کہ وہ کسی سے کوئی بھی بات کرنا چاہتے تھے اور میرا اندازہ ٹھیک بھی ثابت ہوا۔ جس طرح سے وہ مسکرا مسکرا کر ہمارے آگے پیچھے جا رہے تھے، اس میں ان کا خلوص بھی تھا اور ہم سے باتیں اور بہت سی باتیں کرنے کی آرزو بھی تھی۔

شہباز نے کہا۔ "پہلے کھانا کھا لیتے ہیں پھر محفل گرم ہوگی۔" شہباز کی اس بات پر سرجی نے آنکھوں آنکھوں میں اس کی سرزنش کی اور بزرگ کی طرف اپنی مسکراہٹ بھی پھینکی۔

ہم سب قرینے سے اٹھے اور سلیقے سے ڈائننگ ٹیبل کے گرد براجمان ہو گئے۔ سب نے اپنی جانب پلیٹیں سرکائیں۔ بریانی اور پھر حلیم ان میں انڈیلی اور پھر سلیقہ تمیز سب دور بیٹھ گئیں اور میز پر ہمارا قبضہ ہو گیا۔ سب نے پیٹ بھرنے سے ذرا پہلے اپنے ہاتھ کھینچ لیے ماسوائے شہباز کے جو تب اٹھا جب ہانپنے لگا تھا۔ وہ کسی کی جانب دیکھ بھی نہ رہا تھا۔ اگر دیکھ لیتا تو نگاہوں کے کئی نشتر اس کے آر پار ہو جاتے۔ ہم سب میز سے الحمد للہ کہہ کر اٹھے تو شہباز نے ڈکار لی۔ ان صاحب نے شہباز کو درازی عمر کی دعا دی اور پھر ہم سب صوفے پر آ بیٹھے۔ پھر شہباز کا دوست ڈنر سیٹ کی نفیس پیالیوں میں چائے بھر کر لایا۔ سب کے سامنے ایک ایک پیالی رکھی اور خود ان بزرگ کے پہلو میں ٹک گیا۔ مجھے شک گزرا کہ ان بزرگ کو سنانے کے لیے کچھ لوگ چاہیے تھے اور شہباز کے دوست نے یہ سارا انتظام اسی لیے کیا تھا۔

پہلے ہم کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر پہل میں نے کیا۔ پوچھا کہ وہ کینیڈا کب آئے اور کہاں سے آئے۔

بزرگ نے ایک گہرا سانس لیا ایسے کہ آج اپنے اندر کا سارا غبار نکالنا چاہتے ہوں۔ وہ بولے۔ "ہم کراچی میں رہتے تھے۔ ناظم آباد میں۔ 1963ء میں کینیڈا آئے۔"

میں بولا۔ ''بہت عرصہ ہوگیا ہے یہاں بھی اور وہاں بھی بہت کچھ بدل گیا ہوگا؟''

چائے کی ایک گہری چسکی لے کر پیالی خالی کی اور اسے میز پر رکھتے ہوئے بولے۔ ''اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو میں سگریٹ پی سکتا ہوں؟''

میں نے کہا۔ ''بے شک آپ ضرور پی سکتے ہیں اور اس کا مطلب کہ میں بھی پی سکتا ہوں۔'' یہ کہہ کر ہم دونوں نے اپنی اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا سگریٹ سلگائی اور پھر ایک گہرا کش لے کر میں صوفے پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

وہ بھی کش لگا کر ذرا آسودہ ہوئے اور نظریں خلا میں لگا کر بولے۔ ''باہر کی دنیا ہمیشہ ویسے ہی رہتی ہے۔ تبدیلیاں انسان کے اندر آتی ہیں۔'' مجھے ان کی باتوں سے دلچسپی ہونے لگی۔ میں کچھ کریدنا چاہتا تھا۔ میرے ساتھ بیٹھے شہباز کی بڑبڑاہٹ میرے کانوں میں پڑی۔ ''ایک سیاپا اور شروع ہوگیا......''

وہ بزرگ اپنی کہانی سنانے لگے مگر کہانی سے پہلے بھی ان بزرگ خاتون کی آنکھیں نمناک تھیں۔ اکیلے پن اور تنہائی کے زخم میں ان کے چہرے پر دیکھ رہا تھا۔ ان صاحب نے اپنی کہانی شروع کی اور میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔

''یہ میری بیوی ہیں۔ میری محبت اور میں نے شادی بھی اپنی مرضی سے کی تھی۔ مجھے اس پر کوئی پچھتاوا ابھی نہیں ہے۔ میں اکاؤنٹینٹ تھا ایک فرم میں۔ ان دنوں کراچی بہت خوب صورت ہوا کرتا تھا اور میری زندگی بھی بہت پرسکون تھی۔ میں نے اپنے خاندان میں اپنی کزن سے شادی کرنے سے انکار کردیا۔ ہم ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ وہ میرے تایا کی بیٹی تھی۔ میرے انکار پر گھر کا ماحول بگڑ گیا۔ میرے اور میرے والدین کے بیچ سرد مہری کی دیوار کھڑی ہوگئی۔'' ان صاحب نے پھر ایک لمبا کش لگایا۔ دھواں لیونگ روم کی چھت کی جانب چھوڑا اور آبدیدہ ہوگئے شاید بہت کچھ یاد آرہا تھا۔

''میرے والد نے بڑی محنت سے مجھے اور بہن بھائیوں کو پالا پوسا تھا۔ میں ڈٹ گیا اور کہا کہ میں اپنی پسند سے شادی کروں گا۔ ان دنوں اپنی پسند کا اظہار کرنا بھی ایک بے راہ روی سمجھی جاتی تھی۔ مجھے باغی قرار دے دیا گیا۔ میرے ماں باپ میری ضد پر مجھے سمجھاتے تھے۔ مگر میں نہ مانا، میں نے پھر ان سے کورٹ میرج کرلی۔'' یہ کہہ کر انہوں نے پیار سے اپنی بیوی کی جانب دیکھا۔

''میری بیوی کے والدین بھی راضی نہ تھے۔ وہ صرف میرے والدین کی رضامندی چاہتے تھے۔ وہ ہرگز یہ بار نہ اٹھاسکتے تھے کہ ان کی بیٹی نے اپنی پسند کی شادی کرلی ہے۔ جس دن ہمارا کورٹ میں نکاح ہوا تو اسی روز ان کے والد کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ وہ اسپتال میں تھے۔ ہم اس لیے ملنے نہ گئے کہ کہیں ہمیں دیکھ کر ان کی طبیعت زیادہ ناساز نہ ہوجائے۔ ایک ہوٹل میں ہم نے اپنی سہاگ رات منائی۔ دوسرے دن کچھ دوستوں کو کھانے کی دعوت دے کر ولیمے سے بھی سبکدوش ہوگئے۔''

''میری والدہ کو میری شادی کا بڑا چاؤ تھا۔ میں بڑا بیٹا تھا اور وہ اپنی بہو کے لیے کچھ نہ کچھ بناتی رہتی تھیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ بہت روتی ہیں۔ نجانے ہمارے دل کیوں پتھر کے ہوگئے تھے کہ ہم ان سے بھی ملنے نہ گئے۔ بیوی نے اپنا رابطہ اپنے گھر سے ختم کردیا تھا۔ میں نے بھی ایک کرایے کا مکان لیا اور اپنی زندگی گزارنے لگا۔ میرے والدین اور چھوٹے بہن بھائیوں کی گزر اوقات کے لیے میری تنخواہ کا ایک حصہ بھی جاتا تھا۔ وہ جب رکا تو ان کے مالی حالات تنگ ہوگئے تھے۔ میرے پاس اتنی گنجائش نہ تھی کہ انہیں سپورٹ کرتا۔''

میں نے بزرگ سے پوچھا۔ ''کیا آپ نے اپنے والدین کو منانے کی کوشش بھی کی؟''

میرے سوال پر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بولے۔ ''نہیں۔ میں نے کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔''

کہانی عروج پر تھی کہ سرجی کمرے میں داخل ہوئے۔ جب باتوں کا دور شروع ہوا تو وہ باہر نکل گئے تھے۔ واپس آئے تو کھلے پڑ رہے تھے۔ شہباز نے پوچھا۔ ''کہاں تھے؟''

نیچے گارڈ روم میں گارڈ تو بہت اچھے ہیں۔ ان کا کتا بھی بہت پیارا ہے۔

''کیا کتے سے دوستی کرنے گئے تھے؟'' اس نے چوٹ کی۔

''نہیں ندیم کے کزن طارق کو فون کرنا تھا۔ یہاں کے حالات بتانے تھے۔'' یہ سن کر تو میں بری طرح گھبرا گیا۔ اس لیے کہ یہ ایک ایسی بات تھی جو میرے عزت و وقار کی دھجی اڑا سکتی تھی۔ میری ازدواجی زندگی کی بنیاد ہلاسکتی تھی۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سرجی سے ایسی توقع نہیں تھی۔

(جاری ہے)

کتابیں

کشمالہ حسن

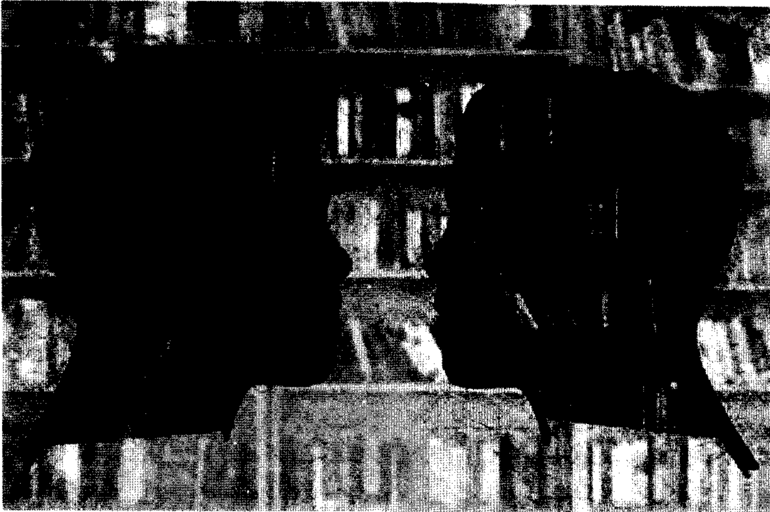
کتابیں صرف علم کی پیاس ہی نہیں بجھاتیں، راہ مستقیم کی رہبری بھی کرتی ہیں۔ اور اپنے دور کی آئینہ دار بھی ہوتی ہیں۔ اس تحریر میں مختصر مختصر سا ان کتابوں کا تعارف دیا گیا ہے جن کی وجہ سے معاشرے پر اثرات مرتب ہوئے۔

کتابیں ملک وملت کے اذہان بدل دیتی ہیں۔

یہ مضمون دنیا کی اہم ترین کتابوں کے حوالے سے ہے۔

اس مضمون میں مذہب عقیدے یا نسل کی بات نہیں کی گئی ہے بلکہ یہ دکھایا گیا کہ وہ کون سی کتابیں ہیں جنہوں نے سماج پر اثرات مرتب کیے اور نسلِ انسانی کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔

سدھارتھا ہرمن ہیز کا یہ ناول بہت مقبول اور کمال کا ہے۔ شعور کی آنکھیں کھول دینے والا یہ ناول دنیا بھر کی



...انوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ وجدان حاصل کرنے کے ...اصل کا ناول ہے۔ بنیادی طور پر یہ مہاتما بدھ کو مرکز بنا کر لکھا گیا ہے۔

ایک نوجوان جو ایک ریاست کا شہزادہ ہے۔ وہ انسان کو دکھی دیکھ کر بے قرار ہو جاتا ہے اور انسان کے دکھوں کے مداوا کی تلاش میں ریاست چھوڑ کر گھر سے نکلتا ہے۔ برسوں بھٹکنے کے بعد اسے ایک آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ آواز معرفت کی ہے۔ وجدان اور آگہی کی ہے اور یہیں سے وہ انسان کو نجات کی راہ دکھانے نکل جاتا ہے۔

ہرمن نے اس ناول کو اتنی خوبی اور سلاست سے لکھا ہے کہ بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔

"1984ء" جارج اوویل کی یہ کتاب اتنا وقت گزرنے کے باوجود اپنا ایک اثر رکھتی ہے۔ اس کتاب میں جارج نے آنے والے دنوں کے مزاج کے حوالے سے لکھا ہے۔ نسلوں کا فرق، کیفیت، زبان، تہذیبی جھگڑے، لسانیت، عصبیت، سوچ اور بہت کچھ۔ اس کتاب نے کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے اور آج بھی اس کے اثر انگیزی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

For whom the bell tolls

ارنسٹ ہیمنگ وے۔ ایک مشہور اور کلاسک رائٹر تھا۔ اس نے جو لکھا وہ کمال کا لکھا۔ اس کا یہ ناول اگرچہ مختصر سا ہے لیکن اثر انگیزی میں بڑی بڑی کتابوں سے بڑھ کر ہے۔

1937ء میں ہیمنگوے اسپین کی خانہ جنگی پر ریسرچ کرنے گیا تھا۔ وہاں سے اس نے اپنی کتاب کا مواد حاصل کیا۔ اس کتاب میں موت، زندگی کی حقیقت، مختلف نظریات، بے بسی اقتدار کا نشہ اور غربت کی پریشانیاں۔ یہ سارے موضوعات ہیں۔

اسپین کی پہاڑیوں میں موجود ایک گوریلا تحریک کی کہانی ہے جس میں ایک امریکی نوجوان جا کر پھنس جاتا ہے۔ مصنف کا مشاہدہ اس نے اس نوجوان کی آنکھوں سے بیان کیا ہے۔ کچھ کتابیں ایسی ہوتی ہیں جن پر ماہ و سال کے گزرنے کا اثر نہیں ہوتا۔ وہ کل بھی شوق سے پڑھی جاتی تھیں اور آج بھی پڑھی جاتی ہیں۔

دوستوفسکی کی کرائم اینڈ پنشمنٹ، ایسی ہی ایک کتاب ہے جو نہ جانے کتنی صدیوں تک زندہ رہے گی اور پڑھی جاتی رہے گی۔ اس کتاب نے سیاست دانوں، نوجوان نسل شاعروں، مفکروں سب کو ایک سا متاثر کیا ہے۔

یہ زندگی کے اصل معنی کو تلاش کرتی ہوئی کتاب ہے۔ اس کو ماسٹر پیس کہا جاتا ہے۔

دی پرنس

میکاولی کی اس تصنیف نے دنیا بھر کے سیاست دانوں اور حکمرانوں کو یکساں متاثر کیا ہے۔ انہیں راستے دکھائے ہیں۔ میکاولی نے یہ کتاب 1512 میں لکھی تھی لیکن صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس کتاب کا سحر پہلے کی طرح برقرار ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو نہ تو آسانی سے لکھی جاتی ہے اور نہ ہی بھلائی جاتی ہے۔

The republic

افلاطون کی یہ کتاب صدیاں گزرنے کے بعد بھی زندہ ہے اور ہر دور میں اس کے مندرجات پر گفتگو ہوتی رہی ہیں۔ اس کتاب میں افلاطون نے ریاست کے معنی واضح کر دیئے ہیں اس نے یوٹوپیا کا خواب دیا ہے۔

علامہ اقبال کا ایک قطعہ ہے

اس راز کو اک مرد فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت وہ طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تو لا نہیں کرتے

مرد فرنگی کہہ کر اقبال نے اطلاطون کی طرف اشارہ کیا ہے۔

دوست بنائیں

ڈیل کارنیگی کی اس کتاب نے دنیا کو متاثر کیا ہے۔ کارنیگی نے یہ کتاب 1937ء میں لکھی تھی۔ دو دنوں کے اندر اس کی پندرہ لاکھ کاپیاں فروخت ہو گئی تھیں۔ دنیا کی ہر زبان میں اس کا ترجمہ ہوا۔

اتنے برسوں کے بعد بھی اس کتاب کو اسی شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ اس کتاب نے سوچ کے نئے دروازے کھول دیئے تھے۔ ہر وہ شخص جو زندگی کے میدان میں کامیابی کا خواہش مند تھا یا ہے۔ اس نے یہ کتاب ضرور پڑھی ہوگی۔

یہ چند ایسی کتابیں ہیں جنہوں نے ہر دور کو متاثر کیا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بے شمار کتابیں ہیں۔ جیسے کارل مارکس کی "دی کیپٹل"۔

War and peace

جدید سکھ مت

اگرچہ دنیا کے بیشتر حصوں میں سکھ برادریاں موجود ہیں۔ البتہ جدید سکھ مرکزی طور پر ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ جدید سکھ مت کے مرکزی ڈھانچے میں تین فرقے ہیں۔ ہر فرقہ نانک کی مرکزی تعلیمات کو قبول کرتا ہے۔ گرنتھ کو مقدس مذہبی تحریر مانتا اور دس گروؤں کو الہام یافتہ سمجھتا ہے۔ پہلا فرقہ اداسی کہلاتا ہے اور یہ بنیادی طور پر مقدس افراد کا ایک سلسلہ ہے۔ یہ سکھ بہت سے ایسے اصولوں اور قواعد پر عمل کرتے ہیں جو ہندومت، بدھ مت اور جین مت کے مرتاضوں کے ہاں بھی نافذ العمل ہیں۔ وہ بیشتر مجرد رہتے اور بدھ بھکشوؤں کی طرح گھردرے پیلے کپڑے پہنتے یا جین جوگیوں کی طرح برہنہ پھرتے ہیں۔ ان کی زیر ملکیت واحد شے کشکول ہے۔ عموماً وہ سرگرم مبلغین ہوتے ہیں اور دیگر عقائد رکھنے والوں کو اپنے مذہب سے متعارف کرانے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ اداسیوں کو نانک پتر بھی کہتے ہیں۔ گرونانک کا سب سے بڑا بیٹا ان کا جدامجد تھا جسے گرو امرداس نے برادری سے خارج کیا تھا۔ وہ گروگوبند کے گرنتھ کو مسترد کرتے جب کہ گرونانک کے آدی گرنتھ کو مانتے تھے۔ سکھوں کا دوسرا فرقہ سہج دھاری سکھ (ست رو) ہے۔ بحیثیت سکھ ان کی ترقی گوبند سنگھ سے پہلے بعض مواقع پر ختم ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ جارحیت پسندی کو مسترد کرتے ہیں جو کہ زیادہ تر سکھ مت کی خصوصیت بن چکی ہے اور داڑھی منڈوانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

اقتباس: مذہب عالم کا انسائیکلو پیڈیا الیوس مور

مرسلہ: حبیب اختر۔ فیصل آباد

لیوٹالسٹائی کا یہ ناول دنیا بھر کے ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ کون سا ایسا پڑھا لکھا آدمی ہے جس نے یہ ناول نہ پڑھا ہو۔ اس ناول کو ایک کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔ یہ نپولین کے عہد کی کہانی ہے۔ جو دراصل ہر دور کی ہے۔ کیسے کیسے کردار اس ناول میں موجود ہیں۔ عام آدمی اور فوجی، کسان، دکاندار، محبت کرنے والی لڑکی اور لڑکا۔ اس نے پورے معاشرے کو ایک ایسا آئینہ دکھایا ہے جس کا نام وار اینڈ پیس ہے۔

The origin of species

چارلس ڈارون کی اس کتاب نے پوری دنیا میں ایک تہلکہ مچا کر رکھ دیا ہے اور آج تک اس کے اثرات باقی ہیں۔

جگہ جگہ بحث ہوتی ہے۔ تقریریں کی جاتی ہیں۔ اس کتاب نے نظریات اور زندگی کے فلسفے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بہت کم کتابیں ایسی ہوں گی جن کے اثرات اتنے گہرے پڑے ہوں گے۔ اس کتاب نے ایک ہنگامہ مچا دیا تھا۔ سیاسی حلقوں میں، مذہبی حلقوں میں، طب کے شعبے میں۔ غرض یہ کہ اس کتاب نے وہ کام کر دکھایا تھا جو ہزاروں تقریروں اور مباحثوں پر بھاری تھا۔

The wind in the willows

بچوں کے لیے لکھنا ویسے ہی مشکل ہے اور وہ بھی کوئی ایسی کتاب جو کلاسک کا درجہ حاصل کرلے۔

کینیتھ گراہم نے یہ کمال کر دکھایا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بیسویں صدی میں بچوں کے لیے اس سے بہتر لکھا ہی نہیں گیا ہے۔ اس میں جانور ہیں۔ درخت ہیں۔ پھول ہیں، پودے ہیں۔ بچے ہیں لیکن سب انسانی عقل کو کچھ نہ کچھ سمجھاتے ہوئے ہیں۔ فانتسی بھی اگر ہے تو اسے جادو بنا کر بغیر جواز کے پیش نہیں کیا گیا۔

The art of war

ہزاروں سال گزر گئے لیکن اس کتاب کی افادیت کم نہیں ہوئی۔ سن زو نے یہ کتاب اب سے دو ہزار سال پہلے چین میں لکھی تھی۔ چین سے ایک فرانسیسی سیاح اسے یورپ لایا تھا۔ یہ کتاب فوجی حکمت عملی پر ہے اور آج بھی اس کی اہمیت اسی طرح ہے جس طرح دو ہزار سال پہلے تھی۔

The lords of the rings

دنیا کے مشہور ترین ناولوں میں سے ایک ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایسی بے مثال کہانی شاید ہی لکھی یا سنائی گئی ہو۔ جے آر آر ٹولکن کی اس کتاب کا دنیا بھر میں ترجمہ ہو چکا ہے اور اس پر فلمیں بن چکی ہیں۔ ہم پاکستانیوں میں سے بہت سوں نے لاجواب فلم لارڈس آف دی رنگ ضرور دیکھی ہوگی۔

ایسی کتابیں کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ اس میں وہ سب کچھ ہے جو ذہنوں کو باندھ کر رکھ دیتا ہے۔

پرائی ساس

کاشف زبیر

مغربی معاشرے میں اب بوڑھوں کے لیے صرف اولڈ ہوم رہ گئے ہیں۔ ان حالات میں زیادہ تر بوڑھے نفسیاتی مریض بن چکے ہیں۔ وہ بھی خود کو اہمیت کا حامل ثابت کرنے کی خاطر ایک مہم پر نکلی تھی۔ اس نے زبردستی کی دعوتیں کھانے کے لیے کیسا سوانگ رچا تھا۔

مغرب کے بے لگام معاشرے کی ایک ہلکی سی جھلک

نینسی پارشل کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی کی بورڈ پر انگلیاں چلا رہی تھی۔ شادی کے بعد اس نے اپنا خاندانی نام تبدیل نہیں کیا تھا۔ اس نے جم کولمین سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ شادی کے بعد اپنا خاندانی نام تبدیل نہیں کرے گی۔ یہ روایت نینسی کے خاندان میں صدیوں سے چلی آرہی تھی۔ نینسی ایک آن لائن بزنس کرنے والی فرم میں جاب کرتی تھی اور اس کا دفتر اس کے اپارٹمنٹ کے ایک گوشے میں واقع تھا۔ یعنی وہ گھر پر ہی کام کرتی تھی۔ اسے باہر نہیں



جانا پڑتا تھا۔ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر وہ ایک منٹ بعد ہی دفتر میں ہوتی تھی۔

جم کولین ایک دوا ساز کمپنی میں میڈیکل کنسلٹنٹ تھا اور وہ ڈاکٹروں اور اسپتال کے عملے کو کمپنی کی نئی ادویات کے استعمال کی تربیت دیتا تھا اسی وجہ سے وہ مہینے میں کم سے کم بیس دن گھر سے باہر ہوتا تھا۔ شادی کے بعد شاید ہی وہ کبھی مسلسل ایک ہفتہ گھر پر رہا ہو۔ جم کی خوش قسمتی کہ نینسی شروع سے تنہائی پسند رہی تھی۔ وہ ماں باپ کی ایک ہی اولاد تھی اور ماں باپ کا کوئی قریبی رشتے دار بھی نہیں تھا۔ اسکول اور کالج کے دور میں اس کی دوست نہ ہونے کے برابر تھیں اور جم اس کا اوّلین بوائے فرینڈ، محبوب اور بالآخر شوہر بن گیا تھا۔ اگر وہ کام کے سلسلے میں زیادہ تر باہر رہتا تھا تو نینسی کے خیال میں یہ بھی اچھا تھا ورنہ میاں بیوی ہر دن ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی بور ہو جاتے۔

''اچھا ہے کچھ دن دور رہنے سے ہماری محبت اور شادی کی گرم جوشی تادیر برقرار رہے گی۔''

''ٹھیک ہے، تمہیں نیا نویلا شوہر بھی اچھا نہیں لگتا ہے۔'' جم نے شوخی سے کہا۔ ''لیکن جب ہمارے بچے ہوں گے تب تو تمہیں ان کی دیکھ بھال کرنی ہی پڑے گی۔''

نینسی جانتی تھی کہ جم کو بچے اچھے لگتے ہیں اور اسے شروع سے بچوں کی خواہش تھی۔ اس نے نینسی سے کہہ دیا تھا کہ وہ بچوں سے بچنے کے لیے کوئی احتیاطی تدبیر نہیں کریں گے۔ نینسی نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ کوئی احتیاط نہیں کرتے تھے لیکن اب یہ قدرت کی طرف سے ہی تھا کہ شادی کے پندرہ مہینے بعد بھی نینسی کے ماں بننے کے کوئی آثار نمودار نہیں ہوئے تھے۔ بہرحال اس وجہ سے ان کے تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش تھے۔ جم جب ایک ہفتہ یا دس دن کے ٹور کے بعد واپس آتا تو نینسی اتنی گرم جوشی سے اس کا استقبال کرتی تھی کہ وہ خوش ہو جاتا۔ ان دنوں وہ اپنی دفتری مصروفیات کم کر دیتی تھی اور زیادہ سے زیادہ وقت جم کو دیتی۔ جب جم اپنے کام سے نکلتا تو نینسی زیادہ کام کر کے ازالہ کر لیتی تھی۔ اس طرح اس کی فرم والے بھی خوش رہتے تھے۔

نینسی کا تعلق ٹیکساس سے تھا لیکن اس کے مزاج میں جارحیت کے بجائے دھیما پن تھا۔ نینسی کے باپ کا کہنا تھا کہ یہ دھیما پن ننھیال سے آیا تھا۔ اس کے ننھیال کا تعلق فرانس سے تھا جبکہ ددھیال خالص سیکسن نسل سے تھا۔ نینسی کا باپ ایک بڑے فارم ہاؤس اور بہت سے مویشیوں کا مالک تھا۔ اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی لیکن نینسی کا دل ٹیکساس میں نہیں لگا تھا۔ کالج کی تعلیم سے فارغ ہوتے ہی اس نے شمال کا رخ کیا تھا۔ وہ اسپرنگ فیلڈ چلی آئی۔ اسے یہ کھلا کھلا اور روشن شہر اچھا لگا تھا۔ اس نے یہیں ایک آن لائن کاروبار کرنے والی فرم میں جاب کر لی۔ ساتھ ہی اس نے اپنے شعبے سے متعلق کچھ کورس بھی کیے۔ دو سال میں وہ افسران میں شامل ہو گئی تھی اور ان ہی دنوں اس کی ملاقات جم سے ہوئی تھی۔ جم شروع میں اسے کوئی کالج گرل سمجھا تھا اور جب اسے پتا چلا کہ نینسی ایک بڑی کمپنی میں ذمّے دار عہدے پر کام کر رہی ہے تو اسے یقین نہیں آیا تھا۔

''چہرے سے بالکل نہیں لگتا کہ تم اتنی خشک قسم کی جاب بھی کر سکتی ہو۔ تمہیں دیکھ کر تو لگتا ہے جیسے کوئی اسٹیج آرٹسٹ ہو یا اوپیرا میں کام کرنے والی کوئی گروپ ڈانسر۔''

''آرٹ کی مجھے بالکل سمجھ نہیں آتی اور میں نے آج تک اوپیرا بھی نہیں دیکھا۔ ڈانس صرف ایک بار کیا تھا جب ہائی اسکول کی الوداعی پارٹی میں ایک لڑکے نے مجھ سے ڈانس پارٹنر بننے کی درخواست کی تھی اور اس پارٹی کے بعد وہ ایسا غائب ہوا کہ مجھے دوبارہ اس کی صورت بھی نظر نہیں آئی۔''

''وہ نہایت بدذوق ہوگا۔'' جم نے یقین سے کہا۔

''نہیں، اصل میں، میں پارٹی میں کھیتوں میں استعمال ہونے والے لانگ شوز پہن گئی تھی اور ڈانس کے دوران میں نے اتنی بار اس کا پاؤں کچلا کہ پارٹی کے بعد اس کے دوست اسے اٹھا کر لے گئے تھے۔ بے چارے سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔''

جم کی ہنسی نکل گئی۔ ''لیکن میرے ساتھ تو تم بالکل ٹھیک ڈانس کرتی ہو۔''

''تمہاری بات اور ہے۔'' نینسی نے سنجیدگی اور یقین سے کہا۔

جم کا تعلق ساؤتھ کیرولینا کے ایک چھوٹے سے قصبے سے تھا۔ قصبے میں اس کی خاندانی ہارڈ ویئر کی دکان تھی جو پانچ نسلوں سے چلی آرہی تھی۔ چھٹی نسل جس کا اکلوتا نمائندہ جم تھا، اس نے یہ دکان چلانے سے انکار کر دیا۔ اسے میڈیکل کے شعبے سے دلچسپی تھی مگر بعض وجوہات کی بنا پر وہ ڈاکٹر نہیں بن سکا تھا لیکن اس نے میڈیکل کنسلٹنٹ بن کر

اپنی خواہش کسی حد تک پوری کر لی تھی۔ اتفاق سے اسے بھی اسپرنگ فیلڈ پسند آیا تھا۔ اس شہر میں بیک وقت شمال کی خوب صورتی بھی تھی اور یہاں موسم بھی اتنا سخت نہیں ہوتا تھا۔ یہیں ایک تقریب میں اس کی ملاقات نینسی سے ہوئی تھی۔

جم کے تعلقات اپنے ماں باپ سے اچھے نہیں تھے انہوں نے خاندانی بزنس ترک کرنے کا خاصا برا منایا تھا اور وہ اس کی شادی میں بھی شریک نہیں ہوئے تھے اس لیے نینسی نے اپنی ساس اور سسر کو براہِ راست نہیں دیکھا تھا بس کچھ تصویروں میں دیکھا تھا۔ اس نے ایک دو بار جم سے کہا بھی کہ وہ اس کے گھر چلتے ہیں لیکن اس بات پر اس کا موڈ آف ہو گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ غلطی اس سے نہیں ہوئی ہے اس لیے وہ کیوں جائے؟ جب تک اس کے ماں باپ اسے خود نہیں بلائیں گے اور اس سے ناراضی ختم نہیں کریں گے وہ نہیں جائے گا مگر اس کے ماں باپ کی طرف سے ایسا کوئی اشارہ نہیں ملا تھا کہ وہ اس سے تعلقات معمول پر لانا چاہتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا تھا کہ انہوں نے جم کی دعوت کے باوجود اس کی شادی پر آنا گوارہ نہیں کیا تھا۔ اس لیے جم بھی ان کا ذکر پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی بات تھی اور اس کا ان کی ازدواجی زندگی پر اثر نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ اپنی زندگی سے بہت خوش تھے۔

نومبر کے آخر میں جم کو ایک طویل دورے پر جانا تھا۔ اسے ویسٹ کوسٹ کی کئی ریاستوں کا دورہ کرنا تھا اور اس بار اسے بیس دن سے زیادہ ہی لگ جاتے۔ بیس دن خاصے زیادہ ہوتے ہیں۔ آغاز میں نینسی اکیلے گھر میں رہ لیتی تھی لیکن اب چند دن بعد اسے بے چینی ہونے لگتی تھی اور اس کی خواہش ہوتی کہ جم جلد از جلد واپس آجائے لیکن نینسی نے فکر ظاہر نہیں کی، وہ پہلے ہی جم کو چھوٹ دے چکی تھی اس لیے اب اگر وہ اعتراض کرتی تو یہ اپنی بات سے پلٹنے والی بات ہو جاتی۔ اس نے جم سے کہا۔ ''ٹھیک ہے ڈیئر تم فکر مت کرو، میں پریشان نہیں ہوں گی۔''

''وہ تو مجھے معلوم ہے لیکن مجھے تو تمہاری فکر رہے گی۔'' جم نے کہا۔ ''میں نے اپنے باس کو وارننگ دے دی ہے اگر آئندہ اس نے میرے لیے اتنا طویل ٹرپ رکھا تو میرا استعفیٰ اس کی میز پر ہوگا۔''

اس بات پر نینسی جذباتی ہو گئی اور اس نے اعتراف کر لیا۔ ''کبھی کبھی جب تمہیں زیادہ دن ہو جاتے ہیں تو میں تمہاری کمی بہت شدت سے محسوس کرنے لگتی ہوں لیکن یقین کرو اس معاملے میں، میں نے تمہیں کبھی قصوروار نہیں سمجھا۔ تم جاب سے مجبور ہو۔''

''بس یہی سوچ کر خود کو تسلی دے لیتا ہوں ورنہ میرا دل چاہتا ہے زیادہ سے زیادہ تمہارے پاس رہوں۔'' جم نے اس کے بال سہلائے۔ جب جم روانہ ہو رہا تھا تو سرما کی پہلی برف باری کا آغاز ہو گیا تھا۔ جم نینسی کو اکیلے چھوڑ کر جاتے ہوئے پریشان نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ جس اپارٹمنٹ میں رہتے تھے وہ بہت لگژری اور شاندار قسم کا تھا۔ یہاں سیکیورٹی کا بہت اچھا نظام تھا۔ آس پاس اچھی فیملیز آباد تھیں اور ان میں سے کئی سے ان کے اچھے تعلقات تھے اس لیے اگر نینسی کا دل چاہتا تو وہ کسی کے گھر بھی جا سکتی تھی۔ اتفاق سے ان کی جان پہچان والی تمام فیملیز صرف میاں بیوی اور بچوں پر مشتمل تھیں۔ یہاں کوئی ساس یا سسر نہیں تھا۔

مہینے میں ایک دو بار نینسی اپارٹمنٹ کے لیڈیز کلب کا چکر لگا لیتی تھی جہاں اس کی پڑوسنوں سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ گفتگو کے دوران موضوع بحث سسرال آتا تو تقریباً تمام خواتین کا ردعمل ایک جیسا ہوتا تھا۔ وہ سسرالی رشتوں کا ذکر یوں کرتی تھیں جیسے دنیا میں ان سے زیادہ خوفناک چیز اور کوئی ہے ہی نہیں۔ نینسی کو کیونکہ سسرالی رشتے داروں کا کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے وہ اپنی رائے محفوظ رکھتی تھی۔ البتہ وہ کبھی کبھی ان خواتین کی گفتگو پر حیران بھی ہوتی کہ کیا واقعی ایسا ہی ہوتا ہے جیسا وہ بیان کرتی ہیں۔ مثلاً دو فلور اوپر رہنے والی مارشا اپنی ساس کا ذکر یوں کرتی جیسے وہ کوئی آدم خور چڑیل ہو جو صرف اس کی زندگی حرام کرنے کے لیے زندہ تھی۔ اسی طرح نینسی کے اپارٹمنٹ کے اوپر رہنے والی میلسی بھی اپنی ساس سے تنگ رہتی تھی جو ہر دوسرے تیسرے مہینے اس کے گھر آدھمکتی تھی اور اسے اچھی طرح تنگ کر کے واپس جاتی تھی۔ ایک دن مارشا نے نینسی سے کہا۔

''تم خوش قسمت ہو کہ تمہاری ساس نہیں ہے۔''

''نہیں، میری ساس ہے۔'' نینسی نے تردید کی۔

وہ سب اچھل پڑیں۔ ''تب تم نے کبھی ذکر کیوں نہیں کیا؟''

''کیونکہ میں ان سے کبھی ملی ہی نہیں مگر اصل میں وہ اپنے بیٹے سے ناراض ہیں اس لیے ہماری شادی میں بھی شرکت نہیں کی۔''

''تب تو تم سچ مچ خوش قسمت ہو۔'' میلسی نے رشک سے کہا۔ ''ایسی ساس قسمت والوں کو ملتی ہے جو کبھی ملنے ہی نہ آئے۔''

''ایسا نہیں ہے، میرا خیال ہے کچھ اچھی ساسیں بھی تو ہوں گی۔''

''اچھی ساسیں۔'' ان سب نے مشترکہ قہقہہ لگایا۔ ''یہ کہاں ہوتی ہیں؟''

نینسی کھسیا گئی تھی لیکن اسے ان کی باتوں پر یقین نہیں آیا تھا، اس کا خیال تھا کہ ابھی دنیا اچھی ساسوں کے وجود سے خالی نہیں ہوئی ہے۔ بہت دنوں سے اسے کلب جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس نے سوچا جم کے جانے کے بعد کلب جائے گی اور کچھ وقت گزارے گی۔ اس کا دفتری وقت صبح آٹھ سے شام پانچ بجے تک ہوتا تھا درمیان میں صرف ایک گھنٹے کے لیے لنچ کا وقت ملتا تھا۔ چلتے پھرتے وہ اپنے بے شمار گھریلو کام نمٹا لیتی تھی۔ اس دوران میں وہ کانوں سے ایک ہیڈ سیٹ لگائے رکھتی تھی اگر اسے کوئی کال آتی تو وہ ایک لمحے میں کمپیوٹر پر آجاتی تھی۔

وہ اپنی جاب سے بہت خوش تھی۔ کیونکہ آن لائن ٹریڈنگ کا کام چوبیس گھنٹے چلتا تھا اس لیے وہ اپنی مرضی کی شفٹ بھی منتخب کر سکتی تھی تاکہ شام کا وقت اپنے شوہر کو دے سکے۔ اسے یہ سہولت بھی تھی کہ اتوار کے علاوہ بھی کسی دن چھٹی لے سکتی تھی یا مسلسل کام کر کے زیادہ دن کی چھٹی لے سکتی تھی۔ اس سہولت کا فائدہ بھی وہ جم کی آمد کے وقت اٹھاتی تھی۔ لیکن اس بار اس نے جم کی روانگی کے اگلے دن ہی چھٹی کی۔ اسے بیوٹی سیلون سے کچھ کام کروانا تھا۔ پھر اس کا ارادہ شاپنگ کرنے اور شام کو لیڈیز کلب جانے کا تھا۔

جیسے ہی اس نے باہر نکلنے کے لیے دروازہ کھولا، ایک بڑی بی کو ایک بڑے سے ہینڈ کیری اور ایک پہیوں والے سوٹ کیس سمیت سامنے پایا۔ ایک لمحے کو نینسی گڑبڑا گئی، وہ خاموش کھڑی خشمگیں نظروں سے نینسی کو دیکھ رہی تھیں اور نینسی کو ان کی صورت جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ بڑی بی کی آنکھوں پر خاصے دبیز شیشے کی عینک تھی یعنی ان کی نظر خاصی کمزور تھی۔ کچھ دیر بعد نینسی نے ہچکچا کر کہا۔ ''سوری مام میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔''

''ہاں اب تم مجھے کیوں پہچانو گی۔'' بڑی بی کا لہجہ بھی کم خشمگیں نہیں تھا۔ پھر وہ اس کے برابر سے گزر کر اندر چلی آئیں۔ نینسی کی بوکھلاہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ اس کے پیچھے لپکتے ہوئے لاؤنج تک آئی۔

''ایک منٹ آپ نے بتایا نہیں....''

''کیا نہیں بتایا؟'' وہ سامان ایک طرف رکھ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

''یہی کہ آپ کون ہیں؟''

بڑی بی نے ایک بار پھر اسے غضب ناک نظروں سے دیکھا اور بولیں۔ ''میں پہلی بار ضرور آئی ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم اپنی ساس کو پہچاننے سے انکار کر دو۔''

''ساس ....'' نینسی اچھل پڑی اور پھر اسے خیال آیا کہ تبھی بڑی بی کی صورت اسے جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ اپنی تصویروں میں وہ اتنی بوڑھی نظر نہیں آتی تھی لیکن وہ تصویریں یقیناً کئی سال پہلے کی تھیں۔ اس لیے بڑی بی اتنی مختلف لگ رہی تھیں۔ نینسی ہکلائی۔ ''آپ جم کی مام ہیں؟''

''تم اسے جم کہتی ہو؟'' بڑی بی نے اسے ایک بار پھر خوفناک انداز میں دیکھا۔ ''وہ اپنے نام کو مختصر کرنا پسند نہیں کرتا تھا اور اگر کوئی یہ جرأت کرتا تو وہ اس پر چڑھ دوڑتا تھا۔''

''اب وہ پسند کرتا ہے۔'' نینسی نے ناگواری سے کہا۔ اسے بڑی بی کا بار بار یوں گھورنا بالکل پسند نہیں آرہا تھا۔ ''بہرحال یہ بتائیے کہ آپ جم سے ملنے کیسے چلی آئیں کیا آپ نے اسے معاف کر دیا؟''

بڑی بی نے شانے اچکائے۔ ''ظاہر ہے، ماں باپ ہمیشہ تو اپنی اولاد سے ناراض نہیں رہ سکتے۔ جم کہاں ہے؟''

''وہ کام سے گیا ہوا ہے اور اب بیس دن بعد آئے گا۔'' نینسی نے جلدی سے کہا۔ اسی وقت اس کے ذہن میں ایک خوفناک خدشہ سر اٹھانے لگا کہ اس کی ساس یہاں رکنے کے ارادے سے آئی تھی۔ اس کے اتنے سارے سامان سے تو یہی ظاہر تھا۔

''چلو بیس دن ہی کی تو بات ہے پھر وہ آجائے گا۔''

نینسی پھر بوکھلا گئی۔ ''کیا مطلب......آپ رکنے کے ارادے سے آئی ہیں؟''

''ظاہر ہے۔'' انہوں نے اسے چشمے کے اوپر سے دیکھا۔ ''اتنا سامان میں ایک دو دن کے لیے تو نہیں لا سکتی۔ اگر میں اپنے بیٹے کے گھر رکنا چاہوں تو تمہیں کیا اعتراض ہے؟''

گھر اس کا اور جم کا مشترکہ تھا لیکن اسے یہ بات کہنا اچھا نہیں لگا تھا۔ بادل ناخواستہ اس نے کہا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ میں بھی مصروف رہتی ہوں اور آپ بور ہو سکتی ہیں۔''

''کوئی بات نہیں، میں عادی ہوں، جم کا باپ تو صبح سات بجے جاتا ہے اور رات دس گیارہ بجے سے پہلے نہیں آتا۔'' بڑی بی نے جواب دیا اور چاروں طرف دیکھنے لگیں۔ ''گھر تو بہت خوب صورت ہے۔''

نینسی اور جم نے یہ گھر اپنی تمام جمع پونجی سے خریدا تھا کیونکہ قسطوں پر لینے کی صورت میں یہ انہیں کئی گنا زیادہ قیمت کا پڑتا۔ اس کے لیے جم نے اپنی بیش قیمت کار بھی بیچ دی تھی اور بعد میں قسطوں پر ایک اچھی گاڑی لے لی تھی۔ جم کی طرف سے خاموشی کے بعد اس نے اپنے سسرال کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا اس لیے ساس کی اچانک اور غیر متوقع آمد سے نینسی کا موڈ خراب ہو گیا تھا اور اس نے باہر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس نے بڑی بی سے کہا۔ ''آئیے میں آپ کو کمرا دکھا دوں۔ آپ اپنا سامان رکھ دیں۔''

''تم مجھے بتا دو میں خود چلی جاؤں گی تب تک تم میرے لیے ناشتا بنا دو۔ میں نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا ہے۔''

نینسی ان کا کمرا دکھا کر کچن میں آئی اور ناشتا تیار کرنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر آنے والے دنوں میں بڑی بی کا یہی رویہ رہا تو گھر کا پُرسکون ماحول خراب ہو جائے گا۔ ساتھ ہی اسے جم پر غصہ آنے لگا کہ وہ اس بار اتنے دن کے لیے کیوں گیا ہے۔ پھر اس نے خود کو سمجھایا کہ جم کو کیا معلوم تھا کہ اس کی ماں آ جائے گی۔ نہ جانے کیوں نینسی کو اس عورت سے چڑ سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کا انداز ہی چڑانے والا تھا۔ ناشتا بنانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ مہمانوں کے لیے مخصوص کمرے سے کوئی چیز گرنے اور پھر ایک چھناکے کی آواز آئی وہ فرائنگ پین میں انڈا چھوڑ کر بھاگی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو یہ دیکھ کر اس کا صدمے سے برا حال ہو گیا کہ سیٹ کی ڈریسنگ ٹیبل کا شیشے والا حصہ اس سے الگ ہو کر نیچے پڑا ہے اور بڑی بی نہایت آرام سے بستر پر بیٹھی ہیں۔

''یہ کیا ہوا؟'' نینسی بولی۔

''میں اپنا بیگ اس پر لٹکا رہی تھی اور یہ ٹوٹ کر نیچے گر گیا۔ بہت گھٹیا اور ہلکی کوالٹی کا ہے۔''

''ہلکی کوالٹی۔'' نینسی روہانسی ہو گئی۔ ''یہ پورا سیٹ چار ہزار ڈالرز کا ہے اور اب تو ڈریسنگ بھی دوسری نہیں ملے گی۔ یہ چند سیٹ تھے۔ اس میں سے آخری میں نے خریدا تھا۔ یا میرے خدا آپ نے اس کا کیا حشر کیا ہے۔''

''دوسرا لے لو۔'' بڑی بی بے پروائی سے بولیں۔

اس نے تلملا کر کہا۔ ''آپ کو اس پر لٹکانے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا الماری نہیں ہے سامان رکھنے کے لیے۔''

''اپنے گھر میں ہمیشہ ڈریسنگ پر لٹکاتی ہوں۔'' وہ بے نیازی سے بولیں۔ ''ویسے ناشتے کا کیا ہوا؟''

اس پر نینسی کو یاد آیا کہ وہ فرائنگ پین میں انڈا چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ بھاگی ہوئی کچن پہنچی تو انڈا سیاہ ہو چکا تھا۔ اس نے جلدی سے چولہا بند کر کے فرائنگ پین ڈسٹ بن میں الٹ دیا۔ ویسے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یہ ساس کے سر پر پھینکتی۔ وہ کچن میں چلی آئی تھیں۔ انڈے کی بو محسوس کر کے انہوں نے منہ بنایا۔ ''یقیناً جلا دیا ہو گا تم نے؟''

نینسی نے انہیں گھورا اور دوبارہ انڈا توڑ کر ڈالا۔ توس، انڈا اور کافی ان کے سامنے رکھی اور کمرے میں آ کر ڈریسنگ ٹیبل کا ملبا اٹھانے لگی۔ لکڑی اور شیشے کے بے شمار ٹکڑے ہو گئے تھے۔ بھاری بیگ گرنے سے ڈریسنگ ٹیبل کی سطح پر بھی کئی خراشیں آ گئی تھیں۔ اس نے بڑی مشکل سے یہ سارا ملبا اٹھایا۔ اس دوران میں اسے کئی زخم بھی لگے تھے۔ کرچیوں سے۔ اسے پٹیاں چپکاتے دیکھ کر بڑی بی آرام سے کافی پی رہی تھیں۔ آخر میں انہوں نے تبصرہ کیا۔ ''تم شہری لڑکیاں بڑی نازک اور پھوہڑ ہوتی ہو۔''

''کیونکہ ہم شہر میں رہتے ہیں۔'' نینسی نے بھنا کر غلط بیانی کی، ورنہ جوانی تک تو اس نے بھی ایک دیہی علاقے میں پرورش پائی تھی مگر وہاں بھی وہ نازک اندام ہی تھی۔ ''اگر میں آپ کی طرح کسی دیہات کی رہنے والی ہوتی تو یقیناً سخت جان ہوتی۔''

''انسان کوشش کرے تو کیا نہیں کر سکتا۔'' بڑی بی نے کافی ختم کی اور کھڑی ہو گئیں۔ ''میں دوپہر کا کھانا دو بجے کھاتی ہوں اور مجھے سبزیوں سے نفرت ہے۔ بیف یا چکن کی کوئی چیز بنا لینا۔''

وہ حکم دے کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں اور نینسی دانت پیستی رہ گئی۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ اس کی تمام جاننے والیاں اپنی ساسوں سے کیوں اتنا چڑتی تھیں۔ ساس

چیز ہی ایسی ہوتی ہے۔اس نے سوچا بھاڑ میں گیا لنچ ۔اگر بڑی بی کو بھوک لگے گی تو خود کچھ بنالیں۔وہ اپنے لیے ناشتے کے دوران ہی کچھ سینڈوچز بنالیتی تھی اور لنچ کے وقفے میں ان سے بھوک مٹا کر کچھ اور کام کر لیتی تھی۔اس ایک گھنٹے میں باقاعدہ کھانا بنانا تو کسی صورت ممکن نہیں تھا بہر حال آج اس کی چھٹی تھی۔کچھ دیر بعد اسے خیال آیا کہ اس کی ساس پہلی باراس کے گھر آئی ہیں اور بہر حال وہ جم کی ماں ہیں اس لیے آج وہ ان کے لیے لنچ بنادے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔بڑی بی نے کھانے کے دوران میز بھی خاصی گندی کی تھی۔اس کی صفائی کر کے اس نے فریزر سے چکن نکالی اوراسے پگھلنے کے لیے چھوڑ دیا۔کچن کے لیے ساری خریداری وہ ہفتے میں ایک بار ہی کر لیتی تھی مگر بڑی بی نے جس طرح اپنا مینو بتایا تھا اس سے یہ سامان ناکافی ہو جاتا۔اس لیے اب اسے دوبارہ مارکیٹ کا چکر لگانا پڑے گا۔

اگلے دو گھنٹے تک وہ کچن میں لگی رہی۔اس دوران میں بڑی بی صرف ایک بار دس منٹ کے لیے کچن میں آئیں،اسے یہ بتانے کے لیے کہ ان کے علاقے میں عورتیں صبح سے شام تک انتھک کام کرتی ہیں اور اف نہیں کرتیں ۔نینسی چولہے کے ساتھ ساتھ خود بھی جلتی رہی۔صرف تین گھنٹے میں اس کا سکون غارت ہو کر رہ گیا تھا۔وہ سوچ رہی تھی کہ آنے والے بیس دن اوراس کے بعد کے دن، جب تک اس کی ساس یہاں رہے گی، کیسے گزریں گے کھانا تیار ہوتے ہوتے ہی دو بج گئے تھے۔اس کے فوراً بعد وہ آکر میز پر براجمان ہوئیں اور ڈٹ کر کھایا۔نینسی کا خیال تھا کہ اس نے اتنا بنالیا ہے کہ شام کو بھی یہی چل جائے لیکن جب بڑی بی آواز بلند ڈکار لیتی میز سے کھڑی ہوئیں تو اس پر سوائے ہڈیوں کے اور کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ان کی خوراک حیران کن تھی۔کمرے میں جانے سے پہلے ان نے فخریہ اورطنزیہ انداز میں نینسی سے کہا۔

''ہم دیہاتی لوگ کام بھی ڈٹ کر کرتے ہیں اور کھاتے بھی ڈٹ کر ہیں۔''

''کام تو نہیں دیکھا میں نے ہاں کھانا ضرور دیکھ لیا ہے۔'' نینسی نے جوابی طنز کیا۔

''جب وقت آئے گا تو کام بھی دیکھ لوگی۔'' بڑی بی بولیں۔''شام کو میں کیلے یا اسٹرابیری کا شیک پیتی ہوں۔''

''گھر میں نہ کیلے ہیں اور نہ اسٹرابیری ہے۔'' نینسی نے انہیں مطلع کیا تو وہ مسکرائیں۔

''اسی لیے تو تمہیں ابھی بتا رہی ہوں۔''

کچن اور میز کی صفائی کرتے ہوئے نینسی غصے کے ساتھ ساتھ کوفت بھی محسوس کر رہی تھی۔اسے لگ رہا تھا اس کے گھر کا نظام تلپٹ ہو کر رہ گیا ہے اور اب یہ اسی وقت سدھرے گا جب بڑی بی سامان سمیت اپارٹمنٹ سے نکلیں گی۔کام نمٹاتے ہوئے وہ اتنا تھک گئی تھی کہ جب اپنے بیڈ روم میں آکر وہ بستر پر لیٹی تو فوراً سو گئی۔حالانکہ اسے دن میں سونے کی عادت نہیں تھی۔پھراس کی آنکھ دروازہ پیٹنے کی آواز سے کھلی۔چند لمحے کو تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔پھر وہ ہڑبڑا کر اٹھی اوراسے یاد آگیا کہ آج اس کی ساس آئی ہیں۔اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔بڑی بی باہر بڑے مشکوک تاثرات لیے کھڑی تھیں۔''دروازہ کیوں بند کیا ہے؟''

''کیونکہ دیہات میں بغیر اجازت کمرے میں گھس آنے کا رواج بھی ہے۔'' نینسی نے طنز کیا۔

''میں پانچ بجے شیک پیتی ہوں۔'' بڑی بی نے گھڑی دیکھی۔''آدھا گھنٹارہ گیا ہے۔''

''مجھے ابھی شاپنگ کے لیے جانا ہے تب ہی میں کیلے اوراسٹرابیری لاسکوں گی۔''

''میں بھی چلوں گی۔'' بڑی بی نے فوراً ارادہ ظاہر کر دیا۔

''آپ تھک جائیں گی۔'' نینسی نے جلدی سے ٹالنا چاہا لیکن وہ کہاں سننے والی تھیں۔جب نینسی تیار ہو کر جانے لگی تو اس نے بڑی بی کو بھی تیار پایا۔مجبوراً وہ انہیں لے کر باہر آئی۔وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ کوئی پڑوسن نہ ملے ورنہ ساسوں کے بارے میں اس کے خیالات کا بعد میں زبردست ریکارڈ لگتا۔مگر اس کی دعا قبول نہیں ہوئی کیونکہ اتفاق سے ہی اسے مارشا اور میلسی آتے ہوئے مل گئیں اور تعارف کے بعد جب انہیں پتا چلا کہ وہ نینسی کی ساس ہیں تو انہوں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا۔اس دوران میں بڑی بی کی زبان مستقل چل رہی تھی اور وہ شہری خواتین کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کھل کر رہی تھیں۔مارشا اور میلسی سے جان چھڑا کر وہ آگے بڑھی تو انہوں نے بڑی بی کو رات لیڈیز کلب میں مدعو کرلیا اور انہوں نے یہ دعوت قبول بھی کر لی۔نینسی جانتی تھی کہ انھوں نے شرارت میں یہ کام کیا ہے اور رات کو سب کے

سامنے اس کی بے عزتی ہو گی۔ باہر سڑک پر آکر اس نے کہا۔

"مام آپ نے ضرور ان کے سامنے اس قسم کی باتیں کرنی تھیں۔ جب آپ کو شہری عورتیں پسند ہی نہیں ہیں تو یہاں کیوں آئی ہیں؟"

"میں تو اپنے بیٹے کے پاس آئی ہوں۔" وہ اطمینان سے بولیں۔ "اب اس نے بدقسمتی سے ایک شہری عورت سے شادی کر لی ہے تو...."

نینسی نے بات کاٹ کر کہا۔ "بدنصیبی تو میری ہے کہ میرا اسرال دیہات سے تعلق رکھتا ہے۔"

اس پر بڑی بی نے اسے گھورا لیکن ان کی چلتی زبان خاموش ضرور ہو گئی تھی۔ نینسی نزدیکی سپر اسٹور سے شاپنگ کرتی تھی جہاں اسے تمام چیزیں بہت اچھی اور تازہ مل جاتی تھیں۔ لیکن بڑی بی کی ناک تلے یہ چیزیں بھی نہیں آرہی تھیں۔ ان کے خیال میں شہر میں تازہ چیزوں کا وہ معیار نہیں جو دیہی علاقوں میں ہے۔ انہوں نے سبزیوں کی خریداری روکنے کی ہر ممکن کوشش کی اور زیادہ زور گوشت پر دیا تھا۔ نتیجے میں نینسی کا بل معمول سے تقریباً چالیس فیصد اوپر چلا گیا تھا۔ بڑی بی نے کئی اضافی خریداری بھی کی جن کی ادائیگی نینسی کو کرنا پڑی تھی۔ اپنا پرس وہ گھر ہی بھول آئی تھیں۔ مزید انہوں نے سامان اٹھانے میں نینسی کی کوئی مدد نہیں کی اسے سب خود اٹھا کر لانا پڑا تھا۔

بڑی بی کا کہنا تھا کہ گھر میں تمام سامان جم کے پاپا لاتے ہیں اس لیے انہیں سامان اٹھانے کی عادت نہیں ہے۔ پھر گھر پہنچتے ہی شیک تیار کرنا پڑا اور جب تک بڑی بی شیک پیتی رہیں ان کا لیکچر سننا کہ آج انہیں زندگی میں پہلی بار اتنا لیٹ شیک پینا پڑ رہا ہے مگر اس سے ان کے شیک پینے کی رفتار پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے دو بڑے گلاس ختم کر دیے تھے۔ بہرحال نینسی نے یہ سب اس لیے برداشت کر لیا کہ بڑی بی نے گھر آنے کے بعد لیڈیز کلب چلنے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ ورنہ نینسی کو خوف تھا کہ آج رات اس کی ٹھیک ٹھاک بے عزتی ہو جائے گی۔

رات کے کھانے میں بڑی بی نے مٹن پائی کھائی اور اس بار بھی ڈش تقریباً صاف کر دی۔ نینسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بڑی بی جو اتنا کھا رہی تھیں وہ جا کہاں رہا تھا۔ اتنا تو وہ اور جم مل کر بھی نہیں کھا سکتے تھے۔ میز پر ہی بڑی بی نے اس کی حیرت بھانپ لی اور بولیں۔ "تم شاید سوچ رہی ہو کہ میں اتنا کیسے کھالیتی ہوں؟"

"ہاں، میں واقعی یہی سوچ رہی تھی۔" نینسی نے مروت بالائے طاق رکھ کر کہا۔ کیونکہ اسے یہ سوچ کر ہول اٹھ رہے تھے کہ اسے کل بھی یہ سب کرنا پڑے گا جبکہ اسے تو اپنا کام نمٹانا ہوگا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ناشتا بنا سکتی تھی۔ لنچ اور ڈنر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ صرف ناشتا صبح سے کرتی تھی، باقی دو وقت ہلکا پھلکا کھاتی تھی۔ اس لیے اسے کچن میں زیادہ محنت کرنے کی عادت نہیں تھی۔ اس دن تو اس نے ریکارڈ وقت کچن میں گزارا تھا۔ بڑی بی نے فخریہ انداز میں کہا۔

"ہم دیہات والے ایسے ہی کھاتے ہیں۔ اب تو میری خوراک کم ہو گئی ہے۔"

بچپن

البیرونی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ آتش پرستوں کا دور تھا۔ شہر شہر اور گاؤں گاؤں آتش کدے بنے ہوئے تھے۔ زرتشت کی تعلیمات عام تھیں مسلمان اقلیت میں تھے لیکن حکومت انہی کے ہاتھوں میں تھی گویا ہندوستان کا نقشہ تھا کہ اکثریت ہندوؤں کی حکومت مسلمان اقلیتوں کی۔ حکومت اور اقتدار ہی کی وجہ سے مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود بے خوف خطر اپنے عقیدے پر قائم رہ کر زندگی بسر کرتے تھے۔ انہی میں سے ایک ابوریان بھی تھا جو ایک غریب خاندان میں پیدا ہوا تھا لیکن علم حاصل کرنے کا بے مایا شوق اسے قدرت کی طرف سے ملا تھا۔ اس وقت خوارزم کی ریاست پر احمد بن محمد بن عراق کی نسبت سے جس خاندان کی حکمرانی تھی وہ آل عراق کہلاتا تھا۔ احمد کا چچا زاد بھائی امیر ابونصر منصور علمی مزاج رکھتا تھا۔ اس نے البیرونی کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا اور اسے حصول علم میں ہر ممکن سہولت پہنچائی چنانچہ البیرونی اپنی تصانیف میں منصور کو استاذی کے لقب سے یاد کرتا ہے اور اس کا نام عقیدت و احترام کے ساتھ لیتا ہے۔ منصور ہی نے البیرونی کو اقلیدس کی جیومیٹری اور بطلیموس کی فلکیات کے ابتدائی درس دیے تھے۔

مرسلہ: قرۃ العین، اقرا سٹی۔ کراچی

نینسی کی آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں۔ ''یہ خوراک کم ہے؟''

''ہاں، جوانی میں اس سے بھی زیادہ تھی۔'' انہوں سرد آہ بھری۔ ''اور میرا وزن بھی ہمیشہ ایک جیسا رہا ہے یعنی تقریباً ایک سوبیس پاؤنڈز۔''

''لیکن آپ کچھ کرتی تو ہیں نہیں تو پھر وزن کیوں نہیں بڑھا؟''

''یہاں کچھ نہیں کر رہی ہوں، گھر میں تو سارا کام ہی میں کرتی ہوں۔ حد یہ کہ گھر پر رنگ اور مرمت کا کام بھی میں کرتی ہوں۔ تمہارے انکل کو اتنی فرصت کہاں، وہ تو بس اپنے بزنس میں مگن رہتے ہیں۔''

نینسی کو اس بات کی صداقت میں شک تھا کہ اس کی ساس مل کر کچھ کرتی ہوں گی۔ امکان یہی تھا کہ گھر میں بھی ان کا زیادہ وقت اسی طرح کھانے پینے اور آرام کرنے میں گزرتا ہوگا۔ نینسی سوچ رہی تھی کہ ان سے صاف بات کر لے۔ اس نے گلا صاف کیا اور بولی۔ ''مام آج میں نے چھٹی کی تھی اس لیے یہ سارے کام ہو گئے لیکن کل سے میں کام پر رہوں گی اور اگر آپ کو دوپہر اور رات میں اسی طرح کھانا ہے تو آپ کو خود زحمت کرنا پڑے گی۔''

''تم نوکری کرتی ہو۔'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولیں۔ ''میرے بیٹے نے ایک ملازمت کرنے والی عورت سے شادی کی ہے؟''

''تو اس میں کیا برائی ہے؟ امریکا کی ستر فیصد شادی شدہ عورتیں ملازمت کرتی ہیں۔'' نینسی نے جوابی خفگی کے ساتھ کہا۔ ''میں نے بھی تو ایک ایسے آدمی سے شادی کی ہے جو ملازمت کی وجہ سے مہینے کے بیس دن گھر سے باہر رہتا ہے۔''

''تمہیں کیا ضرورت ہے ملازمت کرنے کی جبکہ تمہارا شوہر اچھا کماتا ہے۔''

''بس یہ میرا پروفیشن اور شوق ہے پھر میرا وقت اچھا گزر جاتا ہے۔''

''بچے نہیں ہیں یا تم لوگوں نے احتیاط کر رکھی ہے؟''

''جم کی خواہش ہے کہ ہمارے بچے ہوں لیکن ابھی تک ایسا کچھ ہوا نہیں ہے، ہم کوئی احتیاط بھی نہیں کرتے۔''

''دیکھنا جب بچے ہوں گے تو تم خود نوکری سے بیزار ہو جاؤ گی، ہمارے خاندان میں عورتوں سے نوکری کرانے کا کوئی تصور نہیں ہے۔''

''نہیں، میری نوکری ایسی نہیں ہے۔'' اس نے بور ہو کر کہا۔ ''لیکن میں بتا دوں کل سے میں سوائے ناشتے کے اور کچھ نہیں بناؤں گی۔ آپ کو کھانا ہے تو خود بنائیں اور خود کھائیں۔''

''اپنے ہی بیٹے کے گھر میں یہ دن بھی دیکھنے تھے۔'' بڑی بی نے گہری سانس لی۔ ''خیر ٹھیک ہے میں خود بنا لوں گی۔ لیکن میں نے دیکھا ہے فریج میں زیادہ چکن اور گوشت نہیں ہے۔''

''آپ گوشت کے بجائے سبزیاں زیادہ کھایا کریں۔ اس عمر میں اتنا مرغن کھانا نقصان دہ... بھی ہوسکتا ہے۔''

''اب تک تو کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔ پھر رقم کا سب سے صحیح مصرف یہی ہے کہ اسے صحت پر لگایا جائے۔ اب چکن اور گوشت کا کیا ہوگا؟''

اس بار نینسی مسکرائی۔ ''وہ بھی آپ خود لے آئیے گا۔ اسٹور تو دیکھ لیا ہے آپ نے۔''

یہ سن کر بڑی بی گڑبڑا گئی تھیں۔ ''بھئی دیکھو میں زیادہ رقم لے کر نہیں آئی ہوں۔''

''کوئی بات نہیں، کھانا تو آپ نے ہے۔ انسان اپنی صحت پر لگائے تو یہ رقم کا سب سے صحیح مصرف ہوتا ہے۔''

نینسی نے ان کا جملہ ان ہی کو لوٹا دیا۔ اس پر ان کی جو صورت بنی اس سے نینسی کی سارے دن کی کوفت کا کسی حد تک ازالہ ہوا تھا۔ مگر آنے والے دنوں کی جو پیشگی پریشانی... ہوگئی تھی اس میں کوئی کمی نہیں آئی۔ صبح وہ جلدی ناشتا بنا کر اور میز پر رکھ کر بڑی بی کو آواز دے کر اپنے کام والے کمرے میں آ گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد جب وہ اپنے ایک کسٹمر کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ بڑی بی چلی آئیں۔

''ناشتا بالکل ٹھنڈا ہے۔ مجھے گرم ناشتا کرنے کی عادت ہے۔''

''میں ایک گھنٹا پہلے آپ کو ناشتا کا کہہ کر آ چکی ہوں اور اس وقت میں جاب پر ہوں، مجھے ڈسٹرب مت کریں۔''

بڑی بی ناشتا بھول گئیں اور اس کے کام کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ نینسی نے بڑی مشکل سے ان سے جان چھڑائی لیکن اتنی دیر میں اس کا کسٹمر جا چکا تھا۔ فی الحال کوئی کام نہیں تھا اس لیے اس نے غصے کے باوجود بڑی بی کو ناشتا گرم کر کے دیا اور کہا۔ ''اب میں کام کر رہی ہوں تو آپ وہاں نہیں آئیں گی۔ جو کرنا ہے خود کریں گی۔''

''اچھا اچھا اب سکون سے ناشتا تو کرنے دو۔'' بڑی بی نے ٹرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ نینسی ٹھنڈی سانس لے کر کمپیوٹر پر واپس آگئی۔ آنے والے تین چار دن اس کی توقع سے زیادہ دشوار ثابت ہوئے تھے۔ بڑی بی ناشتے کے بعد دو وقت کا کھانا خود بنا اور کھا رہی تھیں۔ وہ اس دوران میں سامان نہایت فراخ دلی سے استعمال کرتی تھیں۔ نینسی کو یہ بھی گوارا تھا لیکن پکانے کے دوران وہ اس کے نہایت صاف ستھرے کچن کا جو حشر کرتیں، اس سے اسے سخت کوفت ہوتی تھی۔ روزانہ رات وہ سونے سے پہلے ایک ڈیڑھ گھنٹا لگ کر کچن کی صفائی کرتی تھی۔ اگلی رات تک کچن کا پھر وہی حشر ہو جاتا تھا۔ اس نے بھنّا کر بڑی بی سے کہا تو وہ اطمینان سے بولیں۔

''ہمارے ہاں کچن کھانا بنانے کے لیے ہوتا ہے، سجانے سنوارنے کے لیے اور بہت سی جگہیں ہیں۔''

''لیکن میں کچن صاف رکھنے کی عادی ہوں۔ پلیز آئندہ آپ جب کچن استعمال کریں تو اسے صاف بھی کریں۔''

بڑی بی سن کر خاموش رہی تھیں۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ ان کا نینسی کی التجا پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ جم جب کام کے لیے باہر جاتا تو عام طور سے اسے دوسرے تیسرے دن کال کرتا تھا لیکن اس بار اس کی کال چار دن بعد آئی تھی۔ البتہ اس کی خیریت کی ای میل اور ایس ایم ایس آتے رہتے تھے۔ نینسی نے ابھی تک اسے نہیں بتایا تھا کہ اس کی ماں آئی ہے وہ یہ بات اسے فون پر بتانا چاہتی تھی۔ کئی بار اسے خیال آیا کہ وہ خود اسے کال کرلے لیکن پھر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ نینسی سونے کے لیے لیٹی تھی کہ جم کی کال آگئی۔

''ڈیئر کیسی ہو؟''

''ٹھیک ہوں اور یہاں تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے۔'' نینسی نے کہا اور اچانک اسے خیال آیا کہ وہ ابھی جم کو اس کی ماں کے بارے میں نہ بتائے تاکہ وہ خود آکر اچانک اسے دیکھے تو اسے سرپرائز ملے۔

''کیسا سرپرائز؟''

''اگر پہلے سے بتا دیا تو وہ سرپرائز کہاں رہے گا۔'' نینسی ہنسی۔ ''لیکن تمہارے اس سرپرائز نے میری زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔''

''تم نے تو مجھے تجسس میں ڈال دیا ہے۔ اب میں جلد از جلد آنے کی کوشش کروں گا۔''

''یہ تو اچھی بات ہے اب میں تمہارے ہر ٹرپ میں کوئی نہ کوئی سرپرائز تیار رکھنے کی کوشش کروں گی۔''

اگلے دن بڑی بی نے ناشتے پر اس سے پوچھا۔ ''تم رات کو کس سے بات کر رہی تھیں؟''

نینسی کو غصہ آگیا۔ ''کیا آپ چھپ کر میری باتیں سنتی ہیں؟''

بڑی بی نے منہ بنایا۔ ''مجھے کیا ضرورت ہے۔ میں تو واش روم جا رہی تھی تو تمہیں باتیں کرتے سن لیا۔''

''آپ کے بیٹے کا فون تھا۔ میں نے آپ کے بارے میں بتایا نہیں ہے، سرپرائز دوں گی۔''

نینسی نے محسوس کیا کہ بیٹے کے بارے میں سن کر وہ زیادہ خوش نہیں ہوئی تھیں شاید اب تک ان کا دل صاف نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے جب آئے گا تو اس سے مل لوں گی۔''

''مجھے لگتا ہے آپ اب بھی جم سے ناراض ہیں؟''

بڑی بی نے سوال کیا۔ ''اگر تمہارا اکلوتا بیٹا تمہارے ساتھ یہ سلوک کرے تو تمہارا کیا ردِعمل ہوگا؟''

نینسی نے سوچا اور اعتراف کیا کہ کچھ اچھا نہیں ہو گا۔ ''لیکن پیشہ بدلنا کوئی اتنی بری بات تو نہیں ہے۔''

''ہمارے ہاں بری بات ہے۔'' بری بی نے سر ہلایا۔ ''تمہارے انکل کا کہنا ہے امریکا کا صدر بھی ملازم ہی ہوتا ہے اور ملازمت سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ آدمی اپنا کام کرے بے شک وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ کاروبار کا ٹھیلا بھی اپنا ہوتا ہے اور امریکی صدر کے دفتر کی ایک چیز بھی اس کی اپنی نہیں ہوتی۔''

''میرا تو خیال ہے کہ ملازمت کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ آخر جو خود سے کاروبار کرتے ہیں ان کا کاروبار ملازمت پیشہ لوگوں کے توسط سے چلتا ہے۔ وہ رقم خرچ نہ کریں تو کام کیسے چلے؟''

''یہ کاروبار کرنے والوں کے ادا کیے ہوئے ٹیکسوں کی رقم ہوتی ہے جس سے سرکاری ملازموں کو تنخواہیں دی جاتی ہیں اور نجی ملازموں کو براہِ راست کاروبار کرنے والے ہی تنخواہ دیتے ہیں۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی ملک کی ترقی کے لیے کاروبار کرنے والے اور ملازمت کرنے والے دونوں ہی بہت اہم ہوتے ہیں۔''

''میں یہ سب نہیں جانتی لیکن ہمارے ہاں ملازمت کرنا نہایت برا سمجھا جاتا ہے۔'' بڑی بی نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔ ''جم سے اختلاف ہی اسی بات پر ہے ورنہ باقی معاملات میں وہ نہایت فرمانبردار اور اچھا بچہ ہے۔''

نینسی کے خیال میں خاندانی ضد جم میں بھی موجود تھی ورنہ وہ کچھ عرصے بعد اس کے ساتھ ماں باپ کے گھر جا کر ان سے معافی مانگ سکتا تھا۔ مگر اس نے ایک بار بھی ایسا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ اگر نینسی نے اس بارے میں بات کی تو اس کا موڈ خراب ہوگیا۔ اس لیے نینسی نے اس سے اس موضوع پر بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ اب اس کی ماں کو دیکھ کر نینسی کو اندازہ ہورہا تھا کہ جم کیوں اپنے ماں باپ سے اتنا بھاگتا تھا۔ کچن کے بارے میں بات کرنے کے بعد بھی بڑی بی کا رویہ نہیں بدلا تھا اور وہ روز ہی کچن اسی طرح گندا چھوڑتی تھیں۔ بس ایک اچھی بات تھی کہ وہ سوائے اپنے کمرے اور کچن کے اور کسی جگہ دخل نہیں دیتی تھیں۔ کمرے کو بھی انہوں نے کباڑ خانہ بنا رکھا تھا۔ مگر نینسی نے کچھ کہا نہیں۔ کمرے کو روز ہی صاف یا ٹھیک کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ اسے کمرا ایک ہی بار ان کے جانے کے بعد ٹھیک کرنا تھا۔

اب اس کی خواہش تھی کہ جم جلد از جلد گھر آجائے اور بڑی بی کے واپس جانے کی تاریخ سامنے آئے۔ اب وہ اسے کام کے دوران نہیں چھیڑتی تھیں لیکن خود نینسی کو گھر اور خاص طور سے کچن کی فکر لگی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے وہ اپنے کام پر صحیح طریقے سے توجہ نہیں دے پارہی تھی اور اسے اپنے باس کی طرف سے کئی بار ٹوکا بھی گیا تھا۔ اگرچہ اس نے نینسی کو نوٹس نہیں دیا تھا کیونکہ وہ اسے اچھا آفیسر سمجھتا تھا۔ البتہ اسے حیرت تھی کہ نینسی، جو چند دن پہلے تک بہت اچھا جارہی تھی اسے کیا ہوا ہے؟ اس وقت بھی اس نے الجھے ذہن کے ساتھ انکوائری کرنے والے کچھ کسٹمرز کو غلط انوائسز بھیج دیں اور ان کی طرف سے شکایت آئی تو باس نے بالآخر خود اس سے بات کی۔ اس نے نرمی سے پوچھا۔

''نینسی تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے تم اتنی غلطیاں کیسے کرنے لگی ہو؟''

''سر آئی ایم سوری لیکن میں کچھ پریشان ہوں۔ آیندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔'' اس نے پشیمانی سے کہا۔

''تمہیں کیا پریشانی ہے؟''

وہ ہچکچائی پھر اس نے بتا دیا۔ ''سر آج کل پہلی بار میری ساس میرے گھر آئی ہیں اور انہوں نے ایک ہفتے میں مجھے تقریباً پاگل کردیا ہے۔''

باس ہنس دیا۔ ''یہ ساس چیز ہی ایسی ہوتی ہے۔ جب میری ساس آتی ہے تو میں گھر میں کام کرنے کی بجائے دفتر چلا جاتا ہوں۔''

نینسی کا باس بھی گھر میں بیٹھ کر کام کرتا تھا۔ نینسی نے کہا۔ ''آپ تو دفتر جاسکتے ہیں۔ میرے گھر کے پاس تو فرم کا کوئی دفتر بھی نہیں ہے۔''

''تب تم ایسا کرو چھٹی لے لو اور آرام سے اپنی ساس کو بھگتاؤ اور جب وہ چلی جائیں تو دوبارہ جوائن کرلینا۔''

''اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ وہ طویل عرصے تک رکنے کے ارادے سے آئی ہیں۔''

''تمہاری مرضی.... بات ابھی میری حد تک ہے۔ میں اسے سنبھال رہا ہوں لیکن اگر یہ مجھ سے آگے چلی گئی تو سمجھ سکتی ہو کہ کیا ہوگا؟''

نینسی جانتی تھی۔ یہ چیز اس کے ریکارڈ کو خراب کر دے گی۔ پانچ سال کی ملازمت کے دوران اسے ایک بار بھی سرزنش کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس نے کہا۔ ''سر، میں اس بار کوئی غلطی نہیں کروں گی۔''

اس رات نینسی سونے کے لیے لیٹی تو اس کے سر میں شدید درد ہورہا تھا۔ اس نے دوا کھائی اور سوگئی۔ صبح اٹھی تو جسم عجیب سا ہورہا تھا۔ وہ واش روم میں آئی تو برش کرتے ہوئے اچانک ہی اسے چکر آیا۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور واپس بستر تک آئی اور چکرا کر گر پڑی پھر اسے ہوش نہیں رہا۔ کچھ دیر بعد بھوک سے بے تاب بڑی بی نے اس کے کمرے میں جھانکا اور اسے یوں بستر پر پڑے دیکھ کر چونک گئیں۔ ''نینسی کیا ہوا ہے تمہیں؟'' انہوں نے اسے جھنجوڑ ڈالا تو اس کے حواس کسی قدر بحال ہوئے۔

''پتا نہیں مجھے بہت چکر آرہے ہیں کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔''

بڑی بی یہاں آنے کے بعد پہلی بار فکرمند نظر آئی تھیں۔ انہوں نے نینسی کو سہارا دے کر اٹھایا۔ ''چلو اٹھو، میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتی ہوں۔''

اتفاق سے ایک کلینک پاس ہی تھا اور بڑی بی اسے وہیں لے گئیں۔ نینسی کی کار انہوں نے کسی نہ کسی طرح ڈرائیو کرلی تھی۔ ویسے وہ جس طرح کار چلا رہی تھیں اسے

دیکھ کر نینسی کو خدشہ ہوا کہ کہیں وہ دونوں ہی کسی اسپتال نہ پہنچ جائیں مگر خیریت رہی اور بڑی بی نے اسے کلینک تک پہنچا دیا۔ اس کی حالت کے پیشِ نظر ڈاکٹر نے دوسرے مریضوں کو چھوڑ کر پہلے اسے دیکھا۔ وہ اسے اندر معائنے کے کمرے میں لے گیا اور کوئی نصف گھنٹے بعد اس نے باہر آ کر بڑی بی سے پوچھا۔ ''یہ تمہاری کیا لگتی ہے؟''

''بہو ہے۔''

''تب مبارک ہو، یہ ماں بننے والی ہے۔ لیکن اس کی کنڈیشن ٹھیک نہیں ہے اسے فی الحال آرام کی اشد ضرورت ہے۔ طاقتور اور سادا غذا کھانی ہوگی۔''

ڈاکٹر نے کچھ دوائیں بھی لکھ کر دی تھیں۔ دواؤں کی قیمت اور ڈاکٹر کی فیس دونوں بڑی بی کو دینا پڑی کیونکہ نینسی کو اتنا ہوش کہاں تھا کہ اپنا پرس لاتی۔ بہرحال جز بز ہونے کے باوجود بڑی بی اسے سنبھال کر گھر تک لے آئیں۔ نینسی کو کام کی فکر تھی۔ اس نے آتے ہی سب سے پہلے اپنے باس کو طبیعت کی خرابی کا بتا کر ایک ہفتے کی چھٹی لی اور پھر جم کو کال کی۔ ''تمہارے لیے ایک سرپرائز اور ہے۔''

''خدا خیر کرے ایک اور سرپرائز۔''

''ہاں میری طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ میں ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔ پتا ہے اس نے کیا کہا ہے؟''

جم پریشان ہوگیا۔ ''نینسی تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں ڈیئر۔'' وہ شرما کر ہنسی اور پھر اس نے بہ مشکل بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ یہ سن کر جم تو فون پر ہی ناچ اٹھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر گھر پہنچ جائے۔ اس خوشخبری کا وہ کتنے عرصے سے منتظر تھا۔ لیکن ابھی اسے کم سے کم مزید ایک ہفتے کا لازمی کام تھا جسے کیے بغیر وہ واپس نہیں آ سکتا تھا۔ کچھ کام ایسے تھے جنہیں وہ التوا میں ڈال دیتا تب بھی مسئلہ نہیں تھا اس نے نینسی سے کہا۔ ''بس میں ایک ہفتے میں واپس آ رہا ہوں تم اکیلی ہو، مجھے فکر ہو رہی ہے۔ ایسا کرو مارشا سے بات کرو وہ تمہاری دیکھ بھال کر لے گی۔''

''نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے آرام کرنے کو کہا ہے اور میں نے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی ہے۔''

''تم اپنا ذہن بناؤ جب تک بے بی نہ ہو جائے تم ملازمت سے عارضی چھٹی لے لو۔''

''تم آؤ تو اس پر بھی غور کرتے ہیں۔ ابھی تو ایک ہفتے کی چھٹی ہے میرے پاس۔''

نینسی نے چھٹی تو لے لی تھی لیکن اسے یہ فکر تھی کہیں ساس اسے دوبارہ کچن میں نہ رگڑ دیں انہیں اپنے لیے پکانا بھی نہایت ناگوار گزرتا تھا اور وہ کئی بار اس پر اسے باتیں سنا چکی تھیں۔ اسے بیڈ روم تک پہنچا کر وہ کہیں چلی گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد باہر کا دروازہ کھلا اور بڑی بی نے اس کے کمرے میں جھانکا۔ ''تم ٹھیک ہو نا...؟ لیٹی رہو میں تمہارے لیے سوپ تیار کر کے لا رہی ہوں۔''

نینسی کو ان کی بات سن کر چکر کو نہیں آیا لیکن وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھی۔ اس گھر میں آنے کے بعد بڑی بی نے پہلی بار کوئی کام کرنے کی بات کی تھی۔ ایک گھنٹے بعد وہ اس کے لیے بکرے کے گوشت اور مشروم کا گاڑھا سا سوپ بنا کر لے آئی تھیں۔ ''یہ پیو اس حالت میں یہ نہایت بہترین چیز ہے۔''

نینسی بکرے کا گوشت نہیں کھاتی تھی اور اسے مشروم سے بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے یہ گاڑھا سوپ دیکھ کر عجیب سا لگ رہا تھا لیکن جب بڑی بی کے اصرار پر اس نے چند چمچ لیے تو اسے اچھا لگا اور پھر وہ پورا پیالہ صاف کر گئی۔ اس کے بعد بڑی بی نے اسے دوا دی اور جب وہ لیٹ گئی تو انہوں نے اسے اطلاع دی۔ ''میں نے تمہارے پرس سے کچھ رقم نکالی ہے۔ میرے پاس جو رقم تھی وہ ڈاکٹر کی فیس اور دوائیاں لینے میں خرچ ہوگئی۔''

نینسی کا اچھا موڈ غارت ہوگیا اور اسے غصہ آ گیا۔ ''آپ مجھ سے کہہ سکتی تھیں، میں آپ کو دے دیتی۔''

''تم بے حال پڑی تھیں اس لیے نہیں پوچھا۔'' بڑی بی بھی دوبارہ اپنے اصل موڈ پر آ گئیں۔ ''صرف پچاس ڈالرز ہی تو لیے ہیں، سامان لے کر آئی ہوں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے برتن سنبھالے اور بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چلی گئیں۔ نینسی کو ندامت ہوئی کہ واقعی وہ اسی کے لیے تو سامان لائی تھیں اور اپنی رقم واپس تھوڑی مانگی تھی۔ کچھ دیر بعد اسے نیند آ گئی اور وہ سو گئی۔ شام کو اٹھی تو بڑی بی نے ایک بار پھر اسے سوپ دیا۔ ان کا موڈ ٹھیک تھا اور رہا سہا نینسی کی معذرت سے ٹھیک ہوگیا اور جب اس نے ڈاکٹر کی فیس اور دواؤں کی رقم دی تو وہ خوش ہوگئیں۔ رات کو انہوں نے اس کے لیے ایک خاص انداز میں ابالی مچھلی بنائی۔ یہ بھی سادہ سی تھی لیکن بہت مزے دار نکلی۔ بڑی بی نے اسے بتایا۔

''اگر ان دنوں میں اس طرح بنا کر مچھلی ہفتے میں ایک بار بھی کھائی جائے تو بچے کی ہڈیاں مضبوط ہوتی ہیں اور اسے ساری عمر جوڑوں کا مسئلہ نہیں ہوتا۔''

''مجھے بھی بتایئے کہ کیسے بناتے ہیں؟'' نینسی بولی۔ اسے بھی فکر لگ گئی تھی کہ اس کا بچہ مضبوط اور صحت مند ہو۔ پھر بڑی بی اسے سکھانے لگیں کہ ان دنوں میں کیا چیزیں کس طرح بنا کر کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اسے ٹھیک رہنے اور ممکنہ مشکلات سے نپٹنے کے گر بھی بتا رہی تھیں۔ ان کی بنائی چیزیں کھا کر اور بتائی ہوئی ترکیبوں پر عمل کر کے نینسی چار پانچ دن میں خود کو چاق و چوبند محسوس کرنے لگی تھی۔ ابتدائی کمزوری کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ورنہ پہلے دن تو اسے لگ رہا تھا کہ اس کے جسم میں جان ہی نہ ہو اور سر مستقل چکرا رہا تھا۔ اب وہ خود کو معمول سے بھی زیادہ بہتر محسوس کر رہی تھی۔ چھٹے دن اس نے بڑی بی کو بتایا۔

''جم کل آجائے گا اس نے کام سمیٹ لیا ہے اور یہ خوشخبری سن کر جلد آرہا ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' بڑی بی بولیں۔ ''میرے جانے کے بعد بھی تم خوراک اور دوسری بتائی گئی باتوں پر عمل کرتی رہنا، اس سے تمہیں بہت فائدہ ہوگا۔''

''سچ تو یہ ہے کہ مجھے ابھی سے بہت فائدہ ہو رہا ہے۔ میں اپنی پڑوسنوں کی حالت دیکھتی رہی ہوں ان دنوں وہ بہت پریشان بھی ہو جاتی ہیں کیونکہ ان کو کوئی گائڈ کرنے والا نہیں ہوتا ہے۔''

بڑی بی نے ناگواری سے کہا۔ ''ظاہر ہے کون گائڈ کرے گا جب ساسوں کو برداشت نہیں کرتی ہیں۔''

''آپ جانتی ہیں اس بارے میں؟'' نینسی کو حیرت ہوئی تھی۔

''کیونکہ آج کل روز ہی آتے جاتے ان سب سے ملاقات ہوتی ہے اور ان کا انداز ایسا ہوتا ہے جیسے میں کوئی ساس نہیں بلکہ عفریت ہوں اور یہاں سے جانے سے پہلے تمہیں کھا کر جاؤں گی۔''

''میں ان کی یہ غلط فہمی دور کر دوں گی۔'' نینسی نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''آپ یقیناً بہت اچھی ساس ہیں جو اس طرح مشکل وقت میں میرا خیال رکھ رہی ہیں اور میری رہنمائی کر رہی ہیں۔''

''ناممکن ہے۔'' بڑی بی نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ساسوں کے بارے میں بہوؤں کے آفاقی خیالات کبھی نہیں بدلیں گے۔''

نینسی کو خیال آیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ اس خدمت گزاری سے قطع نظر اس کے اپنے خیالات بھی مختلف نہیں تھے ساس کے بارے میں اور ایک ہفتے پہلے تک وہ خود کتنی بیزار ہو چکی تھی۔ ''ہر انسان کی فطرت مختلف ہوتی ہے اس میں کچھ اچھائیاں ہوتی ہیں تو کچھ برائیاں بھی ہوتی ہیں۔''

''انسان دوسروں میں صرف برائیاں دیکھتا ہے۔'' بڑی بی نے ایک اور سرد آہ بھری۔ ''اچھائیاں کسی کو نظر نہیں آتیں۔''

اس وقت نینسی نے محسوس کیا کہ بڑی بی کچھ اداس ہو رہی تھیں۔ انہوں نے رات کو بھی اس کے لیے بڑی شاندار ڈش بنائی۔ یہ ایک اٹالین ڈش تھی جس میں چاول کے ساتھ جھینگے ہوتے ہیں لیکن یہ جھینگا پلاؤ نہیں تھا۔ ان چھ دنوں میں نینسی نے بہت مزے کے اور اچھے کھانے کھائے تھے۔ بڑی بی یہ کر رہی تھیں کہ وہ جو پکاتی تھیں اس کی ترکیب ایک کاغذ پر لکھ کر فریج پر لگا دیتی تھیں تاکہ نینسی بعد میں خود پکا سکے۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی ڈائری تیار کی تھی جس میں اس کے لیے معمولات کی تفصیل لکھی تھی۔ اسے آنے والے دنوں کے لحاظ سے تیار کیا گیا تھا کہ کس مہینے کے دوران نینسی کو کیا کرنا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان دنوں ان کے وقت کا ایک ایک لمحہ نینسی کے لیے سوچتے اور کام کرتے ہوئے گزر رہا تھا۔

نینسی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی آرام طلب اور صرف کھانے پینے کی شوقین ساس اتنی گنی نکلیں گی۔ ان چھ دنوں میں وہ بالکل بدل گئی تھیں۔ انہیں اپنے کھانے پینے کا ذرا بھی خیال نہیں رہا تھا ان کا سارا ہی وقت نینسی کی دیکھ بھال میں گزرتا تھا۔ وہ اس کے لیے پکاتی تھیں اور خود بھی وہی کھا لیتی تھیں حالانکہ انہیں مرغن اور بھنی چیزوں سے دلچسپی تھی۔ مگر انہیں اپنے لیے کچھ بنانے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ کھانے کے علاوہ بھی وہ نینسی کا مکمل خیال رکھ رہی تھی۔ گھر کی دیکھ بھال بھی وہی کرتی تھی۔ حد یہ کہ ان دنوں اس کا کچن بھی خوب صاف ہو رہا تھا اگرچہ یہ ویسا تو نہیں تھا جیسا نینسی رکھتی تھیں لیکن پھر بھی پہلے کے مقابلے میں جب بڑی بی اسے گندا کر کے رکھتی تھیں، صاف ہی تھا۔ رات کے کھانے کے بعد نینسی ان کی ہدایت کے مطابق جلدی سونے کے لیے کمرے میں چلی آئی۔ بڑی بی صبح ناشتا بنانے کے لیے جلد بیدار ہو جاتی تھیں اور ناشتا تیار کر کے اسے بھی اٹھا دیتیں۔ لیکن اس صبح انہوں نے اسے نہیں اٹھایا تھا۔ بیدار ہو کر وہ باہر آئی تو بڑی بی اسے کہیں نظر نہیں آئی

تھیں۔ وہ ان کے کمرے میں آئی تو ان کا سامان بھی غائب تھا۔ البتہ کچن میں میز پر اس کا مکمل ناشتا تیار رکھا تھا اور ایک پلیٹ کے نیچے ایک کاغذ دبا ہوا تھا۔ نینسی نے اسے اٹھا کر دیکھا اس پر بڑی بی کی تحریر میں لکھا تھا۔ ''ڈیئر نینسی، مجھے اچانک ہی جانا پڑا ہے۔ تم سو رہی تھیں میں نے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اُمید ہے تم سے پھر ملاقات ہو گی۔ اپنا ڈھیر سارا خیال رکھنا، بہت سارے پیار کے ساتھ تمہاری.... ساس۔''

نینسی حیران رہ گئی۔ بہر حال اس نے اس بات پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی کیونکہ اس کی ساس آئی بھی اچانک ہی تھیں اس لیے اچانک ہی بتائے بغیر چلے جانا اتنا تعجب انگیز بھی نہیں تھا۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ کہیں وہ بیٹے سے بہ دستور ناراض تو نہیں تھیں اس لیے اس کا سامنا کرنے کی بجائے وہاں سے چلی گئیں۔ اسے بھوک لگ رہی تھی اور ابھی وہ ناشتا ہی کر رہی تھی کہ کال بیل بجی۔ وہ اس خیال سے تیزی سے دروازے پر آئی کہ شاید بڑی بی واپس آئی ہیں لیکن دروازہ کھلنے پر سامنے جم نظر آیا۔ وہ ایک لمحے کو حیران ہوئی پھر اس کے گلے لگ گئی۔ جم بہت خوش تھا۔

''تم نے سچ مچ مجھے سرپرائز دیا ہے۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا اڑ کر پہنچ جاؤں۔'' جم نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ''مجھے شام کو آنا تھا لیکن اتفاق سے ایک کلائنٹ نے میٹنگ ملتوی کر دی اور میں صبح والی فلائٹ سے آ گیا۔''

''تم نے ناشتا کیا؟''

''نہیں ابھی کروں گا۔'' جم کوٹ اتارتے ہوئے بولا۔ ''تم جانتی ہو طیارے میں مجھ سے کچھ کھایا پیا نہیں جاتا۔''

نینسی اپنا ناشتا چھوڑ کر اس کے لیے بنانے لگی۔ جب تک جم شاور لے کر آیا اس نے ناشتا میز پر لگا دیا تھا۔ ناشتے کے دوران جم کو اچانک خیال آیا۔ ''تم نے ایک سرپرائز کا اور بھی کہا تھا۔''

نینسی اسی سوال کی منتظر تھی۔ اس نے کہا۔ ''وہ سرپرائز تمہاری والدہ محترمہ تھیں لیکن آج وہ مجھے خود سرپرائز دے گئیں۔''

جم کے ہاتھ سے کانٹا چھوٹ گیا۔ ''کیا میری مام.... یہاں آئی تھیں؟''

''ہاں دو ہفتے رہ کر آج صبح ہی اچانک چلی گئی ہیں۔'' نینسی نے کہا اور پھر جم کو بتایا کہ کس طرح اس کی مام اچانک آ گئی تھیں اور انہوں نے ایک ہفتے تک اس کا جینا حرام کر کے رکھا تھا لیکن ایک ہفتے بعد جب اس کی طبیعت خراب ہوئی تو انہوں نے اس کا اتنا خیال رکھا کہ وہ حیران رہ گئی۔ انہوں نے اسے ایک بھی کام کرنے نہیں دیا۔ جم حیران پریشان سن رہا تھا۔

''ہاں مام ذرا سخت طبیعت کی ہیں۔ لیکن اگر کسی کو مدد کی ضرورت ہو تو وہ پھر پیچھے نہیں ہٹتی ہیں۔ آخر تک اس کے کام آتی ہیں اور تم تو ان کی بہو ہو لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی؟''

''وہ کیا؟''

''یہی کہ مام یہاں کیسے آ گئیں۔ وہ بہت ضدی ہیں اور جس سے ناراض ہو جائیں اس سے ان کا دل آسانی سے صاف نہیں ہوتا۔ جب تک میں معافی نہیں مانگتا وہ یہاں نہیں آتیں۔''

''ناراض تو وہ تم سے ہیں، مجھ سے نہیں، اس کے باوجود انہوں نے ایک ہفتے تک میرا وہ حال کیا جو میں لفظوں میں نہیں بتا سکتی۔ اس کے بعد اتنی اچھی ہو گئیں کہ میں اب تک حیران ہوں۔''

''مام ایسی ہی ہیں۔'' جم نے گہری سانس لی۔ ''بہر حال ان کا آنا یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ اب مجھ سے اتنی ناراض بھی نہیں ہیں۔''

''لیکن وہ اچانک اس طرح کیوں چلی گئیں؟''

''شاید کچھ ناراضی ابھی بھی باقی ہے۔ اسی کو ظاہر کرنے کے لیے وہ میرے آنے سے پہلے یہاں سے چلی گئیں۔''

''تب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' نینسی بولی۔ ''جم، میں چاہتی ہوں ان کی ناراضی ختم ہو جائے۔ دیکھو، تم نے خاندانی پیشہ اختیار نہیں کیا وہ اس بات سے ناراض ہیں لیکن اب اس بات کو بھی طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ میرا خیال ہے اب ان کی خفگی بھی بہت کم رہ گئی ہو گی۔''

جم نے سر ہلایا اور خاموشی سے ناشتا کرنے لگا لیکن اس بار اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نہیں تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ بھی سوچ رہا ہو کہ اب اسے ماں باپ سے مل لینا چاہیے۔ جم کو اس ٹرپ کے بعد دس دن کی چھٹی ملی تھی اور وہ کیونکہ آٹھ دن پہلے آ گیا تھا اس لیے چھٹی بڑھ کر پندرہ دن کی ہو گئی تھی۔ چند دن جم نے دوسرے معاملات نمٹانے میں گزارے تھے، اس دوران میں اس نے نینسی سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے پتا چلتا کہ وہ اپنے ماں باپ کے گھر جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس لیے ایک صبح جب اس نے

اچانک ہی نینسی سے کہا۔

''آج شام کی فلائٹ سے ہم ساؤتھ کیرولینا جا رہے ہیں۔''

نینسی چونکی۔ ''تمہارے مام کے گھر؟''

جم نے سر ہلایا۔ ''یہ تمہارے لیے سرپرائز تھا اور ان کے لیے بھی سرپرائز ہوگا۔''

''تم نے اچھا نہیں کیا، ابھی مجھے جلدی میں تیاری کرنی پڑے گی۔''

''اس کی تم فکر مت کرو، کل جب تم ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں تو میں نے تمہارا اور اپنا سارا سامان سوٹ کیس میں پیک کر دیا ہے۔ اب ہمیں صرف سوٹ کیس لینا ہے۔ دروازے کو لاک کرنا ہے اور ائرپورٹ روانہ ہو جانا ہے۔''

شام کو ایسا ہی ہوا، سب تیار تھا۔ وہ ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ جم خوش تھا لیکن نینسی اس سے زیادہ خوش تھی۔ اس کی عرصے سے خواہش تھی کہ اپنے سسرال والوں سے ملے۔ طیارہ دو گھنٹے بعد ساؤتھ کیرولینا کے دارالحکومت کولمبیا ائرپورٹ پر اترا اور یہاں سے جم کا آبائی گاؤں دو گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ اس نے ائرپورٹ سے ایک کار کرائے پر لے لی۔ وہ ایک ہفتے کے لیے آئے تھے اس لیے جم نے کار بھی ایک ہفتے کے لیے کرائے پر لی جب وہ واپس جاتے تو کار واپس کر جاتے۔ گاؤں شہر سے دور ایک سرسبز اور شاداب علاقے میں تھا۔ نینسی نے ایسے مناظر کم ہی دیکھے تھے۔ وہ خود جس علاقے میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی تھی وہاں دھول مٹی اور پتھر زیادہ نظر آتے تھے۔ اس لیے وہ بہت خوش تھی۔ دو گھنٹے بعد وہ قصبے میں داخل ہوئے جہاں آغاز میں ہی جم کے باپ جیری کولین کا خاندانی اسٹور تھا۔ وہ جم کو دیکھ کر خلافِ توقع بہت خوش ہوا تھا۔ اس نے بنا کسی شکوے شکایت کے جم کو گرم جوشی سے سینے سے لگایا پھر نینسی کو گلے سے لگا کر پیار کیا۔

''پہلے میں تم دونوں سے معذرت کر لوں کہ ہم جم کی شادی میں شریک نہیں ہوئے۔ اس وقت ہمیں بہت غصہ تھا لیکن اب ہمیں احساس ہو گیا ہے کہ ہم نے غلطی کی ہے۔''

''جی، مام کی باتوں سے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔'' نینسی نے کہا۔ ''لیکن جم سے اور مجھ سے بھی غلطی ہوئی، ہم چھوٹے ہیں اور ہمیں شادی کے بعد آپ کے پاس آنا چاہیے تھا۔''

جیری نے قہقہہ لگایا۔ ''اس کا مطلب ہے ساس بہو کی آپس میں بات ہو چکی ہے۔ چلو میں تمہارے ساتھ ہی گھر چلتا ہوں۔''

جیری ملازموں کو ہدایت دے کر ان کے ساتھ آ گیا۔ راستے میں نینسی نے سرگوشی میں جم سے کہا۔ ''لگتا ہے مام پاپا کو بتائے بغیر ہی ہمارے گھر آئی تھیں۔''

''ایسا ہو سکتا ہے۔'' جم نے جوابی سرگوشی کی۔ ''مام بہت سارے کام پاپا کو بتائے بغیر خاموشی سے کر لیتی ہیں۔''

چند منٹ بعد وہ قصبے کے دوسرے کنارے پر واقع جم کے آبائی گھر پر تھے۔ یہ خوب صورت اور آسمانی رنگ کا دو منزلہ گھر تھا۔ جیری ان کو لے کر اندر کی طرف بڑھا اور اس نے باہر سے اپنی بیوی کو آوازیں دینا شروع کر دی تھیں۔ ''میرل کہاں ہو، دیکھو کون آیا ہے؟''

وہ دروازے کے پاس پہنچے تھے کہ وہ کھلا اور ایک سفید بالوں اور کسی قدر سخت چہرے والی عورت باہر آئی۔ مگر جم کو دیکھتے ہی اس کے چہرے کی سختی نرمی میں بدل گئی اور اس نے ہاتھ پھیلا دیے تھے۔ وہ اس کے گلے جا لگا۔ نینسی دم بہ خود عورت کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ یہ وہ عورت تو نہیں تھی جو ساس بن کر اس کے گھر آئی تھی۔

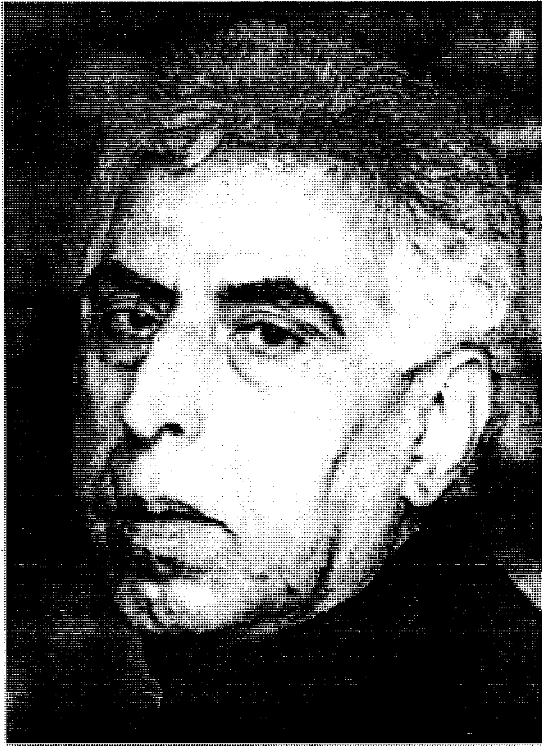
☆☆☆

کیتھی لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھتے ہوئے پاپ کارن کھا رہی تھی۔ اس کا شوہر جوزف ایک ٹرک ڈرائیور تھا اور لمبے ٹرپس پر جاتا تھا۔ اس کا ایک ٹرپ عام طور سے دس سے پندرہ دن کا ہوتا تھا۔ جوزف کل ہی روانہ ہوا تھا اور وہ آج سارا گھر صاف کر کے ابھی بیٹھی تھی کہ ڈور بیل بجی۔ وہ اٹھ کر دروازے تک آئی، اس نے کیٹ آئی سے باہر جھانکا۔ ایک بوڑھی عورت شانے پر ہینڈ کیری ٹانگے کھڑی تھی۔ کیتھی نے دروازہ کھولا تو اسے نیچے رکھا سوٹ کیس بھی دکھائی دیا تھا۔ بڑی بی اسے گھور رہی تھیں۔ کیتھی چند لمحے انہیں دیکھتی رہی پھر ہچکچا کر کہا۔ ''میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔''

''ہنو اب تم مجھے کہاں پہچانو گی۔'' وہ اسے ایک طرف کرتے ہوئے اندر آ گئیں اور سیدھی لاؤنج میں جا پہنچیں۔ کیتھی ان کے پیچھے پیچھے آئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ عورت کون ہے؟

''میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔''

''میں جوزف کی ایک خالہ ہوں۔'' بڑی بی نے کہا اور دل میں سوچا۔ ہر بار ساس بننا بھی مناسب نہیں ہوتا ہے۔



الفاظ بنے ہتھیار

سلمیٰ اعوان

ساحل سے سر دھنتی موجیں بہ زبان خاموشی پیام دیتیں کہ یہ وطن تمہارا ہے۔ تم ہی اسے بچا سکتے ہو۔ عوام، مظلوم عوام صرف ایک بھیڑ ہے، ایک ایسا گلہ ہے جس کی رہنمائی تمہیں کرنا ہے کیونکہ عوام کی اپنی کوئی سوچ نہیں ہوتی۔ انہیں سوچ دینے کی ذمے داری تمہاری ہے۔ بس اس نے قلم سنبھال لیا۔ اشعار کے خنجر سے اس نے سیاست کا پوسٹ مارٹم شروع کردیا اور حکومت بڑی قوتوں کے دباؤ میں آگئی۔

ایک باغی شاعر کے شب و روز کا تذکرہ

سعدی یوسف سے میرا بھرپور تعارف کروانے میں ایک کردار قدیم بغداد کے اُن قہوہ خانوں میں منعقدہ ادبی محفلوں اور شاعروں کا بھی ہے جو میرے لاہور کی ہی طرح ادبی بیٹھکوں، گھروں اور کیفوں میں ادبی نشستوں اور مشاعروں کی صورت نئے اور پرانے شُعرا کے اوپر بحث و مباحثے کے لیے اور کبھی اُن کا کلام اور مفہوم سمجھنے کے لیے منعقد ہوتی رہتی ہیں۔

بغداد میں میری بھی چند شامیں اسی سرگرمی کی نذر

ہوئیں۔ بلا سے مجھے سمجھ نہ آتی مگر میرا ٹیکسی ڈرائیور انگریزی میں مجھے بتاتا اور سمجھاتا۔ بہت ساری مدد انگریزی جاننے والے ادیبوں نے بھی کی۔

مگر ہاں رُکیے ذرا۔ چند اہم یادیں بھی یادداشتوں کی گٹھڑی سے باہر نکل آئی ہیں۔ واقعات کے تناظر میں اگر دیکھوں تو کہہ لیجیے کہ یہی پہلی پہلی ملاقات تھی اور تب ہوئی تھی جب ذہنی بلوغت ابھی غیر ملکی کلاسیکل اور جدید ادب کی رنگا رنگیوں کی دنیا میں داخلے سے گھبراتی تھی۔ ماحول اور ناموں کی نامانوسیت ہی مطالعے کے تسلسل میں روڑے اٹکاتی تھی۔ میری توجہ اور یکسوئی بہت جلد اس کی نئی نئی جہتوں کے کشادہ میدانوں میں گھومنے پھرنے اور لطف اٹھانے سے اُکتا جاتی تھی۔

یہ بیسویں صدی کی ساٹھ کی دہائی کے درمیانی سال تھے اور میں کچے پکے سے دو ناول لکھ چکی تھی۔

یہی وہ دن تھے جب میرا وہ رشتے کا ماموں ہم سے ملنے آیا۔ میں نے شوق و اشتیاق کی بلندیوں سے اس بے حد دلچسپ کردار کو دیکھا تھا جو کبھی کبھار گھر کی بزرگ عورتوں کا موضوع بنا رہتا تھا، جو بڑے شاعرانہ سے مزاج کا آوارہ گرد اور من موجی سا بندہ تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں اپنی مرضی سے فوج میں بھرتی ہو کر مصر کے محاذ پر جا پہنچا۔ مدتوں تو کچھ پتا ہی نہ چلا تھا کہ زندوں میں بھی ہے یا مارا گیا۔

درمیان میں ہوا کے کسی معطر جھونکے کی مانند آیا اور بس اپنی باتوں کی خوشبو کہیں مصر، کہیں شام اور کہیں عراق کے حوالوں سے اِدھر اُدھر بکھیر کر چلا گیا۔ چاہتے ہوئے بھی میں نے کچھ زیادہ باتیں نہ کیں کہ تہی دامنی کا احساس تھا۔ یوں میری بڑی آئیڈیل شخصیت تھی۔ رشک سے سوچتی۔

''ہائے کتنا خوش قسمت ہے۔ کسی پنچھی، کسی پکھیرو، کسی بنجارے کی طرح زندگی گزارنے والا۔ گھومنے پھرنے کے جراثیم تو میرے اندر بھی بڑی وافر مقدار میں تھے۔

پھر کچھ سالوں کے بعد اُن کی مستقل واپسی کا سُن کر میں خود انہیں ملنے گئی۔ مشرق وسطیٰ کے ملکوں سے میری دلچسپی بہت بڑھ گئی تھی۔ سعدی یوسف سے میرا پہلا کچھ گیلا، کچھ سُوکھا تعارف اُنہی کے توسط سے ہوا۔

چھوٹتے ہی جو بات زبان سے نکلی وہ تھی کہ سیرتاً اتنا پیارا انسان کہ جتنا جھوٹ بول لو۔ ہاں صورت کا بھی بڑا وجیہہ ہے۔ شاعر بھی کمال کا، اپنے نظریات میں پکا اور جیالا، جی دار بھی انتہا کا۔ پھر بہت سی چھوٹی چھوٹی تفصیلات بیان ہونے لگیں۔ جانا کہ Without an alphabat. Without a face اُن کی منتخب نظموں کا مجموعہ ہے۔ اسی میں سے ایک نظم انہوں نے پڑھی۔

بہت سا وقت گزرا تو معلوم ہوا
ابن تیمیہ
جیلوں کے ٹارچنگ سیل کا نگران بن گیا ہے
اور وہ الموافق
غلاموں کی بغاوت کچلنے میں مصروف ہے
دمشق کی پولیس
عراقی پولیس
عرب امریکی پولیس
ایرانی اور عثمانی پولیس
ہم پر کتنا ظلم کرتی ہے
ہمارے معصوم اور بے ضرر سے لوگ
اُن کی خطا
تو آؤ وہ کریں جو کرنے کو
ہمارا دل چاہے

ساتھ ہی انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ جانتی ہو نظم میں یہ دو حوالے ابن تیمیہ اور الموافق کون ہیں؟

گو پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔ میں پڑھنے کی شوقین اب دنیا کے ادب کو پڑھنے اور اس سے لطف اٹھانے لگی تھی اور خود کو خیر سے خاصی عالم فاضل چیز سمجھتے ہوئے بڑا اعتماد بھی تھا۔ مگر اُن کے سوال پر قیں ہو گئی تھی۔ ہنستے ہوئے انہوں نے بتایا۔

ابن تیمیہ حنبلی فقہ کا ایک بڑا پیروکار تھا۔ امام حنبل چاروں فقہی اماموں میں سے سب سے زیادہ سخت اور متشدد نظریات کے حامل تھے۔ اور الموافق خلیفہ المتوکل کا بیٹا جو بڑا ہی ظالم اور جابر سپہ سالار تھا۔ جس نے جنوبی عراق کے دلدلی علاقوں جو آہواز Al-Ahwaz ضلع کے قصبات تھے میں زنجی قبائل کے غلام لوگوں کی بغاوت کو بڑی سختی سے کچلا تھا۔ یہ زمانہ کوئی نویں صدی کا اختتامی تھی۔ یعنی 869 سے 881 تک کا وقت۔

اور وہ سعدی یوسف کیا بات ہے اُس جوان کی۔

میں نے محسوس کیا تھا میرے رشید ماموں کے اندر سے جیسے محبت کے سوتے اُبل پڑے ہوں۔

''اس کے اندر تو گویا کوئی پارہ بھرا ہوا ہے۔ چھوٹی سی عمر سے ہی شاعری، سیاست اور سامراجی رویوں کی مخالفت

اس نے اپنا نصب العین بنالیا ہے۔"

اب خلیفہ اور سیدون اسٹریٹ کے قہوہ خانوں میں اِن انقلابی شاعروں کی بیٹھک کی جو تفصیلات تھیں انہوں نے تو مجھ جیسی سیلانی عورت کے اندر طوفان اٹھا دیئے۔

میرے اشتیاق بھرے سوالات کی ماموں سے ایک لام ڈور تھی کہ وہ بھی وہاں جایا کرتے تھے۔

"ارے وہ سب میرے لنگوٹیے یار تھے۔ سعدی یوسف تو میرا بڑا دلارا سا دوست ہے۔ میں تو خود عربی میں شاعری کرتا ہوں۔

اب جو منظر کشی کی تفصیل بیان ہوئی اس نے کیا لطف دیا؟ قہوے کی چسکیاں، سگریٹ کے مرغولے کے دھوئیں میں سعدی یوسف کی شعلہ بار نظم۔ واہ وا کا سماں ابھی بندھا ہی ہے کہ پولیس کا چھاپہ پڑ گیا۔ اب بغداد کے پرانے محلوں کی پیچ در پیچ گلیوں میں بھاگتے پھرتے۔ کہیں پولیس سے دو دو ہاتھ کرتے۔ کہیں اس کی مار پیٹ کا نشانہ بنتے۔

وہ جمال عبدالناصر کا عاشق تھا۔ ارے وہ کیا ہم تو سبھی اس کے دیوانے تھے۔ پرانے بغداد کی گلیوں میں بھاگتے تو اس کے نام کے نعروں سے گلی کوچے گونج اٹھتے۔ وہ ہمارا محبوب جو تھا۔ سعدی حکام کی نظروں میں بہت کھٹکنے لگا تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی بھی کیا شے تھے۔ بھاگتے پھرتے کبھی دمشق، کبھی قاہرہ۔

عراق جمہوریہ بنا۔ پر کہاں استقامت تھی اس ملک کے مقدر میں؟ عبدالکریم قاسمی کا زمانہ، بغاوتوں سازشوں کے وار کیمونسٹ پارٹی میں شامل دھواں دھار تقریریں کرتے اور لوگوں کو اُکساتے۔ شاعر نوجوانوں کا کام انقلابی نظمیں پڑھنا اور چھپتے بھاگتے پھرنا تھا۔ وہ بہت چھوٹی عمر سے ہی سامراجی رویوں کا مخالف اور ترقی پسند نظریات کا پیروکار ہو کر سیاست کی وادیٔ پُر خار میں اُلجھ گیا تھا۔

عراق داخلی کشمکش کا خونین انداز میں اظہار کر رہا تھا۔ صدام بائیں بازو کے ترقی پسندوں کا بیج مار دینا چاہتا تھا۔ ترقی پسند بھی سرکشی اور بغاوت کی انتہاؤں پر پہنچے ہوئے تھے۔ عراق کے شاعروں اور ادیبوں نے جھکنے اور مفاہمت کے الفاظ اپنی لغت سے خارج کر دیئے تھے۔ اقتدار پر قابض ہونے کے بعد صدام کا فیصلہ تھا کہ وہ بائیں بازو کی قیادت کا خاتمہ کر دے گا۔

سعدی یوسف تو بڑی انقلابی نظمیں لکھ رہا تھا وہ راستہ کیسے بدل سکتا تھا؟ بغداد کو خیر باد کہا۔ اور پھر اُسے دوبارہ بغداد اور بصرہ آنا نصیب نہ ہوا۔ اپنے بارے میں اُس نے ایک بار لکھا تھا کہ میں دنیا کا شہری ہوں مگر میری کوئی سرزمین نہیں۔

پھر ان کا لہجہ افسردگی کی تہوں میں جیسے دھنس گیا تھا جب انہوں نے کہا۔

سعدی تو اب بیروت میں ہے۔ وہ بغداد سے عراق سے چلا گیا۔ اس کے ساتھی کچھ بھاگ گئے اور کچھ مارے گئے۔ اچھا ہوا وہ بھی چلا گیا نہ جاتا تو صدام کے ہاتھوں مارا جاتا۔

انہوں نے اُن کی ایک اور نظم گنگنائی۔ یہ عربی میں تھی جس کا مطلب انہوں نے سمجھایا۔ عنوان تھا۔ "پرندے کی آخری پرواز"

اگر تم چاہتے ہو
تو یاد رکھو
کہ میرے پر پانی میں ہیں
پر کہیں لہروں کے بغیر پانی ہوتا ہے
اور ساحل کے بغیر لہریں کب ہوتی ہیں
میں یہاں آرام کرتا ہوں
مطمئن سا
خوش و خرم سا
میں آخری ساحل پر پہنچ چکا ہوں
چلاؤ نہیں
میری تو سانسوں کی آواز بھی مجھ تک نہیں پہنچتی

وہ دن میرے چند خوبصورت دنوں میں سے ایک تھا کہ میرے سامنے میری خوابوں کی دنیا کے کچھ منظر آئے تھے۔ شام اور بغداد میرے خوابوں کی سرزمین ہی تو تھی۔

سعدی یوسف وقت کی تیز رفتاری، غم روزگار کی بھول بھلیوں میں کہیں گم ہو کر یادوں کے اُس صندوقچے میں بند ہو گیا تھا جو کبھی کبھی ہی کھلتا ہے۔

سالوں کے بعد ایک جھٹکے سے کُھلا۔ یہ نوّے کی دہائی کا آغاز تھا۔ ایک خاتون دو چھوٹی بچیوں کے ساتھ میرے اسکول آفس میں داخل ہوئی۔ تعارف نے بتایا کہ چھ فٹی قامت کی چھوٹی خاتون کویت پر صدام کے حملے سے متاثر لوگوں کی طرح بھاگی ہے۔ خود وہ سکھ، شوہر پاکستانی۔ جائے پناہ سُسرال تھی جو اعوان ٹاؤن میں ہی رہائش پذیر تھی۔ وہ اپنی دو بچیوں کے داخلے کے لیے آئی تھی۔

ایک کربناک داستان سُننے کو ملی تھی۔ بستے رستے خوش و

تم لوگ کیسے اچانک گھر بار چھوڑ کر بھاگے۔ پناہ گزینی کا دکھ جیسے پور پور سے عیاں ہوتا تھا۔

زہرت اظہر خاتون نے اپنا اسلامی نام یہی بتایا تھا کہ آنکھوں میں آنسو جھلملاتے جنہیں وہ تھوڑی دیر بعد صاف کرتی۔ کویت کے محکمہ صحت میں اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ میں اچھی ملازمت پر تھی۔ عربی پر بہت عبور تھا۔ انگریزی میں شاعری بھی کرتی تھی۔

اُس کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک مشرق وسطیٰ کی سیاست کے اِس اُتار چڑھاؤ کے پیچ وخم میں الجھی رہی۔ ماموں رشید یاد آئے تھے۔ عراق کی سیاست پر اُن کی باتیں اور تجزیئے یاد آئے تھے۔ بڑے دوٹوک لہجے میں انہوں نے کہا تھا۔

"دیکھنا صدام ایک دن کویت پر قبضہ کرلے گا۔ کویت کی ایک آزاد خودمختار ملک کے طور پر موجودگی عراق کے کسی بھی حکمران سے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ کویت تو سو فیصد عراقی شہر بصرے کا حصّہ ہے۔ ہر عراقی کی یہی سوچ ہے۔ دراصل کویت تو اِن بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں بنا۔ کویتی شیخوں کی دولت سے برطانیہ کے بینک کالے ہوئے پڑے ہیں۔ ایک دن کوئی نہ کوئی دھماکا ضرور ہوگا دیکھ لینا۔

اور وہ دھماکا تو ہو گیا تھا۔

زہرت کے لیے یہ وقت بڑا کٹھن تھا۔ خود مختار عورت روایتی سسرال کی سختیوں، زرمیوں کے مزے چکھ رہی تھی۔ کچھ وقت بعد کویت کو آزاد کرالیا گیا۔ زہرت کا شوہر چلا گیا اور وہ انتظار میں دن کاٹنے لگی کہ کب وہ اُسے آنے کا اذن دے۔ ایک طویل انتظار بعد اِس کے اِس دکھ بھرے دورانیے کا وقت تمام ہوا اور وہ واپس جانے کے لیے بچیوں کے سرٹیفکیٹ لینے آئی۔ ساتھ ہی اس نے مجھے ایک کیسٹ دی یہ بتاتے ہوئے کہ یہ عراق کے ایک بڑے انقلابی شاعر کا کلام ہے جو صدام کے خوف سے جلاوطن ہے۔ اس کے کلام کی یہ کیسٹ اظہر کے ایک گہرے عربی دوست نے دی تھی جو اس شاعر کا بہت بڑا عاشق ہے۔ اظہر اسے پھینک دینا چاہتا تھا مگر اتفاقاً وہ ان کے سامان میں آگئی۔ میں اِسے آپ کو دینے کے لیے لے آئی ہوں۔ سچی بات ہے ہمیں تو عراق سے رتی برابر ہمدردی نہیں۔

اور یہ جلاوطن شاعر سعدی یوسف تھا۔ اور یہ اس کی شہرہ آفاق نظم "امریکا امریکا" تھی۔

خدا امریکا کو محفوظ رکھے
میرا گھر، میری جنت
جینز، جاز، خزانوں کے جزیرے
جان سلور کے طوطے اور نیواور لینز New or
Leans کی بالکونیاں
اُن سے بے پایاں محبت مجھے بھی ہے
مارک ٹوئن، مسیسپی کی دخانی کشتیوں
ابراہم لنکن کے کتوں اور ورجینا تمباکو
اُن سے بڑا ہی پیار ہے مجھے
لیکن میں امریکی نہیں
پینٹم Phantom پائلٹ کے لیے اتنا ہی کافی ہے
کہ دھکیل دے پتھر کے زمانوں میں مجھے
تیل کی ضرورت نہیں، نہ ہی امریکا کی
نہ ہاتھیوں اور نہ ہی گھوڑے گدھوں کی
پائلٹ! میرے گھاس پھونس کی چھت والے گھر
چوبی پل اور مجھ سمیت سب کو چھوڑ دو
تمہارے گولڈن گیٹ اور تمہاری فلک بوس عمارتیں
اُن کی ضرورت کب ہے مجھے
اپنا گاؤں چاہیے، تمہارا نیویارک نہیں
تم مسلح سپاہی اپنے نویدا صحرا سے کیوں آئے
تم لوگ اتنی دور سے بصرہ کیا کرنے آئے
ہمارے گھر دروازوں پر مچھلیاں تیرتی ہیں
یہاں سور چارے کی تلاش میں نہیں پھرتے ہیں
میری بید کی چھڑی، جھونپڑی اور ڈوری کانٹا
چھوڑو سب اور چھوڑو مجھے بھی
اپنے اسمگل شدہ سگریٹ لے لو
ہمارے آلو ہمیں واپس کردو
اپنی مشنری کی کتابیں لے لو
اور اپنے کاغذ ہمیں دے دو
کہ ہم تمہیں بدنام کرنے کے لیے نظمیں لکھیں
اپنے جھنڈے کی پٹیاں لے لو
اور ہمیں ستارے دے دو
افغان مجاہدین کی داڑھیاں لے لو
اور ہمیں والٹ وٹ مین کی
تتلیوں سے بھری داڑھی دے دو
صدام حسین کو لے لو
اور ہمیں ابراہم لنکن دے دو
اُسے نہیں دینا چاہتے

تو پھر کچھ بھی نہ دو
امریکا ہم یرغمالی تو نہیں
اور
تمہارے سپاہی کوئی خدائی خدمتگار نہیں
ہم غریب ہیں مگر ہماری
دھرتی غرقاب دیوتاؤں کی ہے
نڈر ساتھ دیوتاؤں کی
آگ دیوتاؤں کی
غم کے دیوتاؤں کی
جو خون اور مٹی کے ملاپ سے
نغمے تخلیق کرتے ہیں
ہم غریب ہیں
ہمارا خدا بھی غریبوں کا خدا ہے

یہ نظم نمائندہ تھی اُن مظلوم، لاچار اور بے بس عراقی لوگوں کے جذبات و احساسات کی۔ جن پر امریکا اور اس کی لونڈی اقوام متحدہ نے زندگی کی بنیادی سہولتوں کی کھلی فراہمی پر پابندیاں لگادی تھیں۔

یہ بہت لمبی نظم تھی۔ میں تو دم بخود تھی۔ ساکت تھی۔ شاعر کی جی داری اور جرأت رندانہ پر حیران تھی۔ امریکا تو پھبتی پھبتی ہو کے فضا میں بکھرا پڑا تھا۔ شاعر نے کچھ بھی تو نہیں چھوڑا تھا۔ اپنے دل و جگر کا سارا درد باہر انڈیل دیا تھا۔ قاری کو آنسو بہانے پر نہیں اُسے بھی اسی درد میں مبتلا کر دیا تھا۔

اور یہی وہ شناسائیاں تھیں۔ دل میں اُترنے کی کاوشیں جنہیں میرے دل و دماغ کے ایک ایک خلیے نے محبت بھری پذیرائی دے کر اس کی میزبانی قبول کی تھی۔

پھر ایک تعلق استوار ہو گیا۔ محبت کا، پیار اور احترام کا۔ جلاوطنی کا کرب گویا ذاتی کرب سا محسوس ہوتا تھا۔ ایک بار کسی ادبی پرچے میں ایک نظم پڑھنے کو ملی۔ اُسے پڑھ کر لطف اٹھایا۔ محبت کی تجدید ہوئی اور اُسے میں نے کسی اثاثے کی طرح سنبھال بھی لیا۔ آپ بھی ذرا لطف اٹھائیں۔ "عورت" کے عنوان سے لکھی ہوئی یہ نظم جذبات کی کیسی عکاس ہے۔

اس کی یادوں سے میں خود کو کیسے نکالوں گا
میں اُسے کس زمین پر دیکھوں گا
اور کس شہر کی کس گلی میں
کیا میں کسی سے اُس کے بارے پوچھوں گا
اور اگر
کہیں مجھے اُس کا گھر مل جائے
کیا میں اطلاعی گھنٹی بجاؤں گا
کون ہے؟
میں کیا جواب دوں گا
اس کا چہرہ میں کیسے دیکھوں گا
اس کی انگلیوں کے درمیان سے
رستے ہوئے وائن جیسے لطیف سرور سے سرشار
کیسے اُسے ہیلو کہوں گا
اور کیسے اُن سب سالوں کا
دکھ برداشت کروں گا
ایک بار
بیس سال پہلے
ایک ائرکنڈیشن گاڑی میں
میں نے اُسے رات بھر چوما تھا

بہتے وقت کا دھارا بھی کیسا ظالم ہے بہتا چلا جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک دن فرخ سہیل گوئندی اور اس کی لبنانی بیوی ریما گوئندی سے ملاقات ہوئی۔ فرخ سے میرا ممتا بھرا رشتہ ہے۔ ریما کے پاس سعدی یوسف کی منتخب نظموں کا مجموعہ without an alphabt, without a face انگریزی میں ترجمہ شدہ دیکھی تو ایک دن کے وعدہ پر لی اور اس کے کچھ حصے فوٹو کاپی کروائے۔

تعارف میں بھی کچھ کردار اِس کتاب نے اور کچھ ماموں رشید کی باتوں نے ادا کیا۔

عرب دنیا کا چنیدہ اور جدید لہجے میں بات کرنے والا شاعر جس نے کبھی خود کو بڑا نہیں سمجھا ہمیشہ ہی نزار قبانی کی شاعرانہ عظمت کا مداح رہا۔ 1934 میں بصرے کے قریب ابوالخصیب نامی گاؤں میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم وہیں بصرے سے حاصل کی۔ عربی میں ڈگری بغداد یونیورسٹی سے لی۔ شاعری تو چھوٹی عمر سے شروع ہو گئی۔ آزاد نثر میں اظہار خیال جو نئی نوجوان نسل کی ایک اپنی اختراع تھی اور جس نے مروجہ روایاتی شاعری کو پیچھے دھکیل کر عربی شاعری میں ایک نئے رنگ و آہنگ کا آغاز کیا تھا۔ سعدی نے بہت جلد اپنی انفرادیت قائم کر لی تھی۔

وہ ایک شاعر ہی نہیں تھا۔ بہت اچھا نثر نگار بھی تھا۔ جرنلسٹ رہا۔ پبلیشر بنا اور سیاسی کارکن کے طور پر بھی کام کیا۔ عراق ہمیشہ سے اپنے آپ پر نازاں ملک رہا ہے۔ عرب

دنیا کے مشہور شہروں کے بارے میں ایک روایت ہے۔ Cairo writer, Beirut publishes and Baghdad reads۔ اور واقعی بغداد اِس پر پورا اترتا ہے۔ پڑھنے کا شوقین، کتابوں کا شیدائی اور یہی احساس فخر اس کے شاعروں، ادیبوں اور آرٹسٹوں میں نظر آتا ہے۔ آغاز میں سعدی بدر شاکر السیاب اور عبدالوہاب البیتی کی آزاد شاعری سے متاثر ہوا پھر آہستہ آہستہ ان کے اثر سے نکلتا گیا۔

سعدی یوسف اُس ماڈرن عراقی شاعری کا ایک حصّہ بنا جو اس وقت جماعت jam'a at al Ruwwad کے نام سے جانی جاتی تھی۔

سعدی یوسف کی شاعری اپنے ملک کی کہانی کو ناقابل یقین حد تک سچائی کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ یہ شاعری اپنا تعلق قدیم میسوپوٹیمیا کی تہذیبی زندگی سے جوڑتے ہوئے آگے بڑھتی ہے اور عراق کے جدید نظریات سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ اُسے اِس سرزمین پر پھیلی ہوئی غربت، شخصی حکومت اور جنگیں پریشان کرتی ہیں۔ یہاں اُس کی دو ایسی نظمیں ہیں پہلی ''مایوسی'' اور دوسری ''وژن'' کہ جنہوں نے مجھے افسردہ نہیں حد درجہ ملول کیا۔ ان نظموں میں دلی جذبات نے جس انداز میں نوحہ گری کی وہ رلاتی ہے۔

وہ ملک جو ہمارا تھا
وہ ختم ہوگیا
اپنی پیدائش سے پہلے ہی
وہ ملک جسے ہم پسند نہیں کرتے
اس کا دعویٰ ہے
کہ خون ابھی بھی ہماری رگوں میں باقی ہے
یہ عراق اب قبرستان کے کناروں پر ہی پہنچے گا
یہ اپنے بیٹوں کی قبروں سے ملک بھر دے گا
نسلوں کے بعد
نسلیں
شاید اپنے جابر حکمران کو معاف کردیں
مگر یہ وہ عراق تو نہیں ہوگا
کہ جس کا نام بھی عراق تھا

پھر وہ ہوا جو طاقت اور تکبّر کے نشے میں مست قومیں ہمیشہ سے کرتی چلی آئی ہیں۔ امریکا اور برطانیہ نے عراق پر حملہ کردیا تھا۔

میرے شب و روز اِس بربریت اور المناک سانحے پر ماتم کناں تھے تو ایسے میں رونے کے لیے کاندھا تو ہمدرد کا ہی ہوتا ہے۔ میں بھی اپنے ماموں رشید کے پاس بھاگی تھی۔ وہ لاہور میں تھے پر اُن کا دل جیسے بغداد کے گلی کوچوں میں بھٹکتا تھا۔ سعدی یوسف سے چند دن پہلے اُن کی بات ہوئی تھی وہ لندن کے مضافات اوکسبرج میں رہ رہے تھے۔

ہم نے کوئی ایک گھنٹا بات کی۔ اس کی قلبی کیفیات کا اظہار اس کے ضبط کے باوجود اس کے لب و لہجے سے چھلک چھلک پڑتا تھا۔

وہ جو امن کا بھوکا تھا۔ اپنے وطن کے لیے کسی مضطرب روح کی طرح تڑپتا تھا۔ اِن قیامت خیز لمحوں میں کسی اسیر پرندے کی مانند پھڑکتا تھا۔ صدام کے تو خیر وہ روزِ اوّل سے ہی مخالف تھا۔ مگر اس سانحے کی تو اُسے اُمید ہی نہیں تھی۔

کیسے یاس بھرے لہجے میں کہتا تھا۔

''ہم تو انہیں نکال کر بہت خوش تھے۔ ہم احمق تو جانتے ہی نہ تھے کہ وہ تو گھات لگائے بیٹھے تھے کہ کب پھر موقع ملے اور ہمارے اوپر چڑھ دوڑیں۔''

ٹی وی پر تباہی کے مناظر اور نیشنل میوزیم کی بربادی پر اس کی دل گرفتگی شدید تھی۔ صدام کے انجام سے وہ اگرچہ بہت خوش تھا مگر معصوم عراقیوں کی تباہی پر دکھی اور غمگین تھا۔ سامراجیوں کی اجارہ داری پر، اینگلو امریکی سیاست دانوں کے جھوٹ اور دھوکے پر مبنی بیانات اور مغربی میڈیا کی جھوٹی رپوٹوں کے پلندوں پر مشتعل بھی بہت تھا۔

اُسے دکھ بھرے جذبات کی اِس منجدھار سے نکالنے کے لیے میں نے اُس کے سامنے امید کی شمع جلائی اور کہا۔

''سعدی تم کڑھنے اور لکھنے کے سوا کیا کرسکتے ہو؟ یہ سوچو یہ صورت عراق کے لیے بہتر بھی ہوسکتی ہے۔ تم انشاءاللہ وطن جاؤ گے۔ بصرہ جاؤ گے۔''

وہ ہنسا۔ میں نے محسوس کیا تھا۔ اس کی ہنسی بڑی مصنوعی اور کھوکھلی سی ہے۔ تاہم میں نے یہ بھی جانا کہ انسان کتنا ہی بڑا دانشور، کتنا ہی بڑا لکھنے والا کیوں نہ بن جائے کہیں وہ کچھ سراب امیدوں کے سہارے بھی ڈھونڈتا ہے۔

''دیکھو نا۔ ماموں نے میری طرف دیکھا تھا۔ یہ کیسی بدقسمتی ہے کہ آپ اپنے وطن نہ جاسکیں۔ صدی کا چوتھائی حصہ یعنی پورے پچیس سال ہوتے ہیں وہ عراق نہیں گیا۔ اس نے بغداد نہیں دیکھا۔ وہ بصرہ نہیں گیا۔ بصرہ جہاں اس نے جنم لیا، جہاں اس کا بچپن گزرا، جہاں اس کا خاندان ہے، جہاں اس کی ماں جیسی بڑی بہنیں اس کی راہ تکتی ہیں۔ اس کا گھر

امت الجواری بھی ابھی تک دمشق میں ہی ہے۔

ہاں ماموں نے جب یہ کہا کہ اب جب صدام اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے تو اس کی واپسی کا امکان بھی بڑا روشن ہے۔

چلو میں نے تھوڑی سی خوشی محسوس کی۔

میں سالوں تک یہ نہ جان سکی کہ انہیں اپنے وطن جانا نصیب ہوا یا نہیں۔ میرے رشید ماموں فوت ہو گئے تھے۔ اگست 2003ء میں اُن پر دل کا دورہ پڑا تھا۔ اور سچی بات ہے میری زندگی میں اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ ستم ہائے روزگار نے ذرا سی فراغت دی تو دل عراق جانے کے لیے مچلنے لگا۔

سعدی یوسف کے وطن عراق۔ اپنے خوابوں کے شہر بغداد کو دیکھنے کی کتنی آرزو تھی۔ معلوم نہیں ظالموں نے اُس کا کیا حشر کیا تھا۔

انہی دنوں 2006 کے لگ بھگ جب میں بغداد کے لیے کسی ساتھی خاتون کی تلاش میں تھی۔ پاکستان کے خوبصورت شاعر شہزاد نیئر نے مجھے طارق علی کی کتاب Bush in Babylon پڑھنے کو دی۔ کتاب کے مطالعہ نے مجھے بتایا کہ شاعر تو اپنے وطن جا ہی نہیں سکا کہ نئے آقاؤں کے گماشتوں نے اُسے بین کروا دیا تھا۔

لندن میں اپنے گھر میں بیٹھے جب وہ ٹی وی پر لندن کے ہی ایک ہوٹل میں عراقی غداروں اور عراقی سامراجی پٹھوؤں کو نئی گورننگ باڈی میں میٹنگ کرتے دیکھتے ہیں تو حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ اُن کے تصور میں ایکا ایکی وہ منظر ابھرتا ہے جو اُن کے بصرہ اور اس کے مضافات میں گرمیوں کی راتوں میں کھلے آسمان تلے سوتے معصوم دیہاتیوں کی نیند خراب کرنے گیدڑوں کے ریوڑ آتے تھے۔ یہ کچھ غل غپاڑہ مچاتے، کچھ لڑتے جھگڑتے، کچھ جاگنے والے کسی دیہاتی سے اینٹ روڑا کھاتے تھے۔ تو یہ منظر بھی بعینہٖ ویسا ہی تھا۔ وہ اپنے گہرے دوست مظفر النواب کو مخاطب کرتے ہیں۔

او مظفر النواب! میرے عزیز دوست۔
''اس گیدڑوں کی بارات کا کیا کریں۔''
تمہیں یاد ہیں وہ پرانے دن
شام کی لطیف سی ٹھنڈک میں
بانس کی چھت تلے روئی سے بھرے تکیوں سے ٹیک
لگائے
قہوے کی چسکیاں
دوستوں کے جمگھٹے میں
رات کتنی نرمی سے ڈھلتی چلی جاتی ہے
جیسے زبان سے نکلے الفاظ
مٹی سے دھوئیں کے مرغولے اٹھتے ہیں
تب
لمبی گھاس اور کھجور کے درختوں کے عقب سے شور آتا
ہے
گیدڑوں کی بارات
او مظفر النواب
آج کیا گزرا ہوا کل ہے
سچ یہ ہے کہ ہم اِن گیدڑوں کی دعوت ولیمہ میں آئے
ہیں
ان کا دعوت نامہ پڑھا ہے
آؤ اک معاہدہ کرتے ہیں
تمہاری جگہ اِن سے ملنے میں جاؤں گا
میں اِن گیدڑوں کے منہ پر تھوکوں گا
میں اِن فہرستوں پر تھوکوں گا
میں انہیں بتاؤں گا
ہم اہلِ عراق
ہم جو اس دھرتی کی تاریخ کے وارث ہیں
ہمیں اپنی بانس کی معمولی چھت پر فخر ہے

یہ نظم تو منٹوں میں بغداد اور بصرہ پہنچ گئی تھی۔ عراق کے گاؤں گاؤں گھومی۔ سعدی یوسف پر لعن طعن کی بوچھاڑ برسنے لگی۔ دھمکیاں ملنے لگیں۔ جن دو ہزار افراد کی عراق میں داخل نہ ہونے کی لسٹیں بنیں اُن میں سعدی یوسف سرفہرست تھا۔ جنرل ٹومی فرینکس کے نام سعدی یوسف کا خط بھی بڑا مشہور ہوا۔ شاعر نے بھگو بھگو کر جوتیاں ماریں۔

اُس کی شاعری کے کوئی تیس ... کے قریب مجموعے ہیں۔ دو ناول اور پانچ کہانیوں کی کتابیں ہیں۔

سعدی یوسف فیض احمد فیض سے نہ صرف بیروت میں مل چکے تھے بلکہ اُن کا وہ سارا کلام جو انگریزی میں ترجمہ ہو چکا تھا بھی پڑھ چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ فیض کے بہت مداح تھے۔

یہ 2008 ہے اور میں الف لیلیٰ کے بغداد میں ہوں۔ میرا خوابوں کا شہر کتنی بار اجڑا اور کتنی بار بسا۔ یہ میرے پسندیدہ شاعر سعدی یوسف کا بغداد ہے جسے یہاں سے جا کر واپس آنا نصیب نہ ہوا۔ یہ میرے ماموں رشید کا بغداد ہے۔ اِس کے گلی کوچوں میں کہیں ان کے قدموں کے نشان،

اس کی ہواؤں میں کہیں ان کی آواز کی بازگشت مجھے سنائی دیتی ہے۔ یہ وہ شہر ہے جس کی قدامت اور عظمت کے وہ گن گاتے تھے۔

میری یہ کیسی خوش قسمتی کہ مجھے افلاق جیسا بیبا اور پیارا بچہ ڈرائیور کی صورت میں ملا۔ جس نے میری للک دیکھ کر مجھے اس کا چپہ چپہ دکھانے کا وعدہ کیا ہے۔ بغداد ابھی بھی حالت جنگ میں ہے۔ امریکی ابھی بھی ہر اہم جگہ پر جٹ جھاڑے بیٹھے ہیں۔ بہر حال معمولاتِ زندگی اسی انداز میں رواں دواں ہیں۔ راتیں جوان اور دجلہ کی رونقیں تاباں ہیں۔ زندگی یقیناً اسی کا نام ہے۔

میں پرانے بغداد کے اُن کیفوں، قہوہ خانوں اور ادبی کافی ہاؤسوں میں جانے کے لیے مری جا رہی ہوں۔ ایک تو میرا ماموں رشید اِن جگہوں پر جاتا تھا دوسرا میرے اُس شاعر کی جوانی کا عروج انہی جگہوں پر جبر کے تھپڑے کھاتے گزرا تھا۔ مجھے..... مُنتدرل زیدی سے بھی ملنے جانا تھا۔ وہی دلبر بچہ بش کے منہ پر جوتا مارنے والا۔

افلاق نے مجھے شہدا برج پر مستنصر یہ مدرسہ کی ملحقہ مسجد ال آصفہ میں اُتارا۔ بالعموم میں بغداد کی 55 ڈگری پر پہنچی ہوئی گرم ترین دوپہر کے چند گھنٹے کسی مسجد کے ٹھنڈے خواتین والے حصے میں گزارتی ہوں۔

آج لیٹی ضرور تھی مگر نہ آنکھیں بند ہوئیں اور نہ اعضاء نے آرام کی خواہش کی۔ وجہ جانتی ہوں۔ ساتھ ہی المتنابی اسٹریٹ ہے نا۔ جہاں کتابوں کی دنیا ہے۔ میں اٹھی اور باہر نکل آئی۔

داخلہ آسمان کو چھوتی محراب سے ہوا۔ کہیں کہیں عمارتوں کی بالکونیاں ایک دوسرے سے جھپیاں ڈالنے کو مچلتی نظر آئی تھیں۔

عراقی روشن خیال قوم ہے۔ اپنے ثقافتی اور تہذیبی ورثے پر ناز کرنا جانتی ہے۔ انہیں باعزت اور قابل فخر مقام دیتی ہے۔ ماضی کے متنازعہ شاعر ابو نواس ہو، المتنابی ہو بغداد کے کوچہ و بازار میں عظمتوں کے تاج پہنے کھڑے ہیں۔ بلا سے کوئی مرتد تھا یا پیغمبری کا دعوے دار۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کوفے میں 915 ہجری میں پیدا ہونے والا المتنابی اپنی شاعری میں پختہ کار تھا۔ قصیدہ گوئی میں کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ تقریباً ساڑھے تین سو نظمیں اس کی داستان زندگی کی بہت سی پرتوں کو کھولتی ہیں۔ اپنی غیر معمولی ذہانت، حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور کلام کی طاقت سے پوری طرح آگاہ تھا۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے۔

''میں وہ ہوں جس کے لکھے ہوئے کو اندھا بھی پڑھ سکتا ہے۔ میری شاعری جادوئی اثر رکھتی ہے۔ جسے بہرہ بھی سن سکتا ہے۔ جو کام تلوار اور تیر کرتے ہیں۔ میرا کاغذ، قلم اور حرف اُس سے زیادہ موثر ہیں۔''

المتنابی بازار اسی شاعر کی یاد میں ہے۔

میں کتابوں کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی۔ یہ کتابوں کا جہان تھا۔ یہاں کتابوں کی دنیا آباد تھی۔ صاف ستھرے فرشوں پر بکھری ہوئیں، تھڑوں پر دھڑوں کی صورت پڑی ہُوئیں، تختوں پر بچھی ہوئیں۔ برآمدوں کے ستونوں سے ٹکائے عارضی چوبی شیلفوں میں دھری اور بڑی بڑی دکانوں کی شیشے کی الماریوں میں سجی ہوئیں۔

شاندار مردوں کے پرے کہیں انہیں پھرولتے، کہیں انہیں پڑھتے، کہیں بھاؤ تاؤ کرتے نظر آئے تھے۔ کتنی دیر میں نے بھی انہیں دیکھا لیکن وہ زیادہ عربی میں تھیں۔ فرنچ میں تھیں جو میرے لیے بیکار تھیں۔ انگریزی میں جو چند دیکھیں وہ ایسی نہ تھیں کہ میں انہیں جھپٹ کر دبوچتی۔

میں چلتے چلی جاتی تھی۔ برآمدوں کے سایوں میں اور یہ بھی دیکھتی تھی کہ کہیں کہیں اس کے وجود کے کسی چھوٹے سے حصے پر، کہیں بڑے پر جیسے برص کے سے داغ ہیں۔ جلنے سڑنے کے، ٹوٹے پھوٹے ہونے کے، شکستگی کے، بدحالی کے۔ ایسا کیوں ہے؟ بانکپن میں یہ داغ دھبے کیوں؟ رُک کر پوچھا تو جانا کہ کوئی ڈیڑھ سال قبل بم بلاسٹ ہوا تھا۔ جاہلوں نے علم کے اس مرکز کو تباہ کر دیا۔

لیکن پوری دنیا میں بکھرے عراقیوں کے پیغامات نے اس کے اندر نئی روح پھونک کر اِسے کھڑا کر دیا تھا۔ صفحے جو جلے تھے پھر سے زندہ ہو کر لوگوں کے ہاتھوں میں سج گئے۔ المتنابی کی رونقیں لوٹ آئیں۔

میری اس خواہش پر کہ کیا وہ مجھے کسی ایسے بندے سے ملا سکتا ہے جس سے میں عراقی ادب کے حوالے سے کچھ باتیں کر سکوں۔

''ضرور ضرور'' بڑا پُر جوش سا لہجہ تھا۔

''آیئے'' وہ مجھے ساتھ لیے چلنے لگا۔ کوئی چوتھائی فرلانگ پر ایک بہت بڑی دکان کے اندر داخل ہوئے۔ اتنی بڑی دکان تھی کہ میں حیرت سے گنگ اُسے دیکھے چلی جاتی تھی۔ لڑکا مجھے لے کر غربی سمت بڑھا جہاں چند سیڑھیاں اُتر کر ہم ایک تہہ خانے میں اُترے۔ یہ تہہ خانہ کب تھا؟ یہ بغداد

کا ادبی چہرہ تھا۔ جہاں چوبی بینچوں پر دھرے خوبصورت گدّے نما کشنوں پر چند لوگ بیٹھے حقے کے کش لگاتے، بحث ومباحثے میں اُلجھے ہوئے دِکھے تھے۔ آٹھ نو کی نفری ناول نگار، صحافی اور شاعروں پر مشتمل جو ولید ال ونداوی، علی جعفر، رُسُل ال قیسی، رعید جرار، لولوا کاظم۔ جنھوں نے پرجوش انداز میں استقبال کیا، کھڑے ہوئے، عزت دی۔

میں نے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ مناسب سہولتوں سے سجا سنورا کمرا جس کی سامنے والی دیوار پر آراستہ بڑی سی تصویر المتنابی اسٹریٹ میں بچھے صوفوں پر بیٹھے وزیراعظم نورالمالکی کے ساتھ کتب خانہ الفردوس کے مالک کی تھی جو بڑا نمایاں نظر آتا تھا۔ یہ سب مجھے تعارف کے وقت معلوم ہوا تھا۔ تصویر کے متعلق تبھی وضاحت ہوئی تھی کہ بم بلاسٹ کے بعد حکومت اور وہ سب جنھیں کتاب سے محبت تھی۔ جنھوں نے گہرے دُکھ اور یاس کا اظہار کیا تھا۔ وہ لفظ کے تقدس اور اس کی حرمت کے لیے حکومت کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہوئے۔ فوری کوششوں سے اس کی بحالی ہوئی۔ صرف ڈیڑھ سال میں انہوں نے اس کی رونقیں لوٹا دیں اور تخریب کاروں کو پیغام دیا تھا کہ تمہاری تخریب کاری نے وقتی طور پر حرف جلا ڈالے مگر دیکھو ہم نے انہیں پھر سے زندہ کردیا ہے۔

گفتگو کے دروازے کھلنے لگے۔ ادب اور آرٹ کے حوالوں سے جب باتیں شروع ہوئیں تو وہ سب گفتگو میں یوں شامل ہوئے کہ قہوے کی چسکیاں تھیں اور باتیں تھیں۔

1950 کا زمانہ ادب اور آرٹ کے لحاظ سے ایک طرح نشاۃ ثانیہ کا زمانہ تھا۔ ادب میں مختصر کہانیوں کے رجحان نے زور پکڑا گو ابھی تک ناول بہت کم کم لکھا گیا تھا۔ شاعری میں البتہ نئے رجحان سامنے آرہے تھے۔ اس میں آزاد نظم نے زور پکڑا اور اپنا آپ منوایا تھا۔ بہت سارے ناموں کا ذکر ہوا۔ سعدی یوسف بہرحال بہت بڑا نام تھا۔ میری خواہش پر اس کے نئے مجموعے ''تو سُلجیا میرا دشمن'' سے رُسُل ال قیسی نے شط العرب سے دو نظمیں پہلے عربی میں سنائیں۔ پھر اس کا انگریزی ترجمہ کیا۔ تھوڑی سی مدد رعید جرار نے کی۔

شط العرب
پہلا خواب
درد و کرب اور دکھ بھری راتوں میں
تکیہ پانیوں سے گیلا ہوجاتا ہے
اور جیسے یہ کائی کی سی بو دینے لگتا ہے
میری دائیں ہتھیلی کو
چنبیلی کی سبز ٹہنی چھوتے ہوئے
جیسے کہتی ہو
جاگ جاؤ
میں دریا ہوں
کیا تم مجھے پیار نہیں کرتے
تم بصرہ نہیں جانا چاہتے
تکیے کے پروں پر سوار
دریا اے دریا
میں جاگ گیا ہوں
میرے تکیے پر اِک قطرہ پڑا ہے
جو مجھے کائی کی طرح ذائقہ دے رہا ہے
یہ بصرہ ہے
دوسرا خواب
آسمان مجھ پر سایہ فگن ہے
آسمان کے ساتھ چڑیاں بھی سایہ فگن ہیں
میرے دادا میرا ہاتھ تھامتے ہیں
ان کے چہرے پر سرخ کفایہ کا عکس ہے

ذات پات کی تقسیم

برہمن کے وجود میں آنے سے وہ آریہ جو کھلے میدانوں میں سورج اور روشنی کی عبادت کرتے تھے، مندروں کی تعمیر میں مصروف ہوگئے۔ ہزاروں دیوی دیوتاؤں کے لیے ہزاروں اقسام کے مندر تعمیر کیے گئے، جن پر برہمن کی آقائی مسلط ہوگئی۔ معاشرت اور مذہبیت کی اس منزل پر پہنچنے کے بعد اونچی اور نیچ ذاتیں مختص کی گئیں۔ یہ تخصیص برہمنوں کے ایماء پر کی گئی۔ نیچ ذاتوں کا کام صرف اونچی ذات والوں کی سیوا تھا۔ انسانی تاریخ نے اپنے کسی دور میں بھی اتنے ذلیل فلسفہ عمل کو نہیں اپنایا۔ اونچ نیچ کا تصور کسی انتظامی بنیاد پر قائم نہیں تھا بلکہ برہمنوں نے اس کی دوامی بنیادیں وضع کرنے کے لیے ایک فلسفے کی تخلیق کی تھی جو آواگون یا تناسخ کہلاتا ہے۔

مرسلہ: حیدر علی عابدی، کراچی

ذرا فاصلے پر پانی چمکتا ہے
اور دادا میرا ہاتھ پکڑتے ہیں
آؤ تیز چلیں اس سے پہلے
کہ پرندے گھروں کو لوٹ جائیں
آؤ تیز چلیں
اس سے پہلے کہ لہریں ہمارے گھونسلے تباہ کر دیں
ایک اور خواب
کوتل ال زین کے ساحلوں پر صبح کیسی خستہ دم سی ہے
میں آہواز جانے کے لیے دوسرے کنارے کی طرف
تیرتا ہوں
میرے بالوں میں بارش کے موتی
ستاروں کی مانند چمکتے ہیں
کھجور کے درخت ارغوانی کلغیوں سے سجے ہیں
اور کیرون کا پانی مجھے کیسا محسوس ہوتا ہے
جیسے جیسے
بصرے کا پانی

سعدی یوسف پر اُن کی آرا کا مختصر اظہار بھی تھا۔ دراصل سعدی کی شاعری پر اس مختصر سے وقت میں سیر حاصل بحث تو ہو ہی نہیں سکتی۔ رُسل ال قیسی نے کہا تھا۔

وہ عرب دنیا کا ایک منتخب نام جس کی زندگی کا ہر اُتار چڑھاؤ، ہر موڑ، ہر تجربہ قاری کے دل کی دنیا کو زیرو زبر کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ اتنا سارا مال و متاع اس نے عربی زبان اور لوگوں کو تحفے کی صورت دیا۔ ابھی جو دو نظمیں آپ نے سنی ہیں۔ اِن میں مناظر رنگ، بچپن کی یادوں کی خوشبوئیں اور اس کے کرب کا اظہار نمایاں ہے۔

وطن سے جو قدم نکلا تو دوبارہ یہاں دھرنا نصیب نہ ہوا۔ ''نوسٹلجیا میرا دشمن'' جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے۔ اس کے اپنے ملک کے لیے محبت اور اپنے لوگوں کی بربادی پر ماتم کی سی کیفیات کا اظہار ہے۔ لفظ آپ کو کس جہاں میں لے جاتے ہیں۔ جہاں دکھوں کے الیے ہیں۔ جہاں خوبصورتیوں کے چہرے ہیں۔

وہ تاریخ سے مکالمہ بھی کرتا نظر آتا ہے۔ تاہم اس کی نظموں کو سیاسی رنگ نہیں دیا جا سکتا۔ یہ اُس کا وہ اظہار ہے جو اس کے اردگرد موجود تھا اور جسے اس کی آنکھ نے دیکھا۔ دل نے محسوس کیا اور اس نے اسے زبان دی۔

اگر کہیں امریکی قبضے کا ذکر ہے تو کہیں کسی جھیل میں شام کی گھلتی سیاہی کا رنگ بھی ملتا ہے۔ کہیں تتلیوں کے رقص، کہیں طوفان، پانی، بے گھر لوگ، کہیں ناامیدی اور مایوسی کے ہی بطن سے اٹھتی امید کی کوئی سنہری کرن خوش آئند پیغام کی آواز بنتی ہے۔

یہ بڑے پیارے لوگ تھے۔ باتوں کے رسیا، قہوے اور قہوے کے دھنی۔ گہرے سیاہ قہوے کی جب تیسری پیالی میرے سامنے لا کر رکھی گئی میں نے گھبرا کر اُسے دیکھا اور خود سے کہا۔

''اِسے تو میں نے چھونا بھی نہیں۔ سارا حلق کڑواہٹ سے بھر گیا ہے۔ ابھی چینی کی پانچ کیوبز ڈالی تھیں تو یہ حال ہے۔ آفرین ہے اِن لوگوں پر جو اِسے پانی کی طرح پیتے ہیں۔''

سچی بات ہے مجھے تو ان کے نام بھی یاد نہیں رہنے تھے اگر وہ خود اس کا اِس درجہ اہتمام نہ کرتے کہ جو بھی گفتگو میں شامل ہوتا وہ ہر بار اپنا نام اور کام دہرانا نہ بھولتا۔ جس کا فائدہ وقت کی کمی کے باوجود مجھے ہوا تھا کہ جب میں نے رات کو ڈائری میں انہیں قلم بند کیا تو وہ سب اپنے ناموں، کاموں، شکلوں اور آوازوں کی انفرادیت کے ساتھ میرے سامنے تھے اور کہیں ابہام نہیں تھا۔

پہلا شارٹ اسٹوری رائٹر عبدالمالک نوری جس کا مدرسہ فکر مروجہ روایت سے بغاوت تھی۔ مختصر کہانی کے حوالے سے جس نے ادب کا یہ باب کھولا تھا اس کا لب ولہجہ علی جعفر کی نسبت زیادہ صاف، تلفظ زیادہ بہتر اور گفتگو آسانی سے سمجھ آنے والی تھی۔ رعید جرار جو خود بھی کئی کتابوں کا مصنف تھا۔ وہ عبدالمالک نوری کے حوالے سے بات کرتا تھا۔ اس کا بہترین کام نشادالارض Nashid-al-Ard۔ (دھرتی کا گیت) کی صورت سامنے آیا تھا۔ اس میں سوسائٹی کے پسے ہوئے طبقوں کی عکاسی تھی۔ دراصل قانون اراضی ایکٹ نے عراقی معاشرے کی لوئر مڈل کلاس کو جس طرح زرعی غلام بنا کر رکھ دیا تھا اور اعلیٰ تعلیم اور مراعات بالائی اور درمیانے طبقے کے لیے مخصوص ہو گئی تھیں۔ اس سے بے چینی، اضطراب اور جو گھٹن پیدا ہوئی، اس کو نوری نے بہت خوبصورتی سے پورٹریٹ کیا۔ The South wind میں صدیوں کے رائج معاشرتی رویوں پر احتجاج تھا۔

اِسی طرح فہد ال تکرلی Faad-Al-Takarli میں مصنف نے اپنے آباؤ اجداد کی رسوم پر سخت نکتہ چینی کی۔

سفیرہ حافظ Safirah Hafiz نے عورتوں پر

ہونے والی سختیوں اور مظالم پر لکھا۔ اس دور میں کمیونسٹ سوچ بھی اثر انداز ہوئی۔ شاعری میں یہ زیادہ کھل کر سامنے آئی۔ جمیل صدقی الزہاوی، مہدی الجواہری، سعدی یوسف، مظفرالنواب یہ سب بائیں بازو کے وہ ترقی پسند شاعر تھے۔ جنہوں نے حقیقتاً ایک عملی انقلاب کی راہ ہموار کی۔ ان کی شاعری اتنی پُراثر تھی کہ پوری عرب دنیا میں یہ شاعری گونجی۔ آزاد نظم کے شاعروں میں ایک بہت بڑا نام نازک الملائیکہ کا بھی ہے۔ جس نے عورتوں کے مسائل، محبت اور عورتوں کی آزادی پر کھل کر جی داری سے لکھا۔

نازک الملائیکہ سے میرا تھوڑا بہت تعارف ضرور تھا مگر رُسل ال قیسی اُس کا بہت مدّاح تھا اتنا کہ بدر سے بھی زیادہ اُسے سراہتا تھا۔

بدر شاکر اسیاب کا نام بھی بڑا اہم ہے۔ اس کی شاعری کے بہت سے مرحلے تھے۔ ابتدائی دور اگر رومانوی تھا تو حقیقت پسند شاعر بن کر اُس نے کمال کی شاعری کی۔ بدر کے ہاں انقلابی ذہنیت تھی۔ انہوں نے شاعری کے مروجہ اصولوں اور ان کی بندشوں سے آزاد ہو کر لکھا اور خوب لکھا۔

بدر اور نازک الملائیکہ پر باقاعدہ بحث چھڑ گئی تھی۔ اسی طرح ال شعیب کے ہاں موضوعات کا تنوع تھا۔ عربوں کے اندر اپنے مستقبل کے بارے میں پائی جانے والی بے چینی اور اضطراب، اُن کی جہالت، سادگی اور انہیں ملنے والے دھوکے اور ان پر مغربی تہذیب کی یلغار۔ شعیب نے ان احساسات کو بہت خوبصورت زبان اور ادائیگی دی۔

اگر یہاں عبدالوہاب البیاتی کا ذکر نہ کیا جائے۔ رُسل ال قیسی کا لہجہ خاصا جوشیلا تھا تو عراقی شاعری کا باب ادھورا رہے گا۔ سوشلسٹ نظریے کا شاعر جس نے مظلوم اور نچلے طبقے کو جھنجوڑا مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنی عرب شناخت پر بھی زور دیا۔

Exile From Exile کا بھی پڑھنے سے تعلق ہے۔ آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اسے پڑھتے ہوئے کہ عربوں کو کیسے در بدر اور دیس بدر دکھایا ہے۔

صوفے کے آخری کونے پر بیٹھے لولوا کاظم بھی اچھا بولنے والے انسان تھے۔ صاحب علم تھے مگر یہودیوں سے بہت متاثر لگتے تھے۔ مجھے تو گمان گزرا تھا کہ شاید یہودی ہیں اور میں نے پوچھ بھی لیا تھا وہ ہنستے ہوئے بولے۔

”ہوں تو نہیں مگر متاثر ضرور ہوں۔“

اس دوپہر اور شام کی شکر گزاری کہ سعدی یوسف کے ساتھ میں نے عراق کے اور بھی قابل فخر ادبی چہرے دیکھے۔

دو دن بعد کی ایک شام بغداد کی شہرہ آفاق ال شا
کافی شاپ جانا ہوا۔ ال شابندر کافی شاپ کی کھڑکیوں
دجلہ لشکارے مارتا تھا۔ دو منزلہ عمارت بالکونیوں اور آ
پیچھے دار شیڈوں کے ساتھ کونے پر گولائی کی صورت پھیلی ہو
تھی۔

موجودہ ملکی صورت پر تھوڑی سی بات چیت کے ب
یوسف سعدی زیر بحث آ گئے۔ علی ایاد کوئی چالیس کے پیر
میں ایک دلکش شخصیت جس کی انگریزی بڑی شستہ سی تھی
بعض پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈالی تھی۔

صدام کے زمانے میں اُن کی جلاوطنی خود ساخ
تھی۔ وجہ خوف تھا۔ مارے جانے کا۔ ایک بار نہیں صدام
کئی بار مظفر النواب اور سعدی کو لکھا۔

”عراق تمہارا منتظر ہے۔ تم لوگ ملک کا بیش قیمت سرمایہ ہو۔ واپس آؤ کہ ملک تمہارے لیے بہت کچھ کرنے ک خواہش مند ہے۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اگر آتے تو انہیں اعزازات اور انعامات سے ضرور نوازا جاتا مگر چیونٹی کی طرح مَسل بھی دیا جاتا۔ وہ نہیں آئے۔ اچھا ہوا۔ انہوں نے جو لکھا وہ ہم نے ہی نہیں پوری دنیا نے پڑھا۔

پھر انہوں نے بہت سی نظموں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سنائے۔ ”شکریہ تمہارا امراء القیس“ کیا خوبصورت شہ پارہ نظم تھی۔ پھر ”روانگی“ سنی۔

جلد ہی
سب کمرے بند کر دیئے جائیں گے
آغاز تہہ خانے سے ہوگا
ہم ان کے پاس سے گزرتے جائیں گے
ایک کے بعد ایک
حتیٰ کہ ہم بندوقوں تک پہنچ جائیں گے
پھر
انہیں بھی چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں گے
جیسے ہم نے پہلے کمروں کو چھوڑا تھا
اور چلتے جائیں گے
اپنے خون میں تلاش کرتے ہوئے
یا پھر اپنے نقشوں میں
نئے کمروں کے لیے

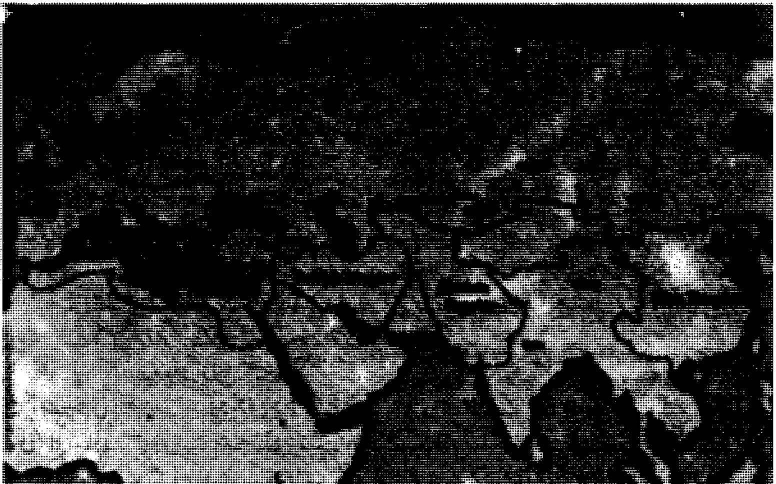
رومن انڈیا روٹ

طارق عزیز خان

برصغیر کو سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا، یورپ کے بادشاہان اس سے بہرمند ہونے کے لیے بے تاب و کوشاں تھے کہ کسی طرح وہاں پہنچنے کا راستہ مل جائے۔ بے شمار مہم جو بادشاہان کی امداد سے سمندری راستے کی تلاش میں پھرتے رہے۔لیکن کامیابی صرف اسے ملی۔

عالمی طور پر معروف ایک میر بحر کا ذکرِ خاص

زمانہ قدیم سے ہی ہندوستان تک رسائی کے آسان سمندری راستے کی تلاش یورپین ملاحوں کی ترجیحات میں شامل رہی ہے۔اس سلسلے میں یونانیوں کو دیگر یورپین اقوام پر برتری حاصل رہی شاید اس کی وجہ سے بحیرہ روم میں یونان کی اہم جغرافیائی حیثیت ہے۔اپنے کٹے پھٹے ساحلوں، بے شمار جزائر اور قدرتی بندرگاہوں کی موجودگی کی وجہ سے زمانہ قدیم سے لے کر آج تک یونان کو بحری مہمات کے حوالے سے مرکزی مقام حاصل رہا ہے۔قدیم یونانی ملاحوں نے نہ صرف



بحیرہ روم کی چھان بین کی بلکہ ان کے بحری جہازوں نے آبنائے جبرالٹر سے نکل کر خلیج بسکے، رودبار انگلستان اور بحیرہ شمالی کے ساحلوں کو دریافت کیا۔ اس سلسلے کی ایک نمایاں مہم یونانی ملاح پائے تھیاس (Pytheas) کی ہے جس نے 325 قبل مسیح میں مغربی یورپ کے ساحلی علاقے سمیت جزائر برطانیہ کی دریافت کی۔ قریب قریب اسی زمانے میں مشہور یونانی فاتح اسکندر اعظم نے خشکی کے راستے مشرق وسطی سمیت جنوب مغربی ایشیا کے وسیع علاقے کو فتح کیا۔ اسکندر کی مہمات کے بعد یونانیوں کی اولین ترجیح بحری راستے سے ہندوستان تک رسائی تھی۔

اسکندر اعظم نے 332 ق م میں مصر کو فتح کرنے کے بعد شمالی مصر میں بحیرہ روم کے کنارے اسکندریہ نامی شہر کی بنیاد رکھی۔ اس نے اپنے ایک قابل سپہ سالار بطلیموس (Ptolemy) کو مصر کا گورنر نامزد کیا۔ بطلیموس نے 323 ق م میں ایران میں اسکندر کی وفات کے بعد مصر میں اپنی خودمختاری کا اعلان کیا۔ یہاں تک کہ 305 ق م میں اس نے بطلیموس اوّل کے نام سے خود کو بادشاہ کہلوانا شروع کردیا۔ مؤرخین کے مطابق بطلیموس خاندان نے 30 ق م تک بلا شرکت غیرے مصر پر حکومت کی، یہاں تک کہ جنوبی اٹلی کی رومن سلطنت نے مصر پر قبضہ کرکے اسے اپنا صوبہ قرار دے دیا۔ دوسری صدی ق م کے دوران مصر پر بطلیموس ہشتم کی حکومت کے عہد میں مصری سلطنت کی حدود مشرق میں فلسطین، مغرب میں لیبیا، شمال میں قبرص (Cyprus) اور جنوب میں سوڈان تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس زمانے میں مصر کے دارالحکومت اسکندریہ کا شمار تجارت، ثقافت اور علوم وفنون کے عالمی مرکز کے طور پر ہوتا تھا۔ یہ بحیرہ روم کی سب سے مصروف بندرگاہ کے طور پر مشرق اور مغرب کے درمیان رابطے کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔

یہ 120 ق م کا ذکر ہے جب جنوبی ہندوستان سے آرہا ایک تجارتی بحری جہاز طوفانی ہواؤں میں پھنس کر بحیرہ احمر میں مصری ساحل کے قریب حادثے کا شکار ہوگیا۔ جہاز کا ہندوستانی عملہ تیرتا ہوا خشک زمین پر پہنچا جہاں مصری پولیس نے انھیں گرفتار کرکے بادشاہ کے روبرو پیش کرنے کے لیے اسکندریہ روانہ کردیا۔ بطلیموس ہشتم کے دربار میں ہندوستانی ملاحوں نے اپنے بحری جہاز کے غرق ہونے کی کہانی سنائی۔ بطلیموس کے ہندوستانی سرزمین اور بحیرہ عرب کے بارے میں سوالات کے جواب میں ہندوستانی ملاحوں نے انکشاف کیا کہ موسم گرما میں جنوب مغرب سے شمال کی طرف چلنے والی مون سون ہواؤں کے دوش پر سفر کرتے ہوئے باآسانی ہندوستان تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ یونانیوں کے لیے سال کے خاص حصے میں چلنے والی مددگار تجارتی ہواؤں کا ذکر ایک دم نیا اور دلچسپی کا باعث تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ بطلیموس کے عہد تک یونانیوں کی پہنچ بحیرہ احمر کے جنوب میں یمن کی بندرگاہ Eudaemon (موجودہ نام عدن) تک تھی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں پہنچ کر ہندوستانی، عرب، مصری اور یونانی تاجر ایک دوسرے سے لین دین کرتے اور اپنے اپنے علاقوں کو واپس لوٹ جاتے۔ یونانیوں کے لیے عرب سرزمین کو بائی پاس کرکے ہندوستان تک براہ راست رسائی کا مطلب زیادہ منافع کمانا تھا۔ یہی وہ پس منظر تھا جس میں بطلیموس ہشتم نے اپنے دربار میں موجود ایک یونانی ملاح، ڈوکسس آف سیزس کو ہندوستانیوں کی راہنمائی میں ہندوستان تک رسائی کا حکم دیا۔

آج ہمارے پاس ڈوکسس آف سیزس کی مہمات سے متعلق سب سے اہم شہادت پہلی صدی عیسوی کی اطالوی جغرافیہ دان اسٹرابو (Strabo) کی ہے۔ اسٹرابو نے اپنی زندگی (63 ق م سے 24 عیسوی) میں یونان کی تاریخ اور جغرافیہ سے متعلق 43 کتابیں لکھیں۔ اس نے اپنی کتاب Geography کی جلد دوئم کے تیسرے باب میں ڈوکسس آف سیزس کی مہمات کا ذکر کیا ہے۔

اسٹرابو کی تحریروں سے ڈوکسس آف سیزس کی تاریخ پیدائش اور ابتدائی زمانے کے بارے میں تو کوئی مستند معلومات نہیں ملتیں، تاہم اندازہ ہے کہ بطلیموس ہشتم کے دربار سے منسلک ہوتے وقت اس کی عمر تیس سال سے کچھ اوپر تھی۔ بطلیموس کی طرف سے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرنے کا حکم ملنے کے بعد یونانی بحریہ نے ڈوکسس کے لیے دو درجن کے قریب گالے (Galley) بحری جہازوں کا ایک بیڑہ تیار کیا۔ ہندوستانی ملاحوں کے مشورے پر یونانیوں نے ان بحری جہازوں پر کم از کم تین بادبان لگانے کا تجربہ کیا۔

تمام تیاریاں مکمل ہوجانے کے بعد ڈوکسس آف سیزس اور اس کے پانچ سو کے قریب عملے نے 118 ق م کے موسم گرما میں ہندوستان تک رسائی کی مہم کا آغاز کیا۔ ان کے بحری جہاز، خلیج سویز اور بحیرہ احمر کو پار کرکے خلیج

عدن میں داخل ہوئے۔ انھوں نے مشرق کی طرف بڑھتے ہوئے بحیرہ عرب کے کھلے سمندر تک رسائی حاصل کی۔

ڈوکسس نے ہندوستانیوں کے مشورے سے جہازوں پر نصب تمام بادبان کھولنے کا حکم دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ شمال مشرق کی طرف چل رہی تجارتی ہوائیں انھیں تیز رفتاری سے ہندوستانی سرزمین کی طرف دھکیل رہی تھیں۔ یونانی بیڑہ خط استواء سے 10 ڈگری شمال کے خط پر مشرق کی طرف بڑھتا رہا، یہاں تک کہ اگلے ایک ماہ کے سفر کے بعد ڈوکسس اور اس کے عملے نے جزائر لکا دیپ (Lakashadweep) کا نظارہ کیا۔ ان کے بحری جہاز چھوٹے درجنوں سرسبز جزائر کے درمیان سے ہوتے ہوئے آگے بڑھے اور مزید دو دن کے سفر کے بعد جنوبی ہندوستان کی بندرگاہ کالی کٹ (Calicut) میں لنگر انداز ہوگئے۔ ڈوکسس نے ہندوستانی سرزمین پر قدم رکھنے سے پہلے اپنی لاگ بک میں مددگار مون سون تجارتی ہواؤں کا ذکر کیا اور مصر سے جنوبی ہندوستان تک کے نئے بحری راستے کی نشاندہی کی۔ ہندوستان میں چند ماہ کے قیام کے دوران ڈوکسس نے مصر لانے کے لیے گرم مصالحوں، عطریات اور قیمتی پتھروں کا لین دین کیا۔ اس نے مقامی ہندوؤں کے رسم و رواج، موسم اور ہندوستان کے جغرافیہ سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ ہندوستان میں قیام کے دوران ڈوکسس کو جنوب میں واقع سری لنکا اور جنوب مغرب میں واقع جزائر مالدیپ کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ اندازہ ہے کہ 117 ق م میں ڈوکسس، ہندوستان تک رسائی کے نئے بحری راستے کی دریافت کا سہرا سجائے مصر واپس پہنچ گیا۔

سٹرابو کے مطابق 116 ق م میں بطلیموس ہشتم نے ڈوکسس کو ایک بار پھر ہندوستان کے تجارتی سفر پر روانہ کیا۔ اس بار یونانی بیڑے کے ساتھ کوئی ہندوستانی یا عرب راہنما موجود نہیں تھا۔ ڈوکسس نے اس بار بھی مددگار مون سون ہواؤں کے سہارے بحیرہ عرب کو پار کر کے ہندوستان تک رسائی حاصل کی۔ اس نے حسبِ سابق کالی کٹ میں تجارتی لین دین کرنے کے بعد مصر واپسی کے سفر کا آغاز کیا۔

ڈوکسس کے بحری جہازوں نے بحیرہ عرب کو پار کیا۔ تاہم ابھی وہ خلیج عدن سے کچھ فاصلے پر تھے کہ طوفانی ہواؤں میں پھنس کر ان کا رخ بجائے مغرب کے جنوب کی طرف ہوگیا۔ آنے والے چند ہفتوں کے دوران یونانی بحری جہازوں نے خط استواء کو پار کیا اور موجودہ تنزانیہ کے قریب پہنچ گئے۔

ڈوکسس کو اس مہم کے دوران برِاعظم افریقا کی وسعت کا احساس ہوا۔ اس نے تنزانیہ میں مقامی لوگوں سے بات چیت کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہاں سے افریقا کی جنوبی ٹیل قریب دو ماہ کی مسافت پر واقع تھی۔ ڈوکسس نے طے کیا کہ وہ اپنی اگلی مہم میں افریقا کے گرد چکر لگانے کی کوشش کرے گا۔

اس نے تنزانیہ میں چند دن کے قیام کے بعد دوبارہ شمال کی طرف سفر کا آغاز کیا۔ اس بار اسے کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی۔ یہاں تک کہ اگلے دو ماہ کے سفر کے بعد اس کے بحری جہاز مصر واپس پہنچ گئے۔

ڈوکسس نے افریقا کی بحر پیمائی کی یا نہیں اس بارے میں کوئی حتمی ریکارڈ دستیاب نہیں ہے۔ بہرحال یہ طے ہے کہ اس نے دوسری صدی ق م کے دوران مصر سے ہندوستان تک رسائی کا بحری راستہ دریافت کرلیا۔ ڈوکسس نے اپنی اس مہم کے دوران مجموعی طور پر کل 15 ہزار کلومیٹر طویل سفر طے کیا۔ اس میں خلیج سویز میں 600 کلومیٹر، بحیرہ احمر میں 4000 کلومیٹر، خلیج عدن میں 2000 کلومیٹر اور بحیرہ عرب میں 9000 ہزار کلومیٹر کا سفر شامل ہے۔ گوکہ یونانی ملاح سکائی لیکس آف کاریا (515 ق م) اور مقدونیہ کا حکمران اسکندر اعظم (334 سے 323 ق م) بحیرہ عرب اور جنوب مغربی ایشیا کو پہلے ہی دریافت کرچکے تھے، تاہم ڈوکسس کی مہمات کے نتیجے میں یونانیوں کو بحرِ ہند اور بحیرہ عرب میں چلنے والی مون سون ہواؤں کے سسٹم کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوئیں۔ انھوں نے بحیرہ احمر اور بحیرہ عرب سے ہندوستان تک رسائی کے بحری راستے کا نیا نقشہ تیار کیا۔ آنے والے عشروں میں یورپین تاجروں نے ڈوکسس کے اختیار کردہ بحری راستے کو فروغ دیا۔

پہلی صدی عیسوی میں یورپ سے ایشیا تک رسائی کے اس پہلے باقاعدہ بحری راستے کو "رومن انڈیا روٹ" (Roman-India Route) کا نام دیا گیا۔ یونان سے مصر اور جنوبی ہندوستان کے ساحلوں تک اس راستے کی کل لمبائی 8 ہزار کلومیٹر کے لگ بھگ تھی، تاہم وسط ایشیا کے پُرخطر زمینی راستے کے مقابلے میں رومن انڈیا روٹ ایک آسان سمندری راستہ تھا جس کے ذریعے یورپ کو زیادہ سے زیادہ ایشیائی خام مال کی ترسیل ممکن تھی۔



قسط نمبر: 11

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے



(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

رانا بشیر کی بیوی کا قتل ہوگیا تھا اور الزام آیا تھا احمد حسین پر۔ اس جرم میں اسے پھانسی ہوگئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ زنیرہ کے ساتھ مل کر اصل قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران رانا بشیر اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا کیونکہ اب اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری اڈے کی یونین میں نائب ضلعی صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اڈا ختم ہو جائے اور اس کی زمین پر عمارت بنا کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ تندہی سے کام کر رہے تھے لیکن ان کی چال نعمان انہی پر الٹ دیتا، ابھی وہ اس مسئلے پر غور کر ہی رہا تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی نے اسے ایک ڈائری دی جو مقتولہ کی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان دونوں مسئلوں پر کام کر ہی رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی فہیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا کہ ہم ایک جوان بہن کے بھائی بھی ہیں اس کے لیے کچھ سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہنا کو اکثر رات میں کسی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کہ وہ کسی کو پسند کرنے لگی ہے۔ فہیم کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرحانہ کا میسج آ گیا کہ اسے ڈائری کا پارٹ ٹول گیا ہے۔ اگلے دن زنیرہ کے ساتھ میں فرحانہ کے گھر گیا تو ڈائری کے واقعات سنے جس نے رفعت قتل کے واقعے کو مزید الجھا دیا تھا۔ اس دن میں اڈے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آ گئے۔ ان میں عزیر خان بھی تھا جس کو اختر کی بہن ثوبیہ کی گمشدگی کا ذمے دار سمجھا جا رہا تھا۔ میں نے عزیر خان سے کہا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ کاروباری حضرات کو بھی سہولت ملے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ معاہدہ پارٹنرشپ پر ہو لیکن ان لوگوں نے منع کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں ستا رہا تھا کہ کالیا کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ عارف جھنڈر جیل سے فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر سنتے ہی میں الجھ گیا۔ گڈز ٹرانسپورٹ کی گاڑیاں آنی شروع ہوگئی تھیں۔ سدو بھائی نے اطلاع دی تھی کہ گڈز کی آڑ میں منشیات کا کاروبار ہوتا تھا۔ سدو کو رخصت کر کے میں بیٹھا ہی تھا کہ کالیا آ گیا۔ اس نے بتایا کہ میری ضمانت منسوخ ہو چکی ہے اور مجھے گرفتار کرنے کے لیے ایس ایچ او دلاور خان آ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلا اور اس کی بائیک پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ کالیا کے اڈے پر پہنچا تھا کہ بہن کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس گھر آئی تھی اور فہیم کو لے گئی ہے۔ مجبوراً میں نے گرفتاری دے دی۔ وہاں مجھ پر تشدد بھی ہوا۔ میں حوالات میں بیٹھا تھا کہ ایک سپاہی نے آ کر ایک اخبار دیا۔ اخبار میں چھپی خبر دیکھ کر میں پریشان ہوا تھا۔ فہیم کے تھپڑ نے مجھے بوکھلا دیا تھا۔ وہ تھپڑ مار کر باہر نکل گیا تھا۔ میں اڈے پر پہنچا تو وہاں صوبیہ کے قتل میں ملوث عزیر نظر آ گیا۔ میں اس کے دفتر میں پہنچا اور ان سے صوبیہ کے متعلق پوچھا۔ وہ گھبرا اٹھا۔ میں نے کہا کہ یہ سوال پولیس بھی پوچھے گی اور وہاں سے اٹھ آیا۔ رانا بشیر کے ہاں پہنچا پھر میں نے ٹرک ڈرائیور کی گلوخلاصی کرا دی جس کے ٹرک نے زونیرہ کی کار کو ہٹ کیا تھا۔ گھر آیا تو کاشف ملنے آ گیا جو میری بہن کو چاہتا تھا۔ وہ بھی اغواء کا سن کر پریشان ہو گیا۔ پھر اسی رات کالیا کے ساتھ ہم سیٹھ ستار کے بنگلے میں داخل ہوئے۔ وہاں روزی نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ سیٹھ ستار نے کہا کہ اس نے میری بہن کو ایک جگہ چھپا رکھا ہے ابھی بلواتا ہوں کہہ کر اس نے کسی کو فون کیا کہ لڑکی کو لے کر آ جائے۔ تبھی روزی نے کہا کہ سیٹھ ستار جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے لڑکی کو گلشن حدید میں نہیں کہیں اور رکھا ہے پھر اس نے بتایا کہ میں سیٹھ ستار سے اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لیے اس کے ساتھ ہوں۔ بعد میں اس کا کہا سچ نکلا۔ اس کے آدمیوں نے مجھے بھی زخمی کر دیا۔ ساتھیوں سے نمٹ کر میں نے سیٹھ سے اگلوا لیا کہ عاصمہ کو کہاں رکھا ہے اسے باحفاظت نکال لایا پھر روزی کے اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ یہ اس کی سہیلی کا فلیٹ تھا۔ ہم اس سے بات کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر باہر سے آواز آئی۔ ”کیبل والا، بل لے کر آیا ہوں۔“ روزی نے دروازہ کھولا تو کیبل والے کو دھکا دے کر دو مسلح شخص اندر آ گئے۔ اس سے نمٹ کر میں نے انسپکٹر کامران کو فون پر کہا کہ روزی کی حفاظت کے لیے دو پولیس والے بھیج دو۔ پھر میں اور کالیا کے ساتھ باہر آ گیا۔ انسپکٹر کامران کی معرفت کئی ایک کو گرفتار کرایا پھر زنیرہ کے گھر پہنچا۔ کچھ ضروری باتیں کر کے میں باہر نکلا تھا کہ ایک ٹیکسی پر نظر پڑی۔ میں اسے نظر انداز کرتا کہ اس ٹیکسی میں بیٹھا ایک شخص اتر کر زنیرہ کے دروازے پر پہنچا۔ میں ہوشیار ہو گیا اور بھاگتا ہوا زنیرہ کے پڑوس والے گھر میں داخل ہو گیا اور چھت کے ذریعے زنیرہ کے گھر میں اتر گیا۔ ٹھیک اسی وقت نیچے سے گولی چلنے کی آواز آئی اور ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ تب تک میں سیڑھیوں تک پہنچ چکا تھا۔ اندر سے زنیرہ پستول تھامے دھمکی دیتی ہوئی نکلی۔ اس کے پیچھے خالہ نجو کھڑی چیخ رہی تھیں۔ میں نے زخمی پر قابو پا کر خالہ سے رسی لانے کو کہا۔ تبھی باہر سے دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔ محلے کے لوگ آ گئے تھے کچھ دیر بعد پولیس بھی پہنچ گئی۔ اسے پولیس کے حوالے کیا اور وہاں سے چل پڑا، ابھی گھر آیا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اسپتال سے بتایا گیا کہ فہیم مل گیا ہے۔ میں اسپتال پہنچا فہیم نے بتایا کہ کچھ لوگ اس پر بے پناہ تشدد کرتے تھے۔ اس کی ٹانگیں بھی کاٹ دی گئی تھیں۔ سیٹھ ستار الگ کالیا کو قتل کرنے پر تلا ہوا تھا کیونکہ وہ مجو کے قتل کا بدلہ لینا چاہ رہا تھا۔ استاد بھا بھا نے مشورہ دیا کہ خود کو چھپا کر رکھوں کیونکہ لیاری کا بچہ بچہ ٹی ٹی لے کر ہمیں ڈھونڈ رہا ہوگا ہم نے میک اپ کیا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچے تو اندر دشمن موجود تھے۔ ہم نے ان پر قابو پایا پھر اگلے روز جب اڈے پر پہنچا تو انور شاہ نے بتایا کہ حاجی مہران آیا تھا۔

(اب آگے پڑھیں)

”کب آیا تھا؟ کتنی دیر ہوئی ہے؟“ میں نے چاچا انور شاہ سے پوچھا۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آیا ہے۔“ وہ بتانے لگا۔

”سخت غصے میں تھا اور بڑی دھمکیاں دے رہا تھا تمہیں...... کہہ رہا تھا کہ اگر میرے بیٹے کو سزا ہوگئی تو ہمیں بھی یہاں سے بستر بوریا گول کرنا پڑے گا۔“

''آپ نے کیا جواب دیا؟'' میں نے گہری متانت سے چاچا کی طرف دیکھا۔

''تم کیا سمجھتے ہو بھتیجے! میں نے اتنے آرام سے اس جاگیردار کی دھمکیاں سن لی تھیں؟'' انور شاہ مسکرایا۔''میں نے بھی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یہ اس کی جاگیر نہیں ہے۔ عام عوام کی سہولیات کا ایک ادارہ ہے یہ اس کے خلاف سازشیں کرنے والوں کا ہم پہلے ہی منہ توڑ جواب دے چکے ہیں اور انشاء اللہ اب بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔''

''واہ...... چاچا! مان گئے آپ کو۔'' میں خوش دلی سے بولا۔''ان جیسے لوگوں سے بالکل بھی نہیں ڈرنا ہے۔ یہ بتائیں اس نے پھر آنے یا مجھ سے ملنے کا کہا تھا؟''

''ایسا تو کچھ نہیں کہا، اتنا ضرور کہہ رہا تھا کہ میں تم تک اس کا یہ پیغام پہنچادوں۔''

میں نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ اس کے بعد کالیا کو فون کھڑکا دیا۔ وہ خود بھی مجھ سے ملنا چاہ رہا تھا۔ اس کی بات سن کر میں نے کہا۔ تم وہیں رہو، میں آرہا ہوں، فون بند کرنے کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مجھے پک کرنے کا کہا تھا، میں نے اسے بلوچ کالونی سے پک کرلیا۔

''ارے واہ...... جگری! آج میرا یار بائیک ماسٹر بنا ہوا ہے۔'' وہ مجھے کار کی بجائے ویسپا اسکوٹر پہ دیکھ کر مسکرا کے بولا اور میرے پیچھے بیٹھ گیا۔

''کبھی کبھی اس کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے میرے یار!'' میں نے کہا اور ویسپا آگے بڑھادی۔ راستے میں، میں نے اسے یاسر نامی شخص کے بارے میں بتایا۔ کالیا نے اسے میرا ایک نیا اور اہم کارنامہ قرار دیا۔

ہم ملیر کے تھانہ پہنچے اور انسپکٹر کامران سے ملاقات کی پھر اسے یاسر کے بارے میں بتاتے ہوئے اس کے گھر کا ایڈریس دے دیا۔ اس نے اسی وقت اس کی گرفتاری کے لیے ایک پولیس پارٹی، اپنے ایک اے ایس آئی نعیم کی سرکردگی میں گزری کی طرف روانہ کردی۔ کامران نے ہمیں امید واثق دلوائی تھی کہ یاسر کی گرفتاری کے بعد ایڈووکیٹ زنیرہ کی ایکسیڈنٹ سازش کیس سیٹھ ستار کے گلے کا پھندا بن سکتا ہے۔

ہم وہاں سے لوٹ آئے۔ کچھ دیر استاد بھابھا کے اڈے میں رہے، اس سے لیاری کے حالات کے بارے میں پوچھا۔ بھابھا نے یہی بتایا کہ فیاض جمالی اپنی کوششوں میں مصروف ہے مگر ابھی تک اسے کوئی خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوسکی ہے۔

''جھینگو سے رابطہ ہوا استاد؟'' کالیا نے بھابھا سے پوچھا۔

''نہیں، اس سے ابھی میری کوئی بات نہیں ہوئی۔'' بھابھا نے جواب دیا۔

''کمال ہے اسے بتانا تو چاہیے تھا کہ میرداد اور اس کے ساتھیوں کی بہ سلامت واپسی کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟'' کالیا بڑبڑانے والے انداز میں بولا تو بھابھا اپنا سیل فون سنبھالتے ہوئے بولا۔

''میں بجن ڈاڈا سے پوچھتا ہوں۔'' اس نے اس کا نمبر پنچ کیا۔ تھوڑی دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد رابطہ منقطع کردیا۔ میری اور کالیا کی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

بھابھا اپنے حلق سے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔''وہی مرغی کی ایک ٹانگ۔''

''کیا مطلب استاد؟'' کالیا نے اس کی طرف الجھی ہوئی نظروں سے دیکھا جبکہ میں اس کا مطلب کچھ کچھ سمجھ گیا تھا۔

''ہماری صلح کی طرف پیش قدمی کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔'' بھابھا بتانے لگا۔''وہ مزید اکڑ گئے ہیں، کہتے ہیں، کالیا کو تو ہم عبرت ناک موت سے دوچار کریں گے ہی، اب اس کے دوست نعمان عرف نومی کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔''

استاد بھابھا کے اس انکشاف پر مجھے اپنے بدن میں سیکڑوں چیونٹیاں رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں جبکہ کالیا نے تلخی سے مسکرادیا پھر بولا۔

''ہونہہ، کوئی مائی کا لعل آج تک پیدا ہی نہیں ہوا جو کالیا کے سائے تک بھی پہنچ سکے۔ لگتا ہے انہیں دوبارہ دھول چٹانی پڑے گی۔ ان سے کھل کر جنگ کرنا پڑے گی۔ اب ان کا جو بھی ساتھی نرغے میں آیا زندہ نہیں بچے گا۔'' کالیا نے حتمی لہجے میں کہا تو بھابھا نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ہولارہ کالیا! ابھی مجھے فیاض جمالی سے بات کرلینے دے۔''

''تو کرلینا بات استاد! پھر ہمیں بھی بتادینا۔ چل جگری!'' کالیا نے مجھے چلنے کا کہا۔

ہم استاد بھابھا کے اڈے سے نکلے تو میں نے کسی خیال کے تحت کالیا سے سوال۔''یار! کیا تجھے واقعی ایسا لگتا ہے کہ

ہماری میرداد سے صلح ناممکن ہے؟“

”ابے لے جگری! کیا تجھے ابھی تک یہ خوش فہمی ہے؟“ وہ ایک تلخ سی مسکراہٹ سے بولا۔

”خوش فہمی تو نہیں ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس کا جلد سدباب ہوجائے۔ یہ ہم پر ایک اضافی مصیبت نازل ہوگئی ہے۔“

”ابے لے جگری! لگتا ہے، تو خود ہی اس کا حل تلاشنا چاہ رہا ہے۔“ زیرک دماغ کالیا نے معنیٰ خیز نظروں سے میری طرف تکتے ہوئے کہا۔

”ہاں یار، میں چاہ رہا ہوں کہ یہ معاملہ اب نہ جمالی کے بس کی بات رہی ہے نہ ہی جینگو کے...... سجن ڈاڈا کو تو ویسے بھی رہنے دو، وہ میرداد وغیرہ کا رشتے دار ہے اور وہی کرے گا جو وہ اسے کہیں گے۔“

”تو بتا ناں جگری! کیا ہے تیرے دماغ میں؟“

”ہمیں شانو کھوجا سے ملنا چاہیے۔“ میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

”شانو کھوجا؟“ کالیا نے سوالیہ انداز میں یہ نام دہرایا۔

”بھول گیا؟“

”ہاں یاد آیا......! ابے لے جگری! اپنا تو دماغ ہی چوپٹ ہوگیا ہے، ابھی کی تو بات ہے، استاد بھابھا کے اڈے میں فیاض جمالی نے بتایا تھا اس کے بارے میں۔“

”ہاں! ہمیں اس سے ایک ملاقات کرنی چاہیے۔“ میں نے خیال انگیز لہجے میں کہا۔

”مگر اب شاید تو بھول رہا ہے جگری کہ جمالی نے یہ بھی بتایا تھا استاد بھابھا کو کہ شانو کھوجا یار مار آدمی ہے۔“

”مگر اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ لیاری کے ہر بڑے گینگ لیڈر کی پڑیا بھی جیب میں رکھتا ہے۔“ میں نے اسے یاد دلایا تو کالیا نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

”میرداد جیسے لوگوں کو جواب دینے کے لیے ایسے ہی آدمیوں سے کام لیا جاسکتا ہے۔“

”سوچ لے جگری! کہیں الٹا شانو ہمارے ہی گلے نہ پڑ جائے۔“

”تم استاد بھابھا سے بات کرو کہ وہ شانو کھوجا سے ایک ملاقات کا بندوبست کرادے۔“

”استاد بھابھا کبھی یہ نہیں چاہے گا۔“

”تو پھر تم خود۔“

اس نے میری بات کاٹ دی اور بولا۔ ”میں ابھی اس سلسلے میں جینگو سے بات کرتا ہوں۔“

”کرو پھر۔“ میں نے ترنت کہا۔

تھوڑی دیر بعد کالیا جینگو سے رابطہ کرنے کے بعد مجھے بتا رہا تھا۔ ”ابے لے جگری! کام ہوگیا۔“

”اس سے اتا پتا پوچھ لو...... ابھی چلتے ہیں۔“

”میں نے وقت لے لیا ہے۔ دو گھنٹے بعد ہم اس سے کھارادر کے ایک مکان میں مل سکتے ہیں۔“ کالیا نے جواب دیا۔ میں ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا۔ اس کے بعد میں نے اسے سدو کی تازہ ترین رپورٹ کے بارے میں بتایا کہ کوئی شخص رانا بشیر کو بلیک میل کررہا ہے اور اسے آج رات آٹھ بجے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے کمرا نمبر 57 میں ملنے کا کہا ہے۔“

”ابے لے جگری! یہ بہت اہم ملاقات ہوگی۔ وہ جو کوئی بھی ہے، مجھے اس کا تعلق پردہ نشین سے جڑتا محسوس ہوتا ہے۔“ کالیا جوش سے بولا۔

”میرا اپنا بھی یہی خیال ہے۔“ میں کہا۔

”چل پھر پہلے شانو کھوجا سے مل لیتے ہیں پھر ہم دونوں ہی ہوٹل ڈی اسٹار کا رخ کریں گے۔“

”سدو نے مجھے پہلے اپنے ہاں آنے کا کہا ہے۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”اس نے اصل وقت سے ایک گھنٹا پہلے بلایا ہے۔“

”ٹھیک ہے چلیں گے مگر ابھی کیا کریں؟ ہمارے پاس دو گھنٹے ہیں۔“

”استاد بھابھا کے اڈے پر چلتے ہیں۔ وہاں تھوڑا وقت گزارنے کے بعد کھارادر روانہ ہوجائیں گے، وقت نکلتا رہے گا۔“ کالیا نے میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور ہم روانہ ہوگئے۔

اڈے پر پہنچے۔ بھابھا نہیں تھا۔ ہم اوپر آگئے۔ یہاں ہم نے تھوڑی دیر بیٹھ کر وقت گزارا اور اس کے بعد روانہ ہوگئے۔

ہم ویسپا پر سوار ہوکے کھارادر پہنچے۔ جینگو نے کالیا کو اس مکان کا پتا اچھی طرح سمجھا دیا تھا جدھر شانو کھوجا سے ہماری ملاقات اس نے طے کی تھی۔

وہ ہمیں گھر پر ہی مل گیا۔ اندر داخل ہوئے تو احساس ہوا کہ یہ گھر نہیں بلکہ چھوٹا سا کوئی اڈا ہے۔ وہاں اور لوگ بھی موجود تھے۔ عجیب سی تیز بو اس چھوٹے سے مکان کے محدود ماحول کو مکدّر کیے ہوئے تھی۔

کالیا نے زیرلب بڑبڑاتے ہوئے ہلکی سرگوشی میں مجھ سے کہا تھا۔ ''یہاں تو چرس اور کوکین کی بو پھیلی ہوئی ہے۔''
ایک آدمی بوسیدہ سی سیڑھیاں پار کراتا ہوا ہمیں اوپر چھت پر بنے کمرے میں لے آیا۔
اس مکان میں اوپر بنا ہوا فقط یہی ایک کمرا تھا۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہم نے جینگو کے فون کا ریفرنس دیا تھا۔ اندر ایک دبلا پتلا سا کالا سیاہ آدمی دری پر پاؤں پھیلائے بیٹھا موبائل پر کسی سے بلوچی میں باتیں کررہا تھا جو ہمارے پلے نہیں پڑرہی تھیں۔ اس نے ہمیں دیکھ کر رابطہ منقطع کردیا اور اٹھ کر اچھے طریقے سے باری باری ہم سے ہاتھ ملایا اور وہیں فرشی نشست پر بیٹھنے کا کہا۔
وہ چالیس کے پیٹے میں نظر آتا تھا۔ چہرہ چھوٹا تھا۔ آنکھیں بڑی اور ڈیلے ابلے ہوئے سے نظر آتے تھے۔ اس کے منہ میں گٹکا دبا ہوا تھا اور ہاتھ میں چرس بھری سگریٹ تھی۔ سر پہ سادہ سی ٹوپی تھی۔ عام سی شلوار قمیص اس کے منحنی جسم پر ہینگر کی طرح جھولتے نظر آرہے تھے۔
اس کی شخصیت ظاہری طور پر غیر متاثر کن تھی اور کہیں سے بھی یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ اس کی جیب میں بڑے بڑے گینگ وار لیڈروں کی پڑیا موجود رہتی ہوگی۔
میں نے اپنا اور کالیا کا تعارف کروایا اور جینگو کے فون کا حوالہ دیا۔ پھر اسے فوراً ہی مطلب کی بات بتادی۔ وہ چند ثانیے کچھ سوچتا رہا۔ اس نے ہمارے لیے چائے منگوائی تھی۔ چائے سادے سے مگوں میں تھی۔ اس دوران اس نے نئی سگریٹ سلگالی۔ چائے کی دوتین چسکیاں لینے کے بعد اس نے سگریٹ کے ایک دوکش لیے پھر بولا۔ ''اس قصے کی بھنک تو میرے کانوں میں بھی پڑی تھی۔ قصور تم لوگوں کا بھی نہیں ہے مگر معاملہ غلط فہمی، جلد بازی اور غصے میں خطرناک ہوگیا ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر رکا۔
میں اور کالیا چائے کی چسکیاں لینے کے دوران اس کی طرف تکے جارہے تھے۔ اس نے اپنے سامنے دھرا مگ اٹھا کے ایک دو چسکیاں مزید بھریں پھر سگریٹ کا ایک گہرا کش لگا کر دھواں اگلا۔ اس کے بعد سر کو ہولے ہولے سے اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''میرداد سے تو میری بھی اچھی خاصی دعا سلام ہے۔ اب اسے میں تمہاری خوش قسمتی ہی کہوں گا کہ آج کل میرداد کا میرے پاس ایک بہت ہی اہم کام پھنسا ہوا ہے، یہاں اس کی نوعیت بتانے کی ضرورت تو نہیں ہے مگر میں اس کے بدلے میں اس سے یہ معاملہ سلجھانے کی بات کرکے دیکھتا ہوں۔''
یہ کہہ کر اس نے مزید دوتین چسکیاں لے کر چائے ختم کی اور خالی مگ دری پر رکھتے ہوئے سگریٹ کے کش لیتا ہوا ہماری جانب دیکھنے لگا۔
''آپ کی بڑی مہربانی ہوگی شانو بھائی! یہ معاملہ بہ احسن طریقے سے سلجھ جاتا ہے تو......'' کالیا کہنے لگا تو شانو کھوجے نے اس کی بات کاٹ دی اور بولا:
''ہمارے کام میں مہربانی، شکریہ اور یار باشی کم ہی چلتی ہے۔ کام بچل ہوتا ہے اور پکا بھی مگر کچھ لے اور دے کے اصولوں پر چلتا ہے۔''
اس کی صاف گوئی تلخ سہی لیکن مجھے بری نہیں لگی تھی۔
''آپ کی بات سے ہم اتفاق کرتے ہیں شانو بھائی!'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جو خرچا پانی ہوگا ہم دینے کو تیار ہیں لیکن......اس میں بھی صحیح اور غلط بات کا خیال رکھا جائے تو اچھا ہوگا۔ کیونکہ بہرحال اس سارے بکھیڑے میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ جنگ انہوں نے خود ہم پر مسلط کرنے کی کوشش کی تھی۔''
''معاملہ اب سمجھنے اور سمجھانے سے اوپر جاچکا ہے دوست!'' شانو بولا۔ ''رہی بات خرچے پانی کی تو وہ اپنی جگہ ہوگا ہی مگر اطمینان رکھو اتنا نہیں ہوگا کہ تم لوگ ادا ہی نہ کرسکو۔ ہاں! ایک اور بات، ضروری نہیں ہے کہ خرچا پانی نقدی میں ہو......میرے لین دین کا طریقہ کار ذرا مختلف ہوتا ہے۔''
''بس شانو بھائی! پھر بسم اللہ کرو، دیر کس بات کی ہے۔'' کالیا نے اس سے کہا لیکن شاید کالیا نے یا تو شانو کی ''لین دین'' یا ''خرچا پانی'' کی بات پر غور نہیں کیا تھا یا پھر اسے درخور اعتنا ہی نہ جانا تھا مگر میں ضرور چونک گیا تھا کہ اس کی بات کا آخر مطلب کیا تھا۔
''آج رات میرداد نے میرے پاس آنا ہے۔ یہاں نہیں، میری لیاری والی جگہ پر۔ وہاں میں اس سے بات کرتا ہوں، تم لوگ مجھے اپنا کانٹیکٹ نمبر دے دو۔''
میں نے اپنا نمبر اسے دے دیا اور اس کا بھی لے لیا۔
اس کے بعد شانو نے ہمیں اپنے پاس سے رخصت کردیا۔ اس ہدایات کے ساتھ کہ اب ہم اس کی اجازت کے بغیر نہیں آئیں گے۔
''ابے لے جگری! مان گئے تیرے دماغ کو تیرا یہ مشورہ کچھ غلط نہیں نکلا۔'' کالیا باہر آتے ہوئے بولا۔ ''شانو بڑا چلتا پرزہ ہے بغیر کسی پاپڑ پستی کے ہمارا کام کرنے پر رضامند

ہو گیا۔‘‘

’’ہم......‘‘ میں نے گومگو سے انداز میں یہ کہتے ہوئے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ کالیا فوراً کھٹک گیا۔

’’ابے لے جگری! میں تیرے چہرے پر الجھن کے آثار دیکھ رہا ہوں۔ خیریت تو ہے؟‘‘

اس کی بات سن کر میں نے ویسپا کو اسٹینڈ آف کیا اور اس پہ سوار ہوتے ہوئے کہا۔ ’’فیاض جمالی نے شانو کھوجا کے بارے میں درست کہا تھا۔ یہ ایک نمبر کا بلیک میلر ہے۔‘‘

’’ابے لے جگری! یہ کیا کہتا پڑا ہے تو؟‘‘ کالیا میرے پیچھے سوار ہوتے ہوئے چونک کر بولا۔ ’’بھلا ہماری ایسی کیا کمزوری اس کے ہاتھ میں آگئی ہے جو یہ ہمیں بلیک میل کرے گا؟‘‘

اس کی بات سن کر میرے چہرے پر غیر تاثراتی مسکراہٹ ابھری تھی۔ میں نے ہیلمٹ پہن لیا تھا۔ کالیا جس قبیل سے تعلق رکھتا تھا وہاں اس نے دماغ چلانے سے زیادہ ہاتھ پاؤں ہی چلانے سیکھے تھے جبکہ میرا معاملہ شروع ہی سے ذرا مختلف تھا۔ کسی بھی بڑے اور نتیجہ خیز عمل کے لیے دور اندیشانہ دماغی سوچ، مربوط چالوں کو ترجیح دیتا تھا۔

کالیا نے شانو کھوجا کی بلیک میلنگ والی حقیقت کو محض کمزوری کا پکڑے جانے پر محمول کیا تھا جبکہ میرے مطابق بلیک میلنگ کا مطلب صرف اپنی کمزوری کا دوسرے کے ہاتھ لگنا نہیں ہوتا مگر یہ بات میں کالیا کو ابھی نہیں سمجھا سکتا تھا۔

سچی بات یہ تھی کہ جتنا پُرامید میں شانو سے پہلے تھا اب وہ فرو ہونے لگی تھی جبکہ کالیا تو امید سے بھی آگے کی توقع، یعنی پوری کامیابی کا یقین سا کر بیٹھا تھا اور میری برملا تعریف بھی کر ڈالی تھی کہ فیاض جمالی کے منع کرنے کے باوجود میرا شانو کھوجا سے ملنا اور اس کا مشورہ اور بعد اس سے ملاقات سو فیصد کامیاب رہی تھی مگر سچی بات یہی تھی کہ میں نے اب شانو کھوجا سے دوبارہ ملنا، بہ الفاظ دیگر اس کے جھانسے یا جال میں آنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

میں نے کالیا سے مزید کوئی بات کیے بغیر اسکوٹر آگے بڑھا دی۔ اڈے پر پہنچا تو تھانہ ملیر کے انچارج انسپکٹر کامران کا فون آگیا۔ اس نے مجھے ایک خوشگوار اطلاع دی کہ یاسر کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور مزید یہ کہ عنقریب عزیر خان کی طرح وہ اس کا بھی چالان عدالت میں پیش کرنے والا ہے۔

’’تہرا...... لے جگری! کامیابی جگہ جگہ ہمارے قدم چوم رہی ہے۔ اب گیا سالا یہ کانا سیٹھ ستار بھی کام سے۔‘‘

جب میں نے کالیا کو یہ خوش خبری بتائی تو اس نے مسرت بھرے انداز میں نعرہ ہائے مستانہ بلند کرتے ہوئے کہا۔ ’’ہاں کالیا! میں ان دونوں بڑے لینڈ مافیائی چیفس کے گلے میں پھندا ڈالنے میں کامیاب ہو چکا ہوں۔ یاسر کے خلاف جمالی گڈز کا احسان جمالی ایک ٹھوس ثبوت ہے، اس کا منشی نواز وعدہ معاف گواہ بننے پر مجبور ہوگا اور محمد ملوک اور اس کا سالار حیم بخش کی گواہیاں رہی کسر پوری کر دے گا۔‘‘

میں نے پُرجوش لہجے میں کہا اور پھر وہاں سے میں اور کالیا ایڈووکیٹ زنیرہ کے ہاں پہنچے۔ اسے میں نے یہ خوش خبری سنائی تو وہ بھی اس خبر پر کھل اٹھی تھی۔

وہیں بیٹھ کر ہم نے چند ضروری باتوں پر تبادلہ خیال کیا اور میں نے اسے پہلی فرصت میں اپنی مدعیت میں سیٹھ ستار پر مقدمہ دائر کرنے کا کہا۔ ساتھ ہی اسے ایک ملاقات انسپکٹر کامران سے بھی کر لینے کا مشورہ بھی دے ڈالا۔

وہاں سے ہم سیدھا سدو کے ہاں پہنچ گئے۔ حالات اب میرے حق میں موافق جا رہے تھے اور ایک ایک کر کے میرے دشمن قانونی شکنجے میں جکڑے جانے والے تھے۔ اب بس میرا ایک یہ پردہ نشیں دشمن باقی بچا تھا اور اسے اس کے عبرت ناک انجام تک پہنچانے کے لیے میری زندگی کا سب سے اہم مقصد رہا تھا۔ اس کی پڑیا بھی میں تیار کیے ہوئے تھا۔ کیونکہ میرا خیال قوی تھا کہ رانا بشیر کو جو شخص بلیک میل کر رہا تھا یا جس نے اسے ہوٹل ڈی اسٹار ملاقات کے لیے بلوایا تھا، اس کے گرفت میں آنے سے پردہ نشیں کی گردن دبوچنے کا مجھے پورا موقع ملنے والا تھا۔

ہم سدو کے ہاں قائد آباد والے گھر میں جا پہنچے۔

سدو، کالیا کو دیکھ کر تھوڑا ہچکچایا مگر میں نے اسے یہ کہہ کر تسلی دی کہ کالیا اور مجھ میں کوئی فرق نہیں تو اسے اطمینان ہوا۔ ہم نے بھیس بدل کر ہوٹل ڈی اسٹار کے لیے روانگی اختیار کی۔ اسکوٹر میں اب کے سدو میرے ساتھ بیٹھا تھا جبکہ کالیا کو میں نے رکشا کرا دیا۔

ہم ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے ہوٹل ڈی اسٹار کے قریب پہنچ گئے جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے کہ یہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل تھا اور وہاں عمومی طور پر داخلے کے کچھ ضوابط ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے ’’واک تھرو‘‘ گیٹ سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ٹائی اور سوٹ بوٹ میں ملبوس عملے کا کوئی فرد آپ کو اندر داخل ہوتے ہی پوچھے گا کہ کیا آپ کا روم یا ٹیبل ریزروڈ ہے؟ (ٹیبل بھی صرف لنچ یا ڈنر کے لیے چائے وغیرہ کے لیے نہیں،

ہاں! البتہ اگر پہلے سے کوئی کمرا بک ہے تو وہ نیچے لاؤنج میں آکر چائے اور دیگر میٹنگ وغیرہ کرنے کے مجاز سمجھے جاتے تھے)۔ میری عام عمومی معلومات کے مطابق اس مہنگے ہوٹل میں چوبیس گھنٹوں کے لیے لوئیکٹگری کا کمرا بھی پندرہ سے بیس ہزار روپے روز تھا جبکہ ڈنر یا لنچ کے لیے کم از کم دو افراد کے لیے ٹیبل "پرہیڈ" کا خرچا بھی کم و بیش اتنا ہی تھا جتنا کہ ایک دن کے کمرے کا کرایہ۔ گویا یہاں پاؤں رکھنے کے لیے پندرہ سے بیس ہزار کا خرچا برداشت کرنے کے مترادف تھا۔ کیونکہ یہ کوئی عام ہوٹل یا ریستوران نہ تھا کہ چند سو میں چائے وغیرہ پی کر چلتے بنے۔

سدو نے پہلے ہی سے ایک کمرا بک کروالیا تھا۔ جو بیس ہزار میں ہوا تھا اور اس نے وہ بیس ہزار کا بل میرے حوالے کردیا تھا جو معاہدے کے مطابق تنخواہ کے علاوہ اضافی خرچ کی مد میں آتا تھا۔ میں نے خنداں پیشانی سے یہ "بل" قبول کرلیا تھا۔

ہم واک تھرو سے اندر داخل ہوئے تو ایک صحت مند گوری چٹی اور دل کش عورت ہمارے قریب آگئی۔ اس نے بہترین تراش کا ڈارک بلیک لیڈیز کوٹ سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ دلنشین سی مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا استقبال کرتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

"سر! ہیو یو اینی ریزرویشن؟"

"یس، روم نمبر 56......" میں نے بھی شستہ انگریزی میں جواب دیا۔ اس کے بعد ہمارا نام دریافت کیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ڈیجیٹل ڈائری تھی۔

"سو نائس، پلیز...... کم آن......" وہ قدرے خم ہوکر بولی۔ ہم آگے بڑھ گئے۔ وہ استقبالیہ کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں ایک بڑی سی نیون سائن نما اسکرین میں آج کی ریزرویش اور بکنگ وغیرہ سے متعلق، بمعہ ناموں کے ٹیکنی کلر کی پٹیاں متحرک تھیں۔ وہ وہاں شاید ہماری کنفرمیشن کے لیے گئی تھی۔ گویا اگر وہاں اسکرین پر ہمارا نام نہ ہوتا تو وہ ہمیں کھڑے کھڑے لاؤنج سے ہی باہر جانے کا راستہ دکھا دیتی۔

اس فائیو اسٹار ہوٹل کی فضا خاموش اور سینٹرل کولڈ تھی۔ وال ٹو وال کارپٹ، فرش پر فلکسڈ کلم بچھا تھا، کوریڈور ... کی طرف چکنا فرش جبکہ فینسی اسٹائل کے اوپر جاتے زینوں پر بھی کارپٹ نظر آتا تھا۔ چھت پر بڑے قیمتی فانوس جھول رہے تھے۔ مدھم آواز میں کہیں آرکسٹرا بج رہا تھا۔

ہم اوپر آگئے۔ اسی خاتون نے ایک نوعمر اور خوب

آنسو (Tears)

آنسو دو طرح کے ہیں، ایک جذباتی اور دوسرے خراش کے زیر اثر پیدا ہونے والے۔ ان کی کیمیائی ساخت بھی باہم مختلف ہے۔ آنسوؤں کا منبع Lachrymal نامی غدود ہیں، جہاں سے آنسوؤں کا مسلسل اخراج ہوتا ہے۔ آنسوؤں سے آنکھیں صاف اور شفاف اور دل و دماغ کو سکون میسر آتا ہے۔ ایک منٹ میں 60 مرتبہ پلک جھپکنے سے آنکھوں کے پپوٹے آلودگیوں کو اس کے اندرونی کونے کی طرف (ناک کی طرف) دھکیلتے ہیں جہاں آنسوؤں کی قلیل مقدار کے ذریعے باریک نالیوں سے اس کی نکاسی ہوتی ہے۔ خراش کے باعث جو آنسو نکلتے ہیں، ان سے نالیاں (Channels) بھر جاتی ہیں۔ 1972ء میں آنسوؤں میں ایک جراثیم کش انزائم کی موجودگی کا پتا چلا جو جراثیم کے خلیوں کی دیواروں کو آنکھ کی سطح پر تباہ کرکے جراثیم کو چند منٹوں کے اندر بے عمل و بے اثر کردیتا ہے۔

مرسلہ: نعمت اللہ، ٹیری کرک

آنسو گیس

چند ٹھوس یا مائع (عموماً مائع) کیمیائی مرکبات جو نہایت تیزی سے بخار بن کر گیس کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔ اس گیس سے آنکھوں میں شدید جلن ہوتی ہے اور بے تحاشا آنسو بہتے ہیں، لیکن عموماً آنکھوں کو نقصان نہیں پہنچتا۔ متاثرہ علاقے سے ہٹ جانے اور آنکھیں دھو لینے سے گیس کا اثر دور ہوجاتا ہے۔ اس گیس سے بچنے کے لیے پانی میں رومال تر کرکے آنکھوں پر رکھ لینا چاہیے۔ عام طور پر Chloxoace to Phenone۔ آنسو گیس استعمال کی جاتی ہے۔ زیادہ تر اسے پولیس احتجاجی لوگوں کو منتشر کرنے کے لیے استعمال کرتی ہے۔

مرسلہ: اظہار الحسن، کراچی

صورت سی غیر ملکی لڑکی کو ہماری رہنمائی کے لیے ساتھ بھیج دیا تھا وہ ہمیں کمرے تک چھوڑنے آئی تھی اور دلکش سی مسکراہٹ کے ساتھ واپس لوٹ گئی تھی۔

لوکیٹیگری کا بھی یہ کمرا بڑا شاندار تھا۔ میں اور کالیا تو اس کے نرم اور آرام دہ بیڈ پر بیٹھ گئے مگر سدو بھائی نے فوراً ہی اپنی ڈیوٹی سنبھال لی تھی۔ آفرین تھا اس شخص پر کہ وہ اپنی تنخواہ پوری پوری حلال کرتا تھا۔

یہاں آکر وہ ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سستایا تھا۔ فوراً ہی دروازے سے چپک گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مطلوبہ کمرا نمبر 57 کو واچ کرر ہا تھا۔ یہ اس کی عقل مندی تھی کہ اس نے 56 نمبر والا کمرا بک کروایا تھا، یعنی مطلوبہ کمرے کے برابر میں...... یہ ساری ہدایات مجھے اسے پہلے دینا چاہیے تھیں مگر اس نے اپنی عقلی صوابدید پر یہ سب پہلے ہی کر لیا تھا اور مجھے اسے کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔

مجھے اس سے معاہدے کے طور پر کی گئیں اس کی وہ شرائط یاد آرہی تھیں جس میں اس نے میرا جاسوس بننے کے لیے ایک یہ بات بھی کہی تھی کہ بعض معاملات میں وہ مجھ سے کسی قسم کا مشورہ کیے بغیر مگر میرے ہی مفاد میں آزادانہ فیصلے کرنے کا مجاز ہوگا اور اس... سلسلے میں، میں اس سے کوئی باز پرس نہیں کروں گا۔ بڑا عجیب مگر پُراعتماد اور ذہین جاسوس تھا۔ مجھے اس کی کارگردگی کا معترف ہونا پڑا تھا اور اس پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے میں نے اسے فری ہینڈ دے رکھا تھا۔

ذرا دیر میں وہ پلٹا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں اور کالیا ہونقوں کی طرح اس کا چہرہ تکنے لگے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ ہمیں کچھ بتائے گا مگر وہ عجیب قسم کی خاموشی میں مستغرق رہا۔ جلد ہی ہمیں اس کی وجہ سمجھ میں آگئی کہ وہ اس طرح اچانک کیوں دروازے سے پلٹا تھا۔ کیونکہ اسی لمحہ دروازے پر ہلکی دستک ہوئی تھی اور سدو نے ہی لیس کہا تھا۔

دروازہ کھلا اور ایک باوردی ویٹر اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں ٹرے تھی جس پر ٹھنڈے پانی کا جگ اور کانچ کے گلاس دھرے تھے۔ اس نے ہمیں ادب سے سلام کیا اور ٹرے ہمارے قریب تپائی پر رکھنے کے بعد بولا۔ ”سر! مزید کچھ چاہیے تو کال کر سکتے ہیں۔“ وہ یہ کہہ کر باہر چلا گیا کہ اس کے کمرے سے نکلتے ہی سدو فوراً حرکت میں آیا اور دوبارہ جا کر اپنی جگہ سنبھال لی۔

چند سیکنڈ بعد وہ پلٹا اور میری طرف دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔

”سر! میں باہر جارہا ہوں اور کمرا نمبر 57 میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ بس اتنا کیجیے گا کہ اس دروازے سے لگ کر کوریڈور میں دیکھتے رہیں اور مذکورہ کمرے میں داخل ہونے والے اس شخص کو نظروں میں لینے کی کوشش کریں جس سے ملنے کے لیے رانا بشیر یہاں کسی وقت بھی پہنچنے والا ہے۔“

”کیا وہ آگئے ہیں؟“ کالیا نے پوچھا۔

”آنے والے ہیں، باہر میدان صاف ہے مجھے جلدی نکلنا ہوگا۔“ وہ بولا۔

”تمہیں ان کی صرف باتیں سننے پر ہی گزارا نہیں کرنا چاہیے، کاش! تم نے ان کی آپس میں ہونے والی گفتگو کو ریکارڈ کرنے کا بھی کوئی بندوبست کیا ہوتا۔“

میری بات سن کر اس نے اپنی شرٹ اونچی کی تو اس کی پینٹ کی بیلٹ میں مجھے ایک ڈیوائس اڑسی ہوئی نظر آگئی۔ میرے چہرے پر حیرت آمیز مسرت دوڑ گئی۔

”میں خفیہ پولیس کا مخبر رہ چکا ہوں سر! ایسی باتوں کو میں بہت پہلے سے خیال کر لیتا ہوں، چلتا ہوں، مجھے ان کا کمرا بھی بگڈ کرنا ہوگا۔“

میں نے اسے جانے کا اشارہ کر دیا۔ وہ نکل گیا۔ میں اور کالیا دروازے کے قریب آگئے اور ایک متوازی اور باریک جھری بنا کر باہر دیکھنے لگے۔ میں اوپر تھا اور کالیا نیچے اکڑوں بیٹھا سدو بھائی کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔ جو مطلوبہ کمرے کے دروازے پر جھکا ہوا کسی ماسٹر کی کے ذریعے قفل کھولنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

اس کا انداز بالکل نارمل تھا، جیسے کوئی شخص بڑے اطمینان سے اپنے کمرے میں داخل ہورہا ہو۔ ایسا اس نے خفیہ کیمروں کو جل دینے کے لیے کیا تھا۔ ذرا ہی دیر میں وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو چکا تھا۔

”ابے لے جگری! تو نے تو ایک سے ایک دنبہ پال رکھا ہے۔“ کالیا نے سرگوشی میں مجھ سے کہا اور باوجود کوشش ضبط کے میرے منہ سے دبی دبی ہنسی برآمد ہوگئی تو میں بولا۔

”ہاں! یہ بڑا کام کا آدمی ہے، ایماندار اور فرض شناس، اس کی وفاداری اپنی جگہ مگر پیسے لے کر کام کرتا ہے یہ میرا، بے چارہ بے روزگار تھا، کسی زمانے میں محکمہ کیرائی (خفیہ پولیس) کے لیے مخبری کرتا تھا۔ لڑائی بھڑائی بھی اسے آتی ہے مگر وہاں اس کی قدر نہ کی گئی تو اس نے وہ لائن چھوڑ دی اور ایک گودام میں چوکیداری کرنے لگا، چاچا انور شاہ نے اسے مجھے

لیک کر دیا تھا۔"

"یار جگری! شکل وصورت سے تو یہ عجیب ہی لگتا ہے۔" کالیا بولا۔

"یہ اس کا دھوکا ہے مگر اپنے مخالفین کے لیے۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "پہلے پہل جب میں نے اسے دیکھا تھا تو میں بھی دھوکا کھا گیا تھا کہ یہ بھلا میرے کیا کام آسکتا ہے مگر جلد ہی اس نے ثابت کر دیا کہ یہ کام کا آدمی ہے۔"

"یہ اب کرنے کیا گیا ہے؟" کالیا نے پوچھا۔

"کمرے میں داخل ہو کے یہ ان دونوں کی گفتگو سنے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"تو یہ کام اسے ہی کرنے دیا جاتا۔ ہمیں یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی پھر......"

"معاملہ اہم نوعیت کا تھا۔ اس لیے میں بھی اس آدمی کو دیکھنا چاہتا تھا جو رانا بشیر کو کسی بات پر بلیک میل کر رہا ہے۔"

"ہمم!" کالیا نے پُرخیال انداز میں ہمکاری بھری تھی۔

معاً ہی میں چونکا۔ کالیا اس وقت تک اکتائے ہوئے انداز میں واپس بیڈ کی جانب پلٹ چکا تھا۔ مجھے چکنے فرش والے کوریڈور میں ایک سوٹ پوش آدمی نظر آیا تھا۔ وہ دراز قامت تھا اور کسرتی جسم کا مالک، اس نے ایک ہاتھ میں سیاہ رنگ کا بریف کیس تھام رکھا تھا۔ چہرے پر کالا چشمہ تھا۔ وہ کلین شیو تھا اور بال کریو کٹ تھے۔ چہرے پر کرخت سی متانت کنڈلی ہوئی تھی۔

جانے کیوں مجھے یہ لگا کہ یہی میرا مطلوبہ شخص ہوسکتا ہے۔ کیونکہ وہ اسی کمرے کے دروازے کے سامنے آکر رکا تھا اور پھر اس نے اپنی جیب سے ایک چابی نکال کر انٹرلاک میں داخل کی تھی۔ اس کے چند سیکنڈ بعد ہی وہ بھی اندر تھا، جہاں سدو پہلے ہی سے چھپنے کی جگہ بنا چکا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی ہو تو لوٹ آؤ جگری!" اچانک عقب سے کالیا کی آواز ابھری۔

"شش......شش......ش" میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ چند منٹوں بعد ہی مجھے اس کوریڈور پر ایک اور شخص تیز تیز قدموں سے آتا دکھائی دیا۔ اس کی حرکات وسکنات سے اضطراب جھلکتا تھا۔

میں اسے پہچان گیا تھا۔ یہ رانا بشیر تھا۔ وہ اسی مذکورہ کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رکا اور ہلکی سی دستک دی۔ دروازہ کھل گیا اور وہ اندر داخل ہوگیا۔ اس کے چند ہی سیکنڈ بعد میں پلٹ کر کرسی پر آبیٹھا۔ میرے چہرے سے جوش سا مترشح تھا۔

"کیا ہوا جگری؟ کچھ دیکھا؟" کالیا نے میرے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا اور میں نے اسے بتا دیا۔

"او......تو اس کا مطلب ہے کام سچل طریقے سے ہو رہا ہے۔" وہ بولا۔

"ہاں! اب دیکھیں، یہ سدو واپس آکر کیا انکشاف کرتا ہے؟" میں نے دبے دبے جوش سے کہا۔

کمرے میں ٹی وی لگا تھا وہ آن تھا۔ وقت گزاری کے لیے میں نے اس پر نظریں جمادیں مگر ذہن کہیں اور تھا جبکہ کالیا کی میں نے دروازے پر ڈیوٹی لگادی تھی۔

دفعتاً میں چونکا۔ ٹی وی پر ایک خبر لائیو دکھائی جارہی تھی۔ طارق روڈ پر ایک بنگلے میں آتش زدگی کا منظر دکھایا جارہا تھا اور ساتھ ایک خاتون رپورٹر اس کے متعلق پورے جوش و خروش سے بتارہی تھی۔

"ناظرین! ہم آپ کو خبر دے رہے ہیں کہ طارق روڈ کے اس بنگلے میں آتش زدگی کا ایک واقعہ ہوا ہے، بتایا جاتا ہے کہ یہ کراچی کے...ایک بڑے بزنس مین رانا بشیر کی رہائش گاہ میں یہ افسوسناک واقعہ پیش آیا ہے، خوش قسمتی سے آتش زدگی کے وقت چوکیداروں اور ایک ملازم کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ مکین کہیں گئے ہوئے تھے۔ گھر کے ملازموں نے ہی فائر بریگیڈ کے محکمے کو فون پر اس کی اطلاع دی ہے جس کے نتیجے میں ریسکیو ٹیم جائے حادثہ پر پہنچ گئی ہے اور تمام ملازمین کو ریسکیو کیا جاچکا ہے۔ کسی جانی نقصان کی اطلاع نہیں ہے مگر بنگلے کے ایک حصے میں آگ پھیل چکی ہے جسے بجھانے کے لیے متعلقہ عملہ مصروف ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ آگ کو پھیلنے سے پہلے ہی اس پر قابو پالیا جائے گا۔"

یہ خبر میں سن رہا تھا اور میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔ رانا بشیر کے بنگلے میں آتش زدگی کا واقعہ......مکین غیر موجود۔ آگ ایک حصے کو متاثر کر چکی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ وہ حصہ کون سا ہوسکتا تھا؟ کیا وہی حصہ جہاں وہ دونوں ڈائریاں رکھی جاسکتی تھیں جو رفعت خانم والے ...... قتل کیس میں اصل قاتل تک پہنچانے کے لیے زبردست معاون ثابت ہوسکتی تھیں؟ اور جسے حاصل کرنے کے لیے میں نے بڑا زور لگایا تھا مگر رانا بشیر نے وہ مجھے دینے سے صاف انکار کر دیا تھا؟

اس کے بعد میں نے پولیس میں جانے کی دھمکی بھی دے ڈالی تھی، کیا یہ اسی دھمکی کا نتیجہ تھی؟

دوراز کار اندیشے، خود بخود ہی میرے ذہن میں ابھرنے لگے تھے اور اس میں کوئی مبالغہ آمیزی نہیں ہوسکتی تھی کہ یہ آگ دانستہ لگوائی گئی تھی اور اس وقت لگوائی گئی تھی کہ رانا بشیر یا اس کی بیٹی فرحانہ گھر پر موجود نہ ہو۔

رفعت خانم مرڈر کیس کی طرف خوش امیدی کے ساتھ بڑھتے ہوئے میرے قدم ایک بار پھر مجھے لڑکھڑاتے محسوس ہونے لگے۔ یہ میں ہی جان سکتا تھا کہ اس آتش زدگی کے پیچھے اصل سازش یا مقاصد کیا ہوسکتے تھے اور یہ کہ... گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے کے شعر کی عملی تفسیر بنا یہ حادثہ گھر کے مکین کا ہی ہوسکتا تھا۔ اس میں رانا بشیر سرفہرست تھا۔

"رانا بشیر چلا گیا ہے۔" معاً کالیا کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں نے ٹی وی کی طرف توجہ دینے کا اشارہ کیا اور خود دروازے کی طرف بڑھا۔ جھری سے جھانکا تو میں نے اسی سوٹ پوش دراز قامت شخص کو نکلتے پایا۔

"کالیا تو سدو کے ساتھ آجانا۔ میں اس آدمی کے تعاقب میں جارہا ہوں۔" میں نے کالیا سے کہا اور اپنے کمرے کا دروازہ کھول کے باہر نکل آیا۔

اس آدمی کے تعاقب میں باہر آیا تو اسے ایک وائٹ کیب میں سوار ہوتے دیکھا۔ یہ کار پرسنل بکنگ کے لیے ہوتی تھی۔ میں فوراً اپنی اسکوٹر کی جانب بڑھ گیا اور ذرا ہی دیر بعد تعاقب شروع ہوگیا۔

کار بندرگاہ جا کر رکی تھی اور وہ شخص نیچے اتر کر سیدھا گیٹ کی طرف جاتا نظر آیا تھا۔ اس شخص کو بندرگاہ کا رخ کرتے دیکھ کر مجھے کچھ حیرت ہوئی تھی۔ میں اسے اب تک زیادہ قریب سے نہیں دیکھ سکا تھا۔ تاہم اب کچھ شبہ پڑتا تھا کہ یہ کوئی غیر ملکی ایشیائی یا کوئی مڈل ایسٹ کا آسودہ حال باشندہ لگتا تھا۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔

کراچی سی پورٹ اس وقت روشنیوں میں جگمگا رہا تھا۔

یہاں میرا ایک کاروباری دوست فرقان بھی ہوتا تھا جو فارورڈنگ اینڈ کلیئرنگ کا کام کرتا تھا۔ میں نے اس سے رابطہ کیا اور اس نے مجھے اندر بلالیا۔

فرقان کے لیے ہمارے گڈز کے ٹرک آتے جاتے رہتے تھے۔ اسے کمیشن ملتا تھا اور ہمیں گاہک۔ بس! دوستی کی یہی نوعیت تھی۔ اس وقت یہ بھی مجھے غنیمت نظر آئی تھی۔

میں اس کے سہارے بندرگاہ میں داخل ہوا اور اس کے پاس تھوڑی دیر میں آنے کا کہہ کر اس دراز قامت آدمی کو تلاش کرنے لگا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔

میں برتھ نمبر 9 پر آیا تو یہاں مجھے ایک متحرک کرین کے سائے تلے گتے کے "بستر" پر ستانے کے لیے لیٹے ہوئے ایک مزدور پر نظر پڑی۔ اس نے میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور وہ بیڑی پی رہا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اس نے کسی سوٹ پوش شخص کو دیکھا ہے جس کے ہاتھ میں بریف کیس بھی تھا، ساتھ ہی میں نے اس کا ناک نقشہ بھی بتا دیا اس نے لیٹے لیٹے ایک طرف اشارہ کردیا۔

یہ جیٹیز کی طرف جانے والا راستہ تھا جہاں ڈیپ سی ٹرمینلو بنے ہوئے تھے۔ ایک ایسی ہی گودی کے قریب پہنچا تو میں ٹھٹک گیا، وہی مطلوبہ شخص مجھے تیز تیز قدموں سے جاتا نظر آگیا۔ میں کنٹینرز کی آڑ لیتا ہوا اس کے تعاقب میں چلتا رہا تو جلد ہی اس کے ساتھ تین اور افراد آن ملے۔ وہ کھڑا ہوگیا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔ پھر چاروں آگے بڑھے۔ ان میں صرف ایک موٹا شخص مجھے مقامی محسوس ہوا تھا باقی، سوٹ پوش سمیت غیر ملکی تھے۔ میں نے دیکھا وہ ایک جہاز میں سوار ہورہے تھے۔ جس کے پھریرے پر سی گوڈیز یعنی سمندری دیوی نام کا ایک پھریرا لہرا رہا تھا اور اس کی باڈی پر بھی یہی نام لکھا تھا۔ جہاز خاصا بڑا اور خوبصورت تھا۔ اس کی باڈی پر سفید اور نیلا رنگ تھا۔ جہاز کی لائٹیں روشن تھیں۔

سی گوڈیز تھا تو باربردار جہاز مگر اس کی سامنے کی بناوٹ سے لگتا تھا اس میں رہائش کا بھی خاطر خواہ بندوبست کیا گیا ہوگا۔ یعنی ذرا لگژری انداز اختیار کیا ہوگا۔

میں نے کچھ سوچ کر سیدھا فرقان کے آفس کا رخ کیا۔ وہ میرا ہی منتظر تھا۔ وہ ایک خوش شکل اور شادی شدہ نوجوان تھا۔ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور باپ بیٹے دونوں کاروبار سنبھالتے تھے۔ اس وقت اس کا باپ دوسرے کمرے میں موجود تھا۔

"زہے نصیب نعمان صاحب! آج کیسے اس غریب خانے کا راستہ بھول گئے؟" وہ مجھے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرایا۔

میں نے بھی موقع کی مناسبت سے تھوڑا بے تکلف ہونا ضروری سمجھا اور اسی انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "یار! یہ غریب خانہ تو نہیں ہے، اتنا شاندار آفس بنا رکھا ہے، میرا تو

ایسا نہیں ہے۔"

"اب کسر نفسی چھوڑ دو اور یہ بتاؤ کیا منگواؤں؟" اس نے کہا۔ میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا آفس روم واقعی شاندار تھا۔

"بس یار! چائے منگوالو۔ زحمت نہ ہو تو پہلے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلا دو۔"

"شیور۔" اس نے اسی وقت انٹرکام پر پانی اور چائے کا کہا اور میری طرف متوجہ ہو کے بولا۔ "لگتا ہے آج خود ہی کوئی کانٹریکٹ لے کر آئے ہو۔ یقیناً اہم نوعیت کا ہوگا۔" وہ فوراً کاروباری گفتگو پر اتر آیا۔

"ہاں یار! کچھ ایسی ہی بات ہے۔" میں نے کہا۔ میں جانتا تھا کہ اس ٹھیٹ کاروباری سے اس کے مقصد کے بنا بات کرنا فضول تھا اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس کے فائدہ والی بات کرنا ہوگی ورنہ بات نہیں بنے گی۔ میں رکا اور سانس لے کر بولا۔ "تمہیں تو معلوم ہوگا کہ ہم نے اپنے اڈے کا ایک حصہ کسی پارٹی کو ٹھیکے پر دے رکھا تھا۔ گڈز کے معاملات وہی پارٹی سنبھالتی تھی، ہمیں تو صرف اپنے کرائے سے مطلب تھا مگر اب ہم نے انہیں فارغ کرنے اور پبلک کے ساتھ گڈز کا کام بھی اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"ویری نائس! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" وہ ایک دم خوش ہو کے بولا۔ "سچی بات بتاؤں، میں تو خود حیران ہوتا تھا کہ زمین تمہاری کام تمہارا، عملے کی بھی تمہارے پاس کمی نہیں، پھر بھلا خود کمائی کرنے کی بجائے دوسری پارٹی کے ساتھ یہ معاہدہ کرلیا؟"

"یار اس وقت پیسوں کی کمی تھی۔ گڈز کے لیے ٹرکوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب حالات کچھ بہتر ہوئے تو سوچا لون وغیرہ لے کر کم از کم پانچ دس وہیلر ٹرک خرید کر بسم اللہ کردی جائے۔"

"بہت اچھا خیال ہے۔" وہ بولا۔

اثنائے گفتگو...... ایک ملازم پانی اور چائے لے آیا۔

میں نے پانی پیا اور چائے کے کپ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ایک چسکی لے کر میں نے کپ میز پر رکھا اور اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "یار! میں کچھ اپورنیس کے سلسلے میں تمہارے پاس آیا تھا۔ مال کی نوعیت، رسد و ترسیل اور ٹیکسز، ڈیوٹیز کے بارے میں کچھ جان کاری ہوجاتی تو میں بھی کچھ سیکھ لیتا۔"

"شیور...... یہ کون سی بڑی بات ہے۔" وہ بولا۔ "چائے ختم کرو...... میں ابھی تمہیں بندرگاہ کی سیر کروائے

لاس اینجلس اولمپکس (امریکا) پاکستان ہاکی کی تاریخ میں کئی طرح سے اہم اور یادگار ہے، لاس اینجلس اولمپکس کے لیے پاکستان ہاکی ٹیم نے بھرپور تیاری کی لیکن ابتدائی مقابلوں میں پاکستان کی کارکردگی نے مایوس کیا۔ رفتہ رفتہ ٹیم نے سنبھالا لیا۔ اور پھر میدان سے فاتح بن کر نکلی۔ یوں سولہ سال بعد پاکستان ایک مرتبہ پھر اولمپکس چیمپئن بنا۔ ہالی ووڈ کے قریب لاس اینجلس کلوزیئم اسٹیڈیم میں 23 ویں اولمپکس کا افتتاح ایک لاکھ تماشائیوں کے درمیان امریکا کے صدر ریگن نے کیا۔ رنگا رنگ افتتاحی تقریب کو مصنوعی سیارے کے ذریعہ دنیا بھر کے تقریباً دو ارب اسّی کروڑ افراد نے ٹیلی ویژن اسکرین پر دیکھا۔ افتتاح کے موقع پر گرجاؤں میں گھنٹیاں بجیں۔ استقبالیہ گیت گائے گئے۔ اولمپکس میں شریک تمام ممالک کے جھنڈے لہرائے گئے جس کے بعد اولمپکس کا نغمہ فضا کی وسعتوں میں گونجا۔ پھر ایک امریکی ایتھلیٹ نے اولمپکس مشعل روشن کی شریک کھلاڑیوں کی جانب سے رکاوٹوں کی دوڑ میں عالمی ریکارڈ قائم کرنے والے امریکی ایتھلیٹ ایڈون موسس نے حلف اٹھایا، افتتاحی تقریب میں ایک لاکھ ایک سو اکتالیس ممالک کے آٹھ ہزار کھلاڑیوں نے شرکت کی۔

مرسلہ: احسن حبیب، پشاور

دیتا ہوں اور کچھ ضروری امور کے سلسلے میں بریفنگ بھی دے دوں گا۔"

"بڑی مہربانی یار تمہاری میں نے تمہارا قیمتی وقت ضائع کیا۔"

"لو اس میں وقت ضائع کرنے والی کون سی بات ہوئی بھلا۔" وہ بولا۔ "یہ تو ہم دونوں کی کاروباری مجبوری ہے۔" وہ ہنسا۔

میں نے دل میں اس کے باپ کو داد دی تھی کہ اس نے اپنے بیٹے کی کیسی خالص کاروباری انداز میں تربیت کی تھی کہ کم بخت کاروبار کے سوا اور کوئی بات کرنے پر تیار ہی نہ تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں نے بھی اپنا اصل مقصد حاصل کرنے کے لیے اس کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہا تھا۔

میں نے چند ہی چسکیوں میں اپنی چائے ختم کر دی اور وقت ضائع کیے بغیر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے مجھے پورے بندرگاہ کی سیر کرا ڈالی۔ گہری جیٹیز کی طرف بھی لے گیا جہاں بڑے بڑے ملکی و غیر ملکی جہاز لنگر انداز تھے جن پر اونچی کرینوں سے ڈیو ہیکل کنٹینرز لوڈنگ اور ان لوڈنگ کیے جا رہے تھے۔ یہ سارے جہاز برآمدات و درآمدات کے لیے تیار کھڑے تھے۔ انہی میں مجھے سی گوڈیز نامی جہاز بھی نظر آ گیا میں دانستہ اس طرف کو بڑھ گیا اور اپنے چہرے پر مصنوعی اشتیاق طاری کرتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔

"یہ ایک خلیجی شیخ بن رائد کی آئل کمپنی "گلفو آئل کا جہاز ہے۔"

اس نے بتایا اور میرا دل اپنی چالاکی پر مسرت سے یکبارگی زور سے دھڑکا۔

"اچھا......! خوب ......" میں نے متاثر ہو جانے والے انداز میں کہا تو وہ آگے بتانے لگا۔

"بن رائد کے علاوہ اس کمپنی کا ایک ڈائریکٹر شاہ میر ہے جو پاکستان کا ہی رہنے والا ہے۔ ادھر ہی ڈیفنس میں رہائش پذیر ہے مگر زیادہ تر ملک سے باہر ہی رہتا ہے۔"

اس نام پر میرا دل پھر زور سے دھڑکا۔

"یہ جہاز مشرق وسطیٰ سے آئل ٹینکرز لے کر آیا ہے۔ ایک بڑی شپمنٹ ہے یہ......" حسب توقع مجھے اس جہاز میں محو پا کر فرقان بولتا رہا اور میں سنتا رہا۔

"یہاں تقریباً ہزاروں کارگو اور مائع کارگو کی ہینڈلنگ ہوتی ہے۔ مختلف کمپنیوں کے مزدور دن رات یہاں کام کرتے ہیں، ہر وقت ایک گہما گہمی کا سماں بندھا رہتا ہے۔" پھر لمحہ بھر کو توقف کرنے کے بعد معنی خیز لہجے میں بولا۔ "لگتا ہے مستقبل قریب میں تمہارا بھی ایکسپورٹ امپورٹ کا ارادہ ہے۔"

میں اس کی بات سن کر جان بوجھ کر چور سے انداز میں مسکرایا۔ اب اسے کیا معلوم تھا کہ میں کیا تھا۔ وہ مجھے لاری اڈے اور گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کا کوئی بڑا تاجر سمجھتا آ رہا تھا۔ حالانکہ میں تو وہاں ایک ملازم تھا۔ یہ تو عطا صاحب کی خاص مہربانی تھی مجھ پر کہ انہوں نے سب کچھ میرے حوالے کر رکھا تھا۔ اسی مغالطے میں وہ مجھے بڑا تاجر سمجھ رہا تھا۔ یوں بھی اس سے قبل فرقان سے کبھی اتنی بات چیت نہیں ہوئی تھی جتنی کہ آج ہو رہی تھی۔

"ہاں یار! کچھ ایسا ہی ارادہ ہے تو سہی مگر یار تجربہ نہیں ہے۔"

"ارے ہمت تو پکڑو۔ تجربہ آہستہ آہستہ ہو ہی جاتا ہے۔" وہ حوصلہ دلانے سے زیادہ مجھے ترغیب دینے کے انداز میں بولا۔ "اب ہمیں ہی دیکھ لو۔ پاپا نے جب فارورڈنگ اینڈ کلیئرنگ کا کام شروع کیا تھا تو ہمارے پاس ایک بھی warehouse (گودام) نہ تھا، حالانکہ اس کاروبار میں ہاتھ ڈالنے والا تب ہی ایکسپورٹر اور امپورٹر سے مالی فائدہ اٹھاتا ہے جب اس کا اپنا ویئر ہاؤس ہو لیکن آج دیکھو ہمارے پاس ایک نہیں دو نہیں، پورے چار ویئر ہاؤس ہیں۔" اس کے لہجے میں فخر تھا۔

"ہمم!" میں نے یوں ہنکاری بھری جیسے میں اس کی باتوں اور مشورے پر غور کرنے کی کوشش کر رہا ہوں حالانکہ اس وقت میرا سارا دھیان اس سمندری دیوی میں سوار ہونے اور اس آدمی کے بارے میں کھوج لگانے پر تھا۔

"تم ابتداء تو کرو باقی inco term (کاروباری قواعد وضوابط) میں تمہیں سمجھا دوں گا، باقی کام کے لیے ہم حاضر ہیں۔ مال اور منافع تمہارا کمیشن ہمارا۔"

"بہت اچھا مشورہ ہے۔ میں غور کروں گا۔" میں نے اسی انداز میں کہا اور پھر سی گوڈیز کی طرف دیکھا۔ "یار فرقان! کبھی میں نے جہاز اندر سے گھوم کر نہیں دیکھا ہے، مجھے ذرا یہ جہاز دیکھنے کا شوق ہو رہا ہے، تم نے تعریف بھی اتنی کر ڈالی کہ میرے دل میں بچوں جیسی خواہش جگا دی۔" وہ ہنسا اور بولا۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں، بڑی سنسنی ہے اس کاروبار میں آ جاؤ یہاں...... ملک ملک گھومنے کے مواقع بھی ملتے رہیں گے۔ چلو اندر یہ ہمارے ہی کلائنٹ ہیں۔"

اس نے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور میرا دل عجیب سی سنسنی سے دھڑک اٹھا۔ اس لیے نہیں کہ میں ایک بڑے جہاز کے اندر کی سیر کرنے والا تھا بلکہ اس لیے کہ اندر میں ایک اہم آدمی کے بارے میں جان کاری حاصل کرنے والا تھا جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ یہ "پردہ نشیں" کا ہی کوئی ٹاؤٹ ہے۔ اگرچہ سدو بھائی نے بھی رانا بشیر اور اس کے درمیان میں ہونے والی گفتگو سن لی ہوگی اور وہ بھی اچھی خاصی معلومات مجھے دینے والا تھا مگر جہاں تک میں اپنا کام کر سکتا تھا وہ میں ضرور کرتا تھا اور یہی میں کر رہا تھا۔

ہم سی گوڈیز کی طرف بڑھے، ڈیک پر ہمیں ایک آدمی کھڑا نظر آیا جو ہماری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ فرقان نے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا تھا۔ اس نے بھی جواب میں ایسا ہی کیا

مگر دوسرے ہی لمحے وہ عرشے سے غائب ہو چکا تھا۔ فرقان مجھے لے کر جہاز کی اسٹیپ ریلنگ کی طرف بڑھا اور میں اس کے پیچھے تھا۔ جہاں چکنے ہوئے اسپاتی اسٹیپ ختم ہوتے تھے وہاں ایک دروازہ تھا جبکہ دائیں جانب کوریڈور نما راستہ تھا جو بل کھاتا ہوا اوپر ڈیک کی طرف جاتا نظر آیا۔ مجھے اس بات کا خدشہ بھی تھا کہ وہ مطلوبہ شخص مجھے پہچان بھی سکتا ہے، بشرطیکہ وہ اس ''پردہ نشیں'' کا کوئی مقرب خاص کارپرداز ہوا تو مگر مجھے اس کی پروا نہ تھی۔ اگر ایسا ہوا بھی تو وہ پریشانی میں مبتلا ہو سکتے تھے اور یہی میرا مقصد تھا، کیونکہ ایسے میں دشمن کھل کر سامنے آتا اور غلطیاں بھی کر بیٹھتا میں خود بھی چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ ''پردہ نشیں'' اور اس کی حقیقت کھل کر میرے سامنے آجائے۔

ذرا ہی دیر بعد ہم ڈیک پر تھے۔ میں نے اپنے چہرے پر اشتیاق طاری کیے رکھا تھا۔ یوں بھی یہ میرا پہلا تجربہ تھا کہ میں کسی جہاز پر سوار ہوا تھا۔ بڑا ہی عجیب اور سنسنی خیز سا تجربہ محسوس ہو رہا تھا۔ حالانکہ جہاز گودی میں رکا ہوا تھا ایک ولولہ انگیز سی مہم جوئی کا احساس ہو رہا تھا۔ آبی ہواؤں کے مست خرام جھونکے بڑے بھلے محسوس ہو رہے تھے۔

وہاں مجھے عملے سے متعلق چند افراد کی عمومی نقل و حرکت دکھائی دی۔ جن کے بارے میں فرقان نے مجھے بتایا کہ اس جہاز کے خلاصی ملاوی اور اسٹاف کے لوگ سیلونی تھے مگر ان میں دو تین مقامی افراد بھی نظر آئے، ایک تو ذرا پکی عمر کا تھا جبکہ باقی دو نوجوان سے تھے، انہی دو میں سے ایک نوجوان کو دیکھ کر میرے ذہن میں شناسائی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ وہ ایک صحت مند سانولا جوان تھا۔ رنگ کالا تھا۔ آنکھیں چھوٹی تھیں اور شکل وصورت سے وہ خاصا غصہ ور اور اکھڑ مزاج دکھائی دیتا تھا۔ وہ عرشے پر پھیلے ہوئے رسوں کا ڈھیر سنبھالنے میں مصروف تھا اور میں بارہا ذہن پر زور دیتا رہا کہ اسے آخر میں نے کہاں اور کب دیکھا تھا مگر یاد نہ آسکا۔

ڈیک کے تقریباً وسط میں تین چار فولڈنگ کرسیاں اور ایک میز رکھی ہوئی تھی۔ وہاں ایک آدمی بیٹھا تھا۔ میز پر پانی کی بوتل رکھی تھی اور دو کانچ کے گلاس تیسرا گلاس اس شخص کے ہاتھ میں تھا۔ وہ خاصا کسرتی جسم کا دکھائی پڑتا تھا۔ اس نے بنیان ٹائپ سی شرٹ پہن رکھی تھی، نیچے چست پتلون تھی۔ رنگ سانولا تھا۔ اس پر بھی مجھے غیر ملکی ہونے کا شبہ تھا۔ اس کے چہرے پر کوچی سی داڑھی تھی جسے شاید عام فہم میں کوچی داڑھی کہا جاتا ہے۔

فرقان اسی آدمی کی سمت بڑھا تھا۔ وہ بھی ہماری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ قریب سے وہ مجھے خاصا بدمعاش قسم کا آدمی محسوس ہوا تھا۔ مجھے تھوڑا خطرے کا بھی احساس ہونے لگا۔ تاہم کچھ تسلی تو تھی کہ فرقان میرے ساتھ تھا اور اگر یہ مجھے پہچان بھی لیتے تو بھی میرا نہیں خیال تھا کہ وہ مجھے کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے۔

''ہیلو! مسٹر راکا!! ہاؤ آر یو؟'' فرقان شناسا انداز میں اس سے مخاطب ہو کے بولا۔ اس نے کھڑے ہونے کی زحمت بھی گوارا نہ کی اور ہاتھ میں پکڑا گلاس رکھ کر مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا اور ایک نظر میرے چہرے پر بھی ڈالی تھی۔ جس پر میں نے بھی بہ غور اور بھانپنے کے انداز میں اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش چاہی تھی۔ میں ایسا کچھ بھی محسوس نہ کر سکا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ وہ مجھے پہچان رہا ہے، ہاں البتہ مجھے دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر کچھ ناپسندیدگی کے آثار ضرور نمودار ہوئے تھے۔ ممکن تھا اس کی وجہ کچھ اور رہی ہو۔

فرقان نے اس کی سرد مہری کا ذرا بھی برا نہیں منایا تھا۔ اس کے چہرے پہ ہنوز کاروباری خوش خلقی کی مسکراہٹ چپکی ہوئی تھی۔ وہ اسی کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے بھی بیٹھنے کو کہا۔

''یہ مسٹر بن رائد نظر نہیں آرہے ہیں؟ کیا کہیں گئے ہوئے ہیں؟'' فرقان نے راکا نامی اس کرخت رو آدمی سے دریافت کیا۔ میں بظاہر خاموش بیٹھا تھا۔ راکا نے تھوڑا کسمسا کر جواب دیا۔

''وہ ادھر ہی ہیں، ابھی آئے ہیں، اپنے کمرے میں آرام کر رہے ہیں۔ ابھی تو وہ کسی سے نہیں مل سکتے۔'' اس کا لب ولہجہ عرابک تھا مگر وہ اردو بھی اچھی بول رہا تھا۔

''او کے کوئی بات نہیں؟'' فرقان نے کہا اور پھر میری جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ میرے کاروباری دوست ہیں۔ مسٹر نعمان! اچھا تمہارا شکریہ، ہم چلیں گے۔'' فرقان نے کہا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی کرسی چھوڑ دی مگر نظریں راکا نامی اس آدمی کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ میرا نام بتانے پر راکا چونکا تھا۔ اس کی بھی تیز سی برماتی نظریں میرے چہرے پر گڑھ کر رہ گئی تھیں۔ میں اور فرقان اس سے بغیر مصافحہ کیے پلٹے تو اس نے آواز دی۔

''مسٹر فرقی! ایک منٹ!'' فرقان رک کر اس کی جانب پلٹا اور میں بھی۔

''آپ نے باس سے کوئی ضروری بات کرنی ہے تو میں

انہیں بلالیتا ہوں؟''

''نہیں کوئی خاص نہیں، بس! یوں ہی میرے دوست لومی کا موڈ ہوا تھا کہ میں اسے جہاز کی سیر کرادوں۔'' باس سے اس کی مراد یقیناً بن رائد ہی ہوگا، بشرطیکہ وہ میرا وہی مطلوبہ شخص ہو جس کا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔

''ہاں تو ٹھیک ہے، کرادو سیر اندر لے جاؤ انہیں۔'' راکا بولا۔ اس کی اچانک ہم میں غیر معمولی سی دلچسپی کو ابھرتے دیکھ کر فرقان حیران ہوا تھا میں نہیں، کیونکہ میں اس ''دلچسپی'' کی وجہ شاید سمجھ رہا تھا۔

''نہیں، پھر بھی، بن رائد صاحب بھی آرام کر رہے ہیں، خوامخواہ ڈسٹرب ہو جائیں گے۔ تمہارا شکریہ۔'' فرقان نے کہا۔ لگ رہا تھا کہ اب فرقان بھی اس سے جان چھڑانے کے موڈ میں ہے۔

''وہ جاگ رہے ہوں گے، انہوں نے شاید تم سے کچھ ضروری بات بھی کرنا ہے۔ وہ تمہارے آفس آنے کا ہی ارادہ کیے ہوئے تھے۔'' راکا نے کہا۔

کہاں تو وہ ہم سے جان چھڑانے کے لیے سیدھے منہ سے بات تک نہیں کر رہا تھا اور اب جیسے ہمیں واپس جانے سے روکنے پر تلا بیٹھا تھا۔ پل کے پل میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا مگر دوسرے ہی لمحے میں نے خود کو یہ تسلی دے کر پُرسکون کر دیا کہ اگر یہ مجھے کسی حوالے سے پہچان بھی جاتے ہیں تو ان کی اتنی جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے اس عظیم الشان جہازسی گوڈیز کو میدان جنگ بنا ڈالتے۔

''کم پلیز۔'' راکا کہتا ہوا۔ اس طرف بڑھ گیا جہاں ایک رہائشی حصے کے کیبن کی دیدہ زیب اسکرین اور گول کھڑکیاں نظر آرہی تھیں۔ اندر سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اسی وقت راکا نے بڑھتے ہوئے قدموں کے ساتھ جیب سے لمبا سا کوئی واکی ٹاکی ٹائپ فون نکالا اور کسی سے بات کرنے لگا۔

''عجیب ہی آدمی ہے۔'' فرقان ہولے سے بڑبڑایا۔ ''چلیں اندر؟''

''چلتے ہیں۔ کیا مضائقہ ہے؟'' میں نے مسکرا کہا۔

''تمہیں اس کا اندازِ تخاطب برا تو لگا ہوگا۔'' اس نے راکا کے پیچھے قدم بڑھاتے ہوئے ہولے سے کہا۔

''کیا کریں یار! امیر لوگ ہیں، تیل کے کنوؤں کے مالک ہیں اور ہم جیسے چھوٹے آدمیوں کے لیے موٹی آسامیوں والے گاہک بھی، برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ جب تم اس کاروبار میں آؤ گے تو اندازہ ہو جائے گا۔''

''کوئی بات نہیں یار! کرنا پڑتا ہے، چلتے رہو۔ ویسے تم اگر اس کے ساتھ عربی میں بات کرتے تو شاید معاملہ کچھ اور ہوتا۔'' میں نے بھی ہولے سے کہا۔

''ایسی بات نہیں، ویسے عربی مجھے بھی تھوڑی بہت آتی ہے، جسے سیکھنا ہماری کاروباری مجبوری کہئے'' وہ بولا۔

تھوڑی دیر بعد ہم ایک خوبصورت سی راہ گزر سے اندر کیبن میں آگئے۔ کیبن میں دو سفید رنگ کے تیز پاور والے بلب روشن تھے اور ان کی روشنی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔

کیبن خاصا کشادہ اور لگژری انداز کا تھا۔ ضرورت کی کیا شے نہیں تھی جو یہاں دکھائی دیتی ہو۔ ٹی وی، کمپیوٹر، ایل ای ڈی، فون اور دیوار گیر میز کرسیاں نرم گرم آرام دہ بنک بیڈ (bunk bed)، کیبنٹس سبھی کچھ تھا۔

ایک آرام سی کرسی پر میں نے اسی شخص کو بڑے ٹھسے سے براجمان دیکھا تھا۔ اس نے فرقان کی طرف ایک نظر ڈالنا گوارا نہ کیا جبکہ مجھ پر اس کی برماتی نگاہیں کھب کر رہ گئی تھیں۔ وہ اس وقت اپنے مخصوص اور کھلے ڈلے لباس، یعنی سفید رنگ کے جبے اور کفہ میں ملبوس تھا۔ ایک ہاتھ میں سلگتا ہوا سگار دبا ہوا تھا۔ چہرے پر چشمہ بھی نہیں تھا اور مجھے اس کے چہرے پہ ایک تبدیلی نظر آئی تھی، اس کی بائیں آنکھ پر سیاہ رنگ کا چرمی فلیپ چڑھا ہوا تھا۔

ایک کونے میں بار کاؤنٹر سا بنا ہوا تھا۔ وہاں بھانت بھانت کی ولایتی شرابوں کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں، وہیں ایک اونچے اسٹول پر ایک اینگلو انڈین حسینہ جو ٹائٹ قسم کی پینٹ شرٹ میں ملفوف تھی، اسی اسٹول پر اپنی لچکیلی کمر کو قیامت خیز انداز میں خم دیئے، یوں بیٹھی تھی کہ اس کی ایک کہنی کاؤنٹر کے ساتھ ٹکی ہوئی تھی اور دوسرے ہاتھ میں وائن کا بلوریں پیگ تھا۔

فرقان نے بڑے خوش آمدی انداز میں اسے جھک کر سلام پیش کیا جو کسی کورنش بجالانے سے کم نہ تھا۔ بن رائد نامی اس شخص نے ہمیں سامنے بچھے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''رائد صاحب! یہ میرے دوست ہیں مسٹر نعمان۔'' فرقان نے میرے تعارف سے گفتگو کی ابتداء کرتے ہوئے کہا۔ ''بندرگاہ کی سیر کرتے ہوئے ان کی نگاہ اس شاندار جہاز سی گوڈیز پر پڑی اور پھر انہوں نے اس کی سیر کی فرمائش کر ڈالی۔''

میرا خیال تھا کہ میرے مشورے کے مطابق فرقان اس

سے تو ضرور عربی میں ہی بات کرے گا مگر ایسا نہیں کیا تھا اس نے۔

''ہمم!'' بن رائد نے اپنی اکلوتی آنکھ سے میری طرف گھورتے ہوئے اپنے حلق سے ایک سنسناتی ہوئی ہمکار خارج کی تھی۔ میں بھی بظاہر ہولے سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا مگر اندر میرے ایک شورش سی جاری تھی کہ کیا واقعی یہ یا اس کا ساتھی راکا مجھے پہچان چکے تھے اور یہ بھی کہ میں یہاں سی گوڈیز کی شان سے ہی متاثر ہوکے اس کی سیر کرنے آیا تھا یا پھر میرا مقصد کچھ اور تھا؟

تب ہی پل کے پل میں نے اپنے اندر کی الجھی ہوئی اور پریشان کن کیفیات پر فوراً ہی قابو پاتے ہوئے ایک دم خود اعتمادی پیدا کی اور بن رائد سے مسکرا کر بولا۔

''بہت خوب رائد صاحب! باہر سے بظاہر ایک کارگو شپ نظر آنے والا سی گوڈیز واقعی اندر سے بہت شاندار ہے۔ آپ مشرق وسطٰی کی کون سی ریاست سے تعلق رکھتے ہیں؟ ویسے آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' میرے پُراعتماد استفسار پر اس نے گمبھیر سے لہجے میں جواب دیا۔

''میرا تعلق عمان سے ہے، آج کل امارات میں ہوں۔''

''یقیناً آپ کسی بڑی آئل کمپنی کے مالک ہوں گے۔'' میں نے اسے کریدا۔ وہ چپ رہا، تاہم اس نے اپنی گھنی بھنویں یوں سکیڑ لیں جیسے میرے سوال پر وہ کچھ الجھ سا گیا ہو، حالانکہ میں نے ایسا کچھ مشکل سوال بھی نہیں پوچھا تھا۔ اس کی مشکل کو فرقان نے فوراً حل کرتے ہوئے بن رائد کی بجائے اسی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے جواب دیا۔

''نعمان! میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ ہمارے یہ معزز مہمان بن رائد ایک بڑی آئل کمپنی گلفو آئل فیلڈ کے... ڈائریکٹر ہیں جس کے چار حصے دار ہیں۔ دو امارات سے تعلق رکھتے ہیں اور باقی دو کا تعلق یورپ سے ہے۔''

''گڈ!'' میں نے مختصراً کہا اور دزدیدہ نظروں سے بن رائد کی طرف دیکھا۔ حسبِ توقع مجھے فوراً ہی محسوس ہوا تھا کہ وہ بتانے سے کترا رہا تھا اس کا جواب فرقان کو دیتے پا کر وہ کچھ کسمسا گیا تھا۔ تب ہی اس نے شاید میرے کسی اگلے سوال سے بچنے کے لیے مجھ سے پوچھا۔ ''تم کیا کرتے ہو مسٹر نعمان؟''

''میں ایک پبلک اینڈ گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی چلاتا ہوں۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔ گفتگو گویا ایک دوسرے کی کنفرمیشن حاصل کرنے کی حد پر محسوس ہو رہی تھی۔

''ہمم۔'' بن رائد نے پھر ہمکاری بھری۔

''کیا پیو گے؟'' اس نے فرقان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''تھینکس بس اب اجازت دیجیے۔'' کہتے ہوئے فرقان نے کرسی چھوڑ دی۔ میں بھی بن رائد کی طرف بظاہر مسکراتی نظروں سے دیکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بھی روکنے کی کوشش نہ کی۔ اینگلولڑکی اسٹول سے اٹھ کر بن رائد کی طرف جا رہی تھی جبکہ راکا اس کے بالکل قریب آ گیا تھا اور جب میں دروازے سے باہر نکلنے لگا تو وہ بن رائد کے کان میں جھک کر کچھ کہہ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم آفس میں تھے۔

''مزہ آیا؟'' فرقان نے پوچھا۔

''ہاں یار! اب تو سنجیدگی کے ساتھ کچھ سوچنا پڑے گا۔'' میں نے اپنے ذہن طباع میں دور اندیشی کی کھچڑی تیار کرتے ہوئے اس سے کہا تاکہ اس کی مجھ میں دلچسپی برقرار رہے اور میں اپنا اصل مقصد حاصل کرتا رہوں۔''

''سوچ رہا ہوں اپنی ٹرانسپورٹ کمپنی فروخت کر کے میں بھی اسی کاروبار میں آ جاؤں ویسے یار! ایک مشورہ دو گے؟''

''ہاں...... ہاں کیوں نہیں ...... بولو؟'' فرقان اپنی آنکھیں روشن کرتے ہوئے بولا۔

''یار! کیا خیال ہے اگر میں آئل فیلڈ میں کچھ لگانے کی کوشش کروں؟''

''بہت سرمایہ چاہیے اس کے لیے دوست!'' وہ بولا۔ ''تمہاری ٹرانسپورٹ کمپنی بھی بک جائے تو بھی اس کا عشرِ عشیر تیل کے کاروبار میں لگانا ایسا ہے جیسے اونٹ کے منہ میں زیرہ۔''

''تم سمجھے نہیں۔'' میں نے بات بنائی۔ ''میں حصے داری کی بات نہیں کر رہا تھا۔ درآمد اور برآمد کی بات کر رہا تھا۔''

''یہ ہوئی ناں بات۔'' فرقان ایک دم خوش ہو کر بولا اور کرسی سے تھوڑا اٹھ کر میرے سامنے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے بھی مسکرا کر اس کا ہاتھ گرمجوشی سے لے کر دبایا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہیں میں یہی مشورہ دے رہا تھا۔ ادھر کا مال ادھر اور ادھر کا مال ادھر کرو۔ دولت سے

کھیلو گے۔“

یہ سب کچھ میں محض فرقان کی کاروباری فطرت کے مطابق کہہ رہا تھا ورنہ اوّل تو میں کسی ٹرانسپورٹ کمپنی کا مالک تھا ہی نہیں، میں تو ایک ملازم تھا وہاں۔ میں تو محض عارضی طور پر اس سے راہ و رسم بڑھانا چاہتا تھا تاکہ اس کی جان پہچان کے حوالے سے مجھے یہاں آنے جانے میں کسی قسم کی مشکلات کا سامنا نہ ہو کیونکہ بن رائد میرا ایک انتہائی مطلوب آدمی تھا۔

”اچھا یار! اب اجازت دو چلتا ہوں، تمہارا بہت وقت ضائع کر دیا میں نے ”سوری یار!“ میں نے کہا اور رخصت چاہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی کھڑا ہو گیا اور بولا۔

”ارے نہیں یار! سوری کی کیا بات ہے، میرے پاپا کا قول ہے کہ کاروباری گفتگو میں جتنا وقت لگے لگاؤ۔ یہ بھی ایک طرح کی سرمایہ کاری ہوتی ہے۔“

”تم دونوں باپ بیٹوں کو کاروبار کے علاوہ اور کچھ سوجھتا بھی ہے؟“ میں نے دل میں کہا اور پھر اس سے ہاتھ ملا کر رخصت ہوا۔

اس کے آفس سے نکلا۔ بندرگاہ پر ایک دم سناٹا سا چھا گیا تھا۔ مجھے حیرانی سی ہوئی، سوچا، یہاں تو چوبیس گھنٹے کی شفٹیں چلتی ہیں، تب خیال آیا۔ کہیں یہ ڈنر بریک نہ ہو۔ میں اب تیز تیز قدموں سے نکاسی کے راستے پر ہولیا تھا۔ ایکا ایکی میرا دل بے چین سا ہونے لگا تھا۔ میں اطراف میں دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ چند ہی لوگ نظر آرہے تھے۔

ماحول میں عجیب سی سیلی سیلی بو پھیلی ہوئی تھی۔ معاً کسی بحری جہاز کا بگل بنکارا۔ میرا دل دھڑکا اور اسی طرف کو میری نگاہ اٹھی تھی جہاں ”سی گوڈیز“ لنگر انداز تھا۔

تب ہی دیوہیکل کنٹینرز کی ایک دیوار پر میں نے کسی سائے کو متحرک ہوتے دیکھا پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ کوئی مزدور ہوگا، اسی لیے آگے بڑھ گیا۔ اس طرف کنٹینروں کی چار پانچ عارضی دیواریں بنی ہوئی تھیں اور ان کے ساتھ ہی دو بڑی کرینیں بھی تھیں جن کے سیلنگو دیواروں کے درمیان جھول رہے تھے۔ تب ہی میں نے اسی سائے کو ایک سیلنگ پر جھول کر کنٹینرز کی دوسری دیوار پھلانگتے ہوئے دیکھا۔ میں نے تب بھی اس کی پروا نہ کی لیکن پھر کنٹینروں کی ایک دوسری دیوار سے گھوم کر جیسے ہی میں نکاسی والی روش پر پہنچا تھا کہ اچانک مجھے اپنے سر پر ہلکی سی گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔

”بچو۔“ اچانک کوئی چلایا تھا، میں بوکھلا سا گیا اور کچھ سمجھ نہ آیا تب ہی کسی نے مجھے عقب سے دھکا دیا۔ میں لڑکھڑا کر گرا اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے عقب میں ایک دہلا دینے والے دھماکے کی آواز سنائی دی، جائے حادثے کے قریب ہونے کی وجہ سے مجھے وہ انسانی چیخ بھی سنائی دے گئی تھی جو بڑی دردناک تھی۔ میں سینے کے بل پر فرش پر پڑا تھا اور اسی طرح کہنیوں کے بل لیٹے لیٹے میں نے گردن موڑ کر اپنے عقب میں دیکھا۔

ایک لرزہ خیز منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ ایک پکی عمر کا مزدور تھا جو ایک بڑی سی فولادی پٹی کے نیچے دبا ہوا تھا، اس طرح کہ اس کا منہ کھلا پڑا تھا اور وہاں سے خون آلودہ لوتھڑے سے باہر کو جھانکنے لگے تھے۔

یکلخت میرے وجود کی وہ ساری حسیات جاگ اٹھی تھیں جو ایسے خطرناک مواقعوں میں مجھے بھرپور قوت فیصلہ بھی عطا کرنے کا مؤجب بنتی ہیں۔ میں نے لیٹے لیٹے اسی دیوار کی آہنی منڈیر کی طرف دیکھا اور وہاں مجھے وہ سایہ جو اپنی ناکامی پر شاید تلملائے ہوئے انداز میں دبکا کچھ سوچ رہا تھا۔ مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر پلٹ گیا۔ میرے وجود میں برقی لہر دوڑ گئی۔ میں نے فرش پر لیٹے لیٹے پورے وجود کے ساتھ سلپ ماری اور اسی دیوار کی طرف رخ ہوتے ہی میں اٹھ کر دوڑا۔

دھماکے کی آواز کے ساتھ ہی شور مچ گیا تھا جبکہ میں گردن اوپر اٹھائے اسی دیوار کی جانب اندھا دھند دوڑے جا رہا تھا، جدھر سایہ راہ مفر کی کوشش میں تھا، وہ خاصا چابک دست اور کسرتی بدن کا آدمی دکھتا تھا۔ پل کے پل مجھے 'شناسا' محسوس ہوا۔

”راکا!“ یہی نام میرے ذہن میں ابھرا تھا اور شکوک یقین کی حد کو چھونے لگے تھے۔ میں اس کے متوازی نیچے دوڑ رہا تھا اور ساتھ ہی گردن اٹھائے اسے نظروں میں لیے ہوئے تھا، جلد ہی اسے بھی احساس ہو گیا کہ اس کا شکار اس کے تعاقب میں تھا وہ پلٹ کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں ایک اندازے سے دیوار کے ایک سرے سے گھوما تاکہ دوسری طرف آ کے اسے نظروں میں لے سکوں کہ مڑتے ہی میں کسی سے ٹکرا کے گرا۔

دھماکے کے ساتھ شور مچ گیا تھا اور لوگ بھاگ اسی طرف کو دوڑے آرہے تھے، یہ بھی تین چار افراد تھے، جن میں سے ایک مجھ سے ٹکرایا تھا، شکر تھا کہ چوٹ زیادہ نہیں لگی تھی، ہم دونوں ہی گرے تھے مگر میں نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ میں دراز قامت تو تھا ہی مگر زیادہ کسرتی یا بھاری جسم نہیں تھا میرا، اسی لیے پھرتی سے دوبارہ اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی، مجھ

سے ٹکرانے والے آدمی کے ساتھیوں نے چیخ کر کچھ کہا تھا مگر میں ان کی پروا کیے بغیر اپنے ہدف کو نظروں میں لیے ہوئے دوڑتا رہا۔ تب ہی میں نے ایک سیلنگ پر سے پھلانگ کر دوسری کنٹینر کی دیوار پر پہنچتے دیکھا۔

اس وقت غیض سے میرا رواں رواں تھرک رہا تھا۔ میں رکا نہیں اور اندھا دھند دوڑتا ہوا، اسی دیوار کی طرف بڑھا۔ میں چونکہ اسے نظروں میں لیے ہوئے تھا اس لیے مجھے اپنی گردن اونچی رکھنی پڑ رہی تھی کہ آنکھوں سے یہ اوجھل نہ ہو جائے۔ یوں مجھے کسی کے ٹکرا جانے کا بھی خدشہ تھا۔

دوسری دیوار پر چڑھنے کے بعد وہ شخص ایک بار پھر میری نظروں سے نکل گیا۔ میں اندازے کے مطابق دوسری طرف سے گھوم کر گیا مگر وہاں بھی مجھے وہ نظر نہ آیا۔ میرا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا اور سانسیں بھی بری طرح پھولی ہوئی تھیں، دفعتاً ایک خیال میرے ذہن میں کلک ہوا اور میں نے سی گوڈیز کی طرف دوڑ لگا دی۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ یہ حملہ آور راکا کے سوا اور کوئی نہیں اسی لیے وہ سیدھا اسی جہاز کا رخ کرے گا۔

میں سی گوڈیز کے قریب پہنچا ہی تھا کہ میں نے حملہ آور کو دوڑتے ہوئے آتے دیکھا۔

''اے......رک جاؤ......'' میں حالت جوش میں چلایا۔

وہ مجھے دیکھ کر پہلے تو ٹھٹکا اور اسے یقین ہی نہیں آیا کہ میں یوں اس کے سامنے موجود ہوں گا، وہ شاید یہی سمجھے ہوئے تھا کہ وہ جل دینے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ میری للکار پر بھی وہ نہیں رکا اور سی گوڈیز کی اسٹیپ ریلنگ کی جانب دوڑا اور وہاں سے اندر غائب ہو گیا۔ اس نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ میں اسے پہچان چکا تھا وہ راکا ہی تھا۔

میں دوسری طرف سے گھوم کر گودی کے اس حصے کی طرف آیا جدھر سے جہاز کے موٹے موٹے رسے جھول رہے تھے، ڈیپ سی ٹرمنل کے پلیٹ فارم سے جہاز کی دیوار کا کافی فاصلہ تھا۔ تاہم میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک جھولتے ہوئے رسے کو دبوچنے کے لیے چند قدم پیچھے ہٹا اور پھر آگے کی طرف دوڑا۔ ایک لانگ جمپ لگائی اور سی گوڈیز کا جھولتا رسا میرے ہاتھوں میں تھا۔ میں نے اپنے معلق جسم کو تھوڑی دیر تک قائم رکھنے کے لیے برابر کیا، اس کے بعد اپنے دونوں ٹانگیں سکیڑ کر رسے میں پھنسا لیں اور اب ہاتھوں پیروں کی مدد سے رسہ پاٹنے لگا۔

مجھے اس کی کوئی پریکٹس نہ تھی، بس اکثر فلموں اور دیگر جگہوں پر یہ نظارہ دیکھا تھا اور وہی ذہن میں نقش تھا لیکن اس کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے پتا لگا تھا کہ دیکھنے اور کرنے میں کتنا فرق ہے کہ میں اپنے وجود کو رسے پر بہ مشکل ایک انچ ہی آگے سرکا پایا تھا اور میرا دم پھول گیا۔ تب ہی اچانک ڈیک کی ریلنگ پر نگاہ پڑی۔ وہاں مدھم روشنی میں مجھے کسی کا سر نظر آیا اور دوسرے ہی لمحے میرے اوسان خطا ہو گئے کیونکہ اگلے ہی لمحے مجھے پستول کی نال کی جھلک دکھائی دے گئی۔ نال لمبی تھی اور پتا چلتا تھا کہ اس پر سائلینسر چڑھا ہوا ہے۔ اس کا رخ جیسے ہی نیچے یعنی میری طرف ہوا، میں نے فوراً رسی چھوڑ دی اور ایک چھپاکے سے پلیٹ فارم اور جہاز کی دیوار کے درمیانی خلا میں پانی کے اندر جا گرا۔

اس وقت میرا رواں رواں بجلی بنا ہوا تھا، نجانے کہاں سے اتنا جوش میرے اندر عود کر آیا تھا کہ میں اپنی اس بروقت پیش رفت سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھا۔ یوں بھی کوئی مہم شروع کرنے کے بعد میں اسے ہر قیمت پر پایہ تکمیل تک پہنچانے کا عادی تھا اور اس کے لیے میں سر دھڑ کی بازی لگانے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ یہی میں کر رہا تھا۔

گولی چلی تھی یا نہیں، مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا، میں نے تو بس اس کی زد سے بچنے کے لیے چھلانگ لگائی تھی۔

پانی میں ایک مختصر سا گہرا غوطہ کھانے کے بعد میں دوبارہ سطح پر نمودار ہوا۔ اوپر دیکھا۔ وہ سایہ اپنے لمبی نال والے پستول سمیت نیچے جھانک رہا تھا۔ گویا میں اب بھی اس کے نشانے پر تھا مگر نیچے تاریکی کے باعث شاید وہ مغالطے میں پڑ گیا تھا اور دوسرے ہی لمحے میں نے اسے پیچھے ہٹ کر غائب ہوتے دیکھا۔ میں نے گودی کے پلیٹ فارم کی طرف پلٹنے کے بجائے جہاز کی باڈی سے منسلک ایک رسے کو پکڑ کر اس طرف تیرتا چلا گیا یہ رسہ آگے جا کر عمودی ہو گیا تھا، مجھے اسے چھوڑنا پڑا، کیونکہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں دوبارہ اسے تھام کر اوپر چڑھنے کی کوشش کرتا۔

میں نے جہاز کی باڈی کے ابھرے ہوئے کچھ فولادی حصوں کو پکڑ پکڑ کر اس کے متوازی پانی میں آگے بڑھنا شروع کیا اور جلد ہی مجھے ایک مختصر سی ریلنگ نظر آ گئی۔ میں نے فوراً وہ تھام لی اس کے نیچے ایک بڑا سا سوراخ تھا جہاں سے مسلسل ایک موٹی دھار کی صورت میں پانی بہہ کر نیچے گر رہا تھا۔ ریلنگ کا جہاں اختتام تھا وہاں ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آ رہا تھا میں اس کے قریب جا پہنچا۔

میرے کپڑے پانی سے شرابور تھے اور خود میں بھی، میں

نے دروازے کو ہلا جلا کر دیکھا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ ناکامی اور بے بسی کے باعث میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

دفعتاً مجھے گودی کے پلیٹ فارم کی طرف جہاں مدھم سی روشنی آتی تھی، ایک سائے کو متحرک دیکھا اور پھر جیسے میری روح فنا ہوگئی۔ وہ حملہ آور درواقعی راکا تھا اس کے ہاتھ میں وہی لمبی نال والا پستول صاف نظر آرہا تھا۔ وہ گودی کے نیم تاریک پلیٹ فارم پر مجھے کسی منحوس عفریت کی طرح نظر آرہا تھا۔ اس نے اپنے پستول کی مہیب نال کا رخ کر کے فائر کیا۔ ''چزز'' کی آواز مجھے بھی سنائی دی تھی، میری خوش قسمتی تھی کہ وہ خطا گئی تھی۔ گولی فولادی ریلنگ پر لگی اور چنگاری اڑی۔

میں نے ریلنگ چھوڑ دی اور ایک بار پھر گودی کے کھالے میں، پانی کے اندر جا گرا۔ مجھے پانی کے اندر کیا، سطح پر بھی تیرنے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ بس جان بچانے کا جذبہ حاوی تھا اور میری قوت ارادی اور کچھ قسمت کی یاوری بھی کہ پانی کے اندر نجانے کون سی ایسی شے میرے ہاتھ لگ گئی تھی کہ جسے تھامے ہوئے میں نے آگے سرکنا شروع کر دیا۔

مجھے ڈر تھا کہ وہ کم بخت کہیں پانی کے اندر بھی نہ گولی چلا دے۔ ظاہر ہے میں زیادہ دیر تک پانی کے اندر نہیں رہ سکتا تھا۔ بس کوشش تھی کہ کسی طرح اس کے نشانے سے دور چلا جاؤں، جہاں تک جاسکتا تھا۔ اچانک وہ شے جو شاید کوئی جال نما شے تھی، اپنے اختتام کو پہنچ گئی اور میرا دم بھی، میں حبس دم کا ماہر نہ تھا، چند پل بعد ہی میری سانسیں گھٹنے لگیں اور میں سطح آب پر ابھر آیا مگر تب میں نے اس ذرا سے موقع سے مستفید ہوتے ہوئے۔ خود کو گودی کے پلیٹ فارم کے ساتھ لگا لیا تھا۔ لہٰذا ابھرتے ہی میں نے پانی سے باہر اور گودی کے پلیٹ فارم پر لڑھکنے کی کوشش چاہی تھی کہ میرے دونوں آگے کو پھیلے ہوئے ہاتھ کسی کی ٹانگوں کو چھو گئے۔ پل کے پل خطرے کو تلوار کی طرح سر پر دیکھتے ہی میں نے اس کی ٹانگیں کھینچ لیں۔ وہ زوردار چھپاکے سے میرے اوپر ہی پانی میں آرہا۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے کنٹینروں کی دیوار والے وسیع گوشے سے بہت سے لوگوں کو اس طرف دوڑتے ہوئے آتے دیکھا۔

ادھر میرے اوپر گرنے والا راکا تھا۔ اسے شاید مجھ سے ایسے اچانک حملے کی توقع نہ تھی۔ پستول بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پانی میں جا گرا تھا کیونکہ مجھے اس کے دونوں ہاتھ اب خالی نظر آرہے تھے لیکن وہ کم بخت پھر بھی مجھ پر بھاری تھا۔ قد میں تو وہ مجھ سے دبا ہوا تھا مگر ڈیل ڈول اس کا مجھ سے ڈبل تھا۔ اس نے بھیڑیے جیسی غراہٹ خارج کرتے ہوئے مجھے دبوچ لیا اور پانی میں غوطہ دیا۔ وہ مجھے حبس دم کر کے مارنا چاہتا تھا۔

پانی کے اندر اور دباؤ کی وجہ سے میں اس پر وار کرنے سے قاصر تھا، ورنہ تو اس کا پیٹ میرے سامنے تھا لیکن پھر بھی میں نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر پنجوں سے اس کا پیٹ دبوچ لیا مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ادھر میرا دم تھا کہ پانی کے اندر گھٹا جا رہا تھا۔ تب میں نے جان بچانے کے جوش غیض تلے تڑپنا شروع کر دیا مگر اس کی گرفت معمولی نہ تھی۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے پتا نہیں اسے مجھ پر رحم آگیا تھا یا پھر کوئی وجہ رہی ہوگی اس نے میرا سر پانی سے باہر نکال دیا۔

میں جو حبس دم کا عذاب جھیل کر بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس نے میرا دماغ الٹ دیا اور ایک گھونسا تان کر میں نے راکا کے چہرے پر رسید کر ڈالا۔ حیرت انگیز طور پر اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا تھا اس پر۔ اس نے مجھے پانی سے نکال کر پلیٹ فارم پر پھینک دیا، جہاں اور لوگوں کا ہجوم سا اکٹھا ہو گیا تھا۔ مجھے زندہ چھوڑنے کی یہی وجہ تھی شاید کہ وہاں اور لوگ بھی آموجود ہوئے تھے۔

''اسی نے اوپر سے پیٹی گرائی تھی۔'' بدبخت راکا نے پانی سے باہر آتے ہی کہا اور اس خبیث کے جھوٹ سے میرے فرشتے کوچ کر گئے۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ سے میری دوبارہ گردن ناپنے کی کوشش چاہی تھی مگر میں نے غصے سے دانت پیس کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا لیکن لوگوں نے اس کی بات میں آکر مجھے دبوچ لیا اور تب ہی مجھ پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ راکا نے کس قدر مکاری سے ایک خطرناک چال چلی تھی اور مجھے ایک طرح سے آتش فشاں کے دہانے پر پھینک دیا تھا۔ ہجوم اپنے ساتھی مزدور کی ہلاکت پر بپھرا ہوا تھا اور وہ میری تکا بوٹی کر ڈالنے کو تیار تھے۔ میں نے اپنی بے گناہی کے لیے منہ کھولنا ہی چاہا تھا کہ وہ سب ہی مجھ پر پل پڑے۔ مجمع میں اشتعال ہو اور شکار بھی ان کے ہاتھ لگ گیا ہو تو ایسے میں کسے قانون کا خیال آتا ہے وہ تو بس اپنی بھڑکتی آگ کی پیاس بجھانے کی کرتے ہیں اور طیش و اشتعال میں ان کی عقل خبط ہو جایا کرتی ہے۔

اس سے پہلے کہ وہ میری تکا بوٹی کر ڈالتے۔ ایک گونج دار آواز ابھری۔ ''رک جاؤ...... یہ بے قصور ہے۔''

یہ آواز مجھے مژدہ جانفزا سنا گئی۔ رکتے رکتے بھی مجھ پر پڑنے والے تھپڑ، گھونسے اور ٹھوکریں اتنی پڑ چکی تھیں کہ میں

ڈھال سا ہوگیا تھا۔ وہ بھلا مانس، میرا نجات دہندہ مجمع کو چیرتا ہوا آ گیا تھا اور مجھے ان کے شکنجوں سے چھڑا کے کھڑا کر دیا۔ راکا کا چہرہ جو پہلے فتح مندی کے باعث تمتمانے لگا تھا اب تاریک پڑنے لگا تھا۔

میں نے نیم بازسی آنکھوں سے اپنے نجات دہندہ کو دیکھا وہ ایک تیس پینتیس سال کا کسرتی بدن کا جوان آدمی تھا۔ رنگ سانولا تھا اور بال کرلی اور گھنے تھے۔

''یہ کیا کہہ رہا ہے تو غفورے! تیرے بابا کے قاتل کو ہم نے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔'' مجمع میں سے کسی نے اس جوان آدمی سے کہا، جو خود بھی گودی مزدور نظر آتا تھا۔

''تم سب چپ رہو...... تھوڑی دیر کے لیے...... ابھی حقیقت بتاتا ہوں۔''

غفورے نام کے اس جوان آدمی نے مجمع سے تیز لہجے میں کہا۔ اس کے بعد وہ قریب کھڑے راکا سے مخاطب ہو کر بولا۔

''تم نے اسے کہاں سے پکڑا تھا اور کیوں؟''

''یہ کنٹینروں والی جگہ سے دوڑتا ہوا اس طرف آ رہا تھا اور ہمارے جہاز میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری اس پر نگاہ پڑ گئی اور پھر میں نے اسے پکڑ لیا۔''

''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔'' میں نے غصے سے دھاڑ کر کہا۔ مجمع میں پھر شور اٹھا تو غفورے نے ہاتھ کھڑا کر کے انہیں خاموش رہنے کا کہا۔ مجھے کچھ ایسا لگا تھا جیسے وہ ان کا کوئی مزدور رہنما ہو کیونکہ اس کا لہجہ ایک تو بڑا دبنگ تھا دوسرے یہ کہ وہ سوجھ بوجھ والا آدمی نظر آتا تھا۔

''میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے باپ کو اس پر چلاتے ہوئے دیکھا تھا، جب کسی نے اس کے اوپر وہ بھاری پیٹی گرائی تھی۔'' غفورا حقیقت بتانے لگا۔ سب اس کی طرف آنکھیں پھاڑے تکنے لگے، راکا بھی پریشان سا ہو گیا تھا اس کی بات سن کر۔

''پتا نہیں اس نے سنا نہیں تھا کہ میرے باپ نے دوڑ کر اسے دھکا دیا تھا تاکہ کنٹینروں کی دیوار سے گرنے والی پیٹی کی زد میں آنے سے بچ جائے مگر بدقسمتی سے بابا اس کی زد میں آ گیا۔ تب ہی میں نے اس کو (مجھے) اٹھ کر بھاگتے دیکھا تھا اور میں نے تھوڑی دور تک اس کا پیچھے بھی گیا تھا۔ اس نے قاتل کو کنٹینرز کی دیوار پر دیکھ لیا تھا شاید کیونکہ یہ اسی کی طرف دیکھتا ہوا بھاگ رہا تھا مگر میں زیادہ آگے نہیں جا سکا تھا۔ میرا باپ فرش پر پڑا تھا۔''

ایف آئی آر

First information Report(FIR)

اس سے مراد وہ ابتدائی اطلاع ہوتی ہے جو متعلقہ پولیس کو کسی جرم کے سرزد ہونے پر دی جاتی ہے۔ یہ اطلاع دونوں صورتوں میں (تحریری اور زبانی) ہو سکتی ہے لیکن آج کل زبانی کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ایف آئی آر کے لیے ضروری ہے کہ وہ

1۔ کسی قابل دست اندازی پولیس جرم کے بارے میں ہو۔

2۔ اگر انچارج تھانہ کو زبانی اطلاع دی جائے تو انچارج خود یا اپنی نگرانی میں اسے تحریر میں لائے گا۔

3۔ یہ تحریر اطلاع کنندہ کو پڑھ کر سنائی جائے، اور وہ اس پر دستخط کرے۔

4۔ اس کے اصل مواد کا اندراج تھانے کے پاس مقررہ فارم میں رکھی ہوئی کتاب میں ہونا چاہیے، اور

5۔ ٹیلی فون پر پیغام جو پولیس قلمبند کرتی ہے ایف آئی آر متصور نہیں ہوتا بلکہ جو بیان شکایت کنندہ سے بعد ازاں پولیس کے روبرو دیا ہوا سے ایف آئی آر سمجھا جائے گا۔

ایف آئی آر کے غلط لکھے جانے یا ناقص ہونے کی صورت میں مجرموں کو فائدہ ہوتا ہے اور وہ سزا کے شکنجے سے بچ جاتے ہیں۔ لہٰذا ایف آئی آر لکھواتے وقت ان باتوں کا خیال رکھا جائے جو مجرموں کو فائدہ نہ پہنچا سکیں۔ قابل دست اندازی جرم کے معاملے میں پولیس ایف آئی آر لکھنے سے انکار نہیں کر سکتی۔

مرسلہ: انسپکٹر نعیم خان، لالیاں

اس کا لہجہ رندھ گیا تھا۔ مجھے شاک لگا۔ جس بوڑھے مزدور نے میری خاطر جان دی تھی وہ اس جوان کا باپ تھا۔ پہلے باپ نے میری جان بچائی تھی اور اب اس کے بیٹے نے مجھے ایک بڑی آفت سے بچایا تھا۔ کس قدر بڑا دل ہوتا ہے ان غریبوں کا۔ تب ہی میں نے شدت غیظ تلے راکا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔ ان سب کو حقیقت بتادی۔

اس اثناء میں فرقان بھی مجمع کو چیرتا ہوا آگیا تھا۔ اس نے یہ صورتِ حال دیکھی تو پریشان سا ہوگیا۔ بولا کچھ نہیں خاموش کھڑا رہا۔ میں جانتا تھا کہ بن رائد وغیرہ اس کے گاہک تھے۔

لوگوں نے راکا اور تیل کے اس تاجر بن رائد کے خلاف نعرے لگانا شروع کردیے، یوں بھی لوگوں کو میری اور غفورے کی بات کا یقین ہوگیا تھا اس لیے بھی کہ غفورا کم از کم اپنے باپ کے قاتل کے بارے میں جھوٹ نہیں بول سکتا تھا جبکہ ایک حقیقت میں بھی جانتا تھا کہ راکا نے وہ فولادی پیٹی کنٹینر کی دیوار سے مجھ پر گرائی تھی مگر زد میں غفورے کا بدنصیب باپ آگیا تھا وہ بھی اس لیے کہ اس نے مجھے دھکا دے کر میری جان بچائی تھی۔ اسی اثناء میں بن رائد بھی وہاں آگیا۔ راکا نے واکی ٹاکی پر اس سے رابطہ کرلیا تھا۔ معاملہ پولیس کے سپرد کردیا گیا تھا اور کے پی ٹی تھانہ کی ٹیم اسی وقت تفتیش کے لیے وہاں پہنچ گئی تھی۔ لوگوں اور غفورے کی گواہی اور میرا بیان قلم بند کرنے کے بعد پولیس راکا کو گرفتار کرکے لے گئی۔

اس دوران کالیا نے مجھے فون کیا۔ وہ پریشان تھا کہ میں اتنی رات گئے تک کہاں غائب ہوں۔ میں نے اسے ابھی کچھ نہیں بتایا تھا بس اپنی خیریت کی اطلاع دی تھی اور جلد پہنچنے کا کہہ کر رابطہ منقطع کردیا تھا۔

فرقان اپنے مہمان گاہک بن رائد کے آدمی راکا کی وجہ سے خاصا پریشان نظر آرہا تھا۔ وہ مجھے اپنے آفس میں لے جا کر بات کرنا چاہتا تھا جبکہ میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہے گا مجھ سے، اسی لیے میں اسے اگلے دن آنے اور اس سنگین معاملے پر بات کرنے کا کہہ کر غفورا کے ساتھ کھسک گیا۔ وہ اپنے بوڑھے باپ کی کچلی ہوئی لاش سنبھالنے میں لگا ہوا تھا۔ اس پر لوگوں نے چادر ڈال دی تھی۔ دیگر کمپنیوں کے لوگوں اور مزدوروں نے غفورے سے افسوس کرنا شروع کردیا تھا اور اسے یقین دلایا تھا کہ وہ قاتل کو قرار واقعی سزا دلا کر رہیں گے۔

میں نے بھی غفورے کے ساتھ اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”غفورا بھائی! میرے پاس تو کچھ کہنے کے لیے الفاظ ہی نہیں ہیں۔ کسی انسان کی جان بچانے والا ایک دوسرا انسان جنت ہی کماتا ہے۔ مجھے اس واقعے کا بے حد افسوس ہے۔ دیکھا جائے تو تمہارے بابا نے محض انسانی ہمدردی ہی کی خاطر میری جان بچانے کی کوشش کی تھی اور اپنی جان ہار گیا۔ اس عمل کی جتنی تعریف کی جائے وہ کم ہے مگر یہ دردناک واقعہ میرے ذہن میں نقش ہو کے رہ گیا ہے میں اسے کبھی نہیں بھلا سکتا۔ ہاں! میں تم سے یہ وعدہ بھی کرتا ہوں کہ قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں تمہارے ہمیشہ ساتھ رہوں گا۔“

”بس! جناب ہم مزدوروں کی زندگی ایسی ہی ہوتی ہے۔ کبھی کوئی کنٹینر اتارتے ہوئے پھسل کر گر جاتا ہے تو کوئی سیلنگ ٹوٹنے سے مرجاتا ہے۔ ابھی تھوڑے دنوں پہلے ہی تو میرا سوہنا بھائی مختیارا بھی کرین میں پھنس کر مرگیا تھا، بس ا یہ حادثے تو ہم غریبوں کا مقدر ہوتے ہیں۔“ غفورے نے دردناک لہجے میں کہا۔ میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا:

”حوصلہ کرو۔ غفورا بھائی! میں تم سے ذرا تنہائی میں ملنا چاہوں گا، بہتر ہوگا کہ تم مجھے اپنے گھر کا ایڈریس دے دو۔ مجھے تم سے ایک اور ضروری بات کرنی ہے۔“

اس نے ایک غم زدہ سی نظر میرے چہرے پر ڈالی اور پھر مجھے اپنے گھر کا پتا بتاتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ میں کل کسی بھی وقت اس سے مل سکتا ہوں۔ میں نے اس کا سیل نمبر بھی لے لیا۔ اس کا گھر بابا بھٹ آئی لینڈ میں تھا جو کیاڑی کے ساحل سے چند ہی ناٹیکل میل دور تھا۔ میں نے وہاں آنے کا وعدہ کیا اور لوٹ گیا۔

اس اثناء میں فرقان نے مجھے بلانے کے لیے اپنا ایک ملازم بھی بھیجا تھا مگر میں وہاں اس سے کنی کترا کے نکل گیا۔

میں سیدھا استاد بھابھا کے اڈے پر پہنچا کیوں کہ تازہ کار حالات کے مطابق میں اور فہیم وہیں رہائش پذیر تھے جبکہ عاصمہ ایڈووکیٹ زنیرہ کے ہاں تھی۔

سدو کے لیے فون پر میں نے یہی ہدایت کردی تھی کالیا کو کہ وہ اسے گھر (قائد آباد) جانے نہ دے جب تک میں وہاں (بھابھا کے اڈے میں) آکر اس سے ہوٹل ڈی اسٹار والی تفاصیل نہ معلوم کرلوں۔

استاد بھابھا کے اڈے میں دن رات ہماہمی لگی رہتی تھی۔ کبھی کوئی آرہا تھا کبھی کوئی جارہا تھا۔ کالیا اور سدو جاگ رہے تھے۔ کالیا نے چھوٹتے ہی مجھ سے پوچھا۔

"ابے لے جگری! تو اتنی دیر کہاں غائب رہا؟ رات بارہ بجا دیئے؟ میں تو یہی سمجھنے لگا تھا کہ جس آدمی کے (بن رائد) کے پیچھے تو گیا ہے اسی نے ہی تیری گردن نہ ناپ لی ہو۔"

"کچھ ایسا ہی ہونے لگا تھا میرے ساتھ کالیا!" میں نے مسکرا کر کہا۔

"ابے لے کیا واقعی ایسا ہوا تیرے ساتھ؟ پھر تو تو نے ضرور کوئی بڑا تیر مارا ہوگا۔"

"بتاتا ہوں ذرا چھری کے نیچے دم تو لینے دے۔" میں مسکرایا اور پھر سدو بھائی کی طرف متوجہ ہوا۔ سب سے پہلے میں نے اس سے معذرتاً کہا۔

"یار معاف کرنا سدو بھائی! میری وجہ سے تم اپنے گھر نہ جا سکے لیکن درحقیقت تم نے جو کام کیا تھا وہ اپنی جگہ ضروری اور اہم نوعیت کا تھا اور مجھے اُمید ہے کہ تم وہ سب مجھے بتانے کے لیے بے چین ہو گے لیکن میں بھی اس سنہری موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا، وہ ایک اہم آدمی تھا جس کے پیچھے جانا میرے از بس ضروری تھا۔ ویسے تم نے کالیا کو تو ساری تفصیل بتا ہی دی ہوگی۔"

"بالکل نہیں۔" اس کی بجائے کالیا نے فوراً نفی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "تفصیل زیادہ اور سنسنی خیز تھی، اسی لیے اس نے کہا کہ تم آجاؤ تو ایک ہی بار سناؤں گا۔"

سدو نے ایک گہری سانس لی۔ پھر بولا۔ "مجھے گھر جانے کی فکر نہ تھی۔ بھلا وہاں میرا کون ہے جو میرے لیے فکرمند ہو رہا ہوگا۔ اکیلا ہی تو میں وہاں رہتا ہوں۔ باقی میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں اور جو میں نے سنا میں وہ آپ کو تفصیل سے بتائے دیتا ہوں، باقی یہ ساری باتیں جو اس آدمی بن رائد نے رانا بشیر کے ساتھ کی تھیں وہ سب میں ریکارڈ بھی کر چکا ہوں جس کی کیسٹ میں آپ کو دے دوں گا۔" وہ اتنا کہہ کر رکا تو میں نے کہا۔

"سناتے چلو میں سن رہا ہوں۔" میرے لہجے سے بے چینی مترشح تھی۔ دیکھنا تھا اب کہ اس اہم راز سے کس حد تک پردہ اٹھتا ہے۔

ہم اس وقت اوپر اپنے کمرے میں موجود تھے۔ فہیم سے میں مل آیا تھا وہ دوسرے کمرے میں سویا ہوا تھا۔ میرے بارے میں وہ کالیا سے جانے کتنی بار پوچھ چکا تھا۔ بے چارہ پریشان ہو رہا تھا۔ اپنے بھائی کو اس حالت میں دیکھ کر میرا بڑا جی کڑھتا تھا۔ دشمنوں نے واقعی مجھ پر بڑا کاری وار کیا تھا۔ دکھ کی ایک لہر میرے اندر سے اٹھتی تھی جب میں اپنے جوان بھائی کو اس حالت میں دیکھتا۔

بہرطور سدو ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بتانے لگا۔ "جو شخص رانا بشیر سے ملنے آیا تھا اس کا نام بن رائد ہے جو گلفو آئل کمپنی کا جی ایم ہے۔ اس کمپنی کے چار ڈائریکٹر ہیں۔ دو یو اے ای سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ باقی دو کا تعلق لندن اور جرمنی سے ہے۔ ان کے نام نہیں معلوم ہو سکے ہیں۔

یو اے ای میں جو ڈائریکٹر ہیں ان میں ایک پاکستانی نژاد مسلم ہے۔ یاد رہے کہ اس کا نام شاہ میر ہے اور یہ وہی آدمی ہے جس کے بیٹے کو ابھی تھوڑے دنوں پہلے میں نے رانا بشیر کی بیٹی فرحانہ کے ساتھ دیکھا تھا اور آپ کو مطلع بھی کیا تھا۔ دونوں کے درمیان اسی کی گفتگو ہوتی رہی تھی جس کی بناء پر مجھے یہ سب معلوم ہوا۔ ظاہر ہے کہ میں سوال کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اس لیے وہی کچھ سننے پر مجبور تھا جس کے متعلق وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ رانا بشیر کو فون کرنے اور اسے کسی بات پر دباؤ ڈالنے والا شخص شاہ میر ہی تھا۔ بن سلیم رائد اس کا ہی بھیجا ہوا آدمی تھا۔

وہ ذرا سانس لینے کے لیے رکا اور مجھے سدو کی وہ بات یاد آگئی تھی جو اس نے ابھی تھوڑے دنوں پہلے ہی مجھے فرحانہ اور اس لڑکے ثمیر کے بارے میں بتائی تھی جس کے مطابق ثمیر ایک بڑے باپ کا بیٹا تھا۔ باپ کا نام شاہ میر تھا جو ایک خلیجی ریاست کی بڑی آئل کمپنی کا چیئرمین اور بعد میں ڈائریکٹر بن گیا تھا۔ وہ عموماً ملک سے باہر اور خلیجی ریاستوں کے دورے پر رہتا تھا۔ رہائش ڈیفنس میں ہے۔ ایک عالیشان کوٹھی ہے جہاں صرف تین افراد مستقل طور پر رہتے ہیں۔ شاہ میر کی بیوی لیلیٰ صماد جو ایک عربی خاتون ہے۔ اس کا جوان بیٹا ثمیر شاہ اور اس سے ایک سال چھوٹی بیٹی کاشف شاہ میر مہینے دو مہینے بعد اپنے پرائیوٹ طیارے میں آتا جاتا رہتا ہے۔"

سدو آگے بتانے لگا۔ چند سال پہلے یہ کمپنی یعنی گلفو آئل خسارے میں جا رہی تھی۔ پھر انہوں نے ایک بین الاقوامی آئل کمپنی ووڈ ورتھ سے ایک معاہدے کے تحت پانچ سالوں کے لیے الحاق کر لیا تھا۔ آخرالذکر کمپنی نے ایک گروپ تشکیل دیا جس کا نام "بلیک گولڈ" رکھا گیا یہ گروپ کالا سونا یعنی تیل کا خزانہ کے قدرتی ذخیروں کی تلاش کیا کرتی تھی۔ ووڈ ورتھ آئل چوں کہ یورپ میں تھی لیکن اس نے یو اے ای میں تیل کی تلاش کا ٹھیکا حاصل کر لیا تھا۔ نجانے کہاں

سے انہیں بھنک پڑ گئی تھی کہ مشرق وسطیٰ کے ایک علاقے صرائفہ میں موجود زیر زمین تیل کے بڑے ذخائر موجود ہیں۔ صرائفہ، ابوظہبی اور بحرین کے درمیان میں واقعہ ایک گم شدہ قصبہ ہے۔ ویران اور لق و دق اس بنجر اور غیر نخلستانی علاقے میں زیر زمین کالے سونے (تیل) کے ذخائر موجود تھے۔ دور پرے اور عام انسانی آبادی اور زندگی کی ہماہمی سے دور واقع اس جہنم زار صحرائی علاقے میں کوئی جانے کا بھی تصور نہیں کرسکتا۔ کالا سونا گروپ کو اس میلوں تک پھیلے بنجر و بے آب و گیاریت کے سمندر میں تیل کا وہ خزانہ حاصل کرنا تھا۔ چونکہ ووڈ ورتھ آئل کو کے لیے ان علاقوں تک رسائی نہ تھی اس کے لیے انہیں یو اے ای کی کسی مقامی کمپنی کی مدد حاصل کرنا ضروری تھا کیونکہ ان کے ذریعے ہی انہیں وہاں کا ٹھیکا مل سکتا تھا چوں کہ ووڈ ورتھ آئل کو ایک بڑی کمپنی تھی، اس میں سیاسی چکر بھی چلتے تھے، اسے کئی غیر ملکی پارلیمان اور عرب شیوخ کے درباروں تک حمایت حاصل تھی۔ پھر مقامی افسروں کی خوشنودی پر ان کا انحصار رہتا تھا۔ چنانچہ ووڈ ورتھ کے لیے اجازت نامہ لینا کوئی مشکل نہ تھا، یوں بھی صرائفہ ایسا علاقہ تھا جہاں تیل کی کھدائی وغیرہ کے سلسلے میں اخراجات زیادہ تھے اور امید کم۔

لہٰذا دیگر ضروری کاغذی کارروائی کی مد میں اس پر اخراجات بھی کم آتے۔ یوں ان دونوں کمپنیوں کے بیچ معاہدہ حصے داری یا شراکتی کاروبار کی بجائے ”رائلٹی“ پر طے کیا گیا جس پر پہلے تو گلفو آئل محترز ہوئی تھی، وہ برابر کی شراکت داری چاہتی تھی مگر ان کی بھی مجبوری تھی، خود وہ دیوالیہ ہونے اور حتیٰ کہ قید لگنے کی سنگین حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ ان پر ٹیکسوں اور دیگر رقوم قرض کے طور پر واجب الادا تھی۔ مقدموں کی ایک طویل فہرست تھی جو اماراتی شیوخ ان کے خلاف تیار کیے بیٹھے تھے۔ باقی دو ڈائریکٹر اس کمپنی کو چھوڑ چکے تھے۔ اس کمپنی کے شیئرز ہولڈرز بھی سرمایہ لگانے میں غیر دلچسپی کا اظہار کرنے لگے تھے۔

ناچار انہیں رائیلٹی کے طور پر ہی یہ معاہدہ سائن کرنا پڑا۔ ووڈ ورتھ کا بلا شرکت غیرے مالک خود اس کمپنی کا چیئرمین مسٹر ڈی کارلو ہے، یہ اسرائیلی نژاد امریکی ہے جو ڈنمارک میں رہتا ہے۔ ڈی کارلو ایک نمبر کا مکار چالاک اور دوسروں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے والا شخص تھا۔

اس نے معاہدہ ہوتے ہی رائلٹی کی پہلی قسط ایڈوانس کے طور پر گلفورڈ آئل کو جاری کردی جس سے گلفورڈ نے سب سے پہلے تو اپنا قرض اتارا۔ اس کے بعد کمپنی کے شیئر ہولڈرز کو اعتماد میں لیا۔ باقی سے ان دونوں یورپین ڈائریکٹرز کی پروا نہ تھی۔ گویا اب گلفو آئل کے صرف وہ ہی ڈائریکٹرز تھے۔ ایک خلیجی شیخ بن رائد اور دوسرا شاہ میر۔

بہرکیف اسے مسٹر ڈی کارلو نے سرمایہ بھیجنے کی راہ کالا سونا گروپ تشکیل دینے پر مشروط کردی۔ کالا سونا گروپ تشکیل پا گیا جس میں گلفو آئل کو معاہدے کے مطابق سرمایے کا پہلا حصہ دے دیا گیا۔

کالا سونا گروپ میں صرف دو آدمی ڈی کارلو کے شامل تھے۔ جن کے بارے میں یہی بتایا گیا تھا کہ وہ دونوں کیمیکل انجینئرنگ میں پی ایچ ڈی ہیں مگر درپردہ ان کی حقیقت کچھ اور ہے۔

یہ دونوں سسلی کے ایک انڈر ورلڈ بدنام زمانہ ڈان ایڈن برونو کے چہیتے مقرب خاص کارپرداز ہیں۔ لڑائی بھڑائی میں مشاق مکاری اور ذہانت میں طاق۔ درحقیقت یہ اپنے منصوبے جسے انہوں نے ”ڈیزرٹ ون“ کا نام دیا ہے کی حفاظت اور نگرانی کے لیے ہی بھیجا ہے، دونوں انتہائی تربیت یافتہ اور ہر طرح کا اسلحہ چلانے کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ کالا سونا گروپ میں کل چھ افراد شامل ہیں۔ باقی چار گلفو آئل کے تعینات کردہ ہیں، ان میں ایک آئل مین انجینئر ووڈرلرز انجینئرز ایک آدمی رگ ماسٹر ہے۔ ان چاروں میں گلفو کا ایک ڈائریکٹر شاہ میر خود بھی شامل ہے جو اپنے مفادات کی نگرانی کرتا ہے۔

صرائفہ میں کھدائی وغیرہ کے سلسلے میں مشینری جرمنی اور جاپان سے برآمد کرنا تھی جس کا ٹھیکا رانا بشیر کو دیا گیا تھا۔ شاہ میر نے یہ ٹھیکا اسے دلوایا تھا۔ دونوں کے درمیان ایک خفیہ تحریری معاہدہ ہوا تھا، یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ معاہدہ کس سلسلے میں تھا مگر ان کی باتوں سے یہی انداز ہوا تھا کہ کوئی بڑا فراڈ کھیلنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کوئی فائل جس سے شاہ میر کے کسی پُراسرار چکر میں پھنسنے کے امکانات تھے، وہ رانا بشیر کے پاس تھی۔

اس فائل میں جغرافیائی سروے کرنے والی ایک مشہور کمپنی کا بنایا ہوا سروے چارٹ تھا مگر کسی وجہ سے رانا بشیر وہ اسے دینے پر رضامند نہیں تھا۔ جس پر شاہ میر نے طیش میں آکر یہ اقرار کرلیا تھا کہ اگر...... وہ فائل اس کے حوالے نہ کی تو وہ اس کی بیوی رفعت خانم کی طرح اس کی بیٹی فرحانہ کو بھی ہلاک کروا ڈالے گا۔ بس رانا بشیر بپھر گیا۔ تاہم بعد میں شاہ میر

نے رانا بشیر سے مصالحتی انداز اختیار کرتے ہوئے اس سے کہا وہ اس سلسلے میں کمپنی کے ڈائریکٹر بن رائند کو خود اس کے پاس مذاکرات کے لیے بھیج رہا ہے مگر رانا بشیر شاہ میر سے اب سخت نفرت کرنے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی بن رائند سے بھی بات نہ بنی اور دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہوئی اور دھمکیوں کے تبادلوں کے بعد یہ خفیہ ملاقات اختتام کو پہنچی۔" سدو اتنا بتا کر خاموش ہوگیا۔

میں گہری سوچ میں مستغرق ہوگیا۔ یہ بات واضح ہوچکی تھی کہ شاہ میر نے بن رائند کو بھی اپنے اس فراڈ میں شامل کرلیا تھا۔

"کیا سوچنے لگا جگری! قصہ تو پورا ہوا رفعت خانم مرڈر کیس کا، یہی شاہ میر وہ پردہ نشیں مجرم ہے ہمارا اور اسی نے ہی تمہیں اس کیس سے ہٹانے کے لیے اپنی ایک دھمکی پر عمل کرتے ہوئے فہیم بھائی کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کیا ہے۔"

کالیا کی بات پر میری آنکھوں میں غبار سا لہرا گیا اور میں سدو بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "سدو! تم نے وہاں ایسا کچھ سنا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ فہیم کے ساتھ اسی نے ظلم کرایا تھا؟" میں سدو کو فہیم کے بارے میں بتا چکا تھا۔

وہ بولا۔ "رانا بشیر اور بن رائند کے آپس میں شاہ میر کے رانا بشیر کو فون کرنے کے حوالے سے بھی بات چیت ہوئی تھی اس نے واضح لفظوں میں تو نہیں کہا تھا لیکن جب رانا بشیر نے اس سے یہ کہا تھا کہ اس کی بیوی رفعت خانم کا قتل خود اس کے بھی گلے پڑنے لگا ہے جس کے باعث نعمان ہم سب کے پیچھے پڑچکا ہے تو اس کے جواب میں بن رائند نے بڑے غرور سے کہا تھا کہ وہ مجھے اس سلسلے میں پہلا سبق دے چکے ہیں۔"

اس کی بات سن کر میرا دماغ گرم ہونے لگا۔ مارے طیش و غیض کے میری کنپٹیاں سائیں سائیں کرنے لگیں۔

گویا شاہ میر اور بن رائند دونوں ہی میرے مجرم تھے مگر میرا اصل اور "پردہ نشیں" دشمن شاہ میر تھا جبکہ بن رائند اس کا سپورٹر یا دست راست تھا۔

اس بات سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ میرے معصوم بھائی فہیم کے ساتھ اس رذیل شاہ میر نے ہی یہ ظلم کروایا تھا۔ میں نے کسی خیال کے تحت سدو سے ایک اور سوال کیا۔

ان کی گفتگو کے دوران رانا بشیر کی بیوی رفعت کے قتل کا کوئی ذکر آیا؟

"ہاں!" سدو نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ "معافی چاہتا ہوں نعمان صاحب کہ مجھے کچھ باتیں آپ کے سوال پر مرحلہ وار یاد آرہی ہیں، اسی لیے میں نے صرف سننے پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا ان کی ساری گفتگو بھی ریکارڈ کرلی تھی تاکہ بعد میں آپ خود بھی ان ہی کی زبانی ہونے والی گفتگو کو تسلی سے سن سکیں۔" وہ اتنا کہہ کر رکا پھر میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔ "رانا بشیر نے غصے میں یہ کہا کہ اس چکر میں انہوں نے میری بیوی کا مرڈر کروایا تھا؟" جس پر بن رائند نے سفاکانہ ہنسی کے ساتھ یہ جواب دیا تھا کہ وہ فائل ہمارے حوالے نہیں کروگے تو اس کی تلاش کی زد میں تمہارے گھر کا دوسرا فرد بھی آسکتا ہے، تم نے دیکھا میں کس طرح راکا کو صاف بچا گیا اور احمد حسین تالا چابی میکر کو پھنسا دیا۔"

"یہ راکا کیا شاہ میر کا خاص آدمی ہے؟" میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

"شاہ میر کی باتوں سے تو ایسا ہی لگتا ہے بلکہ وہ چھلاوا ہے، شاہ میر اسے جہاں پہنچنے کا حکم دیتا ہے وہ وہاں پہنچ جاتا ہے۔ کالا سونا میں بھی اس کی شمولیت ہے، بالکل اسی طرح جیسے ایڈن برو کے دو ہرکارے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے شامل ہیں۔"

سدو نے جواب دیا اور میں ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر دانت پیس کر پُرغیظ لہجے میں بولا۔ "کالیا! میں شاہ میر کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"وہ اب بچ بھی نہیں سکتا جگری!" کالیا نے بھی کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ سدو بھی کھڑا ہوگیا تھا۔

میں نے قریب میز پر ادھ بھرے پانی کے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا، چند گھونٹ بھرے اور بولا۔ "کالیا! میں شاہ میر کے بیٹے ثمیر کو ٹانگوں سے محروم کروں گا جس طرح اس ....خبیث اور جلاد صفت نے میرے بھائی کے ساتھ کیا۔"

"ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور ٹانگ کے بدلے ٹانگ۔" کالیا بھی فرطِ جوش سے بڑبڑایا۔

"ہم......" میرے حلق سے گمبھیر ہمکاری خارج ہوئی اور بولا۔ "میں پہلے ان کی گفتگو کی ریکارڈنگ سننا چاہوں گا۔"

کالیا نے اسی وقت بندوبست کروا دیا۔ سدو نے کیسٹ ہمارے حوالے کی جس کا لب لباب یہی تھا کہ شاہ میر کی نیت میں درحقیقت "ڈیزرٹ" ون منصوبے کے سلسلے میں فتور آگیا تھا۔ شاہ میر فطرتاً ایک دھوکے باز، لالچی اور حریص ذہنیت کا آدمی ہے۔

ووڈورتھ آئل کو اس نے مجبوری کی بناء پر ہی رائلٹی پر

معاہدہ کیا تھا ورنہ وہ اپنا اس میں ''شراکت داری'' کا ہی حق سمجھتا تھا۔ تاہم اسے ادراک تھا کہ مذکورہ کمپنی کے بلاشرکت غیرے چیئر مین مسٹر ڈی کارلو نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برابر کی حصہ داری کی بجائے محض رائلٹی پر انہیں ٹرخایا ہے۔ ان کی بھی مجبوری تھی اس لیے انہیں اسی شق پر یہ معاہدہ کرنا پڑا۔

اب جبکہ شاہ میر نے کالا سونا کے ذریعے صرائفہ میں زیر زمین موجود اس کالے خزانے کا جائزہ لیا تو دنگ رہ گیا۔ اس کے حساب سے گویا صرائفہ کے اس طویل ترین ریت کے دریا (ریگ زار) میں قارون کا خزانہ خام مال کی صورت میں دفن تھا جو ایک بہت بڑا اور عظیم الشان آئل فیلڈ تھا۔ جہاں کالے سونے کی صورت میں صرف مائع ہی نہیں بلکہ ''کولتاری ریت'' اور تیل آلودہ پتھروں'' کی بھی بھرمار تھی۔ یہ وہ خزانہ تھا جس کے بارے میں شاہ میر کا خیال تھا کہ مسٹر ڈی کارلو اسے چالاکی سے لوٹنے والا تھا۔

چونکہ شاہ میر کی نیت میں فتور آ گیا تھا اسی لیے اس نے رانا بشیر سے پاکستان آکر ملاقات کی اور اسے ٹینڈر ملنے پر مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ وہ جلد از جلد مطلوبہ مشینری جاپان اور جرمنی سے امپورٹ کر کے کارگوشپ کے ذریعے مڈل ایسٹ بھیجنے کی کوشش کرے، بروقت رسد و ترسیل سے اس کی کمپنی کی ساکھ اونچی ہوگی اور اسے مزید آرڈر ملنے کے امکانات بڑھیں گے۔ رانا بشیر نے دو ماہ کا ٹائم فریم لیا تھا مگر شاہ میر سے گفتگو کے بعد اس نے اس سے بھی کم مدت مشینری برآمد کرنے کے لیے کوششیں تیز کر دیں۔

ابو رائد جو گلفو آئل کا دوسرا مقامی ڈائریکٹر تھا۔ شاہ میر کے لیے اسے اپنی سازش میں ملانا ضروری تھا جو اس کے لیے چنداں مشکل ثابت نہ ہوا تھا۔ شاہ میر نے اسے بتایا کہ اگر اس کی کمپنی یہ معاہدہ کسی وجہ سے ایسے وقت میں کینسل کر کے خود ہی خفیہ طور پر اس عظیم منصوبے ''ڈیزرٹ ون'' پر کام کرے تو وہ دنیا کی امیر ترین شخصیات میں شمار ہونے لگیں۔

منصوبے کے سارے لوازمات اور وو ڈورتھ کا اچھا خاصا سرمایہ تب تک لگ چکا ہوگا۔ کینسل ہونے کے بعد بقیہ اخراجات گلفو آئل کے لیے کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔ اس کے لیے ابو رائد موجود تھا۔ رانا بشیر بھی اس کے لالچ میں آگیا۔

تاہم مجھے اندازہ ہوا تھا کہ رانا بشیر نے بھی اپنی سیکیورٹی کنفرم کرنے کے لیے شاہ میر کی کسی کمزوری کو اس فائل کی صورت میں اپنے پاس رکھا تھا کہ کہیں شاہ میر کی مدد کے سلسلے میں جو بڑی رقم اسے ملنے والی تھی وہ اس سے محروم نہ کر دیا جائے۔

لہٰذا اس نے وہ سروے چارٹ کی فائل رکھ لی تھی جس کے بغیر شاہ میر ''ڈیزرٹ ون'' منصوبے کو آگے نہیں بڑھا سکتا تھا مگر اس لالچ میں رانا بشیر کو اپنی بیوی سے ہاتھ دھونا پڑے تھے اور اب ان دونوں کی تازہ ترین ''ون ٹو ون'' ملاقات کے بعد یہ دشمنی اپنے عروج پر پہنچتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

رانا بشیر چونکہ شاہ میر سے خوف زدہ ہو گیا ہوگا۔ راکا، شاہ میر کا وہ جلاد صفت ہرکارہ کسی وقت بھی شاہ میر کے اشارے پر رانا بشیر کے خلاف حرکت میں آسکتا تھا۔ اگر رانا بشیر سے وہ اہم فائل میں حاصل کر کے کسی طرح اس سازش کے بارے میں مسٹر ڈی کارلو......

میرے ذہن کی بساط پر کئی مہرے، اپنی چالوں پر سرکنے کے لیے بے چین تھے۔ رانا بشیر میری اور میں اس کی ضرورت بن سکتے تھے۔ فرحانہ بھی تھی۔ ثمیر سے اس کی دوستی کس ''لیول'' کی تھی اس کا ابھی پتا چلانا تھا۔ یہ سب سوچتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ ''آتش زدگی۔''

رانا بشیر کے گھر میں آتش زدگی کا واقعہ بھی تازہ تھا۔ پہلے مجھے رانا بشیر پر ہی شبہ تھا کہ اس نے وہ ڈائریاں تلف کرنے کے لیے آگ لگائی تھی۔ یہ واقعہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کسی سرکاری.... محکمے میں کاغذات کی ایسی فائل یا ریکارڈ کو جو بالا افسران کے گلے پڑنے والے ہوتے ہیں، آتش زدگی کے ''واقعے'' قرار دے کر ضائع کر دیا جاتا ہے۔

اب تازہ کار حالات کو مدنگاہ رکھتے ہوئے مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ یہ حرکت دانستہ تو تھی مگر رانا بشیر کی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ ضرور بن رائد اور اس کے خونی قاتل ہرکارے راکا کی ہو سکتی تھی۔ مجھے ''سبق'' سکھانے کا ٹاسک بھی شاہ میر نے بن رائد اور راکا کو دے رکھا تھا۔ گویا میرے پاس ان دونوں سے انتقام لینے کا موقع موجود تھا مگر میرا اصل شکار شاہ میر تھا۔

رات بہت بیت چکی تھی۔ ہم سو گئے۔

☆......☆

اگلے روز دن چڑھے سوتے رہے۔ غسل اور ناشتا وغیرہ کرنے کے بعد سدو کو سب سے پہلے میں نے استاد بھابھا کے اڈے سے اس ہدایات کے ساتھ روانہ کیا کہ وہ فرحانہ کو مسلسل نظروں میں رکھے۔

اس کے بعد کالیا کے ساتھ میں اڈے پر آیا۔ چاچا انور

شاہ نے مجھے دو خوش خبریاں سنائیں ایک تو عزیر خان کو ثوبیہ کی آبرو ریزی بعد قتل پر عدالت نے سزائے عمر قید لگنے کی دوسری خوش خبری سیٹھ ستار کی گرفتاری کی۔
لینڈ مافیائی چیفس کے خلاف میری یہ ایک بڑی فتح تھی اور یہ فتح مجھے چند گھنٹوں یا دنوں میں نہیں ملی تھی، ایک طویل جدوجہد کی تھی میں نے اور میری اس جنگ میں کالیا بھی ہمیشہ ساتھ رہا تھا اور اب تک ساتھ تھا۔
عزیر خان کو قرار واقعی سزا لگتے ہی اس کے باقی دوست بھی دامن چھڑا کر بھاگ گئے تھے۔ گویا خس کم جہاں پاک والا معاملہ ہو گیا تھا۔ ایسے میں ہم نے روزی کو بھی گواہی کے لیے عدالت میں پیش کروایا تھا جس نے اپنی بہن کے قتل کا بھی سیٹھ ستار پر مقدمہ کر دیا تھا۔
سیٹھ ستار کے چیلے اس کی ضمانت کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے مگر ایڈووکیٹ زنیرہ اور انسپکٹر کامران نے سیٹھ ستار کے خلاف بڑا مضبوط قانونی جال تیار کر رکھا تھا۔ ایک بار قانون کے نرغے میں آتے ہی سیٹھ ستار پر نجانے کتنے ہی کیس ری اوپن ہونا شروع ہو گئے تھے۔
حاجی مہران خان اپیل کے لیے بھاگ دوڑ میں مصروف تھا۔ یوں لینڈ مافیائی چیفس کی جانب سے بظاہر معاملہ ٹھنڈا ٹھار بڑا محسوس ہونے لگا تھا۔ لیاری والا مسئلہ ابھی درمیان میں تھا۔ اگرچہ اس سلسلے میں ہماری کوششیں جاری تھیں۔ شانو کھوجا سے میں جتنا پُراُمید تھا اب اس سے ملاقات کے بعد مجھے مایوسی ہوئی تھی اور اپنی اس بے وقوفی پر مجھے خود بھی غصہ آیا تھا کہ فیاض جمالی کی نصیحت کے باوجود میں اور کالیا اس سے جا ملے تھے۔
شانو کھوجا نے چھوٹتے ہی اپنے مطلب کی بات کر دی تھی۔
اس کا فون آ گیا۔
''یار کالیا! بتا مجھے، اس کا فون اٹینڈ کروں یا نہیں؟'' میں نے کالیا سے پوچھا۔
''اٹینڈ کر لینا چاہیے۔'' وہ بولا۔ ''دیکھیں تو سہی کہتا کیا ہے؟''
اس کے مشورے سے میں نے کال اٹینڈ کر لی۔ دوسری جانب سے اس کی مخصوص غبار آلودہ سی آواز ابھری۔
''نعمان صاحب؟'' اس نے استفساریہ کہا۔
''ہاں! میں نعمان ہی بات کر رہا ہوں، شانو بھائی! خیریت؟'' میں نے دھڑکتے دل سے جواب دیا۔

''یار نومی بھائی! تمہارا معاملہ تو بڑا سنگین صورت اختیار کر گیا تھا۔'' اس نے کہا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے ہمارے معاملے کی سنگینی کی اہمیت جتا کر وہ اپنی کوئی بات منوانا چاہتا تھا۔
''اچھا! تو تم نے کیا کیا؟'' میں نے بھی ہلکے طنز سے کہا۔ وہ بولا:
''اب تم نے یہ سنگین معاملہ میرے حوالے کیا تھا تو ظاہر ہے اسے حل کرنا تو تھا ہی۔''
''ہم۔'' میرے منہ سے برآمد ہوا۔ اس کے طمانیت بھرے انداز نے مجھے تھوڑا چونکنے پر اور اس کی بات سننے پر مجبور کر دیا تھا۔ لہٰذا میں خاموش رہا وہ آگے بولتا رہا۔
''ایسا کرو، تم دونوں میرے اسی کھارادر والے مکان میں آجاؤ، جہاں پہلے بھی ہماری ملاقات ہو چکی ہے، آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے میری بات یا جواب سنے بغیر ہی دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔
''کیا کہہ رہا تھا؟'' کالیا نے فوراً مجھ سے پوچھا۔
''کہہ رہا تھا ہم دونوں اس کے کھارادر والے مکان میں آجائیں۔ وہیں آرام سے باتیں کر لیں گے۔''
''ابے لے جگری! سمجھو اس تیس مار خان نے کام پکا کر دیا ہمارا۔ دیر کس بات کی ہے ابھی چلتے ہیں۔''
''یار کالیا! میں اس شخص سے بچنا چاہ رہا تھا۔'' میں نے خیال انگیز لہجے میں کہا۔
''ابے لے..... وہ کیوں؟''
''بتایا تھا ناں میں نے تجھے کہ فیاض جمالی کی باتیں میں نہیں بھولا اور نہ ہی اس روز کی ہونے والی شانو کھوجا سے ملاقات..... وہ ہمیں ایک چکر سے نکال کر کسی دوسرے چکر میں پھنسا نہ دے۔
اس دن اس کی باتوں سے میں نے یہی اندازہ لگایا تھا جب اس نے ہمارے معاملے کی ساری تفصیل سن کر یہ کہا تھا کہ ''ہمارے کام میں مہربانی شکریہ اور یار باشی کم ہی چلتی ہے۔ کام چکل ہوتا ہے اور پکا بھی مگر کچھ لے اور دے کے اصولوں پر چلتا ہے۔ ایک اور بات ضروری نہیں ہے کہ خرچا پانی نقدی میں ہو میرے لین دین کا طریقہ کار ذرا مختلف ہوتا ہے۔''
مجھے اس کی یہ بات یاد ہے۔ کالیا یہ سن کر بولا۔ ''مگر اس میں پریشان ہونے والی ایسی کیا بات ہے کہ

تو......'' اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو میں ایک گہری سانس لے کر بولا۔

''کالیا! مجھے ڈر ہے کہ وہ ہم سے اس کام کے بدلے میں کچھ ایسا کرنے کو نہ کہہ ڈالے جسے نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں کرنا پڑ جائے اور ہم کسی نئے چکر میں پھنس جائیں۔''

''ابے لے یار! تو بھی واقعی کوئی سادہ لوح شریف ہی انسان رہا۔'' کالیا سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اب انڈا توڑ کر نکلے ہوئے لڑکے تو ہم بھی نہیں کہ وہ ہماری انگلی تھام کر کسی اندھے گڑھے میں لے جا کر گرا دے گا ہمیں۔ پہلے چلیں تو سہی دیکھیں آخر اس نے کون سا تیر مارا ہے۔ پھر اس کے معاملے کی بات بھی سن لیتے ہیں۔ چل اٹھ۔''

تھوڑی دیر بعد ہم ویسپا پر کھارادر روانہ ہو رہے تھے۔ وہاں آدھے پونے گھنٹے میں پہنچ گئے اور شانو کھوجا سے اسی مکان اور اوپر والے کمرے میں ملاقات ہوئی۔ وہ ہمارا ہی منتظر تھا۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ ہم اسی وقت آ رہے ہیں۔

''بیٹھو۔''

ہم سے ہاتھ وغیرہ ملانے کے بعد اس نے کہا اور ہم وہیں اس کے سامنے پہلے کی طرح اس کی بچھائی ہوئی فرشی نشست پر بیٹھ گئے۔

''آج ہی صبح میری لیاری میں میرداد سے ملاقات ہوئی تھی۔'' اس نے بتانا شروع کیا ہماری دھڑکتی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''بتایا تھا ناں میں نے تمہیں کہ وہ اپنے ایک کام کے سلسلے میں مجھ سے ملاقات کرنے والا ہے۔''

ہم دونوں نے بدستور اس کی طرف تکتے ہوئے بیک وقت اپنے سر اثبات میں ہلائے تھے۔

''پہلے تو وہ میری اس بات پر ہی یک دم بھڑک اٹھا تھا کہ تم دونوں ابھی کل ہی یہاں آ کر مجھ سے ملنے گئے ہو مگر میں نے اسے سمجھایا کہ آگ دونوں طرف برابر ہی کی لگی ہوئی ہے بلکہ پارٹی بھی طاقت ور ہے اس لڑائی میں خون خرابے کے سوا اور کچھ حاصل ہونے والا نہیں۔ مزید یہ کہ اب وہ دیت کو بھول جائے۔ پیسے کی بات سے زیادہ بہتر ہوگا کہ کچھ لو اور دو کے تحت کام ہو جائے، یعنی برابری کے فائدے والی بات اور پھر ہر کوئی اپنا اپنا راستہ ناپے۔'' وہ اتنا کہہ کر ذرا دیر کو چپ ہوا۔ کالیا کے چہرے پر تاثر چمکنے لگا تھا، گویا وہ اس کی بات پر مطمئن تھا لیکن مجھے ایک نامعلوم سی بے چینی کھائے ہوئے تھی اور میں الجھی ہوئی نظروں سے اسی کی طرف تکے جا رہا تھا کہ وہ آگے کیا کہتا ہے۔

اس اثناء میں ایک شخص چھوٹی سی عام ٹرے میں چائے کے مگ رکھے اس کھولی نما کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے چائے کی ٹرے ہمارے سامنے درمیان میں رکھ کے خاموشی سے واپس چلا گیا۔

''چائے اٹھاؤ۔'' کہتے ہوئے شانو نے اپنا مگ اٹھا لیا۔ ناچار ہم نے بھی اپنے ہاتھ بڑھا دیئے۔ گرما گرم چائے کی ایک چسکی لینے کے بعد شانو نے پھر بتانا شروع کیا۔

''میرداد سے جب میں نے یہ کہا کہ جس لانچ میں اس کا دو نمبر مال آتا جاتا ہے وہیں ان کا یعنی تم لوگوں کا بیڑا (گروپ) ٹھہرتا ہے۔ اس پر وہ چونک گیا اور فکرمند بھی ہوا۔ میں تو ان جیسوں کی پڑیاں اپنی جیبوں میں رکھتا ہی ہوں ناں۔''

شانو ایک آنکھ میچ کر معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''یہ لوگ تمہاری جڑوں پر وار کریں گے اور جو دو نمبر تمہارا کاروبار ہے وہ تباہ ہو جائے گا۔ اس پر وہ پھر بھی تھوڑا اکڑ کر بولا تھا کہ ہم بھی دیکھ لیں گے۔ تب میں نے کہا کہ مصالحت اسی میں ... ہے کہ تمہاری لانچ ''المیر'' گھوڑا باڑی اور جاتی (ٹھٹھہ) کی بندرگاہ سے کیماڑی خیریت سے آتی جاتی رہے۔ ان کی کسٹم تک رسائی ہے، وہ سب جانتے ہیں تمہارے دھندوں کے بارے میں کیونکہ دشمنی میں سب سے پہلے کمائی کے ذرائع کو ہی نقصان پہنچایا جاتا ہے تمہاری جو لانچ ''المیر'' تیمر کے جنگلات میں پھنسی کھڑی ہے، یہی لوگ اسے نکلوا سکتے ہیں، کتنا مال ہے تمہارا اس کشتی میں، کروڑوں کا بولو ...منظور ہے یہ سودا صلح نامے کے طور پر تو ابھی ہاں کر دو۔''

شانو یہ سب بتا کر خاموش ہوا اور پھر آخر میں گفتگو کو لپیٹتے ہوئے بولا۔ ''وہ مان گیا فوراً ملاؤ ہاتھ۔'' کہتے ہوئے اس نے ہماری طرف اپنا ایک ہاتھ تالی کے طور پر بڑھا دیا۔ کالیا نے فوراً ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ میں تالی ماری اور طوعاً و کرہاً میں نے بھی اس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''تمہیں شاید خوشی نہیں ہوئی؟'' اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''ایسی بات نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''دراصل ... مجھے یہ سارا چکر سمجھ میں نہیں آیا ہے جو تم میرداد کے ساتھ چلانا چاہ رہے ہو۔''

دل میں تھوڑی ترمیم کرتے ہوئے میں نے یہ ضرور کہا تھا۔ ''جو تم ہمارے ساتھ چلانا چاہ رہے ہو۔''

میری بات پر وہ ہنسا۔ مجھے اس کی ہنسی مکارانہ سی محسوس ہوئی۔ وہ بولا۔

"ابھی سمجھائے دیتا ہوں، اس کے بغیر میری چال کامیاب نہیں جاسکتی۔"

اس نے چائے ختم کی، میں نے بھی اپنا خالی مگ دری پر پڑی ٹرے پر رکھ دیا۔ کالیا بھی اپنی چائے ختم کر چکا تھا۔

"تم دونوں کے لیے بھی یہ جان کاری ضروری ہوگی میری طرف پھینکا ہوا چھکا خالی نہ جائے اور گوٹ بھی میری آگے بڑھے، سنو! میرواد منشیات کا کاروبار کرتا ہے۔ سنگاپور سے منشیات ایک بڑی کھیپ خفیہ طور "سی گوڈیز" نامی ایک جہاز میں یہاں لائی جاتی ہے۔"

سی گوڈیز کے نام پر میں ہی نہیں کالیا بھی چونکا تھا۔ کالیا تو فرط جوش میں میری طرف دیکھ کر کچھ کہنا بھی چاہتا تھا اور میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا مگر میں نے بروقت حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے آنکھ مار کے کچھ بولنے سے منع کر دیا جبکہ شانو کھوجا میری اس حرکت کو نہ دیکھ سکا تھا کیونکہ وہ اس وقت اپنی قمیص کی پہلو والی جیب سے کچھ نکالنے میں مصروف تھا۔

پھر اس نے مین پوری کی پڑیا نکالی اور اس پر چڑھا ربر بینڈ کھولنے لگا۔ ہماری طرف بڑھائی۔ میں نے شکریے کے ساتھ انکار میں سر ہلا دیا مگر کالیا نے فوراً اپنی ہتھیلی آگے کردی۔ شانو نے مین پوری کا خشک گٹکا تھوڑا سا اس کی ہتھیلی پر الٹا اور پھر خود اپنے منہ کے قریب لے جا کر بھی یہی عمل کیا۔ کالیا خشک گٹکے کی پھکی مار چکا تھا۔ اب وہ بھی شانو کی طرح جگالی میں مصروف ہوگیا۔

"ہاں! تو میں بتا رہا تھا کہ....." شانو جگالی کرتے ہوئے آگے بولنے لگا۔ "مزے کی بات تو یہ ہے کہ جہاز کے مالک اور نصف سے زائد عملے کو اس کی بھنک بھی نہیں پڑتی حتیٰ کہ جہاز ابھی ساحل سے چند ہی ناٹیکل میل کے فاصلے پر گودی کے خالی ہونے کے انتظار میں ہوتا ہے کہ اس دوران منشیات کی وہ کھیپ خاموشی سے اتار لی جاتی ہے اور قریب کھڑی "الکمیر" لانچ میں بار کردی جاتی ہے۔"

"کمال ہے اتنے بڑے جہاز میں منشیات کی کھیپ لائی جارہی ہے اور جہاز کے بہت سے عملے کو اس کی خبر تک نہیں ہوتی۔" میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اتنے بڑے جہاز میں ہی تو یہ کام ہوتا ہے۔" شانو معنیٰ خیز لہجے میں بولا۔ "پورا جہاز منشیات سے لدا ہوا نہیں

نیند بھی اہمیت رکھتی ہے

امریکا میں ایک ہزار افراد کے سروے سے معلوم ہوا کہ بالغ افراد سات گھنٹے سے کم سوتے ہیں۔ کیا اتنی نیند کافی ہے؟ ڈاکٹر رونالڈ کے مطابق ضرورت سے کم نیند ہمارے ہیجانات کو بہت نقصان پہنچاتی ہے۔ اگر کوئی پریشان کن بات ہوجاتی ہے تو اس پر قابو پانے میں ہمیں شدید دشواری ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تھکے ہوئے بچے اسی صورت حال میں پریشان ہوجاتے ہیں۔ انہوں نے خود اپنے اسپتال میں اپنے اور اپنے ساتھی ڈاکٹر پر تجربہ کیا اور نیند سے محروم رکھنے کے بعد ان کے رویے میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا اور کہا۔ "میں نے انتہائی خوش مزاج اور بااخلاق نوجوان ڈاکٹروں کو نرسوں اور مریضوں پر غصے میں دھاڑتے ہوئے پایا۔ ان علامات کا سبب نیند سے محرومی اور تکان کے سوا کچھ نہ تھا۔"

خوب صورت گفتگو کا فن

مؤثر گفتگو آپ کی شخصیت کو دوسروں کے لیے زیادہ پُرکشش بناتی ہے اور آپ کے سماجی روابط اور تعلقات پر بھی بے حد اثر انداز ہوتی ہے۔ کسی بھی فرد کی گفتگو نہ صرف اس کی شخصیت، دلچسپیوں اور محرکات کی آئینہ دار ہوتی ہیں بلکہ اس کے سماجی طور پر پسندیدہ یا نہ پسندیدہ ہونے کا بھی تعین کرتی ہے۔ آپ کے لفظ آپ کا قیمتی ترین خزانہ ہے۔ اس خزانے کو سلیقہ مندی سے خرچ کر کے آپ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا سکتے ہیں۔ ان کی توجہ، ہمدردی، ستائش، محبت اور خلوص سب حاصل کر سکتے ہیں۔ یاد رکھیے اس خزانے کی فضول خرچی آپ کو سماجی طور پر کنگال بھی کر سکتی ہے۔ گفتگو کرتے وقت دوسروں کی دلچسپی کا خیال رکھیے، آپ کی ذمہ داری ہے کہ انہیں اپنے نکتۂ نظر کو پیش کرنے کا موقع دیں۔ دوران گفتگو محض اپنی ذات کو ہی نہ مقدم رکھیے بلکہ دوسروں کو بھی گفتگو میں شامل ہونے کا پورا موقع فراہم کریں۔

مرسلہ: سلطانہ بھٹو، لاڑکانہ

ہوتا۔ ایک مخصوص مقدار ہوتی ہے۔ آئل برداری کے علاوہ کبھی کبھار سبزی، پھل اور دیگر اجناس کے دیوہیکل کنٹینروں میں منشیات بھی اس طرح رکھ دی جاتی ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا۔‘‘
’’عملے کا کون کون آدمی میرداد کے آدمیوں سے ملا ہوا ہے؟‘‘ اس بار کالیا نے سوال کیا۔
’’عموماً جہاز میں کپتانی کے فرائض مختلف لوگ سنبھالتے ہیں لیکن جہاز کا تمام نظم و نسق ہمیشہ ایک ہی آدمی کے ذمے ہوتا ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ’’سی گوڈیز‘‘ اور اس کی کمپنی کے مالک کا خاص الخاص آدمی ہے اور وہی خفیہ طور پر آئل برداری کی آڑ میں یہ دھندا مقامی لوگوں کی ملی بھگت سے کرتا ہے۔‘‘
’’اس آدمی کا نام؟‘‘ میں نے دھک دھک کرتے دل سے شانو کھوجا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
’’راکا!‘‘ شانو نے بتایا۔
’’ابے لے جگری! یہ تو......‘‘ کالیا فرطِ جوش تلے پھر کچھ بولنے لگا تھا کہ میں نے اس کا ہاتھ دبا دیا۔ خود میں اس نام پر چونکا تھا، اگرچہ مجھے شانو کی آخر الذکر باتوں سے کافی حد اندازہ ہونے لگا تھا۔
یہ ساری صورت حال ایک طرح سے بڑی دلچسپ ہونے لگی تھی مگر میرا ذہن مزید کچھ اخذ کرنے کے لیے تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔ شانو کھوجا کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ جس آدمی کا نام اور اس کا راز اپنے کسی مفاد کی خاطر میرے سامنے آشکارا کر رہا تھا اس سے نہ صرف میری مڈبھیڑ بڑے سنسنی خیز حالات میں ہو چکی تھی بلکہ اس کی ’’خطرناکی‘‘ سمیت میں وہ اب میرے لیے ایک انتہائی ’’مطلوب‘‘ شخص قرار پا چکا تھا۔ راکا کی کمزوریوں سے واقفیت میرے لیے بہت ضروری تھی۔
اب شانو میرے لیے ایک دم اہمیت اختیار کرنے لگا تھا۔ تاہم وہ مجھ سے کیا چاہتا تھا، یہ اب بھی پردے میں تھا۔ میں اس کے مزید بولنے کا منتظر رہا مگر وہ کالیا کی بات پر ذرا چونک گیا تھا لہٰذا اس کی طرف دیکھ کر بولا۔
’’تم کچھ کہہ رہے تھے؟‘‘
’’نن...... نہیں، بس، کچھ خاص نہیں حیران ہو رہا تھا کہ جہاز کا ایک اس قدر اہم آدمی اس دھندے میں ملوث ہے اور مالکوں کو خبر نہیں۔‘‘ کالیا نے جلدی سے بات بنانے کی کوشش چاہی تھی۔
’’ہاں! یہی تو راکا کا کمال ہے۔‘‘ شانو فخر سے بولا۔
میرے دل میں ابھرا۔ ’’اب اس کا یہی کمال اس کے گلے کا کسی بھی وقت پھندا بننے والا تھا۔‘‘
میں نے شانو کھوجا کی طرف دیکھ کر کہا۔
’’تو گویا راکا اور میرداد کے ایک دوسرے کے ساتھ منشیات کے اس دھندے میں۔ خفیہ کاروباری معاملہ داری ہے؟‘‘
’’ہاں!‘‘ شانو نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ ’’جہاز سی گوڈیز پر اس کے دو آدمی جہانگیر اور شاہد، خلاصی کے طور پر اسی کے ہی آدمی ہیں۔ چند ایک آدمی راکا کے بھی ہیں۔‘‘
اس کے انکشاف پر میں نے پُرسوچ انداز میں اپنی بھنویں اچکائیں اور تب ہی میرے اندر ایک زبردست جھماکا ہوا۔ اس بات نے میرداد سے متعلق میری یادداشت کو کھدیڑا تھا اور مجھے سی گوڈیز پر کام کرتا ہوا وہ صحت مند سا مگر کرخت مقامی نوجوان یاد آ گیا جسے دیکھ کر مجھے لگا تھا کہ میں اسے پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں مگر مجھے یاد نہیں پڑ رہا تھا لیکن یاد آ گیا تھا کہ میں نے اسے کب اور کہاں دیکھا تھا۔
اسے میں نے تجن ڈاڈا کے اڈے پر اس وقت دیکھا تھا جب میرداد اپنے ساتھی مجو کی کالیا کے ہاتھوں ہلاکت اور بعد فرار پر آگ بگولا ہو کے اس کے پاس آیا تھا اس وقت میں بھی وہاں موجود تھا، تو وہی خلاصی نوجوان جو میرداد کا ساتھی تھا۔ (جو بہ قول شانو کے یقیناً جہانگیر یا شاہد ہو سکتا تھا) وہ اس کے ہمراہ تھا۔ اسی لیے وہ خلاصی مقامی نوجوان مجھے شناسا سا محسوس ہوا تھا۔
’’ہمارا اس میں کیا رول ہو سکتا ہے؟ کیا تم ہمیں بھی اس دھندے میں ان کا شریک کرنا چاہتے ہو؟‘‘ بالآخر میں مقصد کی بات پر آتے ہوئے شانو سے بولا۔
’’ہا...... ہا...... ہا......‘‘ شانو نے میری بات پر ایک بدمست سا قہقہہ لگایا اور بولا۔
’’دھندے میں تو شاید نہیں۔ بس اس کا ایک کام کر دو۔ ٹھٹھہ کے علاقے گھوڑا باڑی میں تیمر کے جنگلات میں ان کی ایک لانچ پھنس چکی ہے۔ اس کے خفیہ خانوں میں منشیات کی بڑی بھاری کھیپ پھنسی ہوئی ہے۔ لانچ تو اب ناکارہ ہو چکی ہے۔ اسے نکال کر لانے میں بہت سا وقت صرف ہوگا۔ تم دونوں کو بس اتنا کام کرنا ہوگا کہ اس لانچ کے اندر سے منشیات نکال کر جہاں پہنچانی ہوگی وہ میں بعد میں تمہیں بتا دوں گا۔ اب بولو منظور ہے یہ سودا...... بغیر کسی خرچے کے؟‘‘

مجھے اس کی مکاری پر دل میں ہنسی ہی آسکتی تھی مگر میں چپ رہا تھا تاہم کالیا بولا۔

''ابے لے، شانو بھائی! بغیر خرچا کس طرح ہوا؟ اس میں تو پھنس جانے کا خطرہ موجود ہے۔ منشیات فروشی کی سزا بڑی کڑی ہے اگر کسی طرح پولیس کو معلوم ہوگیا یا ہم پکڑے گئے تو عمر قید تو لازمی ہے۔''

اس کے فوراً بعد میں نے بھی شانو سے ایک سوال کیا۔

''حیرت ہے وہ لانچ اب تک پھنسی ہوئی ہے اور کسی کو پتا نہیں؟''

''مقامی پولیس کو پتا چل چکا ہے۔'' شانو نے جیسے چونکا دینے والا انکشاف کیا۔ آگے بولا۔ ''پولیس نے اس جگہ کو اپنی کسٹڈی میں لے رکھا ہے۔''

''کیا پولیس کو معلوم ہے کہ اس لانچ میں منشیات کی کھیپ بھی موجود ہے؟'' کالیا نے سوال کیا۔

''نہیں۔'' شانو نے جواباً نفی میں سر ہلایا۔ ''میر داد کے ٹھٹھہ کے ایک جاگیردار سے اچھے تعلقات ہیں، درحقیقت وہی اس کی پشت پناہی کرتا ہے اس معاملے میں میر داد اسی کا ہی آدمی ہے اور وہی جاگیردار منشیات کا ایک بڑا سوداگر ہے۔''

''کیا نام ہے اس کا؟'' میرا دل ایک اور نئے اور متوقع انکشاف تلے ایک بار پھر تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''حاجی مہران خان!'' شانو نے بالآخر وہ متوقع انکشاف کر ہی ڈالا۔

''ہم!'' میں ایک بے اختیار گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔ کالیا نے میری جانب کن انکھیوں سے دیکھا تھا۔ اس بار وہ محتاط رہا تو اور خود پر قابو بھی پائے رکھا تھا۔

''حیرت ہے۔ میر داد کے پاس اتنے آدمی اور سب سے بڑی بات ایک مقامی جاگیر اس کی سرپرستی کر رہا ہے پھر بھی؟'' میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو شانو بڑی مکاری سے بولا۔

''اس طرح کے دھندوں میں بڑی گمبھیر سیاست اور گورکھ چلتے ہیں دوستو! پولیس کو اگرچہ یہی بتا رکھا ہے کہ اس لانچ میں اجناس کے سوا کچھ نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ ٹرالر (لانچ) مچھلیاں اور جھینگیں پکڑنے کے لیے صرف ٹھٹھہ کی چھوٹی موٹی بندرگاہوں کی حد تک ہی رجسٹرڈ ہے۔ ایک فرض شناس انسپکٹر وجاہت سیال نے یہی پھڈا کر رکھا ہے جس کے باعث بات نہیں بن رہی ہے۔''

''باوجود اس کے جو کام تم ہم سے لینا چاہتے ہو۔ وہ اس کے میر داد یا حاجی مہران کے آدمی بھی کر سکتے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''یار تم سوال بہت کرتے ہو۔ اب ساری باتیں تو میں تمہیں نہیں بتا سکتا ناں؟ یہ سب بھی اسی لیے بتا رہا ہوں تاکہ تم سے کہیں ذرا بھی غلطی نہ ہو سکے۔''

شانو کسی قدر جھلائے ہوئے لہجے میں بولا تو میں جیسے اپنے تئیں اصل بات کی تہہ تک پہنچتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے یہ کام مگر کیا اس کی کیا گارنٹی ہے کہ اس کے بعد میر داد ہمارا ہمیشہ کے لیے پیچھا چھوڑ دے گا؟''

''میں اس کی گارنٹی دیتا ہوں۔''

''کس طرح؟''

''اس کام کو کامیابی سے کرنے کے بعد میر داد خود تم سے کہے گا کہ دشمنی ختم بلکہ وہ تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دے گا، پھر تو بس ناں؟'' شانو بولا۔

''ڈن..... منظور ہے یہ سودا۔'' میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے بھی جوش مسرت سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

باقی کی ہدایت کے مطابق اس نے کسی دن اپنا وہ آدمی میرے پاس بھیجنے کے لیے بچا رکھی تھی جس نے اس مہم میں ابتداء سے آخر تک ہمارے ساتھ رہنا تھا۔ اس کا نام شانو نے راجا انور بتایا تھا۔

''یہ سالا شانو ہمیں کیا ''چ'' سمجھتا ہے۔'' باہر آکر ڈیسپا پر سوار ہوتے وقت کالیا نے غصے سے دانت پیس کر کہا۔ ''میں یہ سارا گورکھ دھندا سمجھ چکا ہوں۔ یہ ہمیں اپنے مفاد کی خاطر قربانی کا بکرا بنا رہا ہے اور جگری! ہمیں استعمال کر رہا ہے اور یہ بھی میں تجھے بتا دوں کہ اس سارے معاملے میں میر داد کا دور دور تک کوئی کام نہیں ہے۔ یہ سالا شانو کھوجا خود اس لانچ کو ہڑپ کرنا چاہ رہا ہے۔ تو صحیح کہہ رہا تھا جگری! اس فراڈیے شانو کے چکر سے ہمیں بچنا چاہیے۔ چل آ..... چھوڑ اسے..... میر داد کوئی بلا نہیں ہے کہ ہمیں کھا جائے گا، جنگ تو جنگ سہی۔ اب تک ہم نے کتنے بڑے ہاتھیوں کو شکست دی ہے، یہ بھلا کیا حیثیت رکھتا ہے۔''

''ہمیں اس کے چکر میں ضرور آنا چاہیے۔'' میں نے سرد وسپاٹ لہجے میں کہا اور کالیا ہونقوں کی طرح میرا چہرہ تکنے لگا اور پھر اسی لہجے میں بولا۔

''ابے لے جگری! یہ کیا کہتا پڑا ہے تو؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں کالیا!'' میں نے کہا۔ ''میں تو اسی وقت ہی اس کی چال سمجھ گیا تھا جب اس نے مجھ سے جھلا کر یہ کہا تھا کہ میں سوال بہت کرتا ہوں اور میرا سوال وہ کھا گیا تھا۔ اسی لیے میں نے مزید جرح کرنے کی بجائے فوراً سودا ڈن کرلیا۔ دراصل یہ ہمیں بے وقوف نہیں سمجھ رہا نہ ہی ''چ'' سمجھ رہا ہے۔ بلکہ یہ ہمیں مصیبت کا مارا ہوا اور دہشت زدہ انسان سمجھ رہا ہے، جو ایک سنگین مشکل سے بچنے کے لیے ذہن سے کم اور دل سے زیادہ سوچتا ہے۔ تم ذرا غور تو کرو کالیا! اب تک میں نے دشمنوں کو انہی کی زبان اور چالوں سے ہی شکست دی ہے۔ کیونکہ یہ زمانہ آتشیں ہتھیاروں سے لڑنے کا نہیں بلکہ دماغی چالوں سے لڑنے کا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو کالیا کہ میں نے بغیر سوچے اور ایسے ہی سودا ڈن کرلیا ہے؟ ہرگز نہیں تمہیں یاد ہے ناں جب ہم نے شانو کھوجا سے پہلی بار ملاقات کی تھی تو تم اس سے راضی تھے مگر میں نہ تھا مگر اب اس سے ہماری ہونے والی اس دوسری ملاقات میں بالکل الٹ ہو رہا ہے، یعنی تم اس سے راضی نہیں ہو مگر میں راضی ہو گیا ہوں اب کیوں؟''

اتنا کہنے کے بعد میں نے ذرا توقف کیا اور کالیا کے بولنے کا منتظر رہا جبکہ میں نے دیکھا کہ کالیا میری بات بڑے دھیان اور غور سے سن رہا تھا اور شاید سمجھ بھی رہا تھا۔ بالآخر مجھے اس کے بولنے کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ متاثر کن لہجے میں بولا۔

''ابے لے جگری! تیری باتوں میں تو واقعی ایک حکمت ہوتی ہے جو پہلے تو میرے سر سے ہی گزر جاتی ہے لیکن تیرے سمجھانے اور توجہ دلانے پر بات مغز میں سماتی ہے۔ جیسے کہ ابھی تو نے مجھ سے کہا تو یہ بات دماغ میں آتی ہے کہ تو را کا سمیت حاجی مہران خان، میرداد سمیت ضرورت پڑنے پر شانو کھوجا کی بھی قبر کھودنے اور ان کی لٹیا ڈبونے کی تیاری کر رہا ہے۔ کیوں؟ غلط کہا میں نے؟''

''ایک دم سولہ آنے درست کہا تم نے میرے یار کالیا!'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''اس لیے میں اس کے دانستہ شانو کے بچھائے ہوئے جال میں پھنسنا چاہتا ہوں تاکہ اس کے اندر گھس کر مزید جان کاری کا موقع مجھے ملتا رہے۔ اب دیکھو، کتنی راز کی باتیں پتا چلیں...... نمبر ایک...... را کا اپنے آئل بردار جہاز میں درپردہ منشیات کا دھندا کرتا ہے، اگرچہ ابھی یہ پتا لگانا باقی ہے کہ آیا اس کے ساتھ اسٹاف کے کتنے اور کون سے آدمی شامل ہیں؟ آیا بن رائد بھی ملوث ہے اور شاہ میر کو معلوم نہیں؟ یا دونوں کو معلوم نہیں۔ نمبر دو حاجی مہران خان اس کالے دھندے میں کس حد تک ملوث ہے؟ تیسرے نمبر پر میرداد پر بھی اسی بات کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ سارے حقائق جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم شانو کھوجا کی بات بظاہر مان لیں لیکن درپردہ ہم ان کے خلاف کوئی اور کارروائی کریں۔''

''ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔'' کالیا بولا۔

''کون سی بات؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اگر شانو نے اپنے کسی مفاد کی خاطر ہم سے کوئی چالاکی کھیلنے کی کوشش کی بھی ہے اور میرداد کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں تو پھر شانو ہمارے سلسلے میں میرداد کو کیسے رام کرنے کی بات کر رہا ہے؟''

''اس نے ترپ کا وہ پتا الگ سے اپنی جیب میں پہلے سے ہی ڈالے رکھا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے اپنا کام ہو جانے کے بعد وہ میرداد کو... ہمارے سلسلے میں دوسرے طریقے سے مطمئن کرلے۔''

''یہ بھی بات تیری سولہ آنے درست ہے جگری!'' کالیا پُرخیال لہجے میں بولا۔

''بس! تو پھر دیکھتا جا میں کرتا کیا ہوں۔'' میں نے آخر میں کہا اور کک مار کر اسکوٹر اسٹارٹ کردی۔

ہم نے وہاں سے ایڈووکیٹ زنیرہ کے گھر کی راہ لی۔ آدھے پون گھنٹے بعد ہم زنیرہ کے پاس تھے۔ حسب توقع وہ مجھے خوش یا جوش میں نظر آنے کے بجائے پریشان اور خاصی جھلائی ہوئی نظر آرہی تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے ایک چونکا دینے والا انکشاف کیا اور مجھے یوں لگا جیسے میری اب تک کی جیت سوائے ایک خوش فہمی کے اور کچھ نہ تھی۔ مجھے اس کی بات پر یقین ہی نہ آیا تو اس نے آج کا تازہ اخبار مجھے تھما دیا۔

عزیر خان کی مقتولہ ثوبیہ کے سلسلے میں گرفتاری اور بعد عمر قید کی سزا لگ جانے کی خبر ابھی گرم ہی تھی کہ یہ منحوس خبر بھی چھپ گئی تھی جسے اخبار والوں نے خوب چٹ پٹے انداز میں اور لہک لہک کر یہ سرخی لگائی تھی۔

''بالآخر ایک باپ کی اپنے لاڈلے بیٹے کو موت کی سزا سے بچانے کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں۔ دیت کے لیے مقتولہ ثوبیہ کے گھر والے رضامند۔''

(جاری ہے)

بیت بازی
قارئین

(نوازش علی لاہور کا جواب)

شبیر شاہ.........گڈو بیراج

اب تم کس مقام پہ آکر بچھڑے ہو
اب تو زندگی کے دن سنورنے والے تھے

(ہادیہ ایمان ماہا ایمان ڈاہر نوالہ کا جواب)

رفیق احمد ناز.........ڈی جی خان

اک زخم جو ابھی تک تازہ ہے
کانٹوں سے نہیں پھولوں نے دیا ہے

(راحیل پراچہ کا جواب)

رضا احمد اعوان.........دریا خان

نامید تو نہیں دل ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

(نورعین کوثر دینہ جہلم کا جواب)

منشی عزیز مے.........لنڈن

روز کہتا ہوں نہ گھر جاؤں گا اس کے لیکن
روز اس کوچے میں اک کام نکل آتا ہے

(احمد جاوید ڈیرہ غازی خان کا جواب)

مریم بنت کاشف.........حیدرآباد

صبر کیوں دلاتے ہو ضبط کیوں سکھاتے ہو
مجھ کو کتنی صدیوں سے یہ سبق تو ازبر ہے

عبدالستار.........ساہیوال

حیات و موت کی آئینہ دار ہے آتش
یہی جلی ہوئی سگریٹ بجھی ہوئی سگریٹ

(نوازش علی کوٹ ادو کا جواب)

نیلوفر شاہین.........اسلام آباد

محفل وہی ہے رونقِ محفل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا وہ دل نہیں رہا

(ناعمہ تحریم کراچی کا جواب)

مریم بنت کاشف.........حیدرآباد

حوصلہ چراغ کا دیکھ
جو ہواؤں میں چلتا رہتا ہے

ظفر اقبال ظفر.........کامرہ شرقی

حالات ہی ایسے ہیں کہ خاموش ہوں
ورنہ میرے سینے میں طوفان بہت ہیں

(نگار فاروقی راولپنڈی کا جواب)

سدرہ بانو تاگوری.........کراچی

ابھی آئے ابھی بیٹھے ابھی آنچل سنبھالا ہے
تمہاری جاؤں جاؤں نے ہمارا دم نکالا ہے

(ڈاکٹر عبدالغنی شکیل ملتان کا جواب)

غضنفر عباس مرزا.........اسلام آباد

ابھی جام عمر بھرا نہ تھا کف دست ساقی چھلک پڑا
رہی دل کی دل ہی میں حسرتیں کہ نشان قضا نے مٹا دیا

(عبدالجبار رومی قصور کا جواب)

الیاس حسن.........روہڑی

وحشتِ دل نہ جگائے کوئی تازہ فتنہ
بارہا روئے ہیں مشکل سے ہنسی آئی ہے

انوار حسین.........سرگودھا

وہ ہم سے دور جائیں گے جہاں بھی
ہماری آہ پہنچے گی وہاں بھی

(رفیق احمد ناز ڈی جی خان کا جواب)

مدیحہ گوہر.........کراچی

عشق اور حسن جہاں جذب ہوئے ہوں اس جا
کوئی کعبہ کوئی بت خانہ بنایا ہوتا

(خوش بخت بھکر کا جواب)

نوشین عابد.........لاہور

منزل کی جستجو بھی نہ رہبر کی تھی تلاش
ہم خاک ہو کے گردِ پس کارواں رہے

انوشہ نوید............گجرات

مستی میں غرق ہو گئی چلتی ہوئی ہوا
مدہوش نکہتوں کے بھنور چھوٹنے لگے

علی عشرت............باغ اے کے

میں جو کہتا ہوں، اب راکھ کا اک ڈھیر ہوں میں
مجھ سے وہ کہتی ہے، میں بھی تو نہیں ہوں دلشاد

انیس الرحمٰن............لاہور

مجھ سے ملنے کی جب کوئی صورت نہیں
یاد کیوں آرہے ہو مجھے دم بدم

(اقرا بانو ناگوری کراچی کا جواب)

آفتاب احمد نصیر اشرفی............کراچی

یہ کہہ کے پھینک دیئے اہلِ کارواں نے چراغ
ہمیں تو شہر میں ہونا ہے شام سے پہلے

ہادیہ ایمان ماہا ایمان............فورٹ عباس

یہ بھیگی رُت یہ مستانی ہوا، برسات کا موسم
بہاروں کا سماں، یہ رس بھرے جذبات کا موسم

(ثناء فرحت لاہور کا جواب)

محمد احسن جاوید............ڈی جی خان

فاصلے ایسے بھی تھے یہ کبھی سوچا نہ تھا
سامنے بیٹھا تھا وہ اور وہ میرا نہ تھا

(نزاہت افشاں فتح جنگ کا جواب)

نسیم اختر............بہاولپور

انہی سے پھر آخر کو کھُل کھیلتے ہیں
وہ کرتے ہیں جن سے حجاب اول اول

سید امتیاز حسین بخاری............سرگودھا

اشک آنکھوں سے برسنے لگے سون کی طرح
جب رکھی سامنے تصویر پرانی تیری

نوشین عابد............لاہور

آج پہروں تلک اڑتا رہا بے کار دماغ
دل میں اک ساتھ اٹھے کتنے ہی بے ربط خیال

شکیل احمد قریشی............دبئی یو اے ای

انگ انگ کو پون نے چھیڑا جھوم کے جب اٹھے بادل
کیا جانے کیا سوچ کے ہو گئی گوری کی آنکھیں جل تھل

شاہد خان............پشاور

اپنی ناداری و افلاس پہ رو دیتا ہوں
چھیڑ دیتے ہیں وہ جب تاج محل کی باتیں

نازنین ناز............کراچی

اف یہ خاموش سیاہ رات امنڈتے بادل
اف یہ تنہائی کا عالم یہ سسکتی ہوئی یاد

لیلیٰ فرحان............فیصل آباد

اب اپنے ہوش میں آجاؤں یا ایسے ہی مدہوش رہوں
للہ تم اپنی نظروں کے فرمان کی مجھ سے بات کرو

(نوشین عابد لاہور کا جواب)

انیس فاروقی............کراچی

روز تاروں کی نمائش میں خلل پڑتا ہے
چاند پاگل ہے اندھیرے میں نکل پڑتا ہے

نازیہ تبسم............حیدر آباد

روک سکیں گے کیا امید
چاہت کی راہوں کے ٹیلے

(محمد اسلام بھٹو لاڑکانہ کا جواب)

انتظار مہدی............نوشہرہ

ہاں ترے پیار کی بہار ہوں میں اس کہانی کا اختصار ہوں میں
بے قراری میں اک قرار ہوں میں ذرے ذرے سے آشکار ہوں میں

سعید حسن............لاہور

ہماری بے کیف زندگی میں وہ پہلی سی دلکشی نہیں ہے
چراغ جلنے کو جل رہا ہے مگر کوئی روشنی نہیں ہے

تبسم اقبال............لاہور

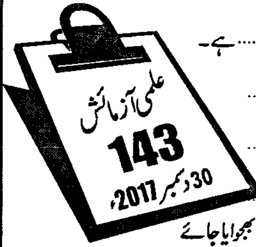
ہیچ ہیں اس رخِ رنگین کے مقابل احسن
یہ گل و لالہ کے قصے یہ کنول کی باتیں

ڈاکٹر بانو............کراچی

ہر نوکِ مژہ صبح کے تارے کا نشیمن
چھلکی ہوئی صہبائے گہربار غزل ہے

☆☆

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔



میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام.......................... ہے۔

نام: ....

پتا: ....

....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے

کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 دسمبر 2017ء تک علمی آزمائش 143 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شاملِ اشاعت کر لیں

(شعر الگ کاغذ پر ہے) 105

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

علمی آزمائش۔144

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 دسمبر 2017ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

غیاث الدین بلبن کے دور میں پیر ہرات کی اولاد میں سے ایک خواجہ ملک علی ہند آئے۔ بلبن نے انہیں پانی پت میں سیر حاصل دیہات پرگنہ میں عطا کیا۔ وہیں 1837 میں ان کی ولادت ہوئی۔ شادی کے بعد تحصیل علم کے شوق میں دہلی آ گئے۔ ابھی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ گھر والے آ کر زبردستی واپس لے گئے۔ یہ ذکر 1855 کا ہے۔ غدر کے بعد دوبارہ دہلی آ کر نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی مصاحبی کی۔ اردو شاعری میں بڑا نام کمایا۔ کہتے ہیں کہ ان کا ایک مسدس ہی انہیں جنت میں لے جائے گا۔

علمی آزمائش 142 کا جواب

میجر عزیز بھٹی شہید 1928ء کو ہانگ کانگ میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد وطن لوٹ آئے اور کھاریاں گجرات میں رہائش اختیار کی۔ 1948ء میں پاک فوج میں شامل ہوئے اور 1950ء میں پنجاب رجمنٹ میں کمیشنڈ پائی۔

انعام یافتگان

1۔ زید بشیر فاروقی (کراچی) 2۔ سید مجاور علی (لاہور) 3۔ فاروق پراچہ (حیدرآباد)
4۔ یاسمین گل (پشاور) 5۔ سہیل خان (کوئٹہ)

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے جلیل احمد جعفری، عطیہ نورین، پروین اختر، آفتاب احمد نصیر اشرفی، محمد عبدالعماس (گولڈن آرکیڈ)، وجاہت وکیل عثمان خان، عبدالحکیم ثمر، محمد یونس جمال، ناعمہ تحریم، تبسم عرفان قریشی، فیروز رحمانی، [illegible]، سبطین سید،

یاسین جان، پروین بیگم، مہر خورشید، باسط فاروقی، واجد خیر محمد، عنایت [illegible]
نواب سلیم کھوکھر، آفتاب گجراتی، صوفی تبسم، نیل اختر، الیاس محمد، خان الیاس، محمد ایضان [illegible]
مرزا، فرحین بشیر، عنایت گجر، انعام گل، فرحین فردوس، نوازش احمد، خواجہ علی، فرحت عباس رضوی [illegible]
سے انوارالاسلام، نادرشاہ، محمد کوثر اسلام، زینت تبسم، خاقان علی، کاظم شاہ، ملک فیض، مسعود اختر [illegible]
انس الحق، فیضان انور، نورعلی، محمد افضل، اشرف بٹ، سہیل خان، ضیاء عباس، نسیم شاہ، سید محمد احتشام الدین [illegible]
سے افتخار حسین شاہ (پپلاں)۔ راولپنڈی سے رضوان احمد ہاشمی (تاہلی موہری)، نوید الحق (علامہ اقبال کالونی)، طارق
ظفر، معین انور، کاظم فریدی، عتیق الرحمن خان، قادرعلی قادری، کاظم جعفری، برجیس مرزا، حضور خان مسعود اظہر، افکار
حسن خان، صابرعلی، ذکی سید، تقی عباس تقی، نوید حسن خان، مہدی علی خان، نعمان خان، ارتضیٰ حسین، محمد اسلام الدین
اسلام آباد سے بیگم پروفیسر ریاض، نیلوفر شاہین، غضنفر عباس مرزا، محمد ذیشان، ماہ جبیں فاطمہ، خالد عثمانی، نعیم اختر، نشاط
بانو، عزیز الحسن۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان خٹک، محمد فیض، عتیق احمد، صابرعلی، سعید الدین۔ حافظ آباد سے عبدالواحد،
محمد ابراہیم مستری، عظیم الدین، خلیق الرحمن۔ سرگودھا سے سید امتیاز حسین بخاری، اکبر خان، معین الدین، اشرف ممتاز،
عنبر زہرا، زاہد حسن، نادرشاہ، فصیح الزماں۔ ملتان سے محمد سرفراز مغل، ڈاکٹر ادیب عبدالغنی شکیل، محمد معین چشتی، خواجہ محمد
حسنین، احمد یار خان، رخسانہ یاسمین خالد، محمد خضر حسن، قیام الدین گردیزی، نسیم احمد۔ کشمور سے شبیر شاہ، فیض محمد۔
ساہیوال سے زین الایمان احمد قریشی، عنایت علی، ناصر حسن۔علی۔ شہدادکوٹ سے: زدہیب بلاول' محمد عنایت اللہ' محمد
فصیح۔ ڈیرا غازی خان سے: محمد سراج الدین' رانا محمد ارسلان' رانا زاہد حسین' اعجاز عطاری' محمد اظفر' منیرالدین' رابعہ
طلعت انصاری۔ ڈیرا اسماعیل خان سے: نثار بیٹنی' آصف اقبال' محمد فہیم' سلطان اشرف خان' ثناء اللہ فاروقی' جہانزیب
غوری۔ بہاولنگر سے: سلیم کامریڈ (کھاناں) طیبہ اطہر' جہانزیب بنگش' سلطان فتح شیر خان زردلی۔ بہاولپور سے: محمد
عبدالصبور' رحمٰن شاہ' کلیم اصغر' نبی بخش جویا' اعجاز زیدی' ارشد خان' سید محمد لئیق' محمد ظفر اقبال۔ سرگودھا سے: محمد اشرف
خان تبسم' سید امتیاز بخاری' ممتاز احمد سندھو۔ پشاور سے: مظہر حسین' شبیر جان' گل باز خان' بشیر اشرف' زردلی خان' غلام
پنجتن طوری' شاہد سلمان۔ نوشہرہ سے: فہمیدہ شریف خان' خیال اشرف خیالی۔ کوٹ غلام محمد سے: رفیع اللہ انصاری۔
خوشاب سے: اعجاز حسین سٹھار (نورپور تھل) محمد خان جوئیہ' شکیل حیدر' ارشد چیمہ' نصرت علی' احمد کمال فرمیانوالی سے محمد
ممتاز۔ سکھر سے ایم راشد (مہران الیکٹرک)، اشرف خان، طارق علی، حیات محمد، فیض جوکھیو۔ شجاع آباد سے فہیم الدین،
حسن علی زیدی۔ حاصل پور سے نعمان ادریس۔ پاک پتن شریف سے علی محمد (حسن پورہ)، نصیر اشرف۔ کوہاٹ سے فدا
حسین طوری۔ خانیوال سے سید ابشام۔ چکوال سے فیض محمد۔ مظفرآباد آزاد کشمیر سے عمران ظفر (پاکستان جیمز جیولری)۔
شیخوپورہ سے ثریا فاطمہ۔ فیصل آباد سے ذیشان ریاض، محمد خالد بٹ، عباس علی سید۔ حیدرآباد سے ماہ رخ، فلک بنت
عبدالندیم، عباس علی، طفیل محمد، فرحان احمد، ناصر عباس بھٹو، امجد بٹ، احمد لون، قیام الدین محمد محی الدین، فیصل شیخ، شاہد
احمد، عبدالخالق اعوان، فیروز احمد، شکیل احمد، ناصرالدین جنجوعہ، فرحین بشیر، فاروق احمد، نشاط فاطمہ۔ ڈیرہ غازی خان
سے محمد احسن جاوید، رفیق احمد ناز (نظام آباد)۔ منڈی بہاؤالدین سے سیف اللہ (ملک وال)، عباس علی سعید، فیصل علی
خان۔ بہاولپور سے حمیرا کوکب واسطی، مہوش خان، فطرت عباس، جاوید نقی عثمانی، اکرم ملک، نواز کھوکھر، محمد فہیم، صفی اللہ
خان۔ بہاولنگر سے ذکیہ امتیاز ملک، انتخاب الحسن، فصاحت اللہ، ظہیر شاہ، یاورعلی سعید، شاہ ممتاز شاہ، صغریٰ بیگم، افضال
محمد۔ لیہ سے نذیر احمد گجر۔ کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ مظفر گڑھ سے چودھری فیض الدین، اظہر یوسف، عنایت فاطمہ،
نعمان ملک، ساجد علی، ارباز خانزادہ، میرپورخاص سے پروفیسر طارق حبیب، سلطان جوکھیو۔ میرپور ماتھیلو سے عباس
حسن۔ میرپور آزاد کشمیر سے یوسف خان۔ خیرپور میرس سے احمد علی زیدی۔ شادی پور سے عباس علی۔ ڈی آئی خان سے
محمد شاد خان۔ ڈی جی خان سے رفیق احمد۔ چنیوٹ سے خورشید حسن زیدی۔ راجن پور سے ملک محمد ظفر اللہ۔ منڈی
بہاؤالدین سے: محمد اقرار الحسن' زینب رضوی' سلمان حسن' سلیم اللہ فہمی۔

بیرونِ ملک سے موصول ہونے والے جواب عباس علی کاظمی (شارجہ)، محمد مستقیم (العین)، زاہد خان (قاہرہ)،
امتیاز احمد خان (دبئی)، فرحین شاہ (فرینکفرٹ)۔

عشق گزیدہ

محترم مدیر
سلام تہنیت
ایک اور روداد پیش کررہی ہوں۔ یہ روداد وسیم کی ہے جسے الفاظ کا پیرہن میں نے دیا ہے۔ اس روداد میں کئی مقام ایسے آئیں گے کہ آپ چونک جائیں گے۔ گو کہ یہ ایک ایسی سچ بیانی ہے جس کا مرکزی نکتہ محبت ہے اور محبت ایک ایسا جذبہ ہے جسے تخلیقاتی ادب میں خواہ وہ نثر ہو یا نظم سب میں اس موضوع کو بحث میں لایا گیا ہے۔ شاعروں نے دیوان کے دیوان تحریر کیے تو ادباء نے خون جگر سے شاہکار تخلیق کیے، کیونکہ یہ ایک الہامی جذبہ ہے، کائنات کا طاقت ور ترین جذبہ۔ یہ چٹانوں سے دودھ کی نہریں نکلواتا ہے تو کبھی بادشاہوں سے ٹکرادیتا ہے لیکن ہزاروں مشکلات اور فتوحات کے جھنڈے گاڑنے کے بعد ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب طاقت و توانائی کے اس منبع کو بے بسی کی کیفیت میں مات ہو جاتی ہے۔ وسیم کی سچ بیانی نے مجھے مجبور کردیا ہے کہ میں اس کی روداد کو کہانی کے انداز میں پیش کروں۔

زویا اعجاز
(لاہور)

وسیم شام کی ڈھلتی پرچھائیوں میں لپٹے اس گھر کے باہر کھڑا تھا۔

کچھ عرصہ قبل وہ یہاں بے فکری سے کسی بھی وقت چلا آیا کرتا تھا لیکن آج اک بے اطمینانی اور ہچکچاہٹ کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس قلیل عرصہ میں درودیوار پر وحشت کے سائے کچھ مزید گہرے سے محسوس ہو رہے تھے اور وہ اس ویرانی و سناٹے کے اسباب سے لاعلم بھی نہ تھا۔

نیم وا دروازے کو آہستگی سے دھکیلا وہ اندر داخل ہوگیا۔

وہاں کوئی بھی ذی نفس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ صحن میں جابہ جا سوکھے پتے بکھرے تھے۔ اپنے قدموں تلے ان کی کراہیں اور سسکیاں سنتا وہ بے اختیار عقبی جانب بڑھتا چلا گیا۔ اس کی توقع کے عین مطابق گھر کا اکلوتا فرد وہیں موجود تھا۔

"صبح سے منتظر ہوں تمہارا۔ اتنی دیر کیوں لگا دی؟" وسیم کے قدموں کی آہٹ سنتے ہی اس نے اپنے مخصوص تند لہجہ میں کہا لیکن آواز میں گھن گرج آج مفقود تھی۔

"میں آنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن تمہارے خط میں جانے ایسا کیا اسرار تھا کہ خود کو روک بھی نہیں پایا۔" وسیم نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"تمہاری یہاں آمد طے تھی وسیم...... تب بھی اور آج بھی، عذر خواہ کوئی بھی ہو۔" اس نے اپنے ہاتھ میں موجود پھولوں کی پتیاں نیم کے پیڑ تلے موجود قبر پر بکھیر دیں۔ "فاتحہ پڑھ لو تو اندر چلے جانا، میں نماز کے لیے مسجد جا رہا ہوں۔"

وسیم نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا اور فاتحہ خوانی کے لیے ہاتھ بلند کر دیئے اور وہ ڈھیلے قدموں سے چپل گھسیٹتا نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

فاتحہ کی ادائیگی کے بعد وسیم چند لمحے خالی الذہنی کی کیفیت میں قبر کی مٹی پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ نیم کے پیڑ پر ایک گھونسلے میں چڑیا کے دو بچے مادہ چڑیا کو اپنے پاس منڈلاتے دیکھ کر گہری مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ اس وحشتناک ماحول میں اسے ننھے پرندوں کی یہ صدائیں بہت خوش کن محسوس ہوئیں۔

شام کے سائے اب رات کی ردا میں سمٹنے لگے تھے۔ وہ چارو ناچار اٹھا اور اندرونی جانب بڑھ گیا۔ یہ پرانے وقتوں کا تعمیر شدہ ایک کہنہ سال گھر تھا جس کا ایک تہائی رقبہ صحن پر مشتمل تھا۔ صحن کے بیچوں بیچ دو کمرے اور ایک جانب مختصر سا باورچی خانہ تھا۔ وسیم کو ہمیشہ ہی سے یہ گھر ایک سرائے لگتا تھا اور آج تو یہ تاثر مزید گہرا محسوس ہو رہا تھا۔

کمرے میں حسب معمول اندھیرا چھایا تھا۔ اس نے دائیں جانب دیوار کو ٹٹولتے ہوئے ایک سوئچ بورڈ تلاش کیا۔ 'چٹ' کی آواز سے کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ وہ اردگرد



موجود اشیاء پر طائرانہ نگاہ دوڑاتے ہوئے ایک بدرنگ کرسی پر بیٹھ گیا۔ بائیں جانب ایک تپائی پر کچھ کتابیں اور ربڑ کی گیند اپنی جھلک دکھا رہے تھے۔ وسیم نے ٹرانس کی کیفیت میں وہ گیند تھام لیا۔

ربڑ کا سرد لمس انگلیوں کی پوروں میں سرایت ہوتے ہی اردگرد پھیلا جامد سناٹا ایک بھرپور منظر میں تبدیل ہو گیا۔

☆☆☆

کھیل کے میدان میں لڑکوں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اس قصبے میں یہ واحد گراؤنڈ تھا جہاں سہ پہر ڈھلتے ہی بہت رونق اور چہل پہل کا سماں رہتا تاہم اس وقت ایک گمبھیر صورتِ حال درپیش تھی۔

یہاں فٹبال اور کرکٹ کو یکساں مقبولیت حاصل تھی۔ لڑکے بالوں نے اپنی سہولت کے مطابق گراؤنڈ کے لیے نظام الاوقات ترتیب دے رکھے تھے۔ جس کے مطابق دونوں فریقین ہنسی خوشی اپنا وقت گذارتے لیکن آج پہلی مرتبہ بحث و مباحثہ کی نوبت آن پہنچی تھی۔ سہانے موسم کی بدولت دونوں کو گراؤنڈ پر مکمل تصرف درکار تھا۔ وسیم کرکٹ گروپ کا ممبر تھا۔ وہ اس قصبہ میں دو ہفتہ قبل ہی اپنے ماموں کے گھر تین ماہ کی چھٹیاں گذارنے آیا تھا۔ اس کا ماموں قصبے کا پٹواری تھا جس کی سرکاری حیثیت کی بدولت وسیم کو کسی بھی اضافی محنت کے بغیر ہی سب لڑکوں میں ممتاز حیثیت حاصل ہو گئی تھی اور اس وقت بھی اس نے اپنی اسی اہمیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس قضیہ کو سلجھانے کا فیصلہ کر لیا۔

''کیوں بے کار میں اپنا وقت برباد کر رہے ہو سب؟ ابھی شام ڈھلتے ہی سب کے گھر والے واپسی کے لیے لٹھ لیے پیچھے پڑ جائیں گے۔''

''تو تم ہی بتا دو کہ کیا حل نکالیں اس مسئلے کا؟'' فٹ بال گروپ کے ایک لڑکے نے کہا۔

''حل تو میرے پاس موجود ہے لیکن کیا تم لوگ تسلیم کر لو گے؟'' اس نے متانت سے کہا۔

''مجبوری کا نام شکریہ، اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں۔'' اس کے ایک ساتھی نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''تو ٹھیک ہے پھر گراؤنڈ میں انھیں کھیلنے دو ہم پچھلی جانب سڑک پر کھیل لیں گے۔''

''لیکن یہ ہارڈ بال اس کے لیے مناسب نہیں یار...... اس پہ مستزاد سڑک کے کونے پر موجود گھر کے مکین بہت آدم بیزار ہیں پچھلی دفعہ اس گیند سے ان کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا۔ بہت لے دے ہوئی تھی اس معاملہ پر۔'' اصغر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''اس کا بھی حل ہے ایک میرے پاس گھر میں ربڑ کی

ایک گیند موجود ہے۔اس سے کام چلاتے ہیں۔ایک نیا تجربہ سہی۔'' وسیم نے متبادل راہ سجھائی۔

تھوڑی سی بحث و مباحثہ کے بعد معاملہ طے پا گیا اور وہ سڑک پر اینٹوں کی وکٹ بنائے اپنے کھیل میں مگن ہو گئے۔اگلے ایک گھنٹے تک وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔ان کا میچ اب اختتامی مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔اس اثناء میں وہاں موجود اکلوتے گھر کا دروازہ کھلا اور ایک درمیانی عمر' متوسط قد و قامت کا حامل شخص اپنے ہاتھ میں ایک بڑا سا شاپر تھامے برآمد ہوا۔

اسی پل وسیم کی ایک زوردار ہٹ سے گیند اچھلتی ہوئی اس کے ہاتھ پر لگی۔

''سوری انکل جی!! میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا ایسا۔'' وسیم نے فوراً صلح جویانہ انداز میں کہا۔

لیکن اس نے بھنّا کر کوڑا کرکٹ سے بھرا وہ شاپر سڑک کے وسط میں پھینکا اور مغلظات اگلنے لگا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے بھئی؟ معذرت کر تو لی ہے میں نے اس سے۔'' وہ بھی طیش میں آ گیا۔

''اسی لیے ہم یہاں نہیں کھیلتے، ذرا سی اونچ نیچ ہو جائے تو یہ یونہی بکنا جھکنا شروع کر دیتا ہے۔'' ساجد نے بمشکل ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''تو اس کا علاج کیوں نہیں کرتے تم لوگ؟'' وسیم کے لیے اس کی زبان دانی کے جوہر اور گیند سے محرومی نا قابل برداشت تھی۔

تیسری صنف سے تعلق رکھنے والا وہ شخص اس قدر زہر آلود زبان کا حامل ہوگا، وسیم کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

''کیا علاج کریں اس بے چارے کا، یہ تو پیدائشی مظلوم ہے۔'' اصغر نے تاسف سے کہا۔

''ہمارے گھر والے بھی اسے کچھ کہنے سے روکتے ہیں......وہ کہتے ہیں اس قبیل کے حامل کی آہ اور بددعا سے ڈرنا چاہیے۔'' ساجد بھی سنجیدہ تھا۔

''اب بددعاؤں کے خوف سے کیا ان کی ہر ناجائز بات بھی برداشت کر لی جائے؟ میں آج ہی بات کرتا ہوں اس کے سرپرستوں سے۔''

''ارے بھائی!! کون سرپرست؟ صرف ایک بیوہ عورت ہی تو رہتی ہے اس گھر میں، وہ اس سے بھی بڑھ کر آدم بیزار ہے۔یہ ملازم ہے اس کا۔'' ساجد نے بتایا۔

''وہ عورت! بھلے برے وقت میں یہاں سب کی مدد بھی تو کر دیتی ہے۔'' اصغر نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''مجھے اس سے کیا مطلب بھئی؟ میں صرف اس کی گالیوں کے متعلق اس عورت سے دوٹوک بات کروں گا۔'' گیند سے محرومی کے بعد کھیل تو ویسے بھی ختم ہو چکا تھا اس لیے وسیم کے لیے اپنے اندر مچل رہے غصہ کا اخراج لازمی تھا۔

''ہمیں تو معاف ہی رکھو۔'' وہ سب تتر بتر ہو گئے۔

وسیم پشت پر ہاتھ باندھے تیز تیز قدموں سے چلتا اس گھر کی سمت بڑھا۔اس کی دستک کے جواب میں ایک خوبصورت اور طرح دار عورت دروازے پر نمودار ہوئی۔

''کیا چاہیے تمہیں لڑکے! کدھر گھسے چلے آ رہے ہو؟'' اس نے درشتی سے کہا۔

''مجھے انصاف چاہیے محترمہ!'' وہ اس کے مزاج کو خاطر میں لائے بغیر بولا۔

''کیا یہاں کوئی عدالت لگائے بیٹھی ہوں میں۔'' وہ سابقہ انداز میں بولی۔

''میں آپ کے ملازم کے متعلق بات کرنے آیا ہوں۔اسے کس نے یہ حق دیا ہے کہ وہ گالیاں دے؟ اسے بخوبی نظر آ رہا تھا کہ ہم سڑک پر کھیل رہے ہیں لیکن پھر بھی وہ دانستہ اسی رستے پر چلتا رہا اور جب چوٹ لگ گئی تو بھی ہم ہی قصوروار ٹھہرے۔یہ کہاں کا انصاف ہے جی؟'' وہ بلا توقف بولتا رہا۔

اس عورت نے چند ثانیوں کے لیے اس کا چہرہ اپنی گہری نظروں کے حصار میں لیے رکھا اور پھر دھیمے لہجہ میں گویا ہوئی۔''اندر چلے آؤ! اطمینان سے بات کرتے ہیں۔''

وسیم نے اس کی معیت میں صحن کے وسط میں بچھی کرسیوں میں سے ایک نشست سنبھال لی۔نیم پختہ صحن اور دو کمروں پر مشتمل یہ گھر بے حد صاف ستھرا تھا۔

''تم سے یہ کس نے کہا کہ وہ میرا ملازم ہے؟'' وہ اس کے مقابل کرسی پر بیٹھ گئی۔

''سارا قصبہ یہی کہتا ہے۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

''تم پہلے تو یہاں کبھی نظر نہیں آئے؟''

''میں دو ہفتہ قبل ہی یہاں شفٹ ہوا ہوں۔''

''پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔'' وہ ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ کر بولی تو وسیم کو اچھنبا ہوا۔یہاں آمد سے قبل اس گھر کے مکینوں کی بیزاری اور چڑچڑاہٹ کے قصے سننے کے بعد سوالات کا یہ سلسلہ اور دلچسپی اسے بے مقصد معلوم نہیں ہو رہی تھی۔

''جی ہاں! میٹرک کے پرچے دے کر آیا ہوں۔''

"تو یہاں وقت ضائع کرنے کیوں چلے آئے۔ اس دھول اڑاتے قصبے، دن بھر گلی کوچوں میں وقت کا ضیاع کرتے لڑکوں کے ساتھ اپنا وقت بھی کیوں ضائع کر رہے ہو؟"

"میرے ماموں نے بہت محبت اور مان سے مجھے یہاں مدعو کیا ہے محترمہ! اور محبتوں کو ٹھکرا کر محض اپنا نفع و نقصان سوچنے والے کم ظرف ہوتے ہیں۔" وسیم نے صاف گوئی سے کہا تو اس عورت کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ دروازے پر وہی شخص نمودار ہوا۔

"یہ ناہنجار یہاں کیا کر رہا ہے رخشی بیگم؟" وہ ٹھٹکا۔

"انصاف لینے آیا ہے۔" رخشی نے اطمینان سے کہا۔

"بہت خوب! الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ آج اس کی وجہ سے میں زخمی ہوتے بچا۔"

"خیر! غلطی تو تمہاری بھی تھی حسن!! رستہ بدل لیتے۔" رخشی کے منہ سے ادا ہونے والے یہ الفاظ سن کر اس کا چہرہ بری طرح متغیر ہوا۔

"رستہ بدلنا ہی تو مجھے نہیں آتا۔" وہ شرربار نظروں سے وسیم کو گھورتا اندرونی کی جانب بڑھ گیا۔

"مجھے لگتا ہے موصوف خفا ہو گئے ہیں۔" وسیم مضطرب ہوا۔

"نہیں! وہ کبھی خفا نہیں ہو سکتا۔ اس کی فکر مت کرو..... تم اپنی پڑھائی کے متعلق بتا رہے تھے مجھے۔ کوئی کتابیں وغیرہ ساتھ لائے ہو کیا؟" اس نے بے نیازی سے پوچھا۔

"ہاں جی! نصاب کے علاوہ بھی کچھ ادبی کتابیں موجود ہیں میرے پاس۔" وہ الجھ سا گیا۔

"ویش گڈ! مجھے ضرور دکھانا اپنی کتابیں...... میں منتظر رہوں گی۔" وہ اس کی آنکھوں میں یکدم در آنے والی چمک کی کوئی توجیہہ نہ تلاش سکا۔

☆☆☆

اگلی صبح وسیم کو سبھی ساتھیوں نے گھیر لیا۔ وہ حسن اور رخشی کے ہاتھوں اس کی بننے والی درگت کا احوال جاننے کے لیے بے تاب تھے۔

"تم لوگوں نے خواہ مخواہ اسے ہوا بنا رکھا ہے۔ مجھ سے تو بالکل نارمل بات چیت کی اس نے۔" اس نے اپنے کندھے اچکائے۔

"ناممکن بات کر رہے ہو وسیم میاں! ہم نے تو اسے الگ تھلگ اور خود میں مگن ہی دیکھا ہے۔ عورت بچے اس سے خوفزدہ رہتے ہیں۔" ساجد نے حیرانی سے کہا۔

"مجھے تو بالکل بھی کوئی خوف محسوس نہیں ہوا اس سے۔ میں تو آج پھر جاؤں گا۔" وہ پُرجوش تھا۔

اسی شام وسیم نے چند کتابیں تھامیں اور رخشی کے گھر چل دیا۔ حسن کچھ دیر قبل ہی مسجد روانہ ہوا تھا۔

"میں تو سوچ رہی تھی کہ شاید تم نہیں آؤ گے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایسا کیوں سوچ لیا آپ نے؟ میں محبت و خلوص کی کبھی بھی توہین نہیں کرتا۔" وہ سادگی سے بولا۔

رخشی نے کوئی جواب نہ دیا اور اس کی لائی ہوئی کتب کے صفحات پلٹتے ہوئے ادھر اُدھر کی باتوں کا آغاز کر دیا۔ وہ اس کے مشاغل، والدین اور دیگر مصروفیات کے متعلق جاننا چاہتی تھی۔ وسیم نے بھی احتیاط اور سنجیدگی سے اسے معلومات فراہم کرنے میں کوئی عار نہ سمجھا۔

صحن میں مخصوص کرسیوں پر بیٹھے وہ ابھی فروعی باتوں میں الجھے تھے کہ حسن کی آواز نے انھیں چونکا دیا۔

"آج یہ کس انصاف کے لیے آیا ہے یہاں؟"

"میں نے بلایا تھا اسے۔" رخشی نے اس کی نظروں میں جھانک کر کہا۔

"یہ تبدیلی کیوں رخشی بیگم؟" اس کے لہجے میں حیرانی نمایاں تھی۔

"تبدیلی تو کائنات کا خمیر ہے۔"

"تو کیا میں یہ سمجھ لوں کہ رخشی بیگم بھی تبدیلی کی زد میں آنے لگی ہیں۔" حسن کے استفسار پر وہ ساکت ہو گئی۔

"تم زیادتی کر رہے ہو حسن!" وہ بولی۔

حسن نے گہری سانس بھری اور سر جھٹکتا ہوا کمرے کی طرف چل دیا۔ رخشی ہونٹ چباتی ہوئی وہیں بیٹھی رہی۔ وہ وسیم کی موجودگی سے بالکل لاتعلق دکھائی دے رہی تھی۔

"مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ میں چلتا ہوں۔" اس نے کہا اور خاموشی سے اٹھ گیا۔

اگلے چند روز وہ دانستہ وہاں جانے سے گریزپا رہا۔ اس گھر میں گزارے مختصر لمحات نے اس کے دل و دماغ میں سینکڑوں ایسی سوچیں برپا کر دی تھیں جن کا کوئی بھی جواب مل کے ہی نہ دیتا تھا۔

رخشی کے تعلیم یافتہ ہونے میں اسے چنداں شبہہ نہ تھا۔ بات چیت کا سلیقہ بھی اسے خوب آتا تھا۔ دوسری جانب

حسن کی بدگوئی اور کھردرے طور طریقوں کے باوجود انداز گفتگو میں تعلیم کہیں نہ کہیں چغلی کھا جاتی۔ان دونوں کی باہمی کیمسٹری بھی وسیم کے لیے بہت منفرد شے تھی۔ان کی آنکھوں سے جھلکتے جذبوں میں احترام محبت اور باہمی دردمندی کا احساس چھپائے نہ چھپتا تھا۔

قصبہ میں زبان زد عام قصوں اور رائے عامہ کے مطابق خواجہ سرا احسن اس کا خاندانی ملازم تھا اور خود وسیم نے بھی اپنے پندرہ روزہ اس قیام کے دوران اُسے کام کاج میں ہی اُلجھے دیکھا تھا۔لیکن اس کا رویہ انداز اور شخصیت کسی طور بھی خواجہ سرایا ملازم کے ایک عمومی ڈھانچے سے میل کھاتی دکھائی نہ دیتی۔بھاری بھرکم لوچ دار آواز اور بے اختیار ہاتھ نچا کر گفتگو کے علاوہ وہ ایک مکمل انسان دکھائی دیتا تھا۔

زندگی میں اچانک در آنے والے ان کرداروں نے وسیم کے ذہن میں کھلبلی مچادی تھی اور لامحالہ تجسس سے مغلوب ہو کر اس نے آمدورفت کے اس سلسلے کا دوبارہ آغاز کر دیا۔

وہ جولائی کی ایک ابر آلود دوپہر تھی۔آسمان پر گھر گھر آتے بادل اور ٹھنڈی پُر کیف ہوائیں بدن گدگدا رہی تھیں۔اس کے سبھی ساتھیوں نے میچ کھیلنے کا منصوبہ بنا لیا تھا لیکن صبح سے محسوس ہوتی حرارت اور نزلہ کے باعث اس نے کھیلنے سے معذرت کر لی۔

وہ کچھ دیر تو یونہی گراؤنڈ کے باہر ٹہلتا رہا پھر اس کے قدم خود بخود رخشی کے گھر کی طرف اُٹھ گئے۔

دروازہ آج بھی نیم وا تھا۔اس نے ہلکی سی دستک دی اور بے دھیانی میں اندر داخل ہو گیا۔وہ دونوں صحن میں نیم کے پیڑ تلے موجود تھے۔حسن اپنے بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے بیٹھا تھا اور رخشی تیل کی ایک کٹوری پاس رکھے اس کے بالوں میں انتہائی نرمی اور ملائمت سے مساج کرتی کچھ کہتی دکھائی دے رہی تھی۔حسن کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی جو وسیم سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔یہ ایک بھرپور دلکش منظر تھا۔

رخشی اس کی آمد سے بالکل بے نیاز تھی لیکن حسن نے بند آنکھوں کے باوجود اس کی موجودگی بھانپ لی۔اس کی پیشانی کے بل گہرے ہو گئے اور وہ اپنی مخصوص جھٹکے دار آواز میں بولا؛

''تمھیں کسی نے تہذیب نہیں سکھائی کیا؟ کسی کے گھر داخل ہونے سے پہلے اجازت طلب کی جاتی ہے۔''

''میں نے دستک دی تھی لیکن آپ نے شاید سنا نہیں۔''وسیم اپنی غلطی کے باعث شرمندہ ہوا۔

''اگر نہیں سنی تھی تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تمھیں منہ اٹھائے اندر چلے آنے کا لائسنس مل گیا۔''

''افوہ! اب چھوڑ بھی دو اس بات کو۔وہ اتنے دنوں بعد آیا ہے۔گھر آئے مہمان سے یوں تو ہمکلام نہیں ہوا کرتے۔''رخشی نے نرمی سے ٹوکا۔

''اوہ!! تو گویا آپ اس کی آمد کا باقاعدہ حساب کتاب رکھنے لگی ہیں۔''اس کا لہجہ یکدم دھیما ہوا پھر وہ وسیم کی طرف دوبارہ متوجہ ہوا۔''معاف کرنا میاں! تم پڑھوا پنی کتابیں۔میں ذرا اپنے کام نمٹالوں۔''

وسیم اس ساری صورتِ حال پر خاصی الجھن کا شکار ہو گیا تھا لیکن اس نے کچھ بھی کہنے سے گریز ہی کیا اور اپنی مخصوص نشست پر جا بیٹھا۔

''اس روز یکدم کیوں غائب ہو گئے تھے بھئی!''رخشی نے چھوٹتے ہی کہا۔

''آپ حسن کی کسی بات پر ڈسٹرب ہو گئی تھیں۔اس لیے مجھے مزید رکنا مناسب نہیں لگا۔''وہ اپنی ازلی صاف گوئی سے بولا۔

''ارے بالکل بھی نہیں! مجھے اس کی کوئی بھی بات ڈسٹرب نہیں کرتی۔وہ بس ضرورت سے زیادہ محتاط ہے.....اس لیے بعض اوقات ایسے برتاؤ کرنے لگتا ہے۔ورنہ اس کا دل بہت صاف ہے۔''اس نے محبت سے کہا۔

''آپ کے گھر میں اور کوئی نہیں رہتا کیا؟''وسیم نے ٹٹولا۔

''نہیں! میں اس دنیا میں تنہا ہوں بالکل۔''وہ یکدم اپنے خول میں سمٹی۔''تم اس روز اپنی کتابیں یہیں بھول گئے تھے۔ویسے اگر تم چاہو تو اگلی جماعت کی پڑھائی کے لیے تھوڑی بہت مدد مجھ سے لے سکتے ہو۔''

''آپ بھول رہی ہیں، کہ میں یہاں صرف چند ہی روز کا مہمان ہوں۔''وسیم اس پیشکش پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔''کالجز میں داخلوں کا آغاز ہوتے ہی میں واپس لوٹ جاؤں گا۔''

''اوہ! ہاں، مجھے یاد ہے بالکل.....''اس نے پیشانی مسلی۔''میں تو بس یونہی کہہ رہی تھی کہ سارا دن کھیل کود بھی تو اچھا نہیں۔''

''میں آجایا کروں گا جی!! آپ مجھے انگریزی اور ریاضی سمجھا دیا کیجیے گا۔''وسیم خود بھی ان دونوں کی ذات کا

اسرار جاننے کے لیے بے تاب تھا اس لیے موقع کا فائدہ اٹھاتے فوری بولا۔

''ٹھیک ہے۔کل سے شام پانچ بجے آجایا کرنا۔'' رخشی کِھل اُٹھی۔

☆☆☆

وسیم اگلے روز مقررہ وقت سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا۔

صحن خالی تھا۔وہ احتیاطاً بلند آواز میں کھنکار کر اپنی موجودگی کا احساس دلانا ہی چاہتا تھا کہ کمرے کی کھڑکی سے نظر آتے منظر نے اس کے قدم ساکت کر دیئے۔رخشی سنگھار میز کے سامنے کھڑی تھی۔اور حسن ہاتھ میں کنگھا تھامے بہت جذب سے اس کے بال سلجھانے میں مصروف تھا۔اس کی آنکھوں سے چھلکتی ستائش خیرہ کن تھی۔وسیم کو اپنا وجود یکسر بے مصرف محسوس ہونے لگا اور وہ اُلٹے قدموں لوٹ گیا۔

اگلا نصف گھنٹا اس نے گراؤنڈ میں فٹبال کھیلتے گزار دیا اور ایک بار پھر ذہن میں ڈھیروں سوال لیے وہ اس 'ونڈر لینڈ' میں جا پہنچا۔رخشی صحن میں پودوں کو پانی دیتے حسن کو کچھ ہدایات دے رہی تھی۔رسمی سلام دعا کے بعد وہ بھی حسن کے ساتھ اسی سرگرمی میں شریک ہو گیا۔اسے پڑھائی یا کتب سے متعلقہ کسی بھی مواد پر گفت وشنید میں دلچسپی نہ تھی۔اسے تو محض اپنے اندرونی ہیجان کی تسکین درکار تھی۔

ایک طے شدہ لائحہ عمل کے تحت اس نے روزانہ آمد کے دوران غیر محسوس انداز میں ان کے چھوٹے موٹے کاموں میں معاونت کا آغاز بھی کر دیا۔ابتدائی وحشت وخوف کا خاتمہ ہو چکا تھا۔وہ رخشی کی دلچسپیوں کا سرا تھامے قدم بہ قدم اس کی ذات کی جانب سفر کرنے لگا۔

وہ بلا ناغہ ایک ساتھ بیٹھتے۔گفتگو کا آغاز اس کی سابقہ پڑھائی' اسکول' اساتذہ' ساتھی طلبہ' والدین اور خاندانی معاملات سے گردش کرتا ہوا اکثر ذاتی پسند ناپسند پر منتج ہوتا۔وہ اسے کھانا کھلائے بغیر شاذ ہی جانے دیتی۔ان دونوں کے مابین انسیت کا ایک ایسا رشتہ پروان چڑھنے لگا جسے وسیم خود بھی کوئی عنوان دینے سے قاصر تھا۔

رخشی اس سے ہمکلام ہوتے اکثر کہیں کھو سی جاتی۔اس کی گہری سیاہ آنکھیں خود پر مرکوز دیکھ کر وسیم کے بدن میں سنسنی دوڑ جاتی لیکن وہ اپنے تاثرات پر قابو پالیتا۔وہ گہری آنکھیں اسے اپنی ذات سے بھی کہیں دور خلا میں جھانکتی محسوس ہوا کرتیں۔اس کی یہ کیفیت آس پاس کسی نہ کسی کام میں اُلجھے حسن کے بشرے میں مزید اضطراب اور بے چینی برپا کر دیتی تاہم وہ اب کچھ بھی کہنے سے گریز ہی کرتا تھا۔

وسیم کی باقاعدہ آمد ورفت اس کے ساتھیوں میں بھی متقبول ہونے لگی اور وہ شوخی وشرارت میں اسے چٹکیاں بھرنے لگے لیکن اس نے سختی سے ان سبھی کو خاموش کروا دیا۔اپنے تجسس سے قطع نظر وہ دلی طور پر رخشی کی بہت عزت کرتا تھا۔

ماہ اگست کا آغاز ہو چکا تھا۔فضاؤں میں حبس کا راج رہتا اور جانے کیوں ایک ایسا ہی حبس اسے حسن و رخشی کے وجود پر مسلط بھی محسوس ہونے لگا۔وسیم کی روانگی کے دن اب قریب ہی تھے اور اپنی مہم میں متوقع ناکامی کے آثار اسے مایوسی میں مبتلا کرنے لگے تھے۔دریافت اور کھوج کا یہ سفر کسی دائرے کی طرح ثابت ہو رہا تھا لیکن پھر پے در پے دو حادثات نے ایک نیا تلاطم برپا کر دیا۔

☆☆☆

اس شام بارش کے بعد ماحول بہت نکھرا نکھرا تھا۔گراؤنڈ میں پانی جمع ہو چکا تھا اس لیے سب لڑکوں نے سڑک پر ہی کرکٹ کھیلنے کا فیصلہ کیا۔وسیم کی موجودگی کے باعث انھیں اب حسن کی جانب سے بھی قدرے بے فکری رہتی۔

ان کے جوش وخروش سے جاری کھیل میں ایک موٹر سائیکل کی آمد نے تعطل پیدا کیا۔بائیک پر دو درمیانی عمر اور گٹھے ہوئے جسم کے افراد سوار تھے۔ان کے جسم مضبوط اور آنکھوں میں ایک مخصوص شاطرانہ چمک تھی۔ان کا تاثر درمیانے درجے کے بدمعاش کا معلوم ہوتا تھا۔

''اوئے لڑکو! یہاں پر حسن نامی ہیجڑا کہاں رہتا ہے؟'' پہلے شخص نے اپنی سرخ آنکھیں گھما کر پوچھا۔

''وہ سامنے موجود گھر میں رہتا ہے۔'' ساجد نے دائیں طرف گھر کی جانب اشارہ کیا۔'' لیکن آپ کو کیا کام ہے اس سے؟''

''او بھوکے بادشاہ! ہیجڑوں سے کیا کام ہوا کرتا ہے؟'' اس نے استہزائیہ کہا۔

اسی وقت حسن بھی معمول کے مطابق اپنے ہاتھ میں شاپر تھامے گھر سے برآمد ہوا۔موٹر سائیکل سوار معنی خیز نظروں کا تبادلہ کرتے اس سے مخاطب ہوئے۔''کل رات ڈیرے پر چلے آنا۔ملک صاحب کے بیٹے کی شادی میں ناچ گانے کا پروگرام ہے۔''

''جاؤ یہاں سے میاں! میں یہ کام نہیں کرتا۔'' اس کی غصیلی آواز اور سرخی چھلکاتا چہرہ دیکھ کر سب لڑکوں نے کھیل

روک دیا۔
"یہ کام نہیں کرتے تو پھر کیا کرتے ہو؟ ہم تمھیں منہ مانگا معاوضہ دیں گے بھئی! ملک صاحب نے آس پاس کے سب علاقوں سے ہیجڑوں کو 'مدعو' کیا ہے۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی یادگار بنانا چاہتے ہیں۔" وہ ہنوز مسکرا رہے تھے۔
"تمھیں جس نے یہاں بھیجا ہے اسے کہہ دینا...... حسن مر تو سکتا ہے لیکن یہ سب کچھ کبھی بھی نہیں کرے گا۔ چلے جاؤ یہاں سے۔" طیش و غضب سے اس کا وجود لرزنے لگا.... اس کی کیفیت نے سبھی لڑکوں میں سراسیمگی پیدا کر دی۔
"چلے جاتے ہیں چلے جاتے ہیں لیکن اس پیشکش پر غور ضرور کرنا......اسے قبول کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تمھارے پاس۔" موٹر سائیکل سوار اس کی درشتی کے باوجود تحمل سے کہتے واپس ہو گئے۔ ان کی یہ خوش اخلاقی سراسر مصنوعی تاثر دے رہی تھی۔
ان کی روانگی کے بعد لڑکے ایک بار پھر اپنی سابقہ سرگرمی میں مصروف ہو گئے۔ حسن بھی کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح آگے بڑھ گیا۔ اس کی کیفیت اور بے بسی نے وسیم کے دل میں ترحم و تاسف کے جذبات پیدا کر دیے۔ اس کا ذہنی ارتکاز منتشر ہو چکا تھا اور پردہ تصور پر بار بار حسن کی آنکھیں اذیت سے چیختی لہرانے لگتیں۔ اور اس کے اندر غصے کا ابال آ جاتا اسی کشمکش میں اس کے ہاتھوں کئی بار گیند پھسلی تو دوستوں نے تمسخرانہ انداز میں اسے دیکھا۔ دیکھنے والے کی زبان خاموش رہتی ہے مگر آنکھیں بہت کچھ کہہ جاتی ہیں۔ اس پر جھنجھلاہٹ سوار ہو چکی تھی۔ اسی عالم میں کھیلنا دشوار لگا اور وہ بیزاری کے عالم میں وہ کھیل سے الگ ہو گیا۔
پھر ہلکی پھلکی پھوار پڑنے لگی تو فضا کی دلکشی مزید بڑھ گئی۔ موسم کی یہ کروٹ دلوں میں عجب سی ترنگ پیدا کر رہی تھی۔
وہ کچھ دیر بے مقصد ٹہلتا رہا پھر رخشی کے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ حسب سابق غیر مقفل تھا۔ اس نے دستک دی اور رسمی سے انتظار کے بعد اندر بڑھ گیا۔ صحن میں خاموشی تھی۔
وہ کمرے کی جانب چل دیا۔
کمرے میں ملگجا سا اندھیرا چھایا تھا اور اس اندھیرے میں ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ اور مدھم سرگوشیوں نے اس کے قدم جامد کر دیے۔ یہ صورتِ حال غیر متوقع بھی تھی اور سنسنی خیز بھی۔
نظریں اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو بستر پر نیم دراز رخشی کی صورت میں حیرت کا ایک اور جھٹکا اس کا منتظر تھا۔ وہ کھلتے ہوئے گلابی ریشمی جوڑے میں ملبوس تھی۔ دراز گیسو پریشان کیفیت میں بستر پر بکھرے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں ایک مردانہ شلوار سوٹ موجود تھا جسے اپنے چہرے پر پھیلائے وہ سرگوشیوں کے سے انداز میں محوِ گفتگو تھی۔ وہ اس کے الفاظ تو سن نہ پا رہا تھا لیکن اس کے بشرے سے منعکس اضطراب' حسرت اور پیاس وہ اس نیم تاریک ماحول میں بھی واضح محسوس کر رہا تھا۔
وسیم کے دل و دماغ میں موجود الجھنیں مزید بڑھ گئیں۔ رخشی کی اس اضطرابی اور ہسٹریائی کیفیت وہ بغور دیکھ رہا تھا کہ اسے اپنے عقب میں ایک آہٹ سی سنائی اور وہ چونک گیا۔ منتشر بالوں اور دھواں دھواں چہرہ لیے حسن کی نظروں کا ارتکاز بھی رخشی ہی تھی۔ اس کی کیفیت سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ منظر اس کے لیے نامانوس نہیں تھا۔ شاید وہ وسیم کی موجودگی کے باعث خجل ہو گیا تھا۔
وہ ادراک کا لمحہ تھا۔ کسی الہامی جذبہ کے تحت وسیم کو بھی اپنا وجود اسی اذیت میں محسوس ہوا۔ جانے کیوں اس پل اسے اپنی وہاں موجودگی پر ندامت ہونے لگی۔ اس نے حسن کے کندھے پر انتہائی محبت و خلوص سے تھپکی دی اور سر جھکائے صحن عبور کر گیا۔ اسی رات اس نے ایک فوری فیصلہ کیا اور اپنے آبائی شہر کوچ کر گیا۔ واپسی کے دو ہی روز بعد اس کا میٹرک کا رزلٹ آ گیا اور وہ اپنے تجسس' الجھنوں' سوالات کو پس پشت ڈالے تعلیمی زندگی کے آئندہ لائحہ عمل میں مصروف ہو گیا۔
کالج میں پڑھائی کا آغاز ہوا تو رخشی' حسن اور ان سے متصل ہر ایک یاد اسی قصبے کی گرد آلود راہوں پہ اڑتی دھول کی مانند بکھر گئی۔ اس کی زندگی میں در آنے والے ان عجیب و غریب کرداروں کو وہ بالکل ہی فراموش کر دیتا لیکن ایک روز حسن کی جانب سے ملنے والے چند سطری خط نے سوچوں کے نئے در وا کر دیے۔ اس نے رخشی کی موت سے مطلع کرتے ہوئے وسیم سے آخری ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی۔
اور آج وہ ایک بار پھر اسی مقام اور اس کمرے میں موجود اپنی ربڑ کی گیند ہاتھ میں تھامے حسن کی واپسی کا منتظر تھا۔ یہ وہی گیند تھی جو پہلی بار حسن سے اور رخشی سے ملاقات کا سبب بنی تھی۔

☆☆☆

"کچھ کھاؤ گے میاں؟" حسن کی آواز نے اسے حال

کی ان تلخ گھڑیوں میں کھینچ لیا۔
"نہیں! مجھے کسی بھی چیز کی طلب نہیں۔" اس نے حسن کے بے حد کمزور، زرد اور بے رونق چہرے سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔
حسن خاموشی سے بستر کے کنارے پر جا بیٹھا۔ کمرے میں بوجھل سناٹا طاری تھا۔
"مجھے رخشی کی وفات کا علم ہی نہ ہو سکا، تمہارا خط نہ ملتا تو شاید اب بھی میں اسی بھرم میں رہتا کہ وہ خوش و خرم ہے۔ بہت افسوس ہوا مجھے۔" وسیم نے بدقت تمام یہ رسمی الفاظ ادا کیے۔
"اس بدنصیب کی موت تو برسوں پہلے ہی ہو گئی تھی۔ ہاں، بس جسم و جان کا ایک ناتہ برقرار تھا جو بالآخر اسی رات ٹوٹ گیا جب تم یہاں سے جا رہے تھے۔"
"اسی رات؟" وسیم ششدر تھا۔ "لیکن تم نے مجھے اتنی تاخیر سے کیوں اطلاع دی؟"
"یہ جو کم بخت دل ہے ناں اسے ہمیشہ بھرم میں ہی رہنا پسند ہے۔ اور جب بھرم ٹوٹ جائے تو اس کے پاس اپنی دھڑکنوں کا سفر ختم کر دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا۔" وہ ایک ٹرانس کی کیفیت میں بولتا چلا گیا۔
"مجھے اب کیوں بلوایا ہے؟" وسیم اپنے ہونٹ چبانے لگا۔
"پتا نہیں! میں تمھارا سامنا بھی کرنا نہیں چاہتا تھا...... لیکن کچھ اعترافات بھی ضروری تھے۔ شاید اسی لیے اتنی تاخیر ہو گئی۔"
"ہاں! مجھے اندازہ تھا کہ تم مجھے اور میری یہاں آمد کو پسند نہیں کرتے تھے۔" وسیم نے ایک بوجھل سانس لی۔
"بالکل نہیں کرتا تھا بلکہ میں تو اس ہوا اور منظر سے بھی خار کھاتا تھا جو میرے اور رخشی کے درمیان حائل ہو۔" اس کے انداز و الفاظ نے وسیم کو گنگ کر دیا۔
"لیکن کیوں؟ تمہارا ان سے آخر کیا رشتہ تھا؟"
"وہ میری منکوحہ تھی...... میری اولین محبت، جنون اور تمنا تھی جس کی خاطر میں نے سب کچھ تج دیا۔" وہ ایک بار پھر اداس لہجے میں بولا۔
"لیکن...... یہ ...... کیسے ممکن ہے بھلا...... تم تو......" وسیم اپنی صاف گو فطرت کے باوجود بات مکمل نہ کر سکا۔
"ہاں! میں تو ہیجڑا ہوں...... شادی کے قابل ہی نہیں۔ میرا مقصد حیات تو محض خوشی کے مواقع پر ناچ گانا ہے، یہی کہنا چاہتے ہو ناں تم؟" وہ اذیت بھرے انداز میں مسکرایا۔
وسیم کچھ نہ کہہ سکا۔ حسن بے تکان بولتا چلا گیا۔ اس کے الفاظ کی انگلی تھامے وہ بھی اسی کے ساتھ ایک مقناطیسی رو میں بہتا ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں رخشی تھی...... علی حسن تھا...... اور ہر سُو سانس لیتی محبت تھی۔

☆☆☆

رخشی اور علی حسن بے حد عام انسان تھے۔ وہ دونوں ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ رخشی کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ وہ دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ بچپن میں والدہ کی وفات کے بعد بھائیوں اور والد نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنائے رکھا۔ وہ محبتوں کے معاملہ میں سیر فطرت تھی۔
علی حسن کے حالات اس کے برعکس تھے۔ بچپن ہی سے یتیمی کی کڑی دھوپ میں جھلستا وہ اپنی ذات میں بے حد تنہا تھا۔ ددھیالی اور ننھیالی رشتہ داروں میں پنگ پانگ کی مانند لڑھکتے اور پرورش پاتے اس کا وجود کیکر بن چکا تھا اس لیے رخشی کی توجہ اور نرم خو طبیعت نے اسے چاروں شانے چت کر دیا۔ باہمی گفتگو اور نصابی بحث و مباحثہ پہلے پہل ذہنی ہم آہنگی میں تبدیل ہوئے اور پھر خود کو دوستی کا بھلاوا دیتے وہ چاہت کی پرپیچ راہوں کے مسافر بن گئے۔
محبت اپنی فطرت میں ایک بہت عظیم سانحہ ہے اور محبت کرنے والے سب سے پہلے 'حماقت' نامی مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس مرض کے زیر اثر ان کی سوچ و فکر ایک خود کار انداز میں یہ طے کر لیتی ہے کہ انھیں چونکہ کائنات کے عظیم ترین جذبے کا ادراک ہوا ہے اس لیے وہ اپنی قسمت و مقدر کی ہر جنبش پر مکمل بااختیار ہو گئے ہیں۔ اس آفاقی جذبے کو ہتھیار بنائے وہ ساری دنیا سے ٹکرا کر لامحالہ فتح یاب ہو کر امر ہو جائیں گے۔
رخشی اور علی حسن کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ محبت کی تال پر رقصاں وہ کچھ زمینی حقائق فراموش کر بیٹھے۔ یونیورسٹی کے دو سال ایک دوسرے کی سنگت میں ایسے گزرے جیسے ندی کی طوفانی لہر جس تیزی سے ساحل کو چھوتی ہے اور اسی تیزی سے لوٹ جاتی ہے۔ گویا چشم زدن میں دو سال بیت گئے۔ اب مستقبل ایک بہت بڑے سوالیہ نشان کی طرح ان کے سامنے موجود تھا۔
"حسن! میں اب یہ وقت کیسے گزاروں گی؟ ایگزامز کے بعد تو کوئی عذر ہی نہ ہوگا تم سے ملاقات کے لیے۔" رخشی

بہت آزردہ تھی۔
''فکر کیوں کرتی ہو۔ ایگزامز ہوتے ہی میں اپنے بزرگوں کو تمھارے گھر بھیج دوں گا۔''اس کی بھرپور تسلی نے رخشی کو حقیقتاً بے فکر کردیا۔
روز وشب خوش فہمیوں اور تصورات کے ہنڈولے میں جھولتے گذرنے لگے لیکن تمناؤں کا یہ فلک بوس قلعہ اس وقت تاش کے پتوں کی مانند بکھرا جب رخشی کے والد اور بھائیوں نے انتہائی سہولت سے علی حسن کے ماموں سے اس رشتے کے لیے معذرت کرلی۔
''آپ کی آمد یقیناً باعثِ عزت ہے لیکن ہم اپنی برادری سے باہر شادی نہیں کرتے۔''
''اب زمانہ بدل گیا ہے بھائی صاحب! ذات برادری کے مدار اپنا اثر کھونے لگے ہیں۔''اس کے ماموں نے ہمت نہ ہاری۔
''زمانہ کبھی نہیں بدلتا......انسانوں کی اقدار اور ترجیحات بدل جاتی ہیں۔'' کچھ دنوں قبل امریکا سے طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے آنے والے رخشی کے منجھلے بھائی لیاقت نے ترش لہجے میں کہا۔
اور ہم باپ بیٹے ابھی اس تبدیلی کی زد میں نہیں آئے ہیں۔'' رخشی کے والد دوٹوک کہتے ہوئے اُٹھ گئے۔ یہ مقابل کے لیے روانگی کا واضح عندیہ تھا۔
علی حسن اس انکار پر بے حد دلبرداشتہ تھا۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد اپنا آخری داؤ کھیلنے کا فیصلہ کرلیا اور پہلے سے طے شدہ منصوبہ کے مطابق آخری پرچہ کے فوری بعد رخشی سے ملاقات کے لیے پہنچ گیا۔ اس کی توقعات کے عین مطابق وہ بھی منتشر ذہنی کیفیت میں مبتلا تھی۔
''یہ سب کیا ہوگیا حسن!! کیا ہماری محبت کی ناؤ کبھی بھی اپنے ساحل تک نہیں پہنچے گی؟''وہ سسکنے لگی۔
''تم نے اپنے گھر والوں سے بات کی؟ وہ اپنے فیصلے پر نظرثانی کریں۔''
''وہ میری کوئی بھی بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں......بلیاقت بھائی تو میرے پرچے دینے کے حق میں بھی نہ تھے۔ صداقت اور ابو جی نے خاندان میں رشتہ بھی طے کردیا ہے۔''
''واہ رخشی بیگم!! یعنی آج آپ مجھے اپنی شادی کے لیے مدعو کرنے آئی ہیں۔''وہ تلخی سے بولا۔
''نن نہیں......میں اس شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔''وہ اس کی کیفیت پر بوکھلا گئی۔
''میں نے تمھیں صرف محبت نہیں......اپنی غیرت اور عزت سمجھا ہے......اور عزت سے دستبرداری ممکن نہیں ہوتی۔ میں تمھیں حاصل کرنے کے لیے آتشیں سمندر بھی عبور کرسکتا ہوں لیکن کیا تم آیندہ کٹھنائیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو؟''
''بالکل......چاہو تو آزمالو۔''
''ہم کل ہی کورٹ میرج کرلیں گے......قانون اور مذہب ذات برادری کے ان جھمیلوں سے مبرا ہے۔ قانونی طور پر کی گئی اس شادی کو ریاستی سرپرستی بھی حاصل ہوگی۔ تمھارے اہلخانہ کو تسلیم کرتے ہی بنے گی۔''اس نے ترپ کا پتا ظاہر کردیا۔
لمحاتی کشمکش اور سوچ بچار کے بعد رخشی نے بھی اس فیصلہ کی توثیق کردی۔ کورٹ میرج کے بعد ایک مختصر عدالتی نظام بھگتنے کے بعد وہ رسم ورواج کی قید سے آزاد ہوگئے۔ وہ دونوں اپنی الگ دنیا بسا کر بے حد خوش تھے اور پھر جلد ہی دبے قدموں وہ وقت آگیا جب خوابوں نے اپنا تاوان وصول کرنے کا آغاز کیا۔

☆☆☆

رخشی کے والد کے لیے اکلوتی بیٹی کی سرکشی ہارٹ اٹیک اور موت کا پروانہ ثابت ہوئی۔ اپنی خواہش کی تکمیل کا یہ انجام تو اس نے کبھی بھی تصور نہ کیا تھا۔ اس قیامت کی گھڑی میں وہ بری طرح بکھر کے رہ گئی۔ حسن خود بھی اس محرومی کا کرب جھیل رہا تھا پھر بھی رخشی کا درد اور ملال وہ سمجھ نہ سکا۔
سوئم تک وہ باقاعدگی سے اپنے گھر جاتی رہی۔ حسن نے بھی کمال محبت کا ثبوت دیتے ہوئے اس کی آمدورفت پر کوئی قدغن نہیں لگائی۔ مرد جب کسی عورت سے محبت کرتا ہے تو اس کی نفسیات پر مکمل حاوی رہنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ حسن بھی لاشعوری طور پر رخشی پر ہر قسم کا نفسیاتی واخلاقی دباؤ برقرار رکھنا چاہتا تھا۔
حیران کن طور پر دونوں بھائیوں کا رویہ بھی بہت تبدیل ہوگیا تھا۔ ان کی خشونت زدہ نظروں میں ویرانی' خلاء اور کرب کی کیفیت دیکھ کر رخشی کا دل کٹنے لگتا۔ ان تینوں کا دکھ مشترک تھا اور نقصان ناقابل تلافی۔ عورت خواہ زندگی میں کسی بھی موڑ پر پہنچ جائے' وہ جبلی طور پر اپنے بھائیوں کے لیے ازل سے ہی ممتا جیسے جذبات کی حامل ہوتی ہے۔ رخشی کی یہ ممتا بھی بھائیوں کی زندگی میں ویرانی اور باپ جیسے چھتناور وجود سے

محرومی میں اپنے کردار پر روز و شب بلکتی رہی۔
سوئم کے بعد لیاقت نے اسے علیحدگی میں طلب کر لیا۔
''تمھارا شوہر نہیں آیا ساتھ؟ تم خوش تو ہو اس شادی سے؟'' اس نے خلوص سے استفسار کیا۔
''انھیں کچھ روز پہلے ہی جاب ملی ہے بھائی! اس لیے نہیں آسکے.....اور میں بہت خوش ہوں، حسن مجھ سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔'' وہ اعتماد سے بولی۔
''ابو جی نے تمھاری شادی سے پہلے ایک وصیت نامہ تیار کروایا تھا۔ وکیل صاحب وہ وصیت سب متعلقہ افراد کے سامنے پڑھنا چاہتے ہیں۔ تم اس سنیچر کی شام حسن کو اپنے ساتھ لے آنا۔ اب وہ بھی ہمارے خاندان کا حصہ ہے۔''
''اس کی کیا ضرورت ہے بھائی! آپ نے میری شادی تسلیم کر لی، بس مجھے اور کچھ بھی درکار نہیں۔'' اس کی آنکھیں بھر آئیں۔
''ضرورت کیوں نہیں، میں اپنے ذمہ کوئی بھی قرض نہیں رکھنا چاہتا۔'' اس کا لہجہ بہت گھمبیر تھا۔ ''میں تم دونوں کا منتظر رہوں گا۔''
حسن کو قائل کرنے کا مرحلہ اس کی توقع سے بہت آسان ثابت ہوا۔ ہر گذرتا لمحہ اسے حسن کی محبت اعتماد اور خلوص کا اسیر کر رہا تھا۔ اس روز وہ مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گئے۔ لیاقت انھیں ساتھ لیے مرحوم والد کے کمرے میں داخل ہوا جہاں صداقت پہلے سے ہی موجود تھا۔ اس کے بکھرے بالوں، بڑھی ہوئی شیو اور ملگجے کپڑوں میں وحشت نمایاں تھی۔
وہ خاموشی سے ایک صوفہ پر بیٹھ گئے۔ ماحول میں عجب نادیدہ تناؤ تھا۔
''مجھے آپ کے والد کی وفات پر بے حد افسوس ہے۔ مگر مشیت ایزدی کے سامنے ہم انسان ہمیشہ بے بس رہے ہیں۔'' کچھ لمحوں کی بوجھل خاموشی کے بعد حسن نے گلا کھنکارتے ہوئے کہا۔
''تمھیں افسوس ہونا بھی چاہیے۔ ہماری ہنستی بستی زندگی اجاڑنے میں تمھارا کردار تو ویسے بھی نا قابل فراموش ہے۔'' صداقت نے سرد لہجہ میں کہا۔
''تم میرے شوہر کی توہین کر رہے ہو صداقت!'' رخشی نے تیزی سے کہا۔
''اپنے خاندان، والد، بھائیوں اور اقدار سے بغاوت کا درس اسی شخص نے پڑھایا تھا تمھیں۔'' وہ ایک بار پھر سابقہ انداز میں گویا ہوا۔
''ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ ہماری محبت سچی ہے، قانون اور مذہب بھی ہمیں اس شادی کی اجازت دیتا ہے۔'' حسن نے ناگواری سے اسے دیکھا۔
''محبت، کس محبت کی بات کر رہے ہو تم؟ چار دن ساتھ گذار لینا، دل و دماغ پر سفلی جذبات حاوی کیے ایک دوسرے کے ساتھ جھوٹے خواب دیکھنا محبت نہیں......ہوس ہوتی ہے۔'' لیاقت نے درشتی سے ٹوکا۔
''آپ غلط سوچ رہے ہیں۔ ہماری محبت میں کوئی کھوٹ ہوتا تو ہم کبھی ایک نہ ہو پاتے۔'' رخشی نے کہا۔
''محبت کا کوئی وجود نہیں ہوتا رخشی! اور یہ بات تمھی نے ثابت کی ہے.....ہم سب نے تمھیں بچپن سے بے انتہا پیار دیا لیکن ہماری چاہت کے رنگ اس قدر کچے تھے کہ تم نے ہمیں کورٹ کچہریوں میں گھسیٹ لیا۔ نفس اور طلب سے بڑی کوئی حقیقت نہیں۔ جب تمھیں دو دہائیوں پر محیط محبت ہمارا نہ بنا سکی تو محض دو سال سے واقف ایک انجان شخص کے لیے یہ دعوے تمھیں زیب نہیں دیتے۔'' صداقت کے لہجہ میں غراہٹ نے انھیں ششدر کر دیا۔
''مجھے اپنی بیوی کے جذبات اور وفا پر مکمل یقین ہے۔'' حسن نے مٹھیاں بھینچ لیں۔
''یہ تو وقت ہی ثابت کرے گا۔'' لیاقت نے تمسخر اڑایا۔
''میرا خیال ہے ہمیں اب یہاں مزید نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ اُٹھو رخشی!'' حسن کا ضبط ختم ہو گیا۔
''تم ایک قدم بھی یہاں سے ہلے تو میں اس پستول کی تمام گولیاں تم دونوں کے جسم میں اتار دوں گا۔'' صداقت نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک پستول برآمد کر کے انھیں نشانے پر رکھ لیا۔
لیاقت انتہائی اطمینان سے کمرے میں موجود الماری سے اپنی میڈیکل کٹ لے آیا اور ایک انجکشن حسن کے بازو میں گھونپ دیا۔ رخشی نے مداخلت کرنی چاہی تو اس سے کڑے تیور سے چانٹا مارا گیا۔ وہ نازک سی دھان پان سی لڑکی الٹ کر صوفے کے چوبی ہتھے سے ٹکرائی اور اگلے چند لمحوں میں وہ نیم مدہوشی کی کیفیت میں فرش پر گر گئی۔
زمان و مکان کی گردش تھم سی گئی تھی۔ ان کے وجود جزوی طور پر مفلوج ہو گئے۔ ذہن گرد و پیش میں ہونے والی تمام سرگرمیوں سے آگاہ ہوتا لیکن اعضاء کی جنبش پر ذرا بھی

اختیار نہ رہا۔ لیاقت کی طب جیسے مقدس پیشہ سے وابستگی اور مہارت نے حسن کا وجود تختۂ مشق بنا کر ان کی محبت سے ایک تاریخی انتقام لیا۔ حسن کے جینیاتی نظام میں عدم توازن پیدا ہو گیا۔ قانونی داؤ پیچ سے اپنے جذبات معتبر ٹھہرانے کے بعد وہ تقدیر کے اس وار سے مات کھا گیا۔

''قانون کا سہارا لے کر تم نے اپنے لیے شوہر اور شریکِ حیات حاصل کیا تھا۔ اب پھر سے اسی عدالت کا در کھٹکھٹا کر اس سے انصاف طلب کرو۔ ان سے دریافت کرنا کہ یہ نکاح اب برقرار بھی رہ پائے گا یا نہیں...... اپنے وکلاء اور ججز کی منت سماجت کرنا کہ تمھیں اس شوہر سے ازدواجی مسرتیں لوٹا دیں۔'' انھیں رہائی دیتے ہوئے لیاقت کی زہرا فشانی عروج پر تھی۔ ''اور اگر وہ اس کی مردانگی نہ لوٹا پائیں تو محبت کا جھنجھنا بجاتے اسی کے ساتھ زندگی گذارنا...... مگر کبھی یہ تصور بھی نہ کرنا کہ ہم اپنے باپ کی موت اور تمھاری بغاوت معاف کریں گے...... ساری زندگی تمھیں اس گناہ کا احساس دلاتے معاشرے کا حصہ نہیں بننے دیں گے۔ اب تم گوشت کے اس لوتھڑے کو لے جا سکتی ہو۔''

رخشی روتے بلکتے ہوئے حسن کو لادکر گھر لے آئی۔

اس وقت تک وہ سمجھ نہ پائی کہ اس کے ماں جایا نے اسے کیسی سزا دی ہے۔ یہ تو کروٹ بدلتے وقت نے بتایا کہ حسن اب حسن نہیں رہا ہے۔

لیاقت کی پیشہ وارانہ مہارت نے حسن کا وقار، بھرم اور شناخت کلی طور پر ملیامیٹ کر دیئے تھے۔

وہ ڈپریشن میں مبتلا ہو گیا۔ اپنی بے بسی، جینیاتی تبدیلی اور رخشی کے آنسو اسے اپنا وجود نوچنے پر مجبور کر دیتے۔ اس کے ناز و انداز میں نمایاں ہوتا تغیر معاشرتی تعامل و ربط میں بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ ذہن محض منفی سوچوں کی آماجگاہ بن کر رہ گیا۔ اپنے رشتہ داروں کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت تھی نہ رخشی سے علیحدگی کا حوصلہ۔ وہ اپنا گھر کہیں بھی بسانے کی اہل تھی لیکن حسن اپنے بے مصرف وجود کے ساتھ باقی ماندہ زندگی تنہا کیونکر گذار پاتا۔ دوسری جانب وہ مستقبل قریب میں اس کی متوقع بیزاری اور نفرت کے تصور سے بھی شدید خائف تھا۔

کچھ روز سوچ بچار کے بعد اس نے رخشی سے ایک بار دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''تم ایک بھرپور زندگی گذارنے کی حقدار ہو۔ میرا ساتھ تمھارے لیے کیکر اور ببول کے سوا کچھ بھی ثابت نہ ہو گا۔ میں تمھیں آزاد کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' اس کے وجود پر ایک لرزہ طاری ہونے لگا۔

''نہیں! مجھے اس رشتہ سے آزادی درکار نہیں۔ میں بہر صورت تمھارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔'' رخشی کی حالت بھی غیر ہونے لگی۔

''میرا وجود تمھیں کوئی خوشی نہیں دے سکتا رخشی!''

''میری خوشی جسمانی تسکین کی محتاج نہیں۔ مجھے صرف تمھارا ساتھ درکار ہے۔ میں ساری زندگی یونہی تمھارے ساتھ گذار لوں گی۔'' اس کے پُرخلوص جذبات کی شدت نے حسن کے خدشات قدرے زائل کر دیئے۔

لیاقت کی دی گئی انجیکشنز کے زیرِ اثر اس کی آواز اور باڈی لینگویج میں تبدیلیاں ظاہر ہونا شروع ہوئیں تو انھوں نے اپنے آبائی شہر سے کوچ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مرحوم والدین کے کچھ اثاثہ جات فروخت کرنے کے بعد حسن نے بینک میں رقم جمع کروا دی تھی۔ ماہانہ حاصل ہونے والے منافع سے زندگی کی گاڑی گھسیٹنے کے اسباب پیدا ہو گئے تھے۔

عمرِ عزیز کا ایک طویل حصہ شہر کی دوڑتی بھاگتی، مصروف ترین زندگی میں گذارنے کے بعد وہ ایک دور دراز قصبہ میں منتقل ہو گئے لیکن اپنی ذات کے سقم پوشیدہ نہ رکھ سکے۔ لوگوں کی متجسس نظریں، خود ساختہ اندازے اور نوکیلے سوالات ان کے لیے ایک نئی آزمائش بننے لگے۔ آغاز میں اکثر عورتیں حقِ ہمسائیگی ادا کرنے کے لیے بن بلائے مہمان کی طرح چلی آتیں اور پھر سوالات کا ایک ناپسندیدہ سلسلہ شروع ہو جاتا۔

''آپ کے خاوند کہیں بیرونِ ملک کام کرتے ہیں کیا؟''

''نہیں۔ وہ بس......'' رخشی کی زبان لڑکھڑا سی جاتی۔

''ان کے خاوند کی وفات ہو چکی ہے۔'' حسن نے اس قصہ کو ایک نیا موڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

''بہت افسوسناک صورتِ حال ہے... آپ نے دوسری شادی کے بارے میں کیوں نہیں سوچا۔ ماشاء اللہ جوان ہو، حسین ہو۔ کوئی بھی مرد ہاتھ تھامنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔'' خاتون کا اگلا سوال انھیں مزید بے چین کر گیا۔

''مجھے اس کی ضرورت ہے نہ حاجت۔ میرے شوہر آج بھی میرے ساتھ ہیں۔'' رخشی رکھائی سے بولی۔

''زندگی یوں جذباتیت سے نہیں گذرتی۔'' مقابل کے فوری مشورہ پر اس نے وہ خاموشی بہتر سمجھی۔

''آپ کے خاندان میں اور کوئی نہیں ہے؟ سسرال نہ

سہی لیکن میکہ میں تو ہوگا کوئی نہ کوئی رشتہ دار۔ اکیلی عورت کے لیے یوں زندگی گذارنا بہت کٹھن ہوتا ہے۔'' ہمدردی کے لبادہ میں لپٹا اگلا سوال ایک بار پھر سب زخم ہرے کر گیا۔

''نہیں! میرے خاندان میں کوئی نہیں ہے۔ سبھی ایک حادثہ میں جدا ہوگئے تھے۔'' بھائیوں کی منتقم مزاجی یاد آتے ہی رخشی کرب سے آنکھیں میچ لیتی۔

''یہ ہیجڑا آپ کو کہاں ملا؟ کوئی ملازمہ وغیرہ رکھ لیتیں اپنے ساتھ۔ دوسراہٹ ہی مل جاتی۔''

''میں بذات خود خاندانی ملازم ہوں اور ہمیشہ ان کے ساتھ ہی رہوں گا۔'' حسن نے ترخ کر کہا۔

''یہ بھی بہتر قدم ہے ویسے! آجکل ملازماؤں کا بھی کیا بھروسا؟'' مقابل کی ڈھٹائی بھی فقید المثال تھی۔

اور پھر جلد ہی وہ بیوہ عورت اور ملازم کے بھیس میں وہاں رچ بس گئے۔ سال بہ سال گذرتے چلے گئے لیکن زندگی میں کبھی بھی ٹھہراؤ پیدا نہ ہوسکا۔ رخشی کے بھائی جلد یا بدیر ان کی ہر رہائشگاہ کی بو سونگھ لیتے اور پھر ان کے بھیجے گئے کارندے اپنی ہرزہ سرائی سے ان کی زندگیاں زہر آلود کرنے لگتے۔

دو سال قبل وہ اس پہاڑی قصبہ میں منتقل ہوئے تھے اور اب تو انہیں اپنی تبدیل شدہ رہائشگاہوں کی تعداد بھی یاد نہ تھی۔

☆☆☆

''بہت کٹھن زندگی گذاری ہے تم نے۔ ایسے ظلم و ستم تو کبھی دیکھے نہ سنے۔'' حسن کے لمحاتی سکوت پر وسیم نے جھرجھرا کر کہا۔

''یہ تو صرف ایک جھلک تھی میاں...... اصل کٹھنائیاں تو اس وقت سہنی پڑیں جب ہم یہاں رچ بس گئے۔'' حسن کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

''یہاں ایسا کیا ہوا تھا؟'' وسیم نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''مات......'' وہ اپنا سر بستر کی پشت پر ٹکائے چھت کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''ہم دونوں روزِ اول سے ہی حالتِ جنگ میں تھے۔ رسم و رواج سے جنگ...... رخشی کے بھائیوں کی انا سے جنگ...... اس منافق معاشرہ کے دہرے معیار سے جنگ...... اور میں فخریہ طور پر کہہ سکتا ہوں کہ ہم اس جنگ میں فتح یاب رہے۔ لیکن...... فطرت و جبلت سے ہونے والی کشمکش میں ہم دونوں ہی نے اپنے اپنے محاذ پر بری طرح شکست کھائی۔''

وسیم خاموشی سے اس کے مزید انکشافات سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہوگیا۔

سابقہ رہائشی مقامات پر لوگوں کے تند و تیز [illegible] اور ہر بار بحالتِ مجبوری وہاں سے انخلاء نے حسن کے دل [illegible] میں بہت توڑ پھوڑ مچائی تھی۔ ایک غیر فطری زندگی بسر [illegible] ہوئے وہ تلخیوں کا شکار ہو رہا تھا۔ رخشی کی محبت اور وفا [illegible]

اب بھی روزِ اوّل کی طرح قائم و دائم تھی۔ حسن اس کی محبت‘ دوست‘ ہمدم‘ مونس‘ غمخوار اور جذباتی سہارا تھا۔

وہ اس محبت کا معتقد بھی تھا لیکن اس سے خائف بھی۔ رخشی کو اپنی زندگی سے خارج کرنے کے بعد حاصل تفریق صرف خسارہ تھا۔ ہمہ وقت کچلی جانے والی عزتِ نفس نے اسے مردم بیزار بنا دیا۔ وہ اپنے آس پاس ہر شخص کو شک‘ نفرت اور حسد کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ اس کے مزاج و فطرت کی یہ تبدیلیاں رخشی پر بھی اثرانداز ہونے لگیں۔

محبت کی پاداش میں برسوں سے سزا میں مبتلا رخشی پینتیس برس سے متجاوز ہو چکی تھی۔ کسی بھی عورت کی زندگی کا یہ وہ دور ہوتا ہے جب رومانویت‘ اپنے شباب کی ستائش کی تمنا اور جسمانی تقاضے جوبن پر ہوتے ہیں۔ وہ بظاہر اپنے رویہ سے کبھی کچھ نہ جتاتی لیکن عدم تحفظ‘ ادھوری بے کیف زندگی ایک دیمک کی طرح اس کے وجود میں سرنگ بنا چکی تھی۔

برکھا رُت‘ چاندنی راتیں‘ ٹھٹری ہوئی سرمائی شب اس پر طاری بے نیازی کے خول میں دراڑیں پیدا کر دیتیں اور پھر اس پل ایک نئی رخشی برآمد ہوتی جو ریشمی کپڑے زیب تن کیے‘ مکمل بناؤ سنگھار کے ساتھ اپنے وجود میں ایک پیاس سموئے انھی لمحات میں واپس جا پہنچتی جہاں اس نے زندگی کی تمام تر مسرتیں کشید کی تھیں۔

فطرت و جبلت سے جنگ آزما ہوتے ان دونوں کے مابین صدیوں کے فاصلے حائل ہونے لگے۔ اس پر مستزاد وسیم کی آمد اور رخشی کا ردِعمل تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔

☆☆☆

وہ ایک خاموش معاہدے کے تحت معاشرتی میل جول سے حتی الامکان گریزاں تھے۔ عورتوں کی متجسس فطرت‘ تلخ سوالات‘ مردوں کی پُرہوس نظریں‘ بچوں کی حسن کے وجود سے چھیڑ چھاڑ سے محفوظ رہنے کی صرف ایک ہی راہ تھی...... بیزاری‘ چڑچڑاپن اور بداخلاقی۔

ایک طویل مدت سے اس رستہ کی مسافت کامیابی سے طے کرنے کے بعد وسیم کی اپنے گھر میں آمدورفت اور میل جول حسن کے دل و دماغ میں برسوں سے دبا ہوا خوف اپنی بھرپور توانائی سے اس کے وجود پر حاوی ہو گیا۔ وسیم کو بڑھانے کی پیشکش کے بعد ان دونوں میں پہلی بار ایک شدید جھگڑا ہوا۔

’’ایک انجان شخص کو گھر میں داخلہ کی اجازت کیونکر دے دی تم نے؟‘‘ وہ اپنی کوفت پوشیدہ نہ رکھ پایا۔

’’ہر شخص پہلے پہل انجان ہی ہوا کرتا ہے۔ رابطے بڑھیں تو پہچان بھی بن جاتی ہے۔‘‘ رخشی نے اطمینان سے کہا۔

’’آج اتنے برسوں بعد رابطوں اور پہچان کی ضرورت کیونکر آن پڑی۔‘‘ اسے حیرت سے زیادہ دکھ نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

’’مجھے خود بھی معلوم نہیں کہ کیوں آن پڑی؟ لیکن جس جرأت اور دلیری سے وہ انصاف طلب کرنے چلا آیا‘ میرے لیے بہت حیران کن تھا۔ کاش ایسی دلیری ہم نے بھی دکھائی ہوتی۔ لیاقت بھائی اپنی اس انسانیت سوز حرکت کا بھگتان تو بھگت لیتے۔ ہم بزدل تھے حسن! اسی لیے کسی ڈاکٹر تک سے رجوع نہ کر سکے۔‘‘

’’کیا اُس وقت کی یہ بزدلی اب تمھارا ملال تو نہیں بن گئی؟ میرا ساتھ دیتے ہوئے قدم لڑکھڑانے تو نہیں لگے؟‘‘ شکوک و شبہات من کی حسیات پر حاوی تھے۔

’’تم نے ایسا سوچ بھی کیسے لیا حسن؟ میری زندگی میں کہیں کوئی ملال یا پچھتاوا نہیں۔ تم میرے جذبات اور خلوص کی توہین کر رہے ہو۔‘‘ احساس ذلت نے اس کا چہرہ سرخ کر دیا۔

’’توہین تو تم نے میری کی آج...... اس بالشت بھر کے چھوکرے کے سامنے مجھے غلط قرار دے دیا۔ زندگی میں یہ وقت بھی دیکھنا باقی رہ گیا تھا۔‘‘ وہ آزردگی سے کہتا ہوا اٹھ گیا۔

ان کی پندرہ سالہ رفاقت میں پہلی مرتبہ باہمی گفت و شنید بالکل ختم ہو گئی۔ اجنبیت اور انا کی ایک بلندوبالا دیوار اس عجیب و غریب رشتہ میں حائل ہو چکی تھی۔ دونوں فریقین خود کو حق بجانب گردانتے کسی بھی طور جھکنے کو تیار نہ تھے۔ اور پھر بالآخر رخشی نے ہی اسے منانے میں پہل کر لی۔

اس روز حسن بہت خوش تھا۔ درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھے وہ بڑی محبت اور جذبے سے اپنی نرم پوروں کی حرارت اس کے وجود میں منتقل کر رہی تھی۔ وقتی طور پر ہی سہی لیکن وہ اپنے وجود کا ادھورا پن اور تمام تلخیاں فراموش کیے اس کی قربت میں مدہوشی کی کیفیت کا شکار تھا۔ وسیم کی بے وقت آمد نے اسے ایک بار پھر حقائق کی تلخی میں دھکیل دیا۔ اگر بات صرف یہیں تک محدود رہتی تو شاید وہ کسی طرح ضبط کر ہی لیتا

لیکن اسے دیکھتے ہی رخشی کے انداز میں یکدم در آنے والی تبدیلی اور وسیم کے منتظر رہنے کا عندیہ ملتے ہی وہ بالکل بے قابو ہو گیا۔

وہ واضح طور پر کسی تبدیلی کی زد میں آ چکی ہے۔ اس بھیانک حقیقت کا ادراک حسن کے وجود کی بنیادیں ہلا گیا۔

☆☆☆

محبت کرنے والوں کے لیے سب سے کٹھن وقت وہ ہوتا ہے جب دلوں میں خود ساختہ گلے شکوؤں کے ننھے بیج ایک تناور درخت بن جائیں۔ فاصلے بڑھنے لگیں تو دل کی بستی میں شام سا موسم اتر آتا ہے۔ رخشی اور حسن کی زندگی میں بھی ایسا ہی موسم کسی گرہن کی مانند چھا گیا تھا۔

حسن نے دانستہ طور پر وسیم کی آمد پر خاموشی اختیار کر لی۔ وہ اپنے شکوک وشبہات کی تصدیق کا منتظر تھا۔ ہاں وہ بات الگ تھی کہ اس انتظار نے اُس کے وجود میں ایک حشر برپا کر رکھا تھا۔

رخشی بے تابی سے اس کی راہ تکتی، گھنٹوں اس کے ساتھ بیٹھی دنیا جہان کے موضوعات پر گفتگو کیا کرتی۔ بہت چاؤ سے اس کے لیے کھانا تیار کرتی۔ یہ تغیرات حسن کے دل میں بے تحاشا حسد پیدا کرنے لگے۔ وہ گیلی لکڑی کی مانند ہر وقت سلگتا لیکن کبھی بھی رخشی کے سامنے اپنے خدشات کا اظہار نہ کر سکا۔

کرب، اذیت، عدم تحفظ، شکوک، حسد اور خاموشی نے اس کی محبت کا شجر خزاں رسیدہ کر دیا۔ دل و دماغ کی گہرائی میں ایک آتش فشاں دہکتا اور پھر بالآخر اگست کی اس شام یہ کھولتا ہوا لاوا برگِ محبت کو جلا کر خاکستر کر گیا۔

اس روز وہ صبح ہی سے بے حد مضطرب تھا۔ کسی انہونی کا خوف اس کی رگیں چٹخا رہا تھا۔ موسم کی اچانک تبدیلی دلوں میں ترنگ پیدا کرنے لگی۔ رخشی ایک بار پھر اپنی اسی اضطراری کیفیت کا شکار ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ اپنے آنسوؤں پر ضبط کی باڑ لگائے وہ اپنے معمول کے مطابق باہر روانہ ہوا تو اس بات سے بے خبر تھا۔ بدقسمتی اور ماضی کی پرچھائیاں گھات لگائے اسے دبوچنے کے لیے تیار ہیں۔

گھر سے نکلتے ہی اس کی ملاقات دو موٹر سائیکل سواروں سے ہوئی۔ وہ اسے ایک شادی کی تقریب میں ناچ گانے کے لیے مدعو کرنے آئے تھے۔ بادی النظر میں وہ اس کی بابت کسی غلط فہمی کا شکار دکھائی دیتے تھے لیکن حسن جانتا تھا کہ وہ انجان تھے نہ ہی کسی غلط فہمی میں تھا[illegible]

وہ رخشی کے بھائیوں کے بھیجے ہوئے [illegible]

ایک بار پھر ان کا سراغ پانے میں کامیاب ہو گئے تھے [illegible]

وجود دھماکوں کی زد میں آ گیا۔ سالہا سال سے جاری [illegible]

کا پیمانہ بالآخر لبریز ہو گیا۔ اس کا ذہن آندھیوں کی زد میں تھا لیکن گھر واپسی کے بعد رخشی کا مخصوص نفسیاتی عدم توازن اور وسیم کی موجودگی اس کے رہے سہے حواس بھی سلب کر گئی۔ وسیم کی روانگی کے بعد وہ تنتناتا ہوا کمرے میں پہنچا اور رخشی کو پورے وجود سے جھنجوڑ دیا۔

''کک۔۔۔ کیا ہو گیا حسن؟ چھوڑ دو مجھے.....'' وہ بوکھلا گئی۔

''بس کرو رخشی بیگم..... اب بس کر دو۔ میرے ساتھ کب تک چوہے بلی کا یہ کھیل جاری رکھو گی؟'' وہ سرد لہجہ میں بولا۔

''میں نے کیا کیا ہے؟ کیسی باتیں کر رہے ہو؟ تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟''

''تمھارے بھائی ایک بار پھر ہماری کھوج لگانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔''

''اب کیا ہو گا حسن؟ کیا ہمیں اپنا بسا بسایا گھر پھر سے چھوڑنا پڑے گا؟'' وہ سراسیمہ ہوئی۔

''نہیں۔ اب اس کی کیا ضرورت ہے بھلا؟ اس دفعہ تو ان کے لیے ایک بہت بڑی خوشخبری بھی منتظر ہے۔'' وہ غرایا۔

''کیسی خوشخبری؟ اور آج تم اتنی اجنبیت و درشتی سے کیوں بات کر رہے ہو مجھ سے؟'' وہ تڑپ اٹھی۔

''تمھارے بھائی کی پیشگوئی سچ ثابت ہونے کی خوشخبری..... وہ ٹھیک ہی تو کہتا تھا..... تم نے ان کی محبت کا مان نہ رکھا تو میری محبت کا مول کیونکر چکاتی رہتی..... میں ٹھہرا ایک ناکارہ، بے مصرف، کھوکھلا شجر..... میں جانتا تھا کہ کسی نہ کسی روز تم مجھ سے یونہی اکتا جاؤ گی۔'' وہ بنا سوچے سمجھے بولتا چلا گیا۔

''میں تم سے کیوں اُکتاؤں گی حسن؟'' وہ ششدر تھی۔

''کیونکہ تمھیں مجھ سے بہتر، مکمل اور نوجوان مرد کی محبت میسر آ گئی ہے۔''

''کس کی بات کر رہے ہو تم؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ننھی بچی مت بنو رخشی...... تم بخوبی جانتی ہو میں وسیم کی بات کر رہا ہوں......اسے دیکھتے ہی تم خود فراموشی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتی ہو۔ پروانے کی طرح اس کے گرد منڈلاتی ہو۔اس کی آمد کی گھڑیاں شمار کرتی ہو...... یہ محبت نہیں تو اور کیا ہے؟'' وہ حلق کے بل چلایا۔

''ہاں! ٹھیک کہہ رہے ہو تم، یہ محبت ہی ہے میں وسیم سے بہت محبت کرتی ہوں لیکن تُف ہے تمھاری سوچ پر کہ تم میری خلوت و جلوت کے ساتھی ہو کر بھی اس محبت کا ماخذ نہ پہچان سکے۔'' وہ ہسٹریائی انداز سے بولی۔

حسن کا ہاتھ بے ارادہ گھوما اور اس کے رخسار پر زوردار تھپڑ رسید کر گیا۔ رخشی نے ایک جھٹکے سے اس کا گریبان تھام لیا اور اس کی نظروں میں جھانک کر پھنکاری۔

''میں وسیم سے بہت محبت کرتی ہوں۔ جانتے ہو کیوں؟ مجھے اس کے لیے ممتا کے جذبات محسوس ہوتے ہیں۔ آج اگر ہماری اولاد ہوتی تو بالکل اسی کی ہم عمر اور بااعتماد مکمل شخصیت کی مالک ہوتی۔ میں نے بارہا سوچا کہ اپنی ادھوری زندگی کی تکمیل کے لیے کسی یتیم بچے کو گود لے لوں لیکن تمھاری وجہ سے......صرف تمھارے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اپنی اس خواہش کا اظہار نہ کر پائی۔ سوچتی تھی میرے ایسی تمنا تمھیں اپنے وجود سے متنفر نہ کر دے لیکن تُف ہے مجھ پر...... کہ میں اس قدر آبلہ پائی کے بعد بھی تمھارے لیے بے اعتبار ہوں۔''

حسن اس کے انکشاف پر ساکت رہ گیا۔ ایک ہی پل میں اس کے تمام الفاظ' خدشات اور تحفظات نے دم توڑ دیا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے پلٹا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ خالی الذہنی کے عالم میں وہ نیم کے پیڑ تلے جا بیٹھا۔ اس کے اعصاب میں رخشی کا سامنا کرنے کی اب بالکل ہمت نہ تھی۔ اس رات وہ برستی بارش میں تنہا وہیں بیٹھا بھیگتا رہا اور اس کی یہی خاموشی اور تنہائی ایک ناقابل تلافی نقصان کا موجب بن گئی۔

☆☆☆

''تم نے ان سے معافی نہیں مانگی؟'' وسیم نے اس کے خاموش ہونے پر فوری دریافت کیا۔

''اس نے موقع ہی کب دیا مجھے؟'' حسن کے آنسو بہنے لگے۔

''لیکن ہوا کیا تھا آخر اس رات انھیں۔''

''سارے زمانے سے نبرد آزما اس کا دل شاید میری واپسی کا منتظر تھا......لیکن میں خود اپنے آپ سے نظریں نہیں ملا سکتا تھا...... اس کا سامنا کیسے کر پاتا؟ اور جب رات بیت جانے کے بعد یہ ہمت پیدا ہوئی تو وہ ایسے سفر پر روانہ ہو چکی تھی جہاں سے واپسی ممکن ہی نہ تھی۔''

''محبت' ایثار اور قربانیوں کے ایک طویل سفر کا یہ انجام بہت کربناک ہے حسن!''

''اس انجام کا کون کتنا ذمہ دار ہے یہ تو مجھے علم نہیں۔ لیکن اگر میں۔۔۔ ایک معمولی نکتہ ذہن نشین رکھ لیتا تو شاید یہ سفر کبھی بھی اس انجام سے بغلگیر نہ ہوتا۔ میں یہ حقیقت فراموش کر چکا تھا کہ محبت بہت طاقتور جذبہ سہی......لیکن جبلت کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے......اس نے ساری زندگی مجھ سے وفا نبھائی مگر اولاد کی جبلی کشش اور تڑپ اس پر غالب آ گئی۔'' اس نے اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''بالکل ایسے ہی جس طرح ایک انجان شخص سے اس کی بڑھتی قربتیں دیکھ کر مجھ پر شک' بدگمانی اور تنفر کے جبلی جذبات حاوی ہو گئے تھے۔''

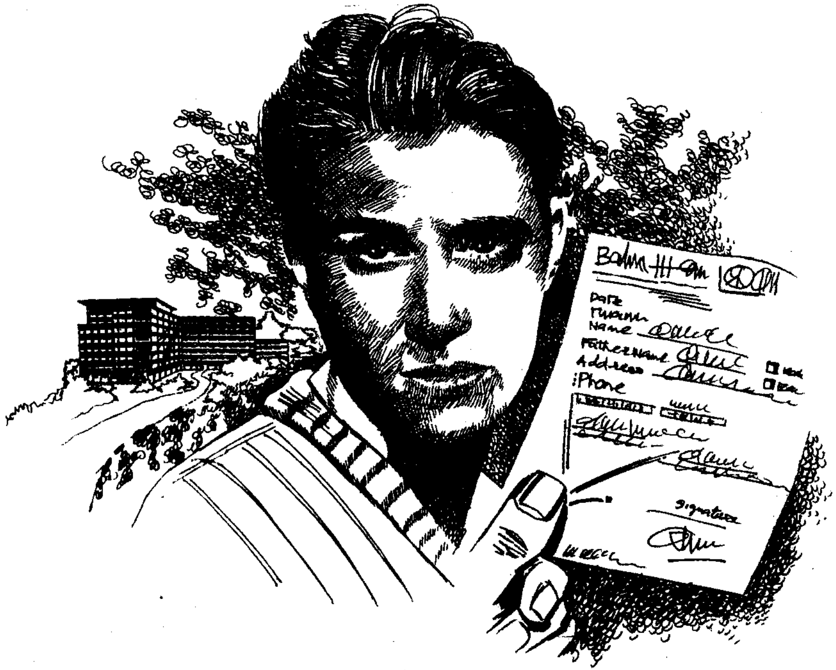
وسیم اس کی بے بسی اور چراغ آخر شب جیسی حالت دیکھ کر تاسف سے سر ہلا کر رہ گیا۔

''میری زندگی اب کوئی دم کی مہمان ہے......میری ایک التجا مان لو بس......مجھ سے رابطہ میں رہنا۔ میں نے اپنے تمام اثاثے تمھارے نام کر دیئے ہیں۔ میری موت کی اطلاع ملے تو مجھے بھی رخشی کے پہلو میں دفنا دینا۔'' وہ بلکتے ہوئے بولا تو وسیم نے بے اختیار آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

وہ شب اس نے حسن ہی کے ساتھ بسر کی۔ اگلی صبح روانگی سے پہلے وہ رخشی کی قبر پر فاتحہ کے لیے پہنچا تو درخت پر موجود گھونسلے میں ایک منظر نے اس کی بصارت جکڑ لی۔ چڑیا کے ننھے بچوں نے اڑان بھرنا سیکھ لیا تھا اور مادہ چڑیا کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر خوشی و سرشاری کے عالم میں گھونسلے کے اوپر منڈلا رہے تھے۔ اب مزید کچھ روز میں وہ اپنی طاقت پرواز آزمانے کے لیے اپنے آشیانے کو الوداع کہہ کر کسی لمبی اڑان پر روانہ ہو جاتے۔

''حسن ٹھیک ہی تو کہتا ہے......محبت بہت طاقتور جذبہ سہی......لیکن جبلت اسے ہمیشہ مات دے دیتی ہے۔'' وسیم نے خود کلامی کی اور اپنی منزل کی جانب قدم بڑھا دیئے۔





شارٹ کٹ

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
یہ روداد بہت زیادہ پرانی نہیں ہے۔ ابھی کچھ سال قبل کی ہے لیکن یہی کھیل آج بھی جاری و ساری ہے۔ اس سچ بیانی سے بہت سے لوگ اس جال میں پھنسنے سے بچ جائیں گے جو ہر گلی و کوچے میں پھیلا ہوا ہے۔

سید محمود حسن
کراچی

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں اور میرا دوست نوید سکھر سے نئے نئے کراچی شفٹ ہوئے تھے، روزگار کی تلاش تھی، کمپیوٹر کورسز ہم نے کر رکھے تھے۔ اور کمپیوٹرز بھی ہمارے پاس تھے، بہر حال روزگار کی تلاش تو تھی ہی، پر ہم بھی شارٹ کٹ پر یقین رکھتے تھے، اور راتوں رات امیر بننا چاہتے تھے، چاہتے تھے کہ کوئی ایسا کام مل جائے جس میں آسانی سے پیسے مل جائیں۔

ہم ابتدا میں نیو کراچی کے علاقے میں شفٹ ہوئے۔

یہ بڑا ہی پُر رونق علاقہ تھا، فلیٹ، پلازہ، دکانیں، شاپنگ سینٹر، تعلیمی ادارے، سب کچھ ہی تو قریب قریب تھے۔ ہم نے بھی ایک فلیٹ کرایہ پر لیا اور رہنے لگے۔ یہ چھوٹا سا ایک فلیٹ تھا جو کہ دو کمروں پر مشتمل تھا۔ اگرچہ ہم دونوں کو اپنے اپنے گھروں سے کچھ ماہانہ رقم ملتی تھی جو کہ بس بمشکل گزارے کے لیے کافی تھی، جس میں سے ہم فلیٹ کا کرایہ بھی ادا کرتے اور دو وقت کی روٹی بھی کھاتے تھے۔

ہمارے گھر کے سامنے دیوار پر ایک اشتہار چسپاں تھا، کمپیوٹر پر ٹائپنگ کر کے پیسے کمایئے، روزانہ 400 سے 600 روپے تک کمایئے، اردو اور انگلش ٹائپنگ اور انٹرنیٹ کنکشن ہونا چاہیے۔ اپنی ویب سائٹ پر اشتہارات کے ذریعے کمایئے، معلومات کے لیے، فون نمبر اور پتا لکھا ہوا تھا، جب نوید نے مجھے اس اشتہار کے بارے میں بتایا تو میں بھی خوش ہو گیا کہ چلو گھر بیٹھے پیسے کمائیں گے۔

یہ ایک پلازہ کے نیچے دو دکانوں میں قائم ایک آفس تھا، ٹیبل، کرسیاں، کمپیوٹرز رکھے تھے۔ ایک دبلا پتلا، کالا سا شخص چشمہ لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی میں نے کہا۔ ''ہم لوگ کام کرنا چاہتے ہیں۔''

''آپ کو انگلش ٹائپنگ آتی ہے؟'' اس نے میرا جائزہ لے کر کہا۔

''جی ہاں مجھے تو اردو ٹائپنگ بھی آتی ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''اچھا ہمارے پاس دونوں طرح کا کام ہے، بس آپ کو ہماری رجسٹریشن فیس دینی ہوگی، جو کہ زیادہ نہیں صرف 1000 روپے ہے۔'' اس نے پھر نوید کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''آپ کا دوست بھی یہ کام کرنا چاہیں گے؟''

''جی جی، یہ بھی بہترین ٹائپسٹ ہیں، اردو اور انگلش، دونوں ہی جانتے ہیں، 50 تک اسپیڈ ہوگی، اور میری بھی۔'' میں نے فخریہ لہجے میں بتایا۔

''یہ تو بعد میں پتا چلے گا کہ کام آپ کر بھی پاتے ہیں یا نہیں، ویسے کتنے ہی لوگ ہماری اس اسکیم سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، اور ڈیلی گھر بیٹھے کما رہے ہیں۔'' اس شخص نے ہمیں سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''ویسے تو ہمارے کئی پراجیکٹ چل رہے ہیں، پر آپ ابتدائی طور پر اس ٹائپنگ والے پروگرام میں حصہ لے سکتے ہیں۔''

''جی جی۔'' ہم دونوں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

بہرحال مجھے اور نوید کو بچپن ہی سے بچت کرنے کی عادت تھی، اور ہم نے پندرہ بیس ہزار روپے اپنے برے وقتوں کے لیے پس انداز کر کے رکھے تھے، اس میں سے ہم نے ہزار ہزار روپے کے دو نوٹ نکالے اور اس راشد نامی شخص کے حوالے کر دیئے۔ اس نے دو رسیدیں کاٹیں اور ہمارے حوالے کر دیں۔ ان رسیدوں کے کونوں پر (Non-Refundable) لکھا ہوا تھا۔ ایک فارم بھی ہم سے پُر کروایا، جس کے تیس روپے ہم سے الگ سے لیے، اس فارم پر لکھا تھا کہ آپ کی دی گئی رقم ناقابلِ واپسی ہے، 24 گھنٹے میں کام کرنے کی پابندی بھی اس فارم میں درج تھی۔

''یہ دیکھیں انگلش کا کام اور یہ رہا اردو کا کام، جو آپ کر سکیں وہ لے لیں اور جب آپ کمپیوٹر پر بیٹھیں گے تو مزید فون پر سمجھا دوں گا۔'' ہمارے پاس اردو اور انگلش۔ دونوں طرح کا کام ہے، اس نے ہمیں ایک بار پھر پُرزور لہجے میں سمجھایا۔

اب آپ کے اوپر ہے کہ آپ کون سا کام لیتے ہیں، کل صبح دس بجے یہ کام کر کے مجھے دکھانا ہوگا، پھر میں دیکھوں گا کتنی correction ہے، کیونکہ پرسوں تک فائل کر کے دینا ہے۔''

''یار ایسا کرتے ہیں کہ اردو کا کام لے لیتے ہیں۔'' ہم دونوں نے آپس میں مشورہ کیا۔

''سر آپ ہمیں اردو کا کام دے دیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس نے مجھے ایک دس سالہ پرانا ڈائجسٹ ہاتھ میں پکڑا دیا، اس کے صفحہ نمبر 120 سے ٹائپنگ اسٹارٹ کرنی ہے اور جب آپ کام اسٹارٹ کریں تو بتا دینا۔

میں اس ڈائجسٹ کو حیرت سے دیکھنے لگا کہ بھلا اس اتنے پرانے ڈائجسٹ کو کوئی کیوں ٹائپ کروانے لگا، خیر میں اسی ادھیڑبن میں ڈائجسٹ لے کر گھر پہنچا، کھانا کھانے کے بعد کمپیوٹر اسٹارٹ کیا، اردو ان پیج اسٹارٹ کیا، اور راشد کو فون ملایا۔

''سر میں نے کمپیوٹر کھول لیا ہے، اب مجھے بتائیں کہ کس طرح سے ٹائپ کرنا ہے۔''

راشد نے فون پر مجھے ڈائریکشن دینی شروع کی۔ ''آپ ان پیج چلائیں، اردو سوفٹ ویئر، چار کالم بنائیں، فونٹ سائز (الفاظ کا سائز) 9 رکھیں اور ٹائپنگ اسٹارٹ کردیں، یاد رہے کہ کل صبح 10 بجے تک مجھے دینا ہے، کوئی مسئلہ ہو تو فون پر معلوم کر لیں۔''

جب اس پیج کو سیٹ کرنے کے بعد میں نے ٹائپنگ اسٹارٹ کی تو میرے بازو شل ہونے لگے، کیونکہ اس طرح سے چار کالم میں اور اتنے کم فونٹ سائز اور کم اسپیس میں مجھے ٹائپنگ کرتے ہوئے دو گھنٹے پورے ہو گئے، اور میں اپنی انتہائی اسپیڈ کے باوجود ایک پیج بھی پورا نہیں کر سکا۔

یہی حال نوید کا بھی تھا، وہ بھی ڈھائی گھنٹے میں صرف ایک ہی صفحہ ٹائپ کر سکا۔ ”یار اب بھوک لگی ہے، کھانا کھا لیتے ہیں۔“

ایک گھنٹا ہمیں کھانا کھانے میں لگ گیا، اور پھر ہم نے ہمت کر کے ٹائپنگ کرنے کی کوشش کی، بس صرف ایک ایک صفحہ ٹائپ کر سکے، راشد نے جب ہمیں کام دکھایا تھا تو صرف ایک سادہ ٹائپ ہوا اردو کا پیج دکھایا تھا، اور اس کے بعد ہماری ہمت جواب دے گئی، کیونکہ وہ بظاہر کمپیوٹر اسکرین پر نظر آنے والا ایک صفحہ کم از کم چھ صفحات کے برابر تھا، یعنی جو اس نے ہمیں دکھایا تھا، وہ ایک سادہ اور عام صفحہ تھا، لیکن جو کام ہمیں دیا گیا، وہ کچھ اور ہی تھا، یعنی دونوں میں تضاد تھا، ہم بھی اس کام کو بہت آسان سمجھے تھے اور کام کرنے کا بیڑہ اپنے سر اٹھا لیا تھا۔

بمشکل تمام میں نے ڈھائی گھنٹے میں ایک پیج کیا، اسی طرح سے میں نے اندازہ لگایا کہ ایک پیج ٹائپ کرنے میں دو سے ڈھائی گھنٹے لگتے ہیں تو بیس صفحات کی ٹائپنگ میں 40 سے 50 گھنٹے لگ سکتے ہیں جبکہ ایک دن میں صرف چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں اور میں ایک ماہر ٹائپسٹ ہونے کے باوجود 24 گھنٹے میں اگر متواتر کام بھی کروں تو اس ٹاسک کو پورا نہیں کر سکتا اور نہ ہی کسی انسان کے بس کی بات اس طرح سے ٹائپنگ کرنا ہے، اور پھر میں نے اس کا نمبر ملایا اور کہا بھائی اس میں تو بڑی دیر لگ رہی ہے، ایک صفحہ ڈھائی گھنٹے میں ٹائپ ہو رہا ہے۔

”لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ آپ کی ٹائپنگ اسپیڈ بہت ہے اور آپ ٹائپ کر سکتے ہیں؟“

”لیکن جو پیج کی سیٹنگ آپ نے بتائی ہے، وہ ایسی ہے کہ کسی حال میں ۲۰ پیج ایک دن میں کیا دو دن میں بھی ٹائپ نہیں ہو سکتے۔“

”بہرحال آپ نے جو ایک ہزار روپے فیس بھری وہ Non-Refundable یعنی ناقابل واپسی ہے جو کہ ہمارا Rule ہے۔“ اس کی فون پر آواز گونجی۔

بہرحال ہم معاہدے کے تحت اس سے فیس واپس نہ لینے کا پابند تھے، اور ہم اس طرح سے ناکام ہو گئے اور ہمارے دونوں دوستوں کے دو ہزار روپے ڈوب گئے۔

اور جب ہم اس کے پاس آفس گئے تو اس نے ہمیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ خیر ہمارا دوسرا پروجیکٹ ہے، اس میں کچھ نہیں کرنا، صرف ویب سائٹ بنانا سکھایا جائے گا، اور پھر وہ ویب سائٹ کو انٹرنیشنل کمپنیاں (Approve) کریں گی، اور ہماری کمپنی کیونکہ ایک انٹرنیشنل کمپنی ہے جس کا یہاں پاکستان میں یہ آفس ہے، اور ہمارے نمائندے برطانیہ، امریکا، آسٹریلیا، سب جگہ پر ہیں، جب آپ ہمارے مطلوبہ معیار پر پورا اتر جائیں گے، تو ہم آپ کے بنائی ہوئی ویب سائٹ کو پاکستان سے باہر موجود اپنے نمائندے کو بھیجیں گے، اور وہ اس کو کمرشل بنائیں گے۔ اور اس پر اشتہارات لگیں گے اور جب لوگ ان اشتہارات پر کلک کریں گے تو آپ کو پیسے ملیں گے لیکن یہ میں ڈیل نہیں کرتا، میرے آفس کے برابر میں ملحقہ جو آفس ہے، حامد صاحب انہیں ڈیل کرتے ہیں۔

”کیا لوگ اس سے پیسا واقعی کما رہے ہیں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا، ہاں ہاں، ڈیلی لوگ اس پروگرام کو جوائن کر رہے ہیں، پیسے کمانے کا یہ طریقہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں رائج ہے، اور ہم ان کمپنیوں کے Certified (تصدیق یافتہ) نمائندے ہیں جس کا سرٹیفیکیٹ بھی دیوار پر آویزاں ہے، بس آپ کو صرف ایک مرتبہ رجسٹریشن فیس بھرنا ہو گی، جو کہ زیادہ نہیں، صرف 5000 روپے ہے۔“

”میں اپنے دوست نوید سے مشورہ کر کے آپ کو بتاؤں گا۔“ میں نے ٹوٹے ہوئے دل سے کہا۔ پھر کمرے پر واپس آ کر میں نے نوید کو ساری بات بتائی تو اس نے کہا۔ ”یار میں تو دوسرا کام بھی کر کے دیکھوں گا، ہو سکتا ہے کہ وہ بہت آسان ہو۔“ نوید نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

”لیکن مجھے تو یہ لوگ فراڈ لگتے ہیں۔“

”او نہیں یار، ہر چیز فراڈ نہیں ہوتی۔“ نوید نے مجھے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”یار میں تو مزید اس کے کسی پروجیکٹ میں حصہ نہیں لوں گا، تم بے شک اپنے دل کا ارمان پورا کر کے دیکھ لو۔“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”اور ہاں میں تمہارے ساتھ چلوں گا ضرور، لیکن ان کے کسی پروگرام کا حصہ نہیں لوں گا۔“

دوسرے دن ہم راشد کے سامنے موجود تھے، اس نے ہمیں ساتھ لیا، اور برابر والے آفس کی جانب چل پڑا، ایک لمبا

سا آدمی کمپیوٹر اسکرین پر کچھ سمجھا رہا تھا۔ کچھ افراد سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے جو کہ اس کمرشل ٹریننگ کو سیکھ رہے تھے۔

''آئیں آئیں، راشد صاحب، آپ نے خود کیوں زحمت کی، پٹے والے کے ہاتھ بھیج دیتے۔''

''نہیں یہ نوجوان بڑے محنتی ہیں، آپ ان کی تربیت کریں، اور اپنے پروگرام میں شامل کر لیں۔'' راشد نے متانت بھرے انداز میں کہا۔

''ہم آپ کو ویب ڈیزائن کی تربیت دیں گے، پھر آپ اپنا پروجیکٹ بنا کر انٹرنیشنل کمپنیوں کو بھیجیں گے، جس کے بعد سے اس پر انٹرنیٹ پر چلنے والے اشتہارات آپ کی بنائی ہوئی ویب سائٹ پر لگیں گے، اور آپ ڈالرز کمائیں گے۔ رجسٹریشن فیس صرف 5000 روپے۔''

میں تو پانچ ہزار روپے کا سن کر پیچھے ہٹ گیا، البتہ نوید اس کام کے کرنے پر تیار ہو گیا۔

اور اس نے دوسرے ہی دن پانچ ہزار روپے ادا کر دیے، اور میں روزگار کی تلاش میں نکل گیا، تھوڑی سی کوشش کے بعد مجھے ایک کنسٹرکشن کمپنی میں کمپیوٹر آپریٹر کی جاب مل گئی، تنخواہ اگرچہ تھوڑی ہی تھی، یعنی کے اونٹ کے منہ میں زیرہ کے مصداق والی بات تھی، پر میں نے بے روزگاری کے اس عالم میں اس کو بھی غنیمت جانا، اور نوکری پر جانا شروع کر دیا۔

میں نے نوید کو بھی سمجھانے کی کوشش کی کہ یار پہلے ہی ہم دو ہزار روپے لٹا چکے ہیں، باقی تم تو مزید پانچ ہزار روپے بھر چکے ہو، لیکن ابھی تک کچھ حاصل نہیں ہوا، میرے ساتھ چلو، تم بھی میری طرح کوئی چھوٹی موٹی جاب کر لو۔ لیکن وہ نہیں مانا۔ اس کے ذہن پر لالچ سوار تھا۔

''جلد ہی تم دیکھنا کہ میں ایک امیر ترین اور بڑا آدمی بن جاؤں گا، اور جلد ہی میری بنائے ہوئی ویب سائٹ پر اشتہارات لگیں گے جس کی مدد سے میں پیسا کماؤں گا۔''

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

بہرحال یہ سلسلہ مزید ایک مہینے چلا، ہفتے میں صرف تین کلاسز ہوتی تھیں، جو کہ نوید اٹینڈ کرنے جاتا تھا، اور مجھے کہتا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب کہ میری بنائی ہوئی ویب سائٹ Approve منظور ہو جائے گی، اور اس پر اشتہارات لگیں گے، اب تک 5 افراد کی ویب سائٹ پر اشتہارات لگ چکے ہیں، اور ان کے پیسے بننے شروع ہو گئے ہیں۔

میں نے کہا کہ اچھا ہے جیسا تم سوچتے ہو، ویسا ہی ہو۔

ایک دن میں اپنی نئی جاب سے جلدی آ گیا، عید کی چھٹیاں ابھی ختم ہوئی ہی تھیں، اور تقریباً ایک ہفتے کے بعد ہی میں آج آیا تھا۔

''چلو یار آج تم بھی میرے ساتھ چلو۔'' نوید نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں یار چلو میں بھی چلتا ہوں۔ واپسی پر چائے بھی پی لیں گے۔'' اور ہم آفس جو کہ اتنا دور نہیں تھا، وہاں پر پہنچ گئے۔

لیکن وہاں پر آفس کا نام و نشان بھی نہیں تھا، بلکہ ایک چائے کا ہوٹل کھلا ہوا تھا۔ ''ارے یہ آفس کہاں چلا گیا اور چائے کا ہوٹل یہاں کس نے کھول لیا۔'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''ارے بھائی، یہاں پر ایک آفس ہوتا تھا، وہ کہاں چلا گیا؟'' نوید نے حیرت سے اس بیرے سے پوچھا جو کہ لوگوں کو چائے سرو کر رہا تھا۔

''صاحب امارے کو پتا نہیں اگر چائے پینا ہے تو پیو، اور ہوٹل پر بیٹھو۔''

اندر ٹیبل، کرسیاں لگی تھیں، اور باہر بھی ٹیبل اور کرسیاں بچھی تھیں، لوگ بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔

ہم کاؤنٹر پر گئے۔ یہاں پر ایک نوکیلی موچھوں والا بارعب آدمی بیٹھا تھا، ہم نے اس سے پوچھا کہ بھائی ادھر جو آفس تھا، وہ کہاں گیا۔'' امارے کو نہیں معلوم، ہم تو ہوٹل کا مینیجر ہے اور تنخواہ پر رکھا ہے، مالک کو معلوم ہوگا۔''

''آپ کا مالک کہاں رہتا ہے؟''

''وہ تو دبئی میں ہوتا ہے، اور اس کے شہر میں کئی ہوٹل ہیں، اگر اس سے ملنا ہے تو دبئی چلے جاؤ۔'' اس نے ہمارا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

لیکن اب کیا ہو سکتا تھا، ہماری طرح کے پانچ چھ افراد اور بھی وہاں کھڑے تھے جو کہ نوید کے ساتھ اسپیشل کمپیوٹر ٹریننگ لے رہے تھے اور پیسا کمانے کے انتظار میں تھے۔

''یار لگتا ہے، کہ یہ لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں۔'' ایک نوجوان نے کہا۔

''ہاں شاید ان کا کام یہاں پر ختم ہو گیا ہے۔'' میں نے پُرزور لہجے میں کہا۔

وہاں جتنے لوگ کھڑے تھے سب کے پیسے ڈوب چکے تھے، ہر شخص اپنا سر پکڑے کھڑا تھا۔ حالانکہ پانچ ہزار کوئی اتنی بڑی رقم تو نہیں، لیکن اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سیکڑوں لوگ پانچ ہزار روپے جو کہ ناقابلِ واپسی تھے بھر چکے تھے، اور

انہیں کیا ملا، ایک اندازے کے مطابق دو سو میں سے صرف بیس افراد کو چند ہزار روپے ملے تھے۔ کچھ لوگ دل برداشتہ ہو کر اس کمپنی کے کام کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ باقی ایک اچھے وقت کے انتظار میں تھے کہ کمپنی بھاگ گئی۔

لیکن ایک خیال میرے دل میں پیدا ہوا، کہ یہ افراد کس شاطر دماغی سے لوگوں سے پیسے بٹور رہے ہیں اور غریب و بے روزگار نوجوان ان کے جھانسے میں پُرکشش اشتہار دیکھ کر آجاتے ہوں گے، اور ناقابل واپسی فیس بھر کر کام لے لیتے ہوں گے اور پھر جب کام نہیں کر پاتے ہوں گے تو اپنی معذوری ظاہر کرتے ہوں گے اور اس طرح سے یہ ہزار روپے ہڑپ کر لیتا ہے۔ دوسری طرف پانچ ہزار روپے والا پروجیکٹ بھی انہی کی ملی بھگت سے چل رہا تھا اور لوگ بڑی تعداد میں بے وقوف بن رہے تھے۔

دوسرا پروجیکٹ بھی بس صرف دھوکا ہی تھا، اور جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، ویب سائٹس کا تو صرف نام ہی استعمال ہو رہا تھا، بے شک ویب سائٹس پر اشتہارات لگتے ہیں مگر ان پر جن کی فیس پوری پوری ادا کی گئی ہو، اور وہ معیاری اور انٹرنیشنل کمپنیز کے معیار پر پوری اترتی ہوں، انہی چیزوں کی آڑ میں سادہ لوح افراد کو بیوقوف بنا کر اور سنہرے خواب دکھا کر لوٹا جا رہا تھا، جس کا ادراک لوگوں کو بعد میں ہوا، اور لوگ لکیر پیٹتے ہی رہ گئے، اور یہ جعلی اور خود ساختہ کمپنی والے لاکھوں روپے بٹور کر فرار ہو گئے۔ نہ ہی ان کا کوئی ایڈریس موجود تھا، اور جو فون نمبر ان کے زیر استعمال تھے وہ بھی اب بند پڑے تھے۔

اسی طرح سے اگر حساب لگایا جائے اور اگر ڈیلی پانچ افراد بھی اس کے جھانسے میں آگئے تو اس کے سیدھے سیدھے پانچ ہزار روپے کھرے ہو گئے۔ اتنی دیر میں ایک سنجیدہ سا شخص وہاں آیا۔

”بھائی آج کل فراڈ بہت ہے، لوگ شارٹ کٹ پیسا کمانے کے نام پر اپنی محنت کی کمائی برباد کر رہے ہیں، اور یہ شاطر لوگ جو کہ نیا سے نیا لبادہ اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں، معصوم لوگوں سے پیسا جمع کر کے اچانک بھاگ جاتے ہیں، ایسے لوگوں کا ٹاسک ہوتا ہے۔ فرض کریں، اگر ایک نوجوان پانچ ہزار روپے فیس دیتا ہے، اور دو مہینے میں دو سو افراد نے ان کے پاس رجسٹریشن بھی کرائی اور پانچ پانچ ہزار جمع کرائے، تو یہ سیدھے سیدھے دس لاکھ روپے ہو گئے، دکان کا ایڈوانس، کرایہ اور خرچا کتنا ہوگا، صرف ایک ڈیڑھ لاکھ روپے، باقی

ارضیات

اس موضوع پر البیرونی کی ایک [illegible] میں زمین کی مختلف تہوں کا مطالعہ، [illegible] چٹانوں کی قسمیں، مدنیات کی قسمیں، مدنیات کے دریافت کے لیے جگہ اور اس کی نشانیوں کے لیے پہچان، مختلف پتھر اور ان کے خوائص درج ہیں۔ البیرونی نے زمین کی عمر بھی حساب لگا کر نکالی اور بتایا کہ کرۂ ارض کی خشکی کو وجود میں آئے کتنا عرصہ ہو چکا ہے۔ خشکی کی عمر جو البیرونی نے نکالی آج کے سائنسدان بھی وہی عمر نکالتے ہیں۔ یہ بات بھی سب سے پہلے البیرونی نے ہی لکھی کہ دریائے سندھ کا طاس کسی زمانے میں سمندر کی تہہ تھا لیکن آہستہ آہستہ خشکی کی تہہ بچھتی رہی اور یہ وجود میں آگیا۔

نباتات

مدنیات کے علاوہ البیرونی کو نباتات سے بھی دلچسپی رہی۔ ان کا ذکر مختلف مقامات پر کیا ہے۔ البیرونی یونانی زبان سیکھنے کے لیے ایک یونانی عالم کے پاس پھول، پتے، بیج لے جایا کرتا تھا۔ اس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ پھول کی پتیاں عام طور پر تین، چار، پانچ، چھ یا اٹھارہ ہوتی ہیں۔ سات یا نو کبھی نہیں ہوتیں۔ اس نے مختلف پودوں کے حصوں اور ان کے خواص پر بھی لکھا ہے۔

تاریخ

البیرونی ایک اعلیٰ پائے کا تاریخ دان تھا۔ سب سے پہلے تو اس نے اپنے ہی وطن کی تاریخ لکھی جس میں غزنوی حکومت کے تمام حالات لکھے۔ اس نے علم تقویم بھی سیکھا۔ تقویم کا علم سن و تاریخ کا علم ہے اور اس سے مؤرخوں کو بڑی سہولت حاصل رہتی ہے۔ اس نے دنیا کے ابتداء اور انتہا کے بارے میں بھی بڑی معلومات جمع کیں۔ اس کی کتابوں میں چین اور منگولیا کے بارے میں معلومات درج ہیں جو اس نے قطبے اور ادائی غور کے حکمرانوں کے سفیروں سے حاصل کیں۔ یہ سفیر 1027ء میں سلطان محمود غزنوی کے دربار میں آئے تھے۔ ان کے علاوہ البیرونی نے اہل خوارزم، اہل سمرقند، اہل صفدو، زرتشتیوں کے تاریخی حالات بھی لکھے۔

مرسلہ: سلطانہ بھٹو، لاڑکانہ

8 لاکھ یا زیادہ، لوگوں سے شاطرانہ طریقے سے جیبوں سے نکال کر فرار ہو جاتے ہیں۔"

واقعی بات اب میری سمجھ میں آ گئی تھی، لوگوں کو چالاکی اور عیاری کے ذریعے کس طرح سے لوٹا جا رہا ہے، اور صرف لوگ لالچ میں شارٹ کٹ کے ذریعے پیسا کمانے کے لالچ میں بیوقوف بن جاتے ہیں، اور اپنی رقم گنوا بیٹھتے ہیں۔ میں نے نوید کو دیکھتے ہوئے کہا کہ میں نے تمہیں منع کیا تھا نہ کہ یہ لوگ تو مجھے فراڈ لگتے ہیں، تم نے خوامخوہ میں اپنا پیسا اور اتنا وقت ضائع کیا۔

"وہ بیچارہ بھی بہت شرمندہ تھا، مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔"

جدید ٹیکنالوجی کے نام پر اور لاکھوں روپے گھر بیٹھے کمانے کا جھانسا دے کر کتنی ہی نام نہاد کمپنیاں وجود میں آ گئی ہیں، جو کہ لوگوں سے لاکھوں اور کروڑوں روپے بٹور کر اچانک بھاگ جاتی ہیں۔

راشد، حامد اور جمال تینوں دوست اسلام آباد کے ایک کیفے میں چائے کی ٹیبل پر بیٹھے تھے، ٹوٹل اس پروجیکٹ پر کتنا خرچا ہوا، دو لاکھ روپے خرچا آیا، دکان غیر معروف طریقے سے کرائے پر لی تھی، صرف دو مہینے کے لیے، باقی سامان بھی راتوں رات ایک کمپیوٹر انسی ٹیوٹ والے کو فرنیچر سمیت بیچ دیا، اس طرح مرتبہ بارہ لاکھ روپے بچ گئے ہیں، پھر کسی اور شہر کا رخ کرتے ہیں، اور لوگوں کی بیوقوفی اور شارٹ کٹ کے ذریعے لاکھوں روپے کمانے کی خواہش سے فائدہ اٹھاتے ہیں، ظاہر ہے اس میں ان کی کوئی پکڑ تو ہے ہی نہیں۔

اگر کوئی ٹائپنگ نہ کر سکے صرف 20 صفحات کی تو یہ اس کا قصور ہے، ان کا نہیں، بس ٹیکنک یہی ہے کہ دکھاتے کچھ ہیں اور کام کچھ اور دیتے ہیں، اور لوگ کام تو یہ سمجھ کر لے لیتے ہیں کہ یہ تو صرف سادہ ٹائپنگ کا کام ہے، اور وہ کر ہی لیں گے، مگر جب وہ اپنے گھر پر جا کر کمپیوٹر پر بیٹھتے ہیں اور فون پر بات کرتے ہیں تو انہیں ایسا فارمیٹ بتاتے ہیں جو کہ وہ کسی حال میں نہیں کر سکتے۔

اسی طرح سے لوگوں کو ویب سائٹ بنانا سکھاتے ہیں، اور پھر انہیں اس پر اشتہارات لگنے کا لالچ دیتے ہیں اور انہیں بتاتے ہیں کہ ہمارے نمائندے دوسرے ملکوں میں بھی ہیں اور ہم ایک انٹرنیشنل کمپنی ہیں، حالانکہ حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں، وہ تو فنکار ہیں جو کہ اپنا فن استعمال کرتے ہیں، صرف ایک یا دو ویب سائٹ جو کہ محدود مدت کی ہوتی ہیں اور اس پر اشتہارات لگے ہوئے بھی ہوتے ہیں انہیں نمونے کے طور پر دکھاتے ہیں اور وہ بھی جال میں پھنس جاتے ہیں، کسی کو مطمئن کرانے کے لیے ویب سائٹ کی فیس خود بھر کر منظور کروا دیتے ہیں جو کہ ایک مہینے کے لیے ہوتی ہے اور کسی کی چند دنوں کے لیے اور جب ٹارگٹ پورا ہو جاتا ہے، یعنی ایک ہزار افراد اس پُرکشش آفر کے نتیجے میں فیس جمع کرا دیتے ہیں جو کہ ناقابلِ واپسی ہوتی ہے۔ راتوں رات گول ہو جاتے ہیں، بہت سے لوگ تو ویب سائٹ پر اشتہارات نہ لگنے کو اپنا ہی قصور سمجھتے ہیں اور یہی کہتے ہیں کہ آپ کو مزید محنت کی ضرورت ہے اور اپنی ویب سائٹ کو مزید اچھا اور خوبصورت بنائیں۔

کچھ لوگ تو دل برداشتہ ہو کر چلے ہی جاتے ہیں، جو ایک مہینے سے زیادہ ٹائم دیتے ہیں، انہیں اپنے پاس سے ایک یا دو ہزار روپے بھی دے دیتے ہیں کہ یہ آپ کی پیمنٹ آئی ہے، آپ مزید محنت جاری رکھیے، اور یہ بات کسی کو بتانا نہیں، صرف چند Intelligent افراد کو ہی پیمنٹ ملی ہے وہ بھی ہماری خاص کوششوں کے نتیجے میں۔ اسی طرح سے لوگوں کی تعداد کم ہوتی چلی جاتی ہے۔

اور آخر میں جب وہ وہاں سے گول ہوتے ہیں، تو بھی لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ان کا آفس اور کہیں شفٹ ہو گیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ وہ نہیں ڈھونڈ سکتے، اور جب ویب سائٹس چل رہی ہوتی ہیں، وہ بھی ہفتے دس دن میں نان پیمنٹ پر بند ہو جاتی ہیں اور لوگ اسے اپنا ہی قصور سمجھ کر اس کام سے دور ہٹ جاتے ہیں اور ان کی چاندی ہو جاتی ہے جس کی منصوبہ سازی انہوں نے پہلے ہی کر رکھی ہوتی ہے۔ وہ جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے لوگوں کو اپنے دام میں لا کر پیسا کما رہے ہیں، یہ بھی تو ایک فن ہی ہے نا، اور اس میں ہماری کوئی پکڑ بھی نہیں ہے۔ تینوں اپنی عیاری پر خوش اور بہت نازاں تھے۔

لوگوں کو دھوکا دینا، بالخصوص بے روزگار نوجوانوں کو سنہرے خواب دکھا کر لوٹنا ایسی جعلی اور نام نہاد گروپوں کا آج کل طریقہ واردات ہے، اس کو سمجھنا مشکل ضرور ہے، پر ناممکن نہیں، ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہر کام کرنے سے پہلے گہری غور و فکر کے ساتھ اس کا جائزہ لیں، مشورہ کریں، اور لالچ میں نہ آئیں، ایسے پُرکشش اشتہارات نوجوانوں کو اپنی طرف بلاتے ہوئے آپ کو بھی سرِ راہ نظر آ سکتے ہیں، اور جو لوگ یہ کام کر رہے ہیں، انہیں بھی سوچنا چاہیے کہ جعلسازی اور بے ایمانی کر کے غریب بے روزگار لوگوں کی خون پسینے کی کمائی وہ کس طرح اپنے ہتھکنڈوں سے ہڑپ کر جاتے ہیں۔

فیکا

محترم مدیر
السلام علیکم
یہ کوئی فرضی کہانی نہیں میرے بچپن کی ایک ہر دل عزیز شخصیت کا زندگی نامہ ہے۔ امید ہے پسند آئے گی۔

طارق عزیز خان
اسلام آباد



ہمارے آبائی شہر رحیم یار خان میں جہاں ہم رہا کرتے تھے اس محلے کا نام صادق ٹاؤن تھا۔ وہاں کے چند کردار نہایت دلچسپ تھے جن کی باتیں اور قصے آج بھی مجھے یاد ہیں۔ فیکا بھی انہی میں سے ایک تھا۔ تاہم اس کا قصہ بیان کرنے سے پہلے میں آپ کو اپنے پرانے محلے کے معاشرتی حالات اور وہاں کے چند دیگر کرداروں سے ملوادوں تاکہ آپ فیکا کے دلچسپ کردار کو سمجھ سکیں۔ صادق ٹاؤن درمیانے طبقے کی سفید پوش آبادی تھی۔ جسے قیام

پاکستان کے فوری بعد باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت آباد کیا گیا تھا۔ ہر گلی میں دو کمروں، باورچی خانہ، غسل خانہ اور کھلے صحن والے چھ چھ گھر تھے جن کے آگے پیچھے دونوں جانب کچی گلیاں تھیں۔ گھروں کی چھتیں آرچ نما ہوتی تھیں۔ جن میں کھڑی اینٹوں کو چونے اور مٹی کے ساتھ جوڑ کر چن دیا جاتا تھا۔ لگ بھگ ہر گلی بلکہ ہر دوسرے گھر میں نیم، بیری اور کیکر کے درخت تھے۔ ہر درخت پر میونسپل کمیٹی کا مخصوص نمبر لگا ہوتا تھا اور ان کی باقاعدہ دیکھ بھال کی جاتی تھی۔ ہمارے پڑوس میں خالو عمر کے گھر کے صحن میں بھی نیم کا گھنا چھتنار درخت تھا جس میں ہر سال شہد کے ایک دو چھتے لازمی لگا کرتے۔ گرمیوں میں اس نیم کی پیلی پیلی میٹھی نمولیاں کھانے کا مزہ آجاتا۔ اس نیم کی شاخیں ہمارے برساتی والے کمرے کی چھت پر جھکی رہتیں۔ جہاں پر گھنی شاخوں کے نیچے پڑے ایک ٹوٹے ہوئے مٹکے میں فاختاؤں کے ایک جوڑے نے گھونسلا بنا رکھا تھا۔ محلے کی ہر دوسری گلی میں ایک دو بلیاں لازمی پائی جاتی تھیں جو خاص اس گلی کی بلیاں کہلاتیں۔ جب کسی گھر کے کونے کھدرے میں بلی بچے دیتی تو ان کا پورا دھیان رکھا جاتا۔ بڑے ہو کر یہی بچے اردگرد کی گلیوں میں اپنا نیا ٹھکانا بنا لیتے۔ ہماری گلی کے کونے پر ایک احاطے میں پرانا متروک کنواں تھا جہاں چند خرگوشوں نے سرنگیں بنا رکھی تھیں۔ کبھی کبھار گرمیوں کی دوپہر میں کوئی ایک آدھ خرگوش پانی کی تلاش میں بھٹکتا ہوا گلی میں آنکلتا تو اس کی شامت آجاتی۔ ہم نے گھر میں ایک نیولا بھی پالا ہوا تھا جو دن میں تو ایک کونے میں پڑا اونگھتا رہتا لیکن جونہی رات ہوتی کبھی کسی کی مرغی پکڑ کر لے آتا تو کبھی کسی دکان میں گھس کر انڈوں کو تہس نہس کر دیتا۔ محلے داروں کی شکایات کے بعد والد صاحب اسے ابوظہبی روڈ سے پرے واقع ریت کے ٹیلوں پر چھوڑ آئے تھے۔ ریت کے یہ ٹیلے بھی ایک دلچسپ جگہ تھی۔ ان کے اندر چھوٹے چھوٹے سوراخوں میں پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ ہم چھپن چھپائی کھیلتے ہوئے سرنگوں میں پانی ڈالتے اور پرندے پکڑ لیتے، کچھ دیر ان سے کھیلتے اور پھر آزاد کر دیتے۔ ہر دو تین سال کے بعد ان ٹیلوں کے قریب سرکس لگا کرتا تھا۔ وقت بدلا تو ان ٹیلوں کی جگہ پر عالیشان شادی ہال اور مارکیٹیں بن گئیں۔ آج کسی سے ذکر کریں کہ یہاں آدھے شہر کے برابر ریگستان تھا تو کوئی یقین نہیں کرتا۔ اس ریگستان کی مشرقی سرحد پر ایک بڑی نہر بہتی تھی۔ اس نہر کے کنارے کیکر کے درختوں پر بیے کے گھونسلے لٹکے دکھائی دیتے تھے۔ یہ نہر اور درخت آج بھی ہیں لیکن بیے جیسا پرندہ نایاب ہو چکا ہے۔

ہمارے محلے کے بیچوں بیچ ایک چوک واقع تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا تجارتی مرکز تھا جہاں شاہ جی کا چائے اور صوفی کا ہوٹل مشہور تھا۔ چوک میں ایک میونسپل لائبریری، دو تین کریانہ کی دکانیں اور ایک پان کی دکان واقع تھی جبکہ بابا نہال کی کریانے کی دکان کے برابر میں ایک صاحب نے کیرم بورڈ بھی رکھا ہوا تھا۔ سر شام ہی کیرم کلب میں چوکڑی جم جاتی جس کا مرکزی کردار بابر چچا ہوتے۔ ان کا کیرم میں کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ پورے بورڈ پر کہیں بھی گوٹ رکھیں وہ آپ کی پسند کے پاکٹ میں اسے گول کر دیتے۔ چوک کی ایک طرف قادری صاحب کا چھوٹا سا دواخانہ بھی تھا۔ ذرا سا کسی بچے نزلہ زکام ہوتا تو اسے فوری طور پر قادری صاحب کے روبرو پیش کر دیا جاتا جن سے ٹیکا لگوائے بغیر جاں بخشی ممکن ہی نہیں تھی۔ اس زمانے میں میونسپل کمیٹی کے اسکولوں میں بھی سرکاری ٹیمیں سال میں ایک آدھ بار وبائی ٹیکے لگانے پہنچ جاتی تھیں۔ یہ ٹیمیں اچانک اسکول پر حملہ آور ہوتیں اور پھر اسکول میں کھلبلی مچ جاتی۔ پورا اسکول خوف وہراس میں ڈوب جاتا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر بھٹی صاحب گیٹ کی ڈیوٹی سخت کر دیتے تاکہ کوئی بچہ فرار ہونے نہ پائے۔ بھٹی صاحب ایک قابل لیکن سخت منتظم تھے۔ جس بچے کو بازو پر خوفناک ٹیکا لگتا وہ آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو سجائے دل ہی دل میں بھٹی صاحب کو خوب کوستا۔ قادری صاحب کا دواخانہ محلے کے بزرگوں کی بیٹھک بھی تھا۔ وہاں گپیں لگانے کے لیے ہمیشہ دو بنچ دھرے رہتے۔ قادری صاحب کے قریب ہی کولے سبزی والے کی دکان تھی جس نے دکان کے سامنے ایک پنجرے میں پالتو کبوتر بھی رکھے ہوئے تھے۔ کولا تھا تو ماہر کبوتر باز لیکن بیچارہ ہمیشہ اس حسرت میں ہی رہا کہ میرا کوئی کبوتر پکڑ سکے۔ میرے سارے کبوتر نہایت وفادار تھے۔ میں نے کبوتروں کی وضع قطع کے حساب سے ان کے نام رکھے ہوئے تھے۔ لڑائی بھڑائی میں جو ماہر تھا اس کا بابا آدم خور، لنگڑا، دوغلہ، سوہنی، مادی، جنگلی، بونا اور پرواز میں ماہر بلیک ڈوگ جسے میں جمعے کے روز نماز کے بعد سائیکل پر لے جا کر بابا غریب شاہ کے پل سے چھوڑتا اور وہ سارا شہر پار کر کے ہمارے گھر کی برساتی میں پہنچ جاتا۔ بلیک ڈوگ کئی سال میرے پاس رہا لیکن ایک دن وہ راستہ بھول گیا۔ آج قریب پینتیس سال بعد بھی میں کبھی کبھی چونک

کر آسمان کی طرف دیکھتا ہوں شاید بلیک ڈوگ کہیں اڑتا ہوا دکھائی دے جائے۔ بابا جمعہ کا کھوکھا چوک سے کچھ فاصلے ہماری پچھلے والی گلی میں تھا۔ باباجی پرانے زمانے کے پڑھے ہوئے تھے اور دکانداری کا حساب کتاب سنسکرت زبان میں لکھا کرتے تھے۔ ان کے کھوکھے کی مشہور سوغات کھٹا اور میٹھا چورن تھے جس کی ایک پڑیا آٹھ آنے کی ملتی تھی۔

بابا جمعہ والی گلی کے سرے پر انجم ماموں کی کتابوں کی دکان الشمس بک ڈپو واقع تھی۔ نام تھا ان کا نجم العارفین انجم لیکن اتنا بھاری بھرکم نام یاد رکھنے کی بجائے ہر چھوٹا بڑا انھیں انجم ماموں ہی کہتا تھا۔ انجم ماموں چٹ پٹے کھانوں کے رسیا تھے۔ وہ دکان میں بیٹھے اس ٹوہ میں لگے رہتے کہ آج کس گھر میں کیا پکا ہے؟ کوئی بچہ کتاب پینسل خریدنے دکان پر آتا تو وہ پہلا سوال یہی کرتے۔ ''ابے کیا پکایا ہے آج تیری اماں نے؟''

کالج کے زمانے میں میرا اور میرے دوستوں کے اٹھنے بیٹھنے بلکہ لیڈو کھیلنے کا ٹھکانہ انجم ماموں کی دکان ہی تھی۔ کبھی کبھار فیکا بھی وہاں آجاتا تو محفل کو چار چاند لگ جاتے۔ عمر کے لحاظ سے فیکا ہم سب دوستوں سے دگنی عمر کا تھا لیکن اپنی دلچسپ باتوں اور قصے کہانیوں کی وجہ سے وہ محلے کے ہر چھوٹے بڑے میں یکساں مقبول تھا۔ اس کا اصل نام تو محمد رفیق تھا لیکن وہ فیکا کے نام سے مشہور تھا۔ فیکا بال بچے دار آدمی تھا۔ ہرفن مولا تھا۔ مزدوری، چوکیداری سے لے کر رنگ سفیدی کا کام بھی کرتا تھا۔ شب برات آتی تو وہ اپنی دکان کے تھڑے پر پٹاخوں کی دکان سجالیتا۔ البتہ پتنگیں اس کے پاس ہر وقت دستیاب رہتی تھیں۔ گلی میں بیری کے دو درختوں کے درمیان دھاگا باندھ کر خود بھی مانجھا لگا کر ڈور تیار کرتا اور کبھی بسنت سے پہلے لاہور سے جا کر بھی خرید لاتا۔ مانجھے کے لیے لئی بناتے وقت اس میں رنگ اور پسے ہوئے شیشے کی مقدار مناسب رکھتا کہ ڈور خوش رنگ اور کاٹ دار تیار ہو۔ شہر میں پیپل والے پل پر نظاماموں پتنگ باز بھی مشہور تھا لیکن فیکے کی بات نرالی تھی۔ اس کے ہاتھ کی بنی سدھ پتنگوں اور ڈور کی پورے شہر میں دھوم تھی۔ مال وہ ایک نمبر رکھتا تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس کی دکان کا انار نہ چلا ہو، کسی چیچر نے دھوکا دیا ہو یا پھر کوئی گولہ ٹھس ہوگیا ہو۔ ایک اکھا دو اکھا، پری، شرا اور تکل پتنگوں کے یہ نام ہم نے اسی سے سنے تھے اور آج تک یاد ہیں۔

وہ خود بھی پتنگ اڑانے کا شوقین تھا اور بڑے بڑے نامی گرامی پتنگ باز اس کے سامنے پانی بھرتے تھے۔ ہر جمعے کو مسجد کے گراؤنڈ میں پتنگ باز جمع ہوتے اور پھر فیکے کی دکان پر رنگوں کی بہار آجاتی۔ میں نے اسے اپنے بچپن سے لے کر آخر تک ایک ہی حلیے میں دیکھا۔ دبلا پتلا ڈیل ڈول، بلی آنکھیں، سانولا رنگ، تیل میں چپڑے سیاہ بال، چھوٹی مونچھیں، ہمیشہ شیو بنائے رہتا۔ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن ملکی حالات سے مکمل باخبر رہتا۔ چرب زبان تھا اور فریق مخالف کو اپنی لچھے دار باتوں سے گھیرنے کا فن جانتا تھا۔ فیکے میں ان ساری خصوصیات کے باوجود دو بری عادتیں تھیں۔ ایک تو وہ چرس پیتا تھا اور دوسرا شرط لگانے کا شوقین تھا۔ باقاعدہ جوا نہیں کھیلتا تھا لیکن بات بات پہ شرط لگانے سے نہیں چوکتا تھا۔ اس کی جان تو ڈیڑھ پسلی کی تھی لیکن وہ بلا کا پھرتیلا اور جفاکش تھا۔ بقول اس کے ایک سوٹا لگانے کے بعد وہ دنیا کا کوئی بھی کام کرسکتا تھا۔ غلہ منڈی سے اناج کی بوری کمر پر لاد کر زیادہ فاصلہ طے کرنے کی اس نے بہت سی شرطیں جیتی تھیں۔ وہ سائیکل چلانے کا بھی ماہر تھا۔ اس نے پنجاب کے مختلف میلوں ٹھیلوں میں دن رات سائیکل چلانے کے مقابلوں میں بھی حصہ لے چکا تھا۔ فیکے کو کبھی کسی نے نشے میں تو ایک طرف ہوش میں بھی کسی بڑے چھوٹے کے ساتھ بدتمیزی یا لڑائی جھگڑا کرتے نہیں دیکھا تھا۔ یہی وجہ تھی سب محلے دار کام کے مقابلے میں اس کی نشے کی عادت نظر انداز کردیتے تھے۔

فیکے کو محلے سے منسلک قبرستان کی ہر قبر کی تاریخ ازبر تھی۔ کس گھر کا کون سا فرد کہاں آسودۂ خاک ہے اسے زبانی یاد تھا۔ اس فن میں اس کے استاد جمو بھائی تھے جن کا اصل نام مشکور حسین صدیقی تھا۔ جمو بھائی کام وام کچھ خاص نہیں کرتے تھے البتہ پان کھانے کے شوقین تھے۔ افسوس کہ انجم ماموں اور انھوں نے زیادہ عمر نہیں پائی۔ جمو بھائی کی وفات کے بعد قبر کی نشاندہی کا کام فیکا بھی کرتا رہا۔ وہ قبر کھودنے سے لے کر مردے کو دفنانے تک ہر کام میں پیش پیش رہتا۔ تاہم کھدائی کے دوران وہ کام کم اور قبرستان سے متعلق خوفناک قصے زیادہ سناتا۔ مردے کو قبرستان لایا جاتا تو دفناتے وقت وہ مٹی کی اونچی ڈھیری پر اکڑوں بیٹھ جاتا اور پھر لواحقین اس کے نت نئے مشوروں سے زچ ہوجاتے۔ فیکے کی قبر شناسی کا ایک واقعہ سناتا چلوں۔ ایک بزرگ جو اپنے کسی رشتہ دار کی وفات پر کئی سال بعد رحیم یار خان آئے تھے قبرستان میں دفن اپنے عزیزوں کو یاد کرنے لگے۔ فلاں کی قبر وہ ہے فلاں وہاں دفن ہے۔ بات کرتے کرتے جذباتی ہوگئے اور چھڑی کا اشارہ

کر کے بولے وہ سامنے بیری کے نیچے میرے والد دفن ہیں۔ کیا جوان رعنا تھے، کیا رنگ روپ اور رعب تھا ان کا، سب یہیں رہ گیا، وہ دیکھو بیری کے نیچے۔ وہ دیکھو بھائیو۔ وہی تھے میرے والد، اب بیری کے نیچے مٹی اوڑھے سو رہے ہیں۔ فیکے سے نہ رہا گیا۔ لپک کر ان کے قریب گیا اور پوچھا "بزرگو، آپ مرزا صاحب کے بیٹے ہیں نا؟"

بزرگ نے اثبات میں گردن ہلائی تو جھٹ سے بولا "وہ بیری کے نیچے حکیم صاحب دفن ہیں آپ کے والد کی قبر وہاں دوسری طرف کیکر کے نیچے ہے۔"

فیکے کا گھر گلی کے ایک کونے پر تھا۔ گھر کے سامنے کچی گلی جبکہ دوسری طرف سڑک کی سائیڈ پر اس کی بیٹھک نما دکان تھی۔ سڑک کے پار جامع مسجد کا بڑا سا میدان اور مسجد کے ساتھ میونسپل کمیٹی کا پرائمری اسکول واقع تھا جو بعد میں مڈل تک ہو گیا تھا۔ اسکول کی وجہ سے فیکے کے پٹاخوں اور پتنگوں کا کام خوب چلتا تھا۔ اسکول کے سامنے شاہ جی گول گپے والے کی ریڑھی بھی کھڑی ہوتی۔ جن کے ہاتھ کے بنے گول گپے تو لاجواب ہوتے ہی تھے لیکن کھٹائی کا کوئی جواب ہی نہ تھا۔ شاہ جی کے برابر میں شبیر گولے والا اور تایا لبو صدیق بھی اپنی رنگ برنگی میٹھی گولیوں ٹافیوں کا ٹھیلا لگاتے تھے تاہم ان سب کے مقابلے میں بچوں کا زیادہ رش فیکے کی دکان پر ہی ہوتا۔ وہ دکان کے باہر چبوترے پر اپنا سامان سجا کر رکھتا۔ فیکے کی دکان کا یہ چبوترا محلے کے بڑوں اور بچوں میں یکساں مقبول تھا۔ فیکا اسکول کے بچوں کو خریداری پر لبھانے کے لیے نت نئے کھیل تماشے ایجاد کرتا رہتا۔ فیکے کا ایک کھیل محلے میں بہت مشہور تھا۔ وہ پانی سے بھری ایک بڑی بالٹی چبوترے پر رکھ دیتا۔ بالٹی کے اندر درمیان میں ایک چھوٹا گلاس ہوتا تھا۔ تماشا یا کھیل کچھ اس طرح تھا کہ فیکے کے اکسانے پر بچے اپنی اٹھنی چونی کو نشانہ باندھ کر بالٹی میں ڈالتے۔ اگر سکہ نیچے جا کر عین گلاس میں گرتا تو انعام کے طور پر فیکا دو سکے ادا کرتا لیکن اگر سکہ گلاس کے باہر بالٹی کے فرش پر گرتا جیسا کہ اکثر ہوتا تو پھر وہ سکہ فیکے کی ملکیت قرار پاتا۔ فیکا گلا پھاڑ پھاڑ خوب چیختے چلاتے ہوئے بچوں کو چیلنج کرتا اور وہ اپنے اپنے سکے گنوا کر منہ بسورتے ہوئے اسکول کی راہ لیتے۔ کچھ دن تک جب یہ کھیل پرانا ہو جاتا تو وہ نیا تماشا ایجاد کر لیتا۔ فیکا لاٹری بھی لگاتا تھا۔ ایک بورڈ پر رنگ برنگی پرچیاں گوند سے چپکی لگی ہوتیں۔ چونی کی ایک پرچی پر مختلف چھوٹے بڑے انعامات تھے۔ بڑے سے بڑا انعام ایک روپیا یا پھر چابی والا اسکوٹر تھا۔ چالاک فیکا نشاندہی کے بعد پرچی خود اپنے ہاتھ سے کاٹتا اور اگر اس پر بڑا انعام ہوتا تو وہ پرچی چھپا کر بچوں سے سودے بازی شروع کر دیتا۔ آخر کار ہم جیسے لالچی بچے روپیا چھوڑ اٹھنی لے کر خوش خوش اسکول چل دیتے۔ فیکے میں اور بھی بہت سے گن تھے۔ وہ محلے کی ہر شادی میں پیش پیش رہتا مایوں ابٹن سے لے کر رخصتی اور ولیمے کے اختتام تک اس کی خدمات جاری رہتیں۔ کبھی معقول انعام پاتا تو کبھی صرف شاباشی سے ہی خوش ہو جاتا۔ تاہم اپنی دکانداری سمیت دیگر مشاغل پر وہ جامع مسجد کے چھوٹے موٹے کاموں کو ہمیشہ ترجیح دیتا۔ دواخانے والے قادری صاحب جو مسجد کمیٹی کے خزانچی تھے، مسجد و عیدگاہ کی صاف صفائی، رنگ سفیدی اور دیگر توڑ پھوڑ مرمت کا کام فیکے کو دیتے جسے وہ پوری تندہی سے سرانجام دیتا۔

یہ میں آپ کو اس زمانے کے واقعات سنا رہا ہوں جب ٹی وی کا اکلوتا چینل ہوا کرتا تھا جس پر بلا ناغہ آٹھ بجے ڈراما اور جمعرات کو اردو فیچر فلم لگا کرتی۔ بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی کا زمانہ تھا اکا دکا گھروں میں ٹی وی تھے جن میں ہمارا گھر بھی شامل تھا شام کو والدہ صاحبہ پانی چھڑکا کر چارپائیوں کے آگے بڑی سی دری بچھا دیتیں جس کے سامنے جھاڑ پونچھ کر ٹی وی رکھا جاتا۔ مغرب کی نماز کے فوری بعد محلے کے اکثر گھر بچوں سمیت ڈراما دیکھنے پہنچ جاتے۔ بڑے چارپائیوں پر اور بچے ٹی وی کے قریب دری پر جم کر بیٹھ جاتے۔ ڈراما شروع ہوتے ہی سب کو سانپ سونگھ جاتا یہاں تک کہ ہماری بلی بھی گھوم گھام کر آ جاتی اور صحن کے ایک کونے میں پنجے پسار کر لیٹ جاتی۔ ہم لوگوں کی نظریں ٹی وی پر جمی رہتیں جبکہ بلی ایک ٹک صحن میں تار پر لٹکے چھینکے کو گھورتی رہتی۔ جس میں دودھ کی دیگچی لٹک رہی ہوتی۔ والد صاحب موسم برسات کے دنوں میں گھر میں ٹی وی دیکھنے آنے والے ہر بچے کو کونین کی کڑوی گولی کھانے کے لیے لازی دیتے۔ جس جمعرات کو فیچر فلم لگی ہوتی وہ دن میلے کا دن ہوتا۔ دراصل بدھ کی شام سے ہی ہر ایک کو کھد بد ہو جاتی کہ اگلے دن کون سی فلم دکھائی جائے گی۔ بدھ کی رات خبرنامے سے پہلے اچانک پروگراموں کی لسٹ ٹی وی... میوزک کے ساتھ چلنی شروع ہو جاتی۔ اب ہر ایک کی نظریں اسکرین پر جم جاتیں۔ ٹی وی والے بھی خوب امتحان لیتے اور جب لوگ مایوس ہونے لگتے تو اچانک اردو فیچر فلم کا اشتہار سامنے آ جاتا۔ ایک دم شور سا مچ جاتا اور ہر کوئی جوش مسرت سے دیوانہ ہو جاتا۔ فیکے کو فلم بینی کا بھی بے حد شوق تھا۔ وہ ہر ہفتے

آنے والی فلم کا پہلا شو لازمی دیکھتا تھا۔ اردو فلمیں عام طور پر شاہی روڈ پر واقع ٹکسی سینما میں لگا کرتیں جہاں ہر نئی فلم کے پہلے شو پر کھڑکی توڑ رش ہوتا۔ ڈیڑھ پسلی ہونے کے باوجود فیکا ہجوم کو چیرتا ہوا اندر گھس کر کھڑکی تک پہنچ جاتا اور پھر ٹکٹ لے کر ہی باہر نکلتا۔ جمعرات کو ٹی وی پر لگنے والی ہر فیچر فلم فیکے نے پہلے سے ہی دیکھی ہوتی اور وہ اس دن دکان پر آنے والے ہر گاہک کو فلم کی اسٹوری مزے لے لے کر سناتا۔ اس زمانے میں ٹی وی کی طرح فریج بھی اکا دکا گھروں میں تھے البتہ ہر گھر کے باورچی خانے میں کھانا محفوظ رکھنے کے لیے ایک عدد جالی دار الماری نما نعمت خانہ ہوتا تھا۔ ٹھنڈے پانی کے کولر تو تھے لیکن اکثر گھروں میں صحن کے ایک کونے پر گھڑونچی بنی ہوتی تھی جس پر دو یا تین مٹی کے گھڑے دھرے رہتے تھے۔ گھڑوں کے پانی کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے باردانے والی بوری کو گیلا کر کے ان پر لپیٹ دیا جاتا تھا۔

وقت بدلا تو محلے کے سیدھے سادھے بچے سیانے ہو گئے۔ گلی ڈنڈے، کوکلا چھپاکی، ڈبا کوٹ، پٹھو گرم، اسٹاپو، کھو کھو اور بابا کھتی لون تیل جیسے دیسی کھیل تماشوں کی جگہ موبائل فون نے لے لی۔ رنگین ٹی وی اور کمپیوٹر عام ہونے لگے۔ اس کا اثر فیکے کے کاروبار پر بھی پڑا۔ محلے کا اسکول اپنی جگہ پر قائم رہا لیکن اب وہاں پڑھنے والے بچوں کے لیے فیکے کے کھیل تماشے پرانے ہو گئے تھے۔ اب وہ پانی کی بالٹی یا لاٹری کے چکر میں آنے والے نہیں تھے۔ جب میری پہلی ملازمت ہوئی تو فیکے سے اچھی خاصی سلام دعا ہو چکی تھی۔ بڑھاپے کا اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا اور چالیس پینتالیس ہی کا لگتا تھا۔ فیکے کے بچے جوان تھے اور کام پر لگے ہوئے تھے لیکن وہ اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے کبھی کبھار رنگ سفیدی کا کام کر لیتا یا پھر بسنت کے سیزن میں پتنگ فروشی کی دکان بھی سجا لیتا۔ ہر سال گرمیوں میں جب گھر والے کوئٹہ چلے جاتے تو وہ میری نگرانی میں گھر کی سفیدی کا کام کرتا اور پھر مجھے اس کے مزیدار قصے سننے کو ملتے۔ آج اس مضمون میں' میں جس دلچسپ واقعے کا ذکر کرنے جا رہا ہوں فیکے نے اس قصے کا ذکر بھی میرے گھر پر دوستوں کی محفل میں کیا۔ یہ شروع سردیوں کے دن تھے فیکے نے ہم دوستوں کے لیے مٹن کڑھائی تیار کی۔ کھانے کے بعد وہ چائے بنا لایا اور سگریٹ سلگا کر قریب ہی بیٹھ گیا۔

فیکے نے بتایا کہ ایک دفعہ چھوٹی عید سے دو دن پہلے وہ بہت پریشان تھا۔ دراصل عید کی وجہ سے مارکیٹ گرم تھی

اولمپکس اور ہاکی

اولمپکس دراصل ایک تحریک کا نام ہے اس کا آغاز 776 قبل مسیح میں یونان کے مقام اولمپیا سے ہوا اور اس کا سلسلہ 394ء تک جاری رہا۔ پھر زمانے نے کروٹ لی اور یونانیوں کی عظیم الشان سلطنت رومیوں کے قبضے میں آ گئی۔ 394ء میں رومی شہنشاہ تھیوڈوسیس اوّل نے ایک حکمنامہ جاری کیا جس کی رو سے ان کھیلوں پر پابندی عائد کر دی گئی پھر یہ کھیل تاریخ کا حصہ بن کر رہ گئے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں جب ماہرین آثار قدیمہ نے اولمپیا کے آثار دریافت کیے تو اولمپکس کھیلوں کے احیا کا خیال آیا۔ ایک فرانسیسی نوجوان بیرن پائرے دی کوبرتن کی کوششوں سے 1896ء میں اولمپکس کھیلوں کا دوبارہ آغاز کیا گیا جو جدید اولمپکس کہلاتے ہیں۔ جدید اولمپکس ہر چار سال بعد انتہائی پابندی سے منعقد کیے جاتے ہیں۔ 1912ء اور 1916ء میں پہلی جنگ عظیم اور 1940ء اور 1944ء میں دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے ان کھیلوں کا انعقاد ممکن نہیں ہو سکا۔ اولمپکس میں ہاکی کی شمولیت 1908ء میں ہوئی یہ مقابلے لندن میں 13 سے 25 جولائی تک ہوئے اور برطانیہ نے چیمپئن کا اعزاز حاصل کیا۔ 1920 میں 14 سے 29 اگست تک اینڈرپ (بیلجیم) میں ہونے والے اولمپکس مقابلوں میں بھی برطانیہ کی ٹیم ہی چیمپئن بنی کیونکہ 1912ء کے اولمپکس میں ہاکی شامل نہیں تھی۔ جب کہ 1916ء میں پہلی جنگ عظیم کی وجہ سے اولمپکس گیم منعقد ہی نہیں ہوئے تھے۔ 1924ء میں پیرس فرانس میں ہونے والے اولمپکس میں ہاکی کو شامل نہیں کیا گیا۔ 1928ء میں ایمسٹرڈیم (ہالینڈ) میں ہونے والے اولمپکس میں برصغیر کی مضبوط ہاکی ٹیم یعنی غیر منقسم ہندوستان نے پہلی مرتبہ شرکت کی اور پہلی ہی بار طلائی تمغہ جیت کر ایک سنہری دور کا آغاز کیا اس کے بعد 1960ء تک اولمپکس ہاکی میں بھارت ہی کا راج رہا۔ 1960ء کے روم اولمپکس میں پاکستان نے اپنی چوتھی اولمپکس شرکت ہی میں بھارت کی اس 32 سالہ برتری کا خاتمہ کر دیا۔ پاکستان پہلی مرتبہ اولمپکس چیمپئن بن کر ابھرا۔ 1948ء سے بھارت اور پاکستان ایک دوسرے کے سخت حریف رہے ہیں اور یہ کشمکش اب تک جاری ہے۔

مرسلہ: ندیم فاروقی، سیالکوٹ

اور چرس ناپید۔ پولیس نے بھی سختی کی ہوئی تھی۔ فیکے کے پاس پیسے تو تھے لیکن عید گزارنے کے لیے چرس کا کوٹہ بالکل نہیں تھا۔ خیر اس نے اِدھر اُدھر پتا کرایا اور اگلے دن شام کو سائیکل پر چرس لینے شہر کے نواحی علاقے کی طرف نکل پڑا۔ اندھیرا پھیلنے سے کچھ پہلے وہ چرس بیچنے والے استاد مندری کے خفیہ اڈے پر پہنچ گیا۔ فیکے نے استاد کے ایک کارندے سے مول تول کیا اور ادائیگی کر کے چرس کا ایک چھوٹا چھتر یعنی چپٹی ٹکیا لے کر باہر نکل آیا۔ اس وقت تک اندھیرا پھیل چکا تھا اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ فیکے نے سر پر اچھی طرح مفلر لپیٹا اور سائیکل پر سوار خوشی خوشی پیڈل گھمانے لگا۔ استاد مندری کے اڈے سے نکل کر وہ گلیوں گلیوں ہوتا پکی سڑک پر آ گیا۔ تاہم ابھی وہ سڑک پر کچھ دور ہی گیا تھا کہ اسے دو پولیس والے دکھائی دے گئے۔ ان کی سائیکل بھی قریب ہی کھڑی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے بید نما ڈنڈے تھے۔ ان میں ایک نے ٹارچ کی روشنی فیکے پر ڈالی جبکہ دوسرے نے ڈنڈے سے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ فیکے نے پیڈل الٹے گھماتے ہوئے سپاہیوں کی سائیکل کے قریب جا کر بریک لگائی اور جمپ لگا کر زمین پر اتر گیا۔

ایک جھٹکے سے سائیکل پچھلے اسٹینڈ پر کھڑی کی۔ سر سے مفلر اتار کر اسے سائیکل کے کیریئر پر رکھا اور کھٹاک سے سپاہیوں کو سیلوٹ دے مارا۔

''بس بس زیادہ اٹین شن ہونے کی ضرورت نہیں۔'' ٹارچ والے سپاہی نے کینہ توز نظروں سے فیکے کو گھورا۔ ''کہاں سے آ رہا ہے؟''

''وہ جی سرکار کو سلام کرنے حاضر ہوا تھا۔'' فیکے نے قریب واقع ایک مزار کا نام بتایا۔

''سلام کرنے آیا تھا یا چھتر لینے آیا تھا؟'' ٹارچ والے سپاہی نے گھور کر فیکے کو دیکھا۔

''توبہ توبہ کریں جی۔'' فیکے نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''میں بال بچے دار آدمی ہوں ان چکروں میں نہیں پڑتا۔''

''اوے ہم تو بندے کی شکل دیکھ کر اس کے کرتوت جان لیتے ہیں۔'' ٹارچ والے سپاہی نے اپنے ساتھی کو فیکے کی تلاشی لینے کا حکم دیا۔ ''سچ سچ بتادے کیا ہے تیرے پاس؟''

''سرکار، غریب کے پاس اس کھٹارا سائیکل کے سوا اور کچھ نہیں۔'' فیکے نے انتہائی مسکین لہجے میں جواب دیا۔ اس نے ابھی تک سیلیوٹ کا انداز برقرار رکھا تھا۔ ٹارچ والے سپاہی نے روشنی فیکے پر ڈالے رکھی جبکہ اس کے ہٹے کٹے ساتھی نے اپنی بید نما چھڑی فیکے کی سائیکل کے ساتھ ٹکائی اور تلاشی کا کام شروع کر دیا۔ فیکا سمجھ گیا کہ آج سپاٹے (سپاہی) عیدی کے چکر میں ہیں اور اسے نہیں چھوڑیں گے۔ اس نے دل ہی دل میں استاد مندری کو ایک موٹی سی گالی دی جس کے کسی کارندے نے گھات لگائے سپاہیوں کو اس کی مخبری کر دی تھی۔ تلاشی لینے والے سپاہی نے فیکے کے سر سے کام شروع کیا۔ بغلوں میں ہاتھ پھیرے، سوئٹر اتروا کے دیکھا، جیبیں ٹٹولیں، آستینیں کھول کر چیک کیں، کمر پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

''سچ بتادے چرس کہاں چھپائی ہے؟'' تلاشی لیتے سپاہی نے فیکے کے نیفے کو ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

سپاہیوں کے تیور بتا رہے تھے کہ آج کسی ایک فریق کی عید کالی ہونا طے تھا۔ فیکا دل ہی دل میں آلتو جلالتو پڑھتا رہا۔ ادھر تلاشی لینے والا سپاہی اب الجھن کا شکار تھا۔ اس نے سر سے پیر تک فیکے کو کھنگال کر رکھ دیا۔ لیکن چرس تو ایک طرف وہاں ماچس کی تیلی بھی برآمد نہیں ہوئی۔

''تو کیا تمہارے پاس چرس نہیں تھی؟'' میرا دوست شہزاد علی چپ نہ رہ سکا اور اس نے فیکے کو ٹوک ہی دیا۔

''تھی سر بالکل تھی۔'' فیکے نے سگریٹ کا لمبا کش لگایا۔ ''بس یوں سمجھ لیں قانون اندھا ہو گیا تھا۔''

دونوں سپاہی ایک ٹک فیکے کو گھور رہے تھے جو مسلسل ہاتھ اوپر کیے مسکینوں کی طرح کھڑا تھا۔ سپاہی نے اس کی تلاشی کے بعد اس کی سائیکل کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔ ایک سپاہی نے ٹارچ کی روشنی سائیکل پر مرکوز رکھی جبکہ دوسرے نے سائیکل کی گدی، کیریئر اگلے پچھلے دونوں مڈگارڈ، اور چمٹے کی اچھی طرح چھان پھٹک کی۔ دونوں ہینڈلز کے کور اتار کر چیک کیے۔ ٹائروں کا باریک بینی سے جائزہ لیا کہ کہیں کوئی نشان دکھائی دے جائے۔ لیکن اس کے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔

''کچھ بھی نہیں ہے سر جی۔'' ہٹے کٹے سپاہی نے گردن نفی میں ہلا کر ٹارچ والے سپاہی سے کہا۔

''تم روشنی کرو، میں تلاشی لیتا ہوں۔'' ٹارچ والے سپاہی نے ٹارچ اپنے ساتھی کو پکڑائی اور کڑے تیوروں کے ساتھ آگے بڑھا فیکے نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے اور نئے سرے سے تلاشی دینے کے لیے اٹین شن ہو گیا۔ اب کی بار دوسرے سپاہی نے فیکے کی خوب اچھی طرح چھان بین کی۔ ایک بار پھر سائیکل کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔ تاہم اس کی تسلی نہ ہوئی۔ اس

نے سر کھجاتے ہوئے فیکے کو گھور کر دیکھا اور اسے کپڑے اتارنے کا حکم دیا۔ فیکے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پہلے قمیص اور پھر شلوار اتار کر سائیکل کے کیرئیر پر رکھ دی۔ دونوں سپاہیوں نے آگے پیچھے گھوم کر فیکے کا اچھی طرح معائنہ کیا اور اسے کپڑے پہننے کا حکم دیا۔

''اوے کوئی آنا ٹکا بھی تیرے پاس نہیں ہے تو یہ کیا چیز؟'' سپاہی نے زچ ہو کر فیکے کو دیکھا۔ ''ہمیں دیکھ کر کہیں راستے میں تو چرس نہیں پھینک دی۔''

''سر جی اگر پھینک دی ہے تو دوبارہ اٹھانے گیا تو پکڑا جاؤں گا۔'' فیکے نے اپنے تئیں بڑے پتے کی بات کی۔

''ہوں۔'' سپاہی نے ایک لمبا سانس کھینچا۔ ''جا بیٹا عید منا تیری قسمت اچھی ہے۔''

روشنی کررہے سپاہی نے ٹارچ اپنے انچارج کو پکڑائی۔ عین اس وقت فیکے نے مفلر اٹھا کر سر پر رکھا، سائیکل کو اسٹینڈ سے گھسیٹا اور جمپ لگا کر اس پر بیٹھ گیا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ تیز تیز پیڈل گھمائے اور ان سے دور نکل آیا۔

''اگر چرس تمہارے پاس تھی تو تم نے اسے چھپایا کہاں تھا؟'' میں نے فیکے سے سوال کیا۔

''سر جی مال تو مفلر میں تھا۔'' فیکے نے سگریٹ بجھا کر پرے پھینکی اور بولا۔ ''میں نے استاد مندری کے اڈے سے نکلتے ہی پچاس کے نوٹ میں چرس لپیٹ کر مفلر کے ایک سرے پر رکھی اور اسے اچھی طرح سر پر لپیٹ لیا تھا۔ جب میں سپاٹوں کے قریب جا کر سائیکل سے اترا تو میں نے مفلر اتار کر سائیکل کے کیرئیر پر رکھ دیا۔''

''لیکن جب سپاہیوں نے سائیکل کی تلاشی شروع کی تو انھیں مفلر دکھائی نہیں دیا؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''سر جی بتایا تو ہے قانون اندھا ہو گیا تھا۔'' فیکے نے سگریٹ کا ایک کش لیا اور بولا ''ان کی مفلر پر نظر ہی نہیں پڑی۔''

''بھئی وہ کیسے؟'' شہزاد نے پوچھا۔ ''سائیکل پر رکھا مفلر جادو سے غائب ہو گیا تھا کیا؟''

''سر وہ جادو سے نہیں ہاتھ کی صفائی سے غائب ہو گیا تھا۔'' فیکے نے جواب دیا۔ ''آپ نے اسکولوں میں دیسی جادوگروں کے تماشے دیکھے ہوں گے۔ ان کے پاس جادو شادو کچھ نہیں ہوتا۔ وہ غیر متعلقہ حرکتیں کر کے دیکھنے والے کی توجہ ہٹا دیتے ہیں اور اپنا کام صفائی سے کر جاتے ہیں۔''

''تم نے ہاتھ کی صفائی کب اور کیسے دکھائی؟'' میں نے پوچھا۔

''جب انھوں نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا تو میں نے جان بوجھ کر ان کے قریب جا کر زور سے بریک لگائی اور عین سپاٹوں کے سر پر پہنچ کر جمپ لگا دیا۔ وہ چونک کر پیچھے ہٹے، ٹارچ کی روشنی سائیکل کے پہیوں پر گئی..... بس اسی لمحے میں نے ہاتھ کی صفائی دکھائی۔'' فیکا سانس لینے کے لیے رکا اور پھر بولا۔

''میں نے پھرتی سے مفلر اتارا اور سائیکل کے کیرئیر پر رکھ دیا اپنے تئیں ان کی سائیکل پر۔ باقی کام تقدیر اور اندھیرے نے کیا۔''

''تو تم نے قانون کو بیوقوف بنا دیا۔'' شہزاد نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں سر جی۔'' فیکے نے جواب دیا ''دراصل میرے مرشد کی دعا سے وہ اندھے ہو گئے تھے۔''

''فیکے تم بوڑھے ہو گئے ہو اب تو نشہ چھوڑ دو۔''

''سر جی، چرس سے کچھ نہیں ہوتا۔'' فیکا بولا۔ ''اگر آپ نے کسی سے دشمنی کرنی ہے تو اسے پڑی (ہیروئن) پر لگا دیں وہ خطرناک چیز ہے۔''

کچھ عرصے بعد میں نے پرانا محلہ چھوڑ دیا۔ پرانے لوگوں سے ملنا جلنا کم ہو گیا۔ اس دوران پتا چلا کہ فیکا بیمار ہو کر اسپتال داخل ہے۔ اس سے ملے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ میں تیمارداری کے لیے اس کے پاس جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دن خبر ملی کہ فیکا فوت ہو گیا ہے۔ کمزور تو وہ تھا لیکن بظاہر بھلا چنگا دکھائی دیتا تھا۔ مجھے یہ سن کر افسوس بلکہ حیرانی ہوئی کہ آخری دنوں میں وہ ہیروئن کا نشہ کرنے لگا تھا۔ شہزاد نے بتایا کہ کسی دوست نے اسے مذاق ہی مذاق میں پڑی سونگھنے کا چیلنج کیا۔ اس نے فیکے سے شرط لگائی کہ اگر وہ ایک بار پڑی سونگھ لے گا تو اس کا رسیا ہو جائے گا۔ فیکا سکا بند چرسی تھا اور ہیروئن سے دور بھاگتا تھا۔ لیکن وہ دوست کے بہکاوے میں آ گیا۔ پانچ سو روپے کی شرط لگ گئی اور فیکے نے زندگی میں پہلی بار سگریٹ کی پنی پر سفید پاؤڈر رکھ کر اس کا نشہ کیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ شرط ہار گیا اور پھر ہیروئن ہی کا ہو کر رہ گیا۔ وہ ہیروئن چھوڑنے کے لیے ایک ادارے میں بھی داخل رہا لیکن بات نہیں بنی۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتا تھا کہ اگر کسی سے دشمنی کرنی ہو تو اسے پڑی پر لگا دو۔



بڑا آدمی

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
یہ میرے ایک دوست کی سرگزشت ہے جسے میں کہانی کے انداز میں لکھ رہا ہوں تاکہ لوگ سبق حاصل کریں۔لڑکیوں کے التفات کا غلط مطلب نہ لیں۔

زاہد شاہ
(لاہور)



میں اپنے گاؤں کا پہلا لڑکا تھا جس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اس سے پہلے کوئی بھی لڑکا پانچویں سے آگے نہ پڑھ سکا اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ گاؤں کا اسکول ہی پرائمری تک تھا۔ اور دوسری وجہ یہ کہ زیادہ تر بچے پانچویں تک بھی مشکل سے ہی پہنچ پاتے اور دو تین جماعتیں پڑھ کر ہی چھوڑ دیتے۔ وہاں کے رہنے والے زیادہ تر بڑے چوہدری یعنی زمیندار کے کھیتوں پر مزدوری کرتے۔ اور باقی لوگ اپنے آبائی پیشوں سے منسلک تھے۔ ان میں کوئی نائی تھا کوئی موچی کوئی کمہار کوئی درزی اور ان سب کی ہی خواہش ہوتی کہ بچہ ذرا بڑا ہو تو وہ اسے اپنے ساتھ کام پر لگا لیں۔ اس طرح گھر میں ایک کمانے والے کا اضافہ ہو جائے گا۔

میری سوچ ان سب سے مختلف تھی۔ بچپن ہی میں بڑا آدمی بننے کی دھن سوار ہو گئی لیکن میرے ذہن میں بڑے آدمی کا کوئی واضح تصور نہیں تھا۔ میں صرف اس شخص کو بڑا آدمی سمجھتا تھا جو قیمتی لباس پہنتا ہو، اچھا کھاتا ہو، گاڑی میں گھومتا ہو اور اس کے آگے پیچھے نوکروں کی فوج ہو۔ اس معیار پر ہمارے گاؤں کے بڑے چوہدری صاحب ہی پورا اترتے تھے چنانچہ میں انہیں ہی بڑا آدمی سمجھتا تھا ایک دن یوں ہوا کہ کچھ سرکاری لوگ ہمارے گاؤں میں آئے۔ وہ میرے چوہدری کی حویلی گئے اور کافی دیر وہاں رہے انہوں نے دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھایا پھر میں نے دیکھا کہ چوہدری خود ان لوگوں کو حویلی کے گیٹ تک چھوڑنے آیا۔ اس کے پیچھے کئی نوکر سروں پر تھال اٹھائے چل رہے تھے انہوں نے وہ تھال ایک گاڑی میں رکھے۔ ان مہمانوں میں ایک شخص سب سے نمایاں تھا۔ اس نے سفید بش شرٹ، سیاہ پتلون، سیاہ چشمہ اور سفید ہیٹ پہن رکھا تھا۔

چوہدری نے جھک کر اس سے مصافحہ کیا اور جب وہ گاڑی میں بیٹھا تھا تو زمیندار سمیت سب لوگ اسے سیلوٹ کرنے لگے۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ وہ چوہدری اور تھانے دار سے بھی بڑا آدمی ہے۔ میں نے دوسرے دن ماسٹر صاحب سے پوچھا وہ آدمی کون تھا جسے سب لوگ جھک جھک کر سلام کر رہے تھے اور تھانے دار نے بھی اسے سیلوٹ کیا تھا۔

''ارے تم نہیں جانتے؟'' ماسٹر صاحب میری پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے۔ ''وہ یہاں کے ڈپٹی کمشنر ہیں۔ اس علاقے کا حاکم۔''

اس وقت تک میں چوہدری صاحب کو ہی گاؤں کا حاکم سمجھتا تھا کیونکہ وہاں کی آدھی سے زیادہ آبادی ان کی زمینوں پر کام کرتی تھی۔ ان ہی کی چوپال میں گاؤں والوں کی قسمت کے فیصلے ہوتے تھے اور ان کی مرضی کے بغیر کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا لیکن اب معلوم ہوا کہ ڈپٹی کمشنر ان سے بھی بڑا حاکم ہے میں نے ماسٹر صاحب سے پوچھا کہ ڈپٹی کمشنر بننے کے لیے کیا کرنا پڑتا ہے۔

ماسٹر صاحب میری بات سن کر ہنس دیے اور بولے۔ ''یہ تمہارے بس کی بات نہیں اس کے لیے بہت پڑھنا پڑتا ہے۔ کم از کم چودہ جماعتیں۔ اس کے بعد مقابلے

کا امتحان ہوتا ہے تب کہیں جا کر افسری ملتی ہے۔''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ یہ واقعی میرے بس کی بات نہیں تھی کیونکہ گاؤں کا اسکول صرف پانچویں تک تھا اس سے آگے پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چودھویں تو بہت دور کی بات تھی۔

ماسٹر صاحب نے مجھے سوچوں میں گم دیکھا تو مسکراتے ہوئے بولے۔ ''آگے پڑھنا چاہتے ہو؟''

میں نے جھٹ اثبات میں سر ہلا دیا تو انہوں نے فوراً ایک محاورا پڑھا۔ ''نیت صاف منزل آسان۔ میں شام کو گاؤں آؤں گا تمہارے باپ سے بات کرنے۔''

اگر بابا مان بھی جاتے تو سب سے بڑا مسئلہ اسکول جانے کا تھا جو گاؤں سے چند کوس کے فاصلے پر نزدیکی قصبے میں واقع تھا۔ ہمارے پاس اپنی کوئی سواری نہیں تھی جس کے ذریعے میں اسکول جاتا۔ صبح کے وقت ایک لاری ہمارے گاؤں کے پاس سے گزرتی تھی لیکن اس کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا اور میں یہ ہی سوچ رہا تھا کہ اگر.... آمدو رفت کا مسئلہ حل نہیں ہوا تو میں کبھی بھی ہائی اسکول میں داخلہ نہیں لے سکوں گا۔

ماسٹر صاحب وعدے کے مطابق شام کو بابا سے ملنے آئے۔ تایا غلام محمد بھی موجود تھے ان کی بیٹی رضیہ میری بچپن کی منگ تھی۔ جب ماسٹر صاحب نے بابا سے پوچھا کہ انہوں نے میرے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے تو وہ ایک سرد آہ بھرتے ہوئے بولے۔ ''میری تو خواہش تھی کہ اسے آگے پڑھاؤں لیکن مجبوری ہے۔ گاؤں میں بڑا اسکول ہی نہیں ہے۔''

''پھر کیا ہوا۔ قصبے کے اسکول میں داخل کرادو۔'' ماسٹر صاحب نے مشورہ دیا۔

''سواری کا مسئلہ ہوگا۔ اتنی دور وہ پیدل نہیں جاسکتا۔'' بابا بولے۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ صبح شیدے کا ریڑھا قصبے کی منڈی تک جاتا ہے۔ میں اس سے بات کرلوں گا واپسی میں لاری سے آجائے گا۔ لاری اڈا اسکول سے زیادہ دور نہیں ہے۔''

تایا جی نے اس تجویز کی پُرزور مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ بچہ بہت چھوٹا ہے۔ اسے اتنی دور بھیجنا مناسب نہیں لیکن میں نے ضد کی تو اماں بھی میری حمایت میں بول



پڑیں۔ بابا تو پہلے ہی میری پڑھائی جاری رکھنے کے حق میں تھے۔ لہٰذا طے پایا کہ ماسٹر صاحب بھی اپنے ساتھ اسکول لے کر جائیں گے۔ میرا داخلہ کروانا اور ریڑھے والے سے بات کرنے کی ذمہ داری بھی انہی کو سونپ دی گئی۔

میری دیکھا دیکھی گاؤں کے تین چار لڑکے اور بھی چھٹی جماعت میں داخلہ لینے کے لیے تیار ہو گئے۔

ماسٹر صاحب ہم سب کو لے کر قصبے کے ہائی اسکول گئے اور ہمارا داخلہ کروا دیا۔ اب ہم پانچوں لڑکے ایک ساتھ ہی اسکول جاتے اور ساتھ ہی واپس آتے۔ اس طرح میرے اکیلے آنے جانے کا مسئلہ حل ہو گیا۔ البتہ تایا جی کی ناراضگی اپنی جگہ برقرار تھی۔ ان کا خیال تھا کہ میں محض اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں اس سے تو بہتر ہے باپ کے ساتھ کھیتوں میں کام کر کے ان کا ہاتھ بٹاؤں تاکہ گھر کی آمدنی میں اضافہ ہو اور مستقبل کے اخراجات پورے ہو سکیں۔

آٹھویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے سب لڑکے میرا ساتھ چھوڑ گئے۔ ان میں سے ایک کو اس کا چچا اپنے ساتھ شہر لے گیا۔ وہ کسی گیراج میں موٹر مکینک تھا اس نے بھتیجے کو بھی کام سکھانے کے لیے اپنے ساتھ لگا لیا۔ دوسرے کو اس کے باپ نے گاؤں میں ہی پرچون کی دکان کھلوا دی اور تیسرا چودھری کے کھیتوں میں کام کرنے لگا۔ یہ سب معاشی مسائل کے شکار تھے اس لیے انہیں گھر کا بوجھ بانٹنے کے لیے پڑھائی ترک کرنا پڑی۔ حالات تو ہمارے بھی اچھے نہ تھے لیکن میرے والدین نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ اپنا تن پیٹ کاٹ کر مجھے آگے پڑھائیں گے۔

میں دل لگا کر پڑھ رہا تھا کیونکہ مجھ پر بڑا آدمی بننے کی دھن سوار تھی۔ اسکول سے واپس آ کر کھانا کھاتا اور ہوم ورک کرنے بیٹھ جاتا۔ عصر اور مغرب کے درمیان گاؤں کے میدان میں لڑکوں کے ساتھ فٹ بال کھیلتا اور رات کو پھر پڑھنے بیٹھ جاتا۔ میرا شمار کلاس کے ذہین طالب علموں میں ہوتا تھا۔ ہر ٹیسٹ میں سب سے زیادہ نمبر میرے ہی آتے۔ اسی طرح نویں جماعت میں بھی اپنی کلاس میں ٹاپ کیا اور میٹرک میں بھی اچھے نمبروں سے پاس ہوا۔

میرے پاس ہونے کی خبر گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور جشن کا سا سماں ہو گیا۔ گاؤں کے سبھی مرد، عورتیں اور بچے جوق در جوق ہمارے گھر آ رہے تھے۔ ہمارے گھر کے باہر بہت بڑا احاطہ تھا۔ بابا نے وہیں چارپائیاں ڈال دی تھیں۔ ایک کونے میں حلوائی نے اپنا اڈا بنا رکھا تھا اور تازہ تازہ لڈو مہمانوں میں تقسیم کیے جا رہے تھے۔ اور اندر زنان خانے میں میری ماں عورتوں کی جھرمٹ میں بیٹھی مبارک بادیں وصول کر رہی تھی۔

جب مہمان رخصت ہو گئے تو بابا نے مٹھائی کا ٹوکرا بنوایا اور مجھے ساتھ لے کر چوہدری کی حویلی کی جانب چل دیئے۔ شام کا وقت اور چوہدری اپنے مصاحبوں کے ساتھ محفل سجائے بیٹھا ہوا تھا۔ بابا نے اسے سلام کیا۔ میں نے تقلید کی لیکن چوہدری نے ہمارے سلام کا جواب نہیں دیا اور ہم دونوں مسکین صورت بنائے ایک طرف کھڑے ہو گئے کافی دیر بعد چوہدری کو کچھ خیال آیا۔ اس نے بابا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی شرفو فرصت مل گئی تجھے یہاں آنے کی؟''

بابا کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''سرکار میں تو صبح ہی آنا چاہ رہا تھا لیکن ایک کے بعد ایک لوگ چلے آ رہے تھے۔ اس لیے آنے میں دیر ہو گئی۔''

''اچھا خیر جانے دے، میں تیری خوشی خراب نہیں کرنا چاہتا ورنہ تجھے اس گستاخی کا مزہ چکھا دیتا۔ آئندہ خیال رکھنا۔'' یہ کہہ کر اس نے ملازموں کو اشارہ کیا کہ وہ مٹھائی کا ٹوکرا اندر لے جائیں۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''کیوں جوان اب تیرا کیا ارادہ ہے۔ تو تو پڑھ لکھ گیا ہے۔ کھیتوں میں کام کرنے کے قابل تو نہیں رہا۔ ایسا کر تو میری زمینوں کا حساب کتاب دیکھ لیا کر۔ منشی تو اب بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس سے ٹھیک طرح کام نہیں ہوتا۔''

میں نے ایک نظر بابا کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ''چوہدری صاحب میں آگے پڑھنا چاہتا ہوں۔''

یہ سنتے ہی چوہدری کا پارہ ہائی ہو گیا۔ وہ غصے سے بولا۔ ''کیا کرے گا آگے پڑھ کر۔ لاٹ صاحب تو بننے سے رہا۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ قسمت میں کیا لکھا ہے لیکن مجھے اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے۔ مجھے اجازت دیں کہ میں اپنی خواہش پوری کروں۔''

''اچھا بھئی جیسے تیری مرضی۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''تو اپنا شوق پورا کر لے۔ لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا کہ تیرا باپ ایک غریب مزارع ہے وہ تیری پڑھائی کا خرچ برداشت نہیں کر سکتا۔''

''میں کرلوں گا کوئی بندوبست۔'' میں نے سر جھکاتے

ہوئے کہا۔ ”اللہ مالک ہے۔“

گھر آکر بابا نے مجھے بہت ڈانٹا۔ ”کیا ضرورت تھی چوہدری کے سامنے زبان چلانے کی۔ تو جانتا نہیں کہ وہ مالک ہے اور ہم اس کی رعایا۔ اس کی زمین پر رہتے ہیں۔ اس کا دیا کھاتے ہیں۔ اس لیے وہ جو کہے چپ چاپ سن لو۔“

اس سے پہلے کہ میں بابا کو جواب دیتا۔ میرا پرانا دوست عبدالرزاق آگیا جسے اس کا چچا مکینک کا کام سکھانے اپنے ساتھ لاہور لے گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ خود بھی مکینک بن گیا ہے اور چچا کے ساتھ اس کی ورکشاپ میں کام کررہا ہے۔ اس نے مجھے مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔ ”اب کیا ارادے ہیں شہزادے؟“

میں نے مرجھائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ارادے کیا ہو سکتے ہیں۔ دل تو بہت چاہ رہا ہے کہ آگے پڑھوں لیکن کوئی سلسلہ نہیں بن رہا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”کیسا سلسلہ؟“

”دیکھو نا۔ یہاں قریب کے کسی قصبے میں تو کوئی کالج نہیں ہے اس کے لیے لاہور جانا پڑے گا۔ وہاں ہمارا کوئی عزیز رشتے دار نہیں ہے۔ ہماری اتنی حیثیت نہیں کہ ہاسٹل کے اخراجات برداشت کرسکیں۔“

”اگر تمہاری رہائش کا مسئلہ حل ہوجائے تو......“

”کیا تمہاری نظر میں کوئی جگہ ہے؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”ہاں میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ جب تک تمہاری رہائش کا بندوبست نہیں ہوجاتا تم میرے ساتھ رہو گے۔ چچا کے گھر میں اتنی گنجائش ہے کہ ایک چارپائی کی جگہ نکل آئے گی۔“

”نہیں یار انہیں تکلیف ہوگی۔“

”کوئی تکلیف نہیں ہوگی بلکہ وہ تو خوش ہوں گے کہ ہمارے گاؤں کا ایک ہونہار لڑکا ان کا مہمان ہے۔“

”پہلے ان سے پوچھ تو لو۔“

”پوچھنا کیا ہے۔ میں انہیں بتادوں گا کہ کچھ عرصے تم ہمارے ساتھ رہو گے۔“

وہ ایک ہفتے کے لیے گاؤں آیا ہے جانے سے پہلے اس نے مجھے اپنے چچا کے گھر کا پتا اور فون نمبر دے دیا اور تاکید کردی کہ لاہور آنے سے پہلے میں اسے اطلاع کردوں تاکہ وہ مجھے اسٹیشن لینے آجائے۔ میں نے جب گھر والوں کو اپنے پروگرام کے بارے میں بتایا تو وہ پریشان ہوگئے۔ ابا کو یہ فکر تھی کہ میں اپنے اخراجات کیسے پورے کروں گا تو ماں اس غم میں گھلی جارہی تھی کہ پردیس میں میرے کھانے پینے کا کیا بندوبست ہوگا۔ سب سے زیادہ مخالفت تایا جی اور رضیہ کی جانب سے ہورہی تھی۔ تایا کا خیال تھا کہ مجھے لاہور جانے کے بجائے چوہدری کے یہاں منشی کی ملازمت کرلینی چاہیے جب کہ رضیہ مجھے اپنی نظروں سے دور نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے ان سب لوگوں کو کسی نہ کسی طرح مطمئن کیا اور جیسے ہی کالجوں میں داخلے شروع ہوئے۔ میں ٹرین کے ذریعے لاہور کے لیے روانہ ہوگیا۔

میں نے عبدالرزاق کو اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ اس لیے وہ مجھے لینے کے لیے اسٹیشن آگیا تھا۔ وہ مجھے ٹیکسی میں بٹھا کر مزنگ چوک لے گیا۔ جہاں اس کے چچا رہتے تھے وہ اس وقت گیراج پر تھے۔ عبدالرزاق نے اپنے کمرے میں ہی میرے لیے بستر لگا دیا تھا۔ یہ کمرا بالکل الگ تھلگ تھا۔ اس کا ایک دروازہ باہر گلی کی طرف اور دوسرا گھر کے اندر کھلتا تھا۔ عبدالرزاق نے میرا منہ ہاتھ دھلوایا۔ میں ابھی لباس تبدیل کر کے بیٹھا ہی تھا کہ اندرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ عبدالرزاق نے دروازہ کھولا اور ہاتھ بڑھا کر ٹرے پکڑ لی۔ اس نے ٹرے میز پر رکھی اور بولا۔ ”شروع ہوجاؤ بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔“

مجھے بڑی شرم آرہی تھی۔ اس کے چچا کا کیا یہ ہی احسان کم تھا کہ مجھے یہاں رہنے کے لیے جگہ دے دی۔ اور اب کھانا بھی آگیا تھا۔ میں نے جی کڑا کر کے عبدالرزاق سے کہا۔ ”آج تو خیر پہلا دن ہے اس لیے میں کچھ نہیں کہہ رہا لیکن میں کل سے کھانا باہر کھاؤں گا۔ میں کسی پر بوجھ بننا نہیں چاہتا۔“

”یہ بات تم خود چچا سے کہنا وہ ہی تمہیں اس کا جواب دیں گے۔“

”کیوں میں نے کوئی غلط بات کہہ دی؟“

”سو فیصد غلط۔ یہ کہہ سکتا ہے کہ اپنا گھر ہوتے ہوئے تم باہر کھانا کھاؤ۔ آئندہ ایسی بات منہ سے نہ نکالنا ورنہ تمہارا سامان نکال کر گلی میں پھینک دوں گا۔“

یہ پیار بھری دھمکی سننے کے بعد میرے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی لیکن میں نے اسی وقت تہیہ کرلیا کہ جتنی جلد ہوسکا میں ہوسٹل چلا جاؤں گا۔ مجھے کسی کا احسان لینا گوارا

نہیں تھا۔

کھانا ختم کرنے کے بعد عبدالرزاق نے پانی سے بھرا جگ اور گلاس لا کر رکھ دیا اور بولا۔ ”اچھا یار تم آرام کرو میں گیراج میں جا رہا ہوں۔ اب شام کو ملاقات ہوگی۔“

اس کے جانے کے بعد میں ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا اور فوراً ہی میری آنکھ لگ گئی۔ کافی دیر سوتا رہا پانچ بجے کے قریب نیند سے بیدار ہوا تو چند منٹ بعد ہی اندرونی دروازہ پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک ماہ لقا دونوں ہاتھوں میں ٹرے پکڑے کھڑی تھی۔ اس نے بڑے دل نشین انداز میں مجھے سلام کیا اور بولی۔ ”چائے لے لیجیے۔“

میں نے ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیا وہ خرامہ خرامہ چلتی ہوئی اندر آئی اور تپائی پر ٹرے رکھتے ہوئے بولی۔ ”میں عبدالرزاق کی چچا زاد بہن سیما ہوں۔ بہن بھائیوں میں میرا نمبر تیسرا ہے مجھ سے بڑے دو بھائی اور ایک چھوٹی بہن ہے۔“

یہ کہہ کر وہ جانے لگی۔ پھر دروازے پر رک کر بولی۔ ”کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلاتکلف آواز دے لیں۔ یہ آپ کا اپنا ہی گھر ہے۔“

اس کے جانے کے بعد کمرا خالی خالی لگنے لگا۔ لیکن اس کے بارے میں کوئی غلط سوچ میرے دل میں نہیں آئی۔ کیونکہ وہ میرے دوست کی منگیتر تھی اور عبدالرزاق مجھے بتا چکا تھا کہ وہ ابھی پڑھ رہی ہے اور چچا کی خواہش ہے کہ وہ گریجویشن کرے۔ تب اس کی شادی کی جائے گی۔

شام کو عبدالرزاق اور اس کے چچا ایک ساتھ ہی گھر آئے۔ ہم نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اس کے چچا کا نام محمد رمضان تھا۔ وہ بڑے ہنس مکھ اور زندہ دل انسان تھے۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بولے۔ ”تم نے ہمارا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ خوب دل لگا کر پڑھو اور گاؤں کے لڑکوں کے لیے مثال بن جاؤ۔ ہم تمہاری ہر طرح سے مدد کریں گے۔“

”چاچا جی آپ کی بڑی مہربانی۔“ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”لیکن میں آپ پر بوجھ بننا نہیں چاہتا۔ جیسے ہی کوئی بندوبست ہوا میں ہاسٹل چلا جاؤں گا۔“

”تم کہیں نہیں جاؤ گے۔“ انہوں نے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔

”یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ جب تک دل چاہے یہاں رہ سکتے ہو۔“

دوسرے دن کالج گیا اور فارم لے کر اسی وقت جمع کروا دیا۔ میرے میٹرک میں بہت اچھے نمبر آئے تھے اس لیے آسانی سے داخلہ ہو گیا۔ اس طرف سے اطمینان ہونے کے بعد میں نے پارٹ ٹائم جاب کی تلاش شروع کر دی لیکن کامیابی نہیں ہوئی تو میں نے محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دی۔ اس سے مجھے اتنی آمدنی ہونے لگی کہ اگلے سیمسٹر کی فیس دینے کے قابل ہو گیا لیکن میں نے کام کی تلاش جاری رکھی تاکہ اتنے پیسے ملنے لگیں کہ میں ہاسٹل کے اخراجات برداشت کر سکوں۔

ایک دن میں کالج سے چھٹی کے بعد گھر جانے کے لیے بس اسٹاپ کی طرف جا رہا تھا کہ کچھ فاصلے پر مجھے سڑک کے کنارے ایک کار کھڑی نظر آئی۔ ایک لڑکی پریشانی کے عالم میں ہاتھ ہلا کر گاڑیوں کو رکنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ میں نے قریب جا کے دیکھا تو وہ میری کلاس فیلو تھی۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے لیکن کبھی بات کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور بولی۔ ”اچھا ہوا آپ آ گئے۔ پلیز میری مدد کریں۔“

”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”ٹائر پنچر ہو گیا ہے۔ کئی گاڑیوں کو ہاتھ دے چکی ہوں لیکن کوئی نہیں رکا۔“ گو کہ میں نے بھی کبھی ٹائر نہیں بدلا تھا لیکن چچا کے گیراج پر لڑکوں کو ٹائر بدلتے دیکھا تھا پھر بھی میں نے احتیاطاً کہہ دیا۔ ”میں کوشش کرتا ہوں آپ گائیڈ کرتی رہیں۔“

اس نے کار کی ڈگی کھولی۔ میں نے دوسرا ٹائر، جیک اور پانا نکالا اور پانچ منٹ میں ٹائر تبدیل کر دیا وہ بہت خوش ہوئی اور بولی۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ اس وقت آپ نے میرا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا۔“

”کوئی بات نہیں آپ کی جگہ کوئی اور خاتون ہوتیں تب بھی میں یہی کرتا۔ آپ تو میری کلاس فیلو ہیں۔“

”چلیں میں آپ کو چھوڑ دوں۔“

میرے منع کرنے کے بعد بھی اس نے اصرار کر کے مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا لیا۔ وہ گلبرک میں رہتی تھی اگر وہ

مجھے مزنگ چھوڑنے جاتی تو اسے بہت دور پڑتا۔ میں اسے کہتا رہا کہ راستے میں کہیں اتار دے لیکن وہ بضد تھی کہ وہ مجھے گھر پر ہی چھوڑے گی۔ میں نے اترتے وقت تاکید کی کہ دوبارہ گاڑی چلانے سے پہلے ٹائر میں پنچر ضرور لگوالیں۔

دوسرے دن خالی پیریڈ میں وہ میرے پاس آئی اور مجھے اپنے ساتھ کینٹین لے گئی اس نے مجھے کچھ پوچھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس وقت کینٹین میں زیادہ رش نہیں تھا اس نے الگ تھلگ گوشہ منتخب کیا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں عام طور پر لڑکوں سے بے تکلف نہیں ہوتی لیکن کل آپ نے جس طرح میری مدد کی اس کا تقاضا ہے کہ میں آپ کو اچھی سی چائے پلاؤں۔''

''بڑی مہربانی کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔'' میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔

''آپ واقعی اس قابل ہیں کہ آپ سے دوستی کی جائے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''کیونکہ آپ دوسرے لڑکوں سے بہت مختلف ہیں۔ کم گو، محنتی اور اپنی دنیا میں مگن رہنے والے۔ مجھے ایسے لوگ بہت پسند ہیں۔''

''اوہ! آپ نے تو مجھ پر اچھی خاصی ریسرچ کر رکھی ہے۔''

''یہ صرف میرا مشاہدہ ہے ورنہ میں تو آپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔''

''جان کر کیا کریں گی۔ میرا کوئی ایسا پرکشش بیک گراؤنڈ نہیں ہے۔''

''پھر بھی کچھ تو بتائیں۔''

''آپ اصرار کر رہی ہیں تو بتا دیتا ہوں۔ میرا باپ ایک غریب مزارع ہے جو زمیندار کے کھیتوں میں مزدوری کر کے اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پال رہا ہے۔ زمیندار ہمیں صرف اتنا دیتا ہے کہ جس سے جسم و جان کا رشتہ برقرار رہ سکے۔ ہمارے گاؤں میں بہت غربت ہے اور لوگ اپنے بچوں کو پڑھانے کے بجائے کم عمر میں ہی کمانے کے لیے لگا دیتے ہیں۔ میں اپنے گاؤں کا واحد فرد ہوں جو میٹرک کرنے کے بعد آگے پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں ایک جاننے والے کے گھر میں رہتا ہوں اور ٹیوشن کر کے اپنے تعلیمی اخراجات پورے کر رہا ہوں۔''

''اوہ یو آر گریٹ۔'' وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''اب تو میرے دل میں تمہاری قدر اور بڑھ گئی ہے۔'' وہ آپ سے تم پر آ گئی تھی۔ میں نے بھی اس کے لیے یہ ہی صیغہ استعمال کیا۔

''اب تم اپنے بارے میں بتا دو۔'' وہ کچھ شرماتے ہوئے بولی۔

''ڈیڈی مل اونر ہیں۔ اس کے علاوہ ایک سپر اسٹور اور دو پیٹرول پمپ بھی ہیں۔ ایک بھائی امریکا میں پڑھ رہا ہے اور میں یہاں اکیلی بور ہوتی رہتی ہوں۔ ڈیڈی کو اپنے کاروبار سے فرصت نہیں۔ ممی اپنی سہیلیوں میں مگن رہتی ہیں۔ جب بہت دل گھبراتا ہے تو وقت گزارنے کے لیے سپر اسٹور چلی جاتی ہوں۔ ڈیڈی تو چاہتے ہیں کہ میں پوری طرح وہاں کا انتظام سنبھال لوں کیونکہ وہ اکیلے اتنا بڑا کاروبار نہیں سنبھال سکتے لیکن مجھے بزنس سے کوئی دلچسپی نہیں میں تو موسیقی اور شاعری کی دلدادہ ہوں۔''

میں نے دل میں سوچا کہ اس لڑکی سے دوستی کرنا فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ شاید یہ اپنے باپ سے کہہ کر میرے لیے کسی ملازمت کا بندوبست کر دے لیکن میں پہلی ملاقات میں اپنی زبان سے یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کے لیے مجھے مناسب وقت کا انتظار کرنا ہوتا شاید وہ مجھے خود کوئی پیشکش کر دے۔

چند دن اور گزر گئے۔ ہما سے تقریباً روزانہ ہی بات ہوتی۔ وہ اکثر مجھے کینٹین چلنے کے لیے کہتی لیکن میں ٹال دیتا کیونکہ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ وہ ہی ہر بار میری خاطر کرے۔ اور میری اتنی گنجائش نہیں تھی کہ جواب میں اسے ٹریٹ دے سکتا۔ ایک دن وہ مجھے زبردستی کینٹین لے گئی وہ کچھ پریشان لگ رہی تھی بیٹھتے ہی بولی۔ ''تم نے بتایا تھا کہ پارٹ ٹائم جاب کرنا چاہتے ہو؟''

''ہاں کہا تو تھا۔ اس کے لیے کوشش بھی کر رہا ہوں لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔''

''اگر مناسب سمجھو تو ڈیڈی سے مل لو۔ انہیں سپر اسٹور کے لیے ایک آدمی کی ضرورت ہے۔ جو سپر اسٹور کا حساب کتاب دیکھ سکے۔''

''لیکن مجھے تو اکاؤنٹس کا کوئی تجربہ نہیں۔''

''تجربہ تو کام کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ آپ آمدنی اور خرچ کا حساب تو رجسٹر میں لکھ سکتے ہیں باقی میں سکھا دوں گی۔''

میں نے سوچا کہ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ ہو سکتا ہے قدرت نے اسی لڑکی کو میرے لیے وسیلہ بنا کر بھیجا ہو۔ چنانچہ میں نے اس کے ڈیڈی سے ملنے پر رضامندی ظاہر کر

دی۔ اس نے مجھے ایک کارڈ دیتے ہوئے کہا کہ ٹھیک سات بجے اس پتے پر پہنچ جاؤں۔

ہما کے ڈیڈی بہت تپاک سے ملے۔ وہ انہیں میرے بارے میں بہت کچھ بتا چکی تھی۔ اس لیے انہوں نے مجھ سے زیادہ سوال نہیں کیے۔ بس کام کی نوعیت سمجھائی اور کہا کہ وہ مجھ پر بھروسا کر کے یہ ذمہ داری سونپ رہے ہیں انہیں شک ہے کہ وہاں کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے۔ اس لیے مجھے اپنی آنکھ اور کان کھلے رکھنے ہوں گے۔ میں سر جھکائے ان کی باتیں سنتا رہا پھر وہ بولے۔ ”تنخواہ کیا لو گے؟“

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں آپ جو مناسب سمجھیں۔“

”ٹھیک ہے ہم کوشش کریں گے کہ تمہیں کوئی شکایت نہ ہو۔ تم کل سے ہی کام پر آجاؤ تمہاری ڈیوٹی دو سے آٹھ تک ہوگی میں مینیجر سے کہہ دوں گا وہ تمہیں کچھ ایڈوانس دے دے گا کپڑے وغیرہ بنا لینا۔“

ان کے جانے کے بعد وہ بولی۔ ”میں بھی لنچ کے بعد اسٹور آجاؤں گی تاکہ تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔“ پھر اس نے مجھے چائے پلائی اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ مجھے گھر تک چھوڑ آئے۔ میں نے چچا کو یہ خبر سنائی تو وہ بولے۔ ”اس طرح تو تمہاری پڑھائی کا حرج ہوگا۔“

”اس کی آپ فکر نہ کریں۔“ میں نے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”وہاں کام کچھ زیادہ نہیں ہے مجھے تیاری کا وقت مل جائے گا۔“

دوسرے دن میں مقررہ وقت پر اسٹور پہنچ گیا۔ مینیجر کوئی خرانٹ بندہ تھا۔ اس نے مجھے ناگواری سے دیکھا اور دفتر میں بٹھانے کے بجائے سیل مین بنا کر کاؤنٹر پر کھڑا کر دیا۔ میں نے احتجاج کیا تو وہ بولا۔ ”فی الحال ہمارے پاس اکاؤنٹ میں کوئی جگہ نہیں اگر تم سیل مین کا کام نہیں کرنا چاہتے تو گھر چلے جاؤ۔“

اس کی بات سن کر میں خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا لیکن میں نے اس سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا اور چپ چاپ کاؤنٹر پر کھڑا ہو گیا۔ اب مجھے ہما کا انتظار تھا اس کے آنے کے بعد ہی فیصلہ ہوتا کہ مجھے یہ جاب کرنی ہے یا نہیں۔

وہ تین بجے کے بعد آئی اس نے مجھے کاؤنٹر پر کھڑا دیکھا تو حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”آپ کے مینیجر کے حکم کی تعمیل۔“ میں نے جل کر کہا۔ ”انہوں نے مجھے سیل مین بنا دیا۔“

ہما کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ مجھے لے کر اپنے کیبن میں گئی اور انٹرکام کے ذریعے مینیجر کو بلایا۔ اسے دیکھتے ہی وہ پھٹ پڑی۔ ”ڈیڈی نے آپ کو نہیں بتایا کہ انہیں اکاؤنٹ کے کام کے لیے رکھا گیا ہے۔ پھر آپ نے انہیں کاؤنٹر پر کیوں کھڑا کیا؟“

”میڈم اکاؤنٹ میں ایک ہی آدمی کی جگہ ہے اور وہاں شریف صاحب پہلے سے ہی کام کر رہے ہیں۔“

”شریف صاحب بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اب ان سے کام نہیں ہوتا۔ اسی لیے ان صاحب کو رکھا گیا ہے۔ آپ ان کے بیٹھنے کا انتظام کریں اور کچھ ایڈوانس بھی دے دیں۔“ یہ کہہ کر اس نے کچھ لکھا اور مینیجر کو پکڑا دیا۔ اس نے چٹ دیکھ کر برا سامنہ بنایا اور بولا۔ ”میڈم یہ تو بہت زیادہ ہیں۔“

”آپ سے جو کہا جا رہا ہے وہ ہی کریں۔ زیادہ بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔“

مینیجر مجھے گھورتا ہوا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ بولی۔ ”مجھے شک ہے یہ اور شریف ملے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے یہاں گڑبڑ ہو رہی ہے۔ تمہیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

”فکر نہ کرو جو کچھ یہاں ہو رہا ہے وہ بہت جلد سامنے آجائے گا۔“

آدھے گھنٹے بعد ہی مینیجر نے شریف صاحب کے کمرے میں میری میز لگوا دی اور ایک لفافہ پکڑا کر مجھ سے ایک واچر پر دستخط لے لیے۔ اس لفافے میں پانچ ہزار روپے تھے جو مجھے ایڈوانس کے طور پر دیے گئے تھے۔ جب میں نے اپنی سیٹ سنبھال لی تو ہما نے مجھے اپنے کیبن میں بلایا اور بولی۔ ”فی الحال تم شریف سے سارا ریکارڈ لے کر آمدنی اور خرچ کا حساب بنانا شروع کر دو اس کے بعد میں بتاؤں گی کہ کیا کرنا ہے۔“

اس کے بعد اس نے شریف صاحب کو بھی بلا کر یہ ہی ہدایت دیں اور گھر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد شریف صاحب نے مجھ سے کہا۔

”تم آج کی تاریخ سے رجسٹر بنانا شروع کرو۔ ابھی پچھلا ریکارڈ مکمل نہیں ہوا ہے۔ دراصل میری طبیعت پچھلے دنوں کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے بہت سی رسیدوں اور واچر کا اندراج نہیں ہو سکا۔“

میں ناتجربے کار ضرور تھا لیکن مجھ میں اتنی سمجھ ضرور تھی

کہ آمدنی اور خرچ کا حساب کس طرح رکھا جاتا ہے۔ اوراس کے لیے کن کاغذات کی ضرورت پڑتی ہے۔ میں نے پہلے ہی دن دیکھ لیا کہ ادائیگیوں کے دن اور رسیدیں تو موجود ہیں لیکن جو سامان فروخت ہورہا ہے اس کا ریکارڈ نا مکمل ہے۔ چار میں سے دو کیش رجسٹر خراب تھے اوراس کی جگہ گاہک کو خریداری کی رسید دی جارہی تھی لیکن بہت سے چھوٹے آئٹم رسید کے بغیر ہی فروخت ہورہے تھے۔ یہ بہت بڑا گھپلا تھا جس پر نظر رکھنا ضروری تھا۔

میں نے ہما کو یہ بات بتائی تو اس نے اسی روز کیش رجسٹر ٹھیک کروادیے اور کیشیئر کو سختی سے ہدایت کی کہ رسید کے بغیر کوئی چیز فروخت نہ کی جائے اسی طرح اس نے سیکیورٹی گارڈ سے بھی کہہ دیا کہ وہ رسید دیکھے بغیر گاہک کو کوئی چیز نہ لے جانے دیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس روز اسٹور ہونے پر جو اسٹیٹ منٹ بنا اس میں ڈیڑھ گنا زیادہ فروخت دکھائی دی تھی۔

یہ میری پہلی کامیابی تھی۔ لیکن میں یوں انجان بن گیا کہ جیسے اس کارروائی میں میرا کوئی دخل نہیں تھا۔ میں نے ہما سے کہہ دیا کہ وہ باقاعدگی سے اسٹور آیا کرے۔ میری ہر چیز پر نظر ہے جہاں کوئی گڑبڑ محسوس ہوئی اسے فوراً بتادوں گا۔ لیکن خود کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا کیونکہ یہ میری بساط سے باہر ہے۔

پہلی تاریخ کو تنخواہ ملی تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ پورے دس ہزار ملے تھے۔ اور ایڈوانس میں دیے گئے پانچ ہزار بھی نہیں کاٹے۔ میں نے اس کا ذکر ہما سے کیا تو وہ بولی۔ ''تم نے اسٹور کو اتنے بڑے نقصان سے بچایا ہے۔ اس کے عوض وہ پانچ ہزار کچھ بھی نہیں۔ اسے تم اپنا انعام سمجھ لو۔''

''مجھے شبہہ ہے کہ اب بھی کہیں کوئی گڑبڑ ہے اگر اس کا پتا چل جائے تو مزید نقصان سے بچا جا سکتا ہے۔''

''مجھے یقین ہے کہ تم ایک دن اس کا بھی پتا لگا لوگے۔ کوشش جاری رکھو۔''

اس روز میں نے ایک گھنٹا پہلے چھٹی کی اور بازار سے عبدالرزاق اور چچا کے گھر والوں کے لیے کچھ تحائف اور گھر کی ضرورت کی چیزیں مثلاً جام، جیلی، مکھن، اسکوائش بسکٹ اور چاکلیٹ وغیرہ خریدیں۔ میں جب سامان سے لدا پھندا گھر پہنچا تو سب لوگ حیران رہ گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ آج پہلی تنخواہ ملی ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ کھانے کے بعد سیما نے چائے بنائی تو میں نے ارے ارے [illegible] مجھے ہاسٹل میں کمرا مل گیا ہے اور میں وہاں شفٹ ہورہا ہوں۔

یہ سنتے ہی چچا کے چہرے پر اداسی چھا گئی وہ بولے۔ ''تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے؟''

''کوئی تکلیف نہیں ہے بلکہ مجھے یہاں تو اپنے گھر سے زیادہ آرام مل رہا ہے۔ بس آنے جانے کا مسئلہ ہورہا ہے جس کی وجہ سے پڑھنے کا وقت نہیں مل رہا ہے۔''

''اگر پڑھائی کا حرج ہورہا ہے تو ہم تمہیں نہیں روکیں گے۔'' چچا بولے۔ ''لیکن تمہاری وجہ سے یہاں رونق ہوگئی تھی۔''

مجھے ان کی بات پر ہنسی آگئی کہ کیسی رونق اور کہاں کی رونق۔ میں تو صبح سے رات تک گھر سے باہر ہی رہتا تھا۔ یہ ان کا خلوص ہی تھا جو وہ یہ بات کہہ رہے تھے۔ میں نے ان کا دل رکھنے کے لیے کہہ دیا۔ ''آپ فکر نہ کریں میں ملنے کے لیے آتا رہوں گا۔ آپ لوگوں کے سوا میرا یہاں اور کون ہے۔''

وہ یہ سن کر خوش ہوگئے اور مجھے ہاسٹل جانے کی اجازت دے دی۔ دوسرے دن میں نے کالج سے چھٹی کی۔ عبدالرزاق بھی کیرج نہیں گیا اس نے میرے ساتھ مل کر پیکنگ میں مدد کی اور ہاسٹل تک چھوڑنے آیا۔ اس کمرے میں پہلے سے ایک لڑکا رہتا تھا۔ اتفاق سے وہ بھی اس دن کالج نہیں گیا۔ اس نے خوش دلی سے استقبال کیا اور رسمی تعارف کے بعد ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ اس کا نام ندیم تھا۔ مجھے تھوڑی دیر میں ہی اندازہ ہوگیا کہ وہ بہت ہنس مکھ اور زندہ دل لڑکا ہے۔ ہم نے ایک ساتھ کھانا بھی ہاسٹل کی میس میں کھایا۔ جب میں لباس تبدیل کر کے جانے لگا تو اس نے خالص لاہوری انداز میں کہا۔ ''کہاں کی تیاری ہے شہزادے؟''

میں نے اسے بتایا کہ ایک سپر اسٹور میں پارٹ ٹائم جاب کرتا ہوں۔ وہیں جارہا تھا۔

وہ یہ سن کر بہت متاثر ہوا اور بولا۔ ''شاباش ہے بھئی ہمت ہے تمہاری جو پڑھائی کے ساتھ ساتھ جاب بھی کر رہے ہو۔''

میں نے دل میں سوچا کہ بیٹا تمہارے گھر میں دانے ہیں۔ اس لیے یہ بات کہہ رہے ہو اگر میری طرح غریب والدین کی اولاد ہوتے تو آٹے دال کا بھاؤ پتا چلتا لیکن میں

نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ وہ اچھا بندہ تھا اور مجھے اُمید تھی کہ اس کے ساتھ خوب وقت گزرے گا۔

فرسٹ ایئر کے امتحان قریب آگئے تھے۔ میں سب کچھ بھول کر پڑھائی میں لگ گیا۔ ہما نے یہ رعایت دے دی تھی کہ میں اپنا کام ختم کرنے کے بعد وقت سے پہلے ہاسٹل جاسکتا ہوں تاکہ امتحان کی تیاری کرسکوں۔ کالج بند ہوچکے تھے۔ اس لیے میں نے اسٹور جانے کے اوقات تبدیل کر دیے۔ میں صبح گیارہ بجے جاتا اور شام پانچ بجے واپس چلا آتا۔ مینیجر شہباز کو یہ بھی ناگوار گزرا اور اس نے ہما کے ڈیڈی سے میری شکایت کردی لیکن اسے وہاں بھی منہ کی کھانا پڑی۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ رعایت مجھے ہما نے دی تھی اس لیے انہوں نے الٹا شہباز کو ہی ڈانٹ دیا۔

امتحان ختم ہوئے تو میرا دل گھر جانے کے لیے مچل اٹھا لیکن ملازمت کا معاملہ تھا اس لیے ہما سے کہنے کی ہمت نہیں پڑی۔ ڈر رہا تھا کہ اگر اس نے چھٹی دینے سے انکار کردیا تو بڑی سبکی ہوگی لیکن وہ میری توقع سے زیادہ مہربان اور ہمدرد ثابت ہوئی ہم آخری پرچہ دے کر باہر آئے تو وہ بولی۔ ”آؤ کہیں بیٹھتے ہیں۔“

وہ مجھے ایک معروف ریسٹورینٹ میں لے گئی اور بولی۔ ”امتحان ختم ہونے کی کوشش میں آج لنچ میری طرف سے۔“ میرے ذہن پر چھٹی سوار تھی۔ میں نے سوچا کہ موقع اچھا ہے اس سے بات کرکے دیکھتا ہوں۔ کیا پتا مان جائے لیکن میرے کہنے سے پہلے بول پڑی۔ ”تم گھر کب جارہے ہو؟“

”چلا تو جاؤں لیکن یہاں کام کون دیکھے گا؟“

”کسی کے جانے سے دنیا کے کام نہیں رکتے۔ تمہیں گھر والوں سے جدا ہوئے ایک سال ہوگیا ہے۔ انہیں تمہارا انتظار ہوگا۔ کام میں دیکھ لوں گی۔“

”ٹھیک ہے میں ایک ہفتے میں واپس آجاؤں گا۔“

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”ایک ہفتہ تو کم ہے کم از کم پندرہ دن کے لیے تو جاؤ۔“

میں نے اسی روز اسٹور پہنچ کر مینیجر کو پندرہ دن کی چھٹی کی درخواست دے دی۔ وہ ناک بھوں چڑھاتے ہوئے بولا۔ ”تم پینڈو لوگوں کا یہی مسئلہ ہے بہانے بہانے گاؤں کی طرف دوڑ لگاتے ہو۔“

جی چاہا کہ اس کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کروں تاکہ اسے پتا چل جائے کہ پینڈو کا ہاتھ کیسا ہوتا ہے لیکن اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے گاؤں سے آئے ہوئے ایک سال ہوگیا ہے اب تو میرا حق بنتا ہے چھٹی کرنے کا۔“

”ٹھیک ہے جاؤ لیکن پندرہ دن کے بعد آجانا۔“

تھوڑی دیر کے بعد ہما نے اپنے کیبن میں بلایا اور ایک لفافہ دیتے ہوئے بولی۔ ”ویسے تو ہمارے ہاں عید پر بونس ملتا ہے لیکن اس میں ابھی دیر ہے۔ اچھا نہیں لگتا کہ تم خالی ہاتھ گھر جاؤ۔ اس لیے تمہارے لیے اسپیشل بونس ہے۔ بہن بھائیوں کے لیے کچھ لے جانا۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوکر شاپنگ کے لیے بازار روانہ ہوگیا۔ اس لفافے میں دس ہزار روپے تھے۔ اس کے علاوہ میں نے بھی اچھی خاصی بچت کر رکھی تھی۔ میں نے گھر والوں کے لیے کپڑے اور رضیہ کے لیے چوڑیوں کا سیٹ خریدا اور دوسرے روز صبح کی گاڑی سے روانہ ہوگیا۔

میں نے اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی اس لیے سب لوگ مجھے دیکھ کر حیران ہوگئے اماں کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ بار بار میری بلائیں لے رہی تھیں۔ بابا کام پر گئے ہوئے تھے انہیں کسی نے خبر کردی تو دوڑے چلے آئے۔ تایا تائی رضیہ اور گاؤں میں جس کو بھی میرے آنے کی خبر ملی وہ مجھ سے ملنے آیا۔ رضیہ ایک کونے میں کھڑی بظاہر مسکرا رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں ڈھیروں شکوے مچل رہے تھے۔

مہمانوں کے جانے کے بعد میں نے اپنا سوٹ کیس کھولا اور ایک ایک کرکے گھر والوں کے لیے لائی ہوئی چیزیں ان کے حوالے کردیں۔ جنہیں دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ نجمہ اپنے جوڑے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ ماں جی کو بھی اپنا سوٹ بہت پسند آیا اور بولی۔ ”یہ تو میں نجمہ کی شادی میں پہنوں گی۔“

بابا نے ساری زندگی دھوتی کرتا ہی پہنا تھا جب میں نے ان کے سامنے برانڈڈ کاٹن کا سوٹ رکھا تو وہ کپکپاتی آواز میں بولے۔ ”پتر یہ تو چوہدریوں کے پہننے کے کپڑے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”بابا شہر میں سب لوگ یہی لباس پہنتے ہیں۔ اگلی بار تمہارے لیے ایسے کئی جوڑے لے کر آؤں گا۔“

ماں جی بولی۔ ”پتر کتنا پڑھ لیا تو نے واپس آجا تو تیری

شادی کا سوچوں بھائی جی کئی بار کہہ چکے ہیں۔''

''ابھی تو میں نے گیارہ جماعتیں پڑھی ہیں جب تک چودہ نہ پاس کرلوں اچھی نوکری نہیں ملے گی۔''

''پھر انہیں کیا جواب دوں؟''

''ان سے کہو انتظار کریں میں شادی کی خاطر اپنا مستقبل برباد نہیں کرسکتا۔''

شام میں تایا جی سے ملنے گیا تو رضیہ کا منہ پھولا ہوا تھا۔ میں نے تائی جی سے دو چار باتیں کیں اور چپکے سے کھسک کر پیچھے والے باغ میں آگیا جہاں تائی جی نے کئی قسم کی سبزیاں اگائی ہوئی تھیں۔ میں نے جیب سے نکال کر چوڑیوں اور پرفیوم کی شیشی اسے دی تو وہ خوشی سے نہال ہوگئی اور بولی۔''ہائے اللہ کتنی خوب صورت چوڑیاں ہیں اور یہ خوشبو کتنی اچھی ہے لگتا ہے بڑا پیسا آگیا ہے تمہارے پاس۔ جبھی اتنی مہنگی چیزیں خرید رہے ہو۔''

''نہیں پیسا کہاں سے آنا ہے ابھی تو میری پڑھائی چل رہی ہے بس اپنا خرچا پورا کرنے کے لیے چھوٹی موٹی نوکری کرلی ہے۔ اسی میں سے کچھ بچت کرلیتا ہوں۔''

''کب تک چلے گی تمہاری پڑھائی؟''

''بس تین سال اور چودہ جماعتیں پاس کرلوں تجھے بیاہ کر شہر لے جاؤں گا۔''

''مجھے نہیں جانا کہیں بھی۔'' وہ ایک ادا سے بولی۔''میں یہیں ٹھیک ہوں اپنے گاؤں میں۔''

''اچھا وقت آنے پر دیکھا جائے گا اب میں چلتا ہوں۔''

''صبح ناشتا یہیں کرنا میں تمہارے لیے آلو کے پراٹھے بناؤں گی۔''

''ایک شرط پر آؤں گا۔''

''وہ کیا؟''

''جب تک میں یہاں ہوں تم مجھے آلو کے پراٹھے کھلاؤ گی۔''

''اگر اتنا ہی شوق ہے تو مجھے بیاہ کرلے جاؤ۔ پھر روز پراٹھے کھانا۔''

''وہ دن بھی جلد آئے گا۔'' میں نے اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔

پندرہ دن پلک جھپکتے گزر گئے اور میں ایک بار پھر اپنے معاملات میں مصروف ہوگیا۔ میری غیر موجودگی میں ہما خاصی پریشان ہوگئی تھی مجھے دیکھتے ہی بولی۔''اچھا ہوا تم

آ گئے ورنہ میں تمہیں ٹیلی گرام دے کر بلانے والی تھی۔''

''کیوں خیریت تو ہے ایسی کیا پریشانی ہوگئی؟''

''تم نے آمدنی اور خرچ کا حساب کتاب تو ٹھیک کر لیا لیکن اس کے باوجود ہماری سیل میں کمی ہوتی جا رہی ہے جب کہ سارا حساب میں خود چیک کرتی ہوں۔''

''لگتا ہے یہ کوئی اور چکر ہے اس کا کھوج لگانا ہوگا۔''

اس دن کے بعد میں نے اکاؤنٹس کے علاوہ دیگر معاملات پر بھی نظر رکھنا شروع کر دی۔ مجھے شک تھا کہ ہم مختلف کمپنیوں اور ہول سیل سے جو مال خریدتے ہیں۔ کیا وہ پوری مقدار میں سپلائی ہو رہا ہے یا نہیں۔ میں نے اپنا شک دور کرنے کے لیے اسٹاف رجسٹر چیک کیا تو اس میں پچاس سے زیادہ ایسے آئٹم کا اندراج نہیں تھا جن کی ادائیگی گزشتہ پندرہ دن کے دوران ہوئی تھی۔ یعنی کاغذوں پر یہ مال خریدا گیا۔ جھوٹے بل داخل کیے گئے لیکن حقیقت میں وہ مال سپلائی نہیں ہوا۔ اس کھیل میں مینیجر، شریف صاحب اور اسٹور کیپر سب شامل تھے۔

میں نے یہ کہانی ہما کو سنائی تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور بولی۔ ''اس سے تو بہتر ہے ہم یہ اسٹور بیچ دیں آخر ہم کب تک یہ نقصان برداشت کرتے رہیں گے۔''

''تمہیں اتنی جلدی حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے۔'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میں ہوں ناں تمہارے ساتھ لیکن مشکل یہ ہے کہ میں ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا میرے پاس اتنے اختیارات نہیں ہیں۔''

''تم مجھے اپنی اسکیم بتاؤ میں تمہیں سارے اختیارات دوں گی۔''

''پہلا آرڈر تو تم یہ جاری کرو آئندہ ہر بل کے ساتھ ڈلیوری چالان اور انسپکشن رپورٹ لازمی ہونی چاہیے۔ سامان کا معائنہ کرنے کے بعد اسٹور کیپر ان دونوں کاغذات پر دستخط کرے گا۔ اس سے یہ تصدیق ہو جائے گی کہ جو بل جمع کیا گیا ہے وہ سامان واقعی سپلائی ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ تم ایک لڑکے کی خاص طور پر یہ ڈیوٹی لگاؤ جو روزانہ سپر اسٹور کھلنے پر حاضر اسٹاف کی فہرست تیار کرے۔ اس طرح ہمیں اندازہ ہو جائے گا کہ کون سی چیز شارٹ ہے ہم اس کا آرڈر دے سکیں۔''

''ٹھیک ہے میں آج ہی پروموشن دے کر تمہیں اسسٹنٹ مینیجر بنا دیتی ہوں۔ ان سب کاموں کی نگرانی تم ہی کرو گے تمہاری تنخواہ بھی دگنی ہو جائے گی۔''

جیسے ہی شہباز کو معلوم ہوا کہ مجھے ترقی دے کر اسسٹنٹ مینیجر بنا دیا گیا ہے تو وندناتا ہوا ہما کے کیبن میں گیا اور بولا۔ ''لگتا ہے آپ کو اب میری ضرورت نہیں رہی جب سارے کام امجد نے ہی کرنے ہیں تو بہتر ہے مجھے فارغ کر دیں۔''

''شاید تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے تمہارے اختیارات میں کمی نہیں کی بلکہ اسے کچھ نئی ذمہ داریاں دی ہیں اس کے باوجود تم کام نہیں کرنا چاہتے تو ڈیڈی سے بات کر لو۔''

وہ منہ لٹکائے واپس آ گیا۔ اس نے میرے کیبن کے آگے سے گزرتے ہوئے یوں گھورا جیسے مجھے کچا چبا جائے گا۔ لیکن میں نے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا۔ مجھے ایسے لوگوں سے نمٹنا خوب آتا تھا۔ اس کا غصہ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہی تھا۔ میں نے اس کی کرپشن کے سارے دروازے بند کر دیے تھے۔ اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اسی تنخواہ پر کام کرتا رہے یا نوکری چھوڑ کر چلا جائے۔

دوسرے دن سے ہی ان اقدامات پر عمل شروع ہو گیا۔ اس روز سامان کی پہلی کھیپ آئی تو میں نے اسٹور کیپر کو ساتھ لیا اور ڈلیوری چالان کے مطابق ایک ایک چیز چیک کی اور اسٹور کیپر سے کہا کہ وہ اپنی تسلی کرنے کے بعد ان کاغذات پر دستخط کر کے بل کے ساتھ اکاؤنٹس آفس میں جمع کرا دے۔ وہاں سے چیک بن جائے گا اور اسٹاک رجسٹر میں ہی اس کا اندراج کر دے۔ میں نے سارا سسٹم کمپیوٹرائزڈ کر دیا۔ اب ہر چیز ہماری انگلیوں پر تھی۔

ان اقدامات کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے اور اسٹور کا منافع بتدریج بڑھنے لگا جبھی وہ حادثہ پیش آ گیا جس کی مجھے بالکل بھی توقع نہیں تھی۔ میں معمول کے مطابق اسٹور سے چھٹی کر کے ہوسٹل واپس جا رہا تھا کہ راستے میں چند لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ اس روز سردی کچھ زیادہ ہی تھی۔ اسی لیے سڑک پر آمد و رفت برائے نام تھی۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا انہوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ وہ مجھے بری طرح زدوکوب کر رہے تھے پھر کسی نے میرے سر پر ڈنڈے سے ضرب لگائی اور میں چکرا کر گر پڑا۔

ہوش آیا تو اپنے آپ کو اسپتال میں پایا۔ میرا سر پٹیوں سے جکڑا ہوا تھا اور ایک نرس میری تیمارداری میں مصروف تھی۔ میں نے اس سے پہلا سوال یہ ہی کیا۔ ''سسٹر! مجھے یہاں کون لایا ہے؟''

''مس ہما وہ تھوڑی دیر پہلے ہی گئی ہیں۔''

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ گویا میں رات بھر بے ہوش پڑا رہا لیکن ہما کو اس واقعہ کا کس طرح پتا چلا۔ شام کو وہ آئی تو اس نے بتایا کہ راہ گیروں نے مجھے ٹیکسی میں ڈال کر اسپتال پہنچایا تھا۔ انہیں میرے بٹوہ میں ایک وزیٹنگ کارڈ ملا جس پر فون نمبر درج تھا۔ اسپتال والوں نے اسی نمبر پر فون کر کے اطلاع دی تو وہ فوراً اسپتال پہنچی۔ خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے فوراً ٹانکے لگائے اور خون چڑھایا۔ اب میری حالت خطرہ سے باہر ہے اور دو تین دن بعد اسپتال سے فارغ کر دیا جائے گا۔

ان تین دنوں میں اس نے میرا بہت خیال رکھا۔ وہ صبح شام مجھے دیکھنے آتی۔ ایک دفعہ اس کے ڈیڈی بھی آئے۔ اسپتال کا بل بھی انہوں نے ہی ادا کیا۔ ڈاکٹروں نے مجھے ایک ہفتہ آرام کرنے کی ہدایت کی تھی اس دوران بھی وہ مجھے دیکھنے ہاسٹل آتی رہی۔ وہ روزانہ میرے لیے ڈھیروں پھل، دودھ اور جوس کے ڈبے لے کر آتی اور جب میں اسے منع کرتا تو ناراض ہو کر کہتی۔ ''یہ چیزیں تمہاری صحت سے بڑھ کر نہیں ہیں۔ تمہیں نہیں معلوم کہ تم ہمارے لیے کتنے اہم ہو۔''

میرے دل میں ہما کی عزت اور بڑھ گئی۔ اتنے بڑے باپ کی بیٹی ہو کر وہ مجھ جیسے معمولی شخص کا کتنا خیال رکھ رہی تھی۔ مانا کہ وہ مالکن ہونے کے ساتھ ساتھ میری دوست اور کلاس فیلو بھی تھی لیکن مجھے لگا کہ اس ہمدردی اور خیر گیری کے پیچھے کوئی اور ہی جذبہ ہے اور تب میں نے پہلی بار اس کے بارے میں مختلف انداز سے سوچنا شروع کر دیا۔

''کیا یہ ممکن ہے؟'' میں نے اپنے دل سے سوال کیا۔ جواب اثبات میں آیا۔ اس کے رویہ سے تو یہ ہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ اس نے قدم قدم پر تمہارا ساتھ دیا۔ تمہاری مدد کی اگر اس کے دل میں تمہارے لیے کوئی جذبہ نہ ہوتا تو وہ یہ سب کیوں کرتی؟

لیکن ہماری سماجی حیثیت میں بہت فرق تھا۔ اس کا باپ کبھی بھی مجھ جیسے غریب شخص کو اپنا داماد بنانا گوارہ نہ کرتا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اس فرق کو کم کیا جائے اور میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے کسی اچھے عہدہ پر فائز ہو جاؤں پھر شاید اس کے باپ کو کوئی اعتراض نہ ہو لیکن کیا اس وقت تک ہما میرا انتظار کرے گی۔

''بالکل۔'' دل نے جواب دیا۔

''اگر تم سے وہ محبت کرتی ہے تو آئندہ بھی تمہارا ساتھ دے گی۔''

اس کے بعد میں نے پوری توجہ پڑھائی پر مرکوز کر دی۔ اب میں اپنی کوئی ایک کتاب لے کر جاتا اور اسٹور میں بھی کچھ نہ کچھ پڑھ لیتا۔ میرے کانوں میں ماسٹر جی کے الفاظ گونجتے رہتے۔ تمہیں بڑا آدمی بننا ہے واقعی ہما کو حاصل کرنے کے لیے اس منزل تک پہنچنا ضروری تھا۔

میں نے سیکنڈ ایئر کا امتحان بھی اچھے نمبروں سے پاس کیا چھٹیوں میں گاؤں گیا تو رضیہ حسب معمول روٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی کہ بہت پڑھ لیا۔ اب واپس آجاؤ۔ تایا جی بھی ناراض ناراض تھے۔ انہیں میرے مستقبل سے زیادہ اپنی بیٹی کی شادی کی فکر تھی۔ انہوں نے غصے میں آ کر یہاں تک کہہ دیا کہ کمی کا بیٹا کمی رہتا ہے تو ڈپٹی کمشنر تو لگنے سے رہا۔

میں نے ان سب کی باتوں کو ایک کان سے سنا اور دوسرے سے اڑا دیا۔ مجھے ہر حال میں اپنا مشن پورا کرنا تھا۔ واپس آ کر میں نے بی کام میں داخلہ لے لیا۔ یہاں بھی ہما میرے ساتھ تھی۔ وہ میرے کچھ اور قریب آ گئی تھی۔ اسے آئسکریم کھانے کا بہت شوق تھا۔ وہ مجھے اکثر آئسکریم پارلر لے جاتی جہاں ہم دیر تک باتیں کرتے اسے اپنے باپ کی صحت کے بارے میں بہت تشویش تھی۔ وہ بیمار رہنے لگے تھے اور کاروبار پر کوئی توجہ نہیں دے پا رہے تھے۔

وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ میں نے بی کام کر لیا اور مجھے ایک بینک میں ملازمت مل گئی۔ ہما نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ اسٹور میری منزل نہیں۔ مجھے ابھی اور آگے جانا ہے ویسے بھی اس کا بھائی امریکا سے واپس آ گیا تھا اور باپ کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹا رہا تھا۔ ہما نے مجھے ایم بی اے کرنے کا مشورہ دیا۔ ہفتے میں ایک دن کلاس ہوتی تھی۔ اس نے بھی میرے ساتھ ہی داخلہ لے لیا۔ تو مجھے بھی یقین ہو گیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ میرے ہمراہ وقت گزارنا چاہتی ہے۔

میں نے اپنے گھر والوں کو اپنی نئی ملازمت کے بارے میں نہیں بتایا ورنہ مجھ پر رضیہ سے شادی کرنے کے لیے دباؤ بڑھ جاتا بس یہ ہی کہتا رہا کہ اچھی ملازمت کے لیے چودہ جماعتیں کافی نہیں اس لیے میں نے اگلی جماعت میں داخلہ لے لیا ہے۔ ماں باپ نے تو کچھ نہیں کہا لیکن تایا جی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ انہوں نے بابا سے صاف کہہ دیا کہ اگر چھ مہینے کے اندر امجد اور رضیہ کی شادی نہیں ہوئی تو وہ یہ رشتہ ختم کر دیں گے۔ بڑی مشکل سے تائی نے انہیں ٹھنڈا کیا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ رضیہ کسی اور سے شادی کرنے پر تیار نہیں ہو گی۔

میں تو خود یہ ہی چاہ رہا تھا کہ وہ یہ منگنی توڑ دیں لیکن اپنی زبان سے کہنا مناسب نہیں تھا جب تک مجھے ہما کی طرف سے اطمینان نہیں ہو جاتا لیکن ابھی تک مجھے اس کے دل کا حال جاننے کا موقع نہیں ملا تھا حالانکہ ہم ہفتے میں ایک دو بار ضرور ملتے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ آئسکریم پارلر یا کسی ریسٹورینٹ میں لے جاتی۔ ہم دنیا جہاں کی باتیں کرتے لیکن اس نے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی مجھے کوئی ایسا اشارہ ملا جس سے معلوم ہوتا کہ وہ سنگل ہے یا اس کی بات کہیں طے ہو چکی ہے۔

ایم بی اے کرنے کے بعد مجھے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ اب میرے پاس گاڑی بنگلا حیثیت سب کچھ تھا۔ میں واقعی بڑا آدمی بن چکا تھا اور پورا یقین تھا کہ اب میں ہما کو پرپوز کروں تو اسے یا اس کے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ ہما بھی میری کامیابی پر بہت خوش تھی۔ اس نے فون کر کے کہا کہ وہ اسی خوشی میں ٹریٹ دینا چاہتی ہے لہٰذا آج رات میں اس کے ساتھ ڈنر کروں۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ اس روز میں نے اپنا بہترین لباس زیب تن کیا اور بن سنور کر ریسٹورینٹ پہنچ گیا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ میں آج ہما سے اپنے دل کی بات ضرور کہوں گا۔ وہ وقت مقررہ پر آ گئی۔ میں .... اس کی سج دھج دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سفید لباس میں وہ آسمان سے اتری ہوئی حور لگ رہی تھی۔ اس نے ہلکا ہلکا میک اپ کیا ہوا تھا اور اس کے بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں خاص چمک تھی اور خوشی سے اس کے گال تمتما رہے تھے۔

''کیا بات ہے بہت خوش لگ رہی ہو؟'' میں نے اسے چھیڑا۔

''ہاں بات ہی کچھ ایسی ہے۔'' وہ جھینپتے ہوئے بولی۔

''میں بھی اس خوشی کے موقع پر تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''پہلے کھانا کھا لیں پھر آرام سے باتیں کریں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے بیرے کو اشارہ کیا کھانا ختم ہوا تو وہ بولی۔ ''ہاں اب کہو کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''بات تو بہت سیدھی سی ہے لیکن اسے زبان پر آتے آتے چار سال لگ گئے۔''

''اف اب کہہ بھی چکیں۔ اتنی لمبی تمہید باندھنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''بات یہ ہے کہ ہما میں تمہیں پرپوز کرنا چاہتا ہوں۔''

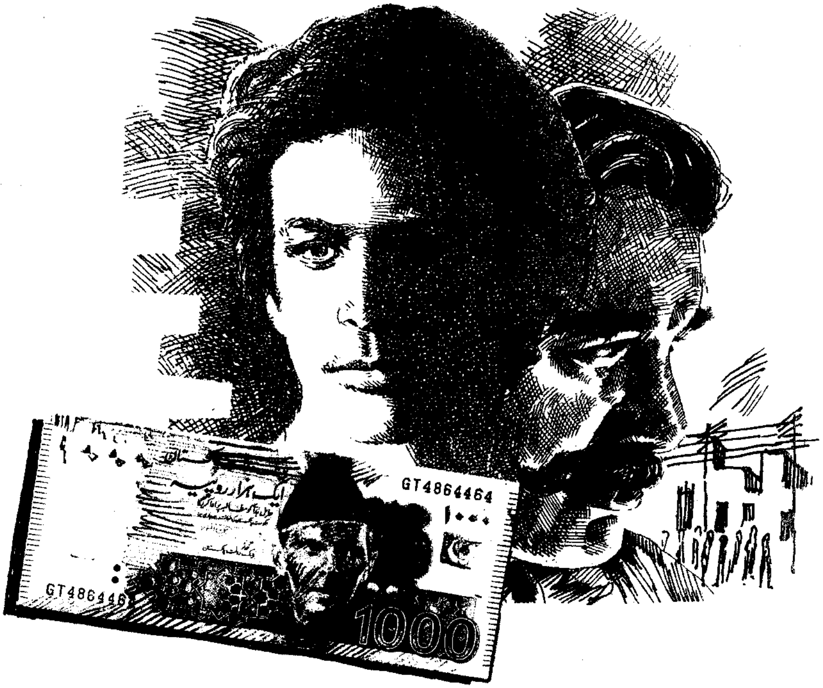
''کیا؟'' وہ یوں اچھلی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ وہ چند لمحے خاموش بیٹھی رہی پھر آہستہ سے بولی۔ ''مجھے حیرت ہے کہ تم نے اتنی بڑی بات کیسے کہہ دی؟''

''کیوں مجھ میں کیا کمی ہے؟ کیا میں تمہارے قابل نہیں؟'' میں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

''ہاں تم میں کوئی کمی نہیں۔ تم ہر لحاظ سے بہترین انسان ہو لیکن شادی صرف دو انسانوں کے نہیں بلکہ دو خاندانوں کے ملاپ کا نام ہے۔ بے شک تم ایک کامیاب انسان ہو لیکن اپنے ماضی سے کبھی پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ تمہارا پس منظر ہمیشہ ساتھ ساتھ چلتا رہے گا۔ جب تم برأت لے کر آؤ گے تو میرا دولت مند باپ اپنے مہمانوں سے تمہارے خاندان کا تعارف کس طرح کروائے گا۔ تمہاری سیدھی سادی ان پڑھ ماں میری ممی کی فیشن ایبل سہیلیوں سے کس طرح بات کریں گی۔ نہیں امجد میں اپنا اور تمہارا تماشا نہیں بنا سکتی۔ تم چاہے کتنے ہی بڑے آدمی بن جاؤ۔ ہمارے خاندانوں کے درمیان حیثیت کا فرق کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔'' وہ ایک لمحہ رکنے کے بعد بولی۔ ''ویسے بھی میں یہ بتانے آئی تھی کہ اگلے ہفتے میرا کزن کینیڈا سے آ رہا ہے اور ایک ماہ بعد ہماری شادی ہو جائے گی تم آؤ گے ناں؟''

اس کے بعد میرے کہنے کے لیے کچھ نہ رہا میں نے دوسرے ہی دن بابا کو خط لکھ دیا کہ وہ تایا جی سے رضیہ کی رخصتی کی تاریخ لے لیں۔





نیا حکمراں

جناب مدیر اعلیٰ
سلام شوق
یہ سچ بیانی ہمارے ایک دوست کے قصبے کی ہے، لیکن میں اسے اپنے پاکستان کے ہر علاقے کی سچائی سمجھتا ہوں۔ اس قصے کو پڑھنے کے بعد غور کریں گے تو آپ بھی میری رائے سے متفق ہو جائیں گے۔
یہ سچ بیانی نہیں، ایک سبق ہے کہ ہمارے ہاں یہی تو ہو رہا ہے۔
منشی فضل دین
(نارووال)

ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ اس علاقے میں وہی ایک مارکٹ تھی۔ اس مارکٹ میں ضرورت کی ہر چیز مل جایا کرتی تھی۔ راشن سے لے کر کپڑے اور جوتے تک۔ ان دکانوں کے علاوہ کچھ ایسی دکانیں بھی تھیں جن میں سامان تو فروخت نہیں ہوا کرتا لیکن علاقے کی ضروریات کو پوری کرتی تھیں۔
جیسے دو ٹیلر ماسٹر تھے۔ ایک نے اپنی دکان کا نام شنگھائی ٹیلرنگ شاپ رکھا ہوا تھا جبکہ دوسرا دانیال ٹیلرنگ

تھا۔ ان کے علاوہ دو باربر شاپ بھی تھے۔ جہاں علاقے والے اپنے بال کٹوایا کرتے۔ ان کے علاوہ ایک حکیم صاحب تھے۔ ایک ڈاکٹر تھا۔

پوری فضا پُرسکون تھی۔ اس علاقے میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ سوائے ایک پرابلم کے۔ اور وہ پرابلم بشیرا کی تھی۔ ایک مشہور اور خطرناک غنڈا۔ جس کی دور دور تک دھاک بندھی ہوئی تھی۔ پولیس والے بتاتے تھے کہ وہ کئی قتل کر چکا تھا۔

علاقے کے ہر دکان دار کو مہینے میں پانچ سو روپے دینے پڑتے تھے۔ وہ کہا کرتا کہ یہ اس کے حق حلال کی کمائی ہے۔ کسی میں یہ پوچھنے کی جرات نہیں ہوتی تھی کہ اس قسم کی کمائی حق حلال کی کیسے ہوسکتی ہے۔

اس کے گرگے بھی اسی کی طرح خطرناک تھے۔ ذرا سی دیر میں بندے کو ادھیڑ کر رکھ دیا کرتے۔ بشیرا کی ایک عادت اور بھی تھی۔ پانچ سو کے علاوہ وہ دکان والوں سے اور بھی بہت کچھ وصول کرلیا کرتا۔ جیسے لانڈری والا اس کے کپڑے مفت دھونے کے لیے مجبور تھا۔ ٹیلرنگ والے اس کے کپڑے سینے کے پابند تھے۔ اسی طرح وہ اور اس کے گرگے حجامتیں بھی مفت بنوایا کرتے تھے۔ کسی میں انکار کی ہمت نہیں تھی۔

جب اس علاقے والوں نے یہ دیکھا کہ بشیرا کی حرکتیں بڑھتی چلی جارہی ہیں تو انہوں نے ایک جرگہ بلوا لیا۔ یہ جرگہ اس کے خلاف ایکشن کے لیے بلوایا گیا تھا۔ اس کی ابتدا نظامی صاحب نے کی تھی۔ وہ کسی زمانے میں سرکاری اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوا کرتے تھے۔ اس جرگے کی ابتدا ان ہی کی تحریک تھی۔

''بھائیو۔ آخر ہم سب کب تک ایک آدمی کے خوف کا شکار رہیں گے؟ یہ کوئی جنگل نہیں ہے۔ جس میں طاقتور کی حکمرانی ہو۔ ہم ایک ہوکر بہت کچھ کرسکتے ہیں۔''

''تو پھر ماسٹر صاحب۔ بتائیں کیا کیا جائے؟'' کسی نے پوچھا۔

''ہمت کرنی ہوگی۔'' ماسٹر نے کہا۔ ''ایک دو آدمی میرا ساتھ دیں تو ہم کمشنر صاحب کے پاس چلتے ہیں۔ ایک ایپلی کیشن بنانی ہوگی۔ وہ میں بنادوں گا۔''

''ماسٹر صاحب۔ کمشنر کیا ہم لوگوں سے ملیں گے؟''

''یہی تو ایک ٹیکنیکل بات ہے۔'' ماسٹر نے کہا۔ ''ہوتا یہ کہ ہم میں بہت سے لوگ اپنا انفرادی معاملہ لے کر حاکموں کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ اگر ہم پورے علاقے کا پرابلم لے کر ان کے پاس جائیں تو وہ ہم سے ملاقات بھی کریں گے اور اس شیطان سے ہماری جان بھی چھڑا دیں گے۔ اب یہ بتاؤ۔ تم میں سے کون کون چل رہا ہے میرے ساتھ؟''

دو آدمیوں نے ہاتھ اٹھا دیے۔ یہ دونوں بھی بشیرا اور اس کے بندوں سے تنگ آچکے تھے۔ اب ایک اچھا موقع مل رہا تھا۔

لیکن ماسٹر کی اسکیم ادھوری رہ گئی۔ کوئی بھی نہیں جاسکا۔ اس جرگے ہی میں سے کوئی ایسا تھا جس نے بشیرا سے جاکر سب بتا دیا تھا۔ بشیرا صبح صبح بستی میں آدھمکا تھا۔ اس نے سب سے پہلے ماسٹر ہی کے گھر چھاپہ مارا تھا۔ ماسٹر صاحب کو گھر سے باہر بلوالیا گیا تھا۔

''ہاں ماسٹر صاحب، میں یہ کیا سن رہا ہوں؟'' بشیرا نے کہا۔ ''کہاں جانے کی تیاری ہورہی تھی؟''

''تمہارے خلاف شکایت لے کر جارہا تھا۔'' ماسٹر صاحب نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

''اچھا لگا...... ماسٹر...... اچھا لگا۔'' بشیرا نے ان کے کاندھے پر تھپکی دی۔

ماسٹر اس ادا پر بشیرا کو دیکھتے رہ گئے تھے۔ بشیرا نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ ''دیکھو ماسٹر، اس علاقے میں کوئی تو ایسا ہے جس نے بشیرا کے خلاف کچھ کرنے کا سوچا۔ ورنہ یہ تو مردہ لوگوں کی بستی ہے۔ سب اپنے حال اور اپنی کھال میں مگن ہیں۔ چلو، معاف کردیا تم کو۔ لیکن یہ پہلی اور آخری بار ہوا ہے۔ اس کے بعد معاف نہیں کروں گا۔ سمجھ گئے۔''

بے چارے ماسٹر سمجھ ہی گئے تھے۔ اسی لیے انہوں نے آئندہ ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔

اس کے بعد سے بشیرا کی دھاک اور بڑھ گئی تھی۔ اب کون اس کے منہ لگتا۔

سب نے چپ سادھ لی تھی اور سب اس کو پانچ سو روپے دیے جارہے تھے۔ اس کے علاوہ اس کو جو مراعات ملا کرتی تھیں۔ ان کا کوئی حساب ہی نہیں تھا۔

پھر ایک دن شادو کو ایک نوجوان مل گیا۔

شادو اسی بستی کی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اس نے میٹرک تک تعلیم بھی حاصل کررکھی تھی۔ وہ اس دن اپنے باپ کے کھیتوں کے درمیان سے گزر رہی تھی کہ اس نے

ایک نوجوان کو دیکھ لیا جو کھیتوں کے بیچ میں کھڑا اس طرح چاروں طرف دیکھ رہا تھا جیسے کسی کی تلاش ہو۔ شادو تو اس سے بچ کر گزرنا چاہتی تھی لیکن اسی نے شادو کو آواز دے کر روک لیا تھا۔ ''اے لڑکی بات سنو۔''

شادو رک گئی تھی۔ وہ نوجوان اس کے پاس آ گیا۔

''سنو۔ میں بستی میں پہلی بار آیا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''تو پھر میں کیا کروں؟'' شادو نے تیکھے انداز سے پوچھا۔

''تم کم از کم اتنا تو بتا سکتی ہو ناں کہ کیا اس بستی میں رہنے کے لیے گھر مل جائے گا؟'' اس نے پوچھا۔ ''مجھے یہ بستی بہت پسند آئی ہے۔''

''کیوں؟ کیا خاص بات ہے اس بستی میں؟'' شادو کی شوخی عود کر آئی تھی۔ پہلے تو اس اجنبی سے اسے ڈر سا لگا تھا۔ لیکن اب ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

''جس بستی میں تم جیسی کوئی لڑکی ہو وہ بستی خاص تو ہو گی۔'' اس نے شادو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر کے لیے شادو کا دل دھک سا رہ گیا۔ بستی میں اور بھی نوجوان تھے۔ سب اس کے دیوانے تھے لیکن کسی میں بات کہنے کا وہ سلیقہ نہیں تھا جو اس نوجوان میں تھا۔ اس نے کتنی آسانی سے شادو کے حسن کی تعریف کر دی تھی۔ شادو کو وہ نوجوان اسی وقت سے اچھا لگنے لگا۔

''بتاؤ ناں......'' نوجوان نے پوچھا۔ ''رہنے کے لیے مکان مل جائے گا؟''

''لیکن تم یہاں رہ کر کرو گے کیا؟'' شادو نے پوچھا۔ ''کام کیا کرو گے؟''

''تم اس کی فکر مت کرو۔ میں جہاں جاتا ہوں۔ وہاں کام نکل ہی آتا ہے۔ یہاں بھی نکل آئے گا۔ تم صرف اتنا بتا دو کہ مکان کہاں ملے گا۔''

شادو کا دل چاہنے لگا کہ کاش یہ نوجوان اسی بستی میں رک جائے یہیں رہنے لگے۔ اسے یاد آیا کہ زبیدہ کا مکان خالی تھا۔ وہ ایک بیوہ عورت تھی۔ اس کا مکان اچھا خاصا بڑا تھا۔ کئی کمرے تھے اس میں۔ یہ نوجوان کرائے پر وہاں رہ سکتا تھا۔

''ہاں۔ یہاں ایک مکان تو ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''خالہ زبیدہ کا۔ پوری بستی میں مشہور ہیں۔ کسی سے پوچھ لو۔ ان کا پتا بتا دے گا۔ ہو سکتا ہے کہ تم ان کے یہاں یوں ہی رہنے لگو۔ وہ تم سے پیسے بھی نہ لیں۔''

''ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔ داراب نے کبھی کسی کی حق تلفی نہیں کی۔''

شادو کو اس کا نام بہت عجیب سا لگا تھا۔ داراب۔ ان علاقوں میں ایسے نام سننے کو نہیں ملتے تھے۔

''تمہارا نام کیسا ہے؟'' شادو نے پوچھا۔ ''داراب۔ ہمارے یہاں ایسے نام تو نہیں ہوتے۔''

داراب مسکرا دیا۔ ''داراب بہت اچھا نام ہے۔ ویسے تمہارے یہاں مجھ جیسا بندہ بھی کبھی نہیں آیا ہو گا۔''

''یہ تو ہے۔'' شادو نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ''کیا خاص بات ہے تم میں؟''

داراب ہنس پڑا۔ ''ایک تو تم ہر چیز میں کوئی خاص بات تلاش کرنے کے چکر میں رہتی ہو۔ یہ بتاؤ۔ تمہاری خالہ زبیدہ کا مکان کہاں ہے۔''

''آ جاؤ...... میرے ساتھ...... میں تمہیں دور سے دکھا دوں گی۔''

''کیوں دور سے کیوں؟''

''سمجھا کرو ناں، کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا کہ شادو کس کے ساتھ چلی آ رہی ہے۔''

''کیا اس بستی والوں کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت ہے؟''

''بستی والوں کے لیے ہو یا نہ ہو۔ لیکن بشیرا کے لیے ہو گی۔'' شادو نے کہا۔

''اور یہ بشیرا کون ہے؟'' داراب نے پوچھا۔

''اس پورے علاقے کا سب سے بڑا غنڈا۔'' شادو نے بتایا۔ ''یہ سمجھ لو کہ یہاں اس کی حکومت ہے۔ بستی کا ہر دکاندار اسے پانچ سو روپے مہینا دیتا ہے۔ اس کے کارندے ہر طرف گھومتے پھرتے ہیں۔ دکاندار اس کے سامنے مجبور ہیں۔ اس کے کارندے بھی اسی کی طرح خطرناک ہیں۔ ایک بار اس نے مجھے دیکھ لیا تھا بس میرے پیچھے پڑ گیا۔ اس نے میرے گھر شادی کا پیغام بھجوا دیا۔ گھر والوں نے انکار کیا تو اس نے کہا کہ تم لوگ چاہے جتنا انکار کرو۔ میں کسی دن شادو کو لے جاؤں گا اور اس کو اپنی دلہن بناؤں گا۔''

''یہ تو زبردستی کی بات ہوئی؟''

''ہاں، زبردستی کی بات تو ہے لیکن کون ہے جو اس کے سامنے آئے؟''

داراب نے کچھ نہیں کہا۔ اس دوران بستی آ چکی تھی۔ سامنے گلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

''وہ دیکھو۔'' شادو نے اشارہ کیا۔ ''وہ جو بڑا سا پیپل کا پیڑ دکھائی دے رہا ہے ناں۔ اس کے سامنے ہی خالہ زبیدہ کا گھر ہے۔ تم وہاں چلے جاؤ۔ اس سے بات کرلینا۔''

''اور تم کب ملوگی؟'' داراب نے پوچھا۔

''دیکھو۔'' شادو نے کہا۔ ''میں تو چلتی ہوں۔ تم کچھ ٹھہر کے آنا۔'' اس نے اپنے قدم تیز کر لیے۔

لیکن وہ اپنے گھر نہیں پہنچ سکی تھی کہ دو آدمی اچانک اس کے سامنے آگئے۔ وہ بشیرا کے آدمی تھے۔ شادو دونوں کو پہچانتی تھی۔ دونوں خونخوار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''کیا بات ہے۔ بہت خوش خوش چلی آرہی ہے۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔ ''کون تھا وہ آدمی جس کے ساتھ آرہی تھی؟''

شادو سہم کر رہ گئی تھی۔ ''میں اسے نہیں جانتی۔ اس بستی میں اجنبی تھا۔ کسی کا پتا پوچھ رہا تھا۔ میں نے بتا دیا۔ بس اتنی سی بات تھی۔''

''یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔'' دوسرے نے کہا'' تجھے معلوم ہے۔ بشیرا نے ہم دونوں کو تجھ پر مقرر کیا ہے۔ ہم تجھے اِدھر اُدھر نہیں بھٹکنے دیں گے۔ تو بشیرا کی امانت ہے۔ کوئی اور تیرے پاس پھٹک بھی نہیں سکتا۔ کاٹ کر رکھ دیں گے اس کو۔''

''بھائی کیوں شور کر رہے ہو تم دونوں۔'' داراب کی آواز آئی۔ ''اس بے چاری کے ساتھ میں تھا۔ اب کچھ بگاڑ سکتے ہو تو بگاڑ لو۔''

ان دونوں نے تیزی کے ساتھ اس پر حملہ کیا تھا۔ شادو کو ایسا لگا جیسے کوئی بجلی سی کوند گئی ہو۔ کیا پھرتی تھی اس نوجوان میں۔ اس نے ذرا سی دیر میں دونوں کو ڈھیر کر دیا تھا۔ دونوں لہولہان ہو رہے تھے۔ بار بار خون تھوک رہے تھے۔

اس تماشے کو دیکھنے کے لیے بستی کے بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ان سب کے لیے یہ ایک نئی بات تھی کہ کوئی اجنبی ان کی بستی میں آکر بشیرا کے بندوں سے بھڑ جائے اور ذرا سی دیر میں اس نے دونوں کا کچومر نکال کر رکھ دیا تھا۔

''اب تم دونوں دفع ہو جاؤ۔ یہاں سے۔'' داراب نے کہا۔ ''ابھی مرا غصہ کم نہیں ہوا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں پھر شروع ہو جاؤں۔ اور ہاں، اپنے بشیرا سے کہنا کہ میں اس بستی میں مکان لے رہا ہوں۔ وہ آئندہ سے یہاں کا رخ بھی نہ کرے ورنہ ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔''

دونوں اسے خون خوار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے چلے گئے تھے۔ شادو ایک طرف سکتے کے عالم میں کھڑی ہوئی دیکھ رہی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جو نوجوان اس بستی میں کرائے کے مکان کی تلاش میں آیا تھا۔ وہ اتنا بڑا لڑاکا بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے بشیرا کے بندوں کے چھکے چھڑا دیے تھے۔

بستی والوں نے داراب کو گھیر لیا تھا۔ طرح طرح کی باتیں ہونے لگی تھیں۔

''میاں۔ تم نے بشیرا کے آدمیوں کو مار کر مصیبت مول لے لی ہے۔'' ماسٹر صاحب نے کہا۔ وہ بھی دوسروں کے ساتھ اس تماشے کو دیکھنے آگئے تھے۔

''جناب۔ یہ لوگ اسی قسم کی زبان سمجھتے ہیں۔'' داراب نے کہا۔ ''خدا جانے آپ لوگ کب سے ان کا ظلم برداشت کر رہے ہوں گے۔ اگر شروع میں ہمت کر جاتے تو اب تک سب ٹھیک ہو چکا ہوتا۔''

شادو شاید خالہ زبیدہ کو داراب کے بارے میں بتا چکی تھی۔ اسی لیے وہ آگے بڑھ کر بولی۔ ''بیٹا میں نے سنا ہے کہ تم اس بستی میں کوئی گھر ڈھونڈ رہے ہو؟''

''ہاں...... آنٹی...... اگر کوئی مل جائے تو اچھا ہو۔''

''بیٹا میرا نام زبیدہ ہے۔ سب مجھے خالہ زبیدہ کہتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو میرے مکان میں آجاؤ۔ میں تم سے کرایہ بھی نہیں لوں گی۔''

''ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔ اگر میں آپ کے گھر میں رہا تو کرایہ دوں گا۔''

''چلو پھر جو تمہاری مرضی ہو دے دینا۔''

داراب نے زبیدہ کے گھر رہنا شروع کر دیا۔ سب یہ سمجھ رہے تھے کہ داراب نے بشیرا کے بندوں کو مار کر اچھا نہیں کیا ہے۔ ایک دن وہ اپنا بدلہ لینے ضرور آئے گا۔ یہ معاملہ اس کی ساکھ کا تھا۔

اور وہی ہوا، بشیرا تیسرے ہی دن بستی میں آدھمکا تھا۔

وہ اپنے ساتھ چار پانچ آدمیوں کو لے کر آیا تھا۔ اس نے آتے ہی دہاڑنا شروع کر دیا۔ ''اوئے، کون ہے وہ مرد کا بچہ جس نے ہمارے بندوں کو مارا تھا۔''

کسی نے خوف سے زبیدہ کا مکان بتا دیا۔ بشیرا دہاڑتا ہوا زبیدہ کے مکان تک پہنچ گیا۔ اس نے دروازے

پر گالیاں دینی شروع کر دیں۔ اتنا ہی نہیں اس نے دو تین ہوائی فائر بھی کر دیے تھے۔ ہر طرف دہشت پھیل گئی تھی۔

"ادئے باہر نکل۔ کہاں چھپ کر بیٹھ گیا ہے؟"

دروازہ کھلا اور داراب بڑے اطمینان سے باہر آ گیا۔ اس کے چہرے سے کسی خوف کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ "کیا بات ہے۔ کیوں شور مچا رکھا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کیا تو ہی ہے وہ مرد کا بچہ؟" بشیرا نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ میں ہی ہوں۔" داراب نے اطمینان سے کہا۔ "اور ایک بات سن لو۔ کوئی بندہ اگر تمہارے علاقے میں آ کر تمہیں چیلنج کر رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کوئی انتظام کر کے ہی آیا ہوگا۔"

"کیا بکواس کر رہا ہے۔ کیا انتظام کیا ہے تو نے؟"

"تمہارے پاس موبائل تو ہوگا ناں۔" داراب نے کہا۔ "ذرا اپنے گھر والوں کو فون کر کے پوچھ تو لو۔ میرے بندے اس وقت تمہارے گھر پر ہیں۔ اور جب تک میں نہیں کہوں گا۔ وہ نہیں جائیں گے۔"

بشیرا کے چہرے پر ایک تاریکی سی پھیل گئی۔ اس نوجوان کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے اسے سہما کر رکھ دیا۔ اس کا ایک آدمی تیزی سے داراب کی طرف بڑھا۔ بشیرا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے موبائل نکال کر اپنے گھر کا نمبر ملایا اور کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اس نے موبائل بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔

اس کے گھر میں اس کی ایک بیوی تھی اور ایک چھوٹا بچہ تھا۔

"کیا چاہتا ہے تو" اس نے داراب سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں شکستگی تھی۔ شاید دوسری طرف سے کوئی ایسی ویسی بات سننے کو مل گئی تھی۔

"میں تو کچھ نہیں چاہتا۔" داراب نے کہا۔ "اب تو جو بتاؤ گے تم بتاؤ گے۔"

"کب تک۔" بشیرا ہنکارنے لگا تھا۔ "آخر کب تک تیرے بندے ...... میرے گھر رہیں گے؟"

"بس ایک بات کا وعدہ کر لو۔ میرے بندے تیرے گھر سے چلے جائیں گے۔" داراب نے کہا۔

بشیرا اس وقت اپنی بے عزتی محسوس کر رہا تھا لیکن اس آدمی نے اس کی دھکتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس کے اپنے آدمی اس وقت اجازت طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن اس نے اپنے بندوں کو کوئی کارروائی کرنے سے روک رکھا تھا۔ اس کی گردن اس وقت اس نوجوان کے ہاتھ میں تھی۔

"جواب دو استاد۔" داراب نے اسے للکارا۔

"کیا وعدہ لینا چاہتا ہے؟" بشیرا نے پوچھا۔

"صرف یہ کہ آئندہ سے تم یا تمہارا کوئی بندہ اس بستی میں نہیں آئے گا۔" داراب نے کہا۔ "اور ایک بات یاد رکھو

مستقل مقاصد اپنائیے

زندگی میں بیزاری اور مایوسی سے بچنے کا ایک موثر طریقہ مقاصد اور ارادوں کی مستقل تلاش بھی ہے۔ کامیابی حاصل کرنے کے لیے مقصد کی موجودگی بہت ضروری ہے۔ یہ مقصد کوئی فضول سا یا بے جان نہیں ہونا چاہیے بلکہ بھرپور عزم، بلند دماغی اور ذہانت کا حامل ہونا چاہیے جس میں کسی فرد کی مکمل شخصیت جھلکتی ہو۔ مقصد کے تعین میں اس بات کی نشاندہی ضروری ہے کہ آپ اپنی قوت فیصلہ کو کام میں لائیں اور مضبوطی سے کیے جانے والے فیصلے پر ڈٹ جائیں۔ بوریت سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کا ہر عمل ذہنی پختگی اور استحکام کا مظہر ہو اور آپ کو معلوم ہو کہ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ ان فیصلوں کے سلسلے میں کسی ابہام اور شک و شبے کا شکار نہ رہیں۔ جب آپ بوریت کے خاتمے کے لیے اپنے مقصد کو متعین کر لیں تو پھر اسے دماغ کے اسٹور میں ڈال دیں اور بھول جائیں۔ وہ مقصد خودکار عمل کے تحت خود بخود آپ کے اعصاب پر سوار ہو جائے گا۔ آپ کا پختہ ارادہ رفتہ رفتہ مقصد کو دماغ کی اوپری سطح سے نکال کر لاشعور کی گہرائیوں میں لے جائے گا اور پھر وہاں جم جائے گا۔ ایسے ہی جیسے بارش کا پانی زمین کی سطح سے رستہ، جگہ بناتا، جذب ہوتا ہوا گہرائی تک پہنچ جاتا ہے اور نئی کونپلوں کو جنم دیتا ہے۔ آپ کا مقصد بھی اندر پہنچ کر کرشمے دکھائے گا اور خوشیوں، کامیابیوں و مسرتوں کی نئی کونپل کو پھوٹنے پر مجبور کر دے گا۔

مرسلہ: ظہیر شیخ، کراچی

میں کوئی ٹٹ پونجیا نہیں ہوں۔ سوچ سمجھ کر اس میدان میں قدم رکھا ہے اگر تمہارے دل میں کوئی بات ہے کہ ابھی تو جا رہے ہیں لیکن بعد میں نمٹ لیں گے تو یہ خیال دل سے نکال دینا۔ میرے بندے ہر وقت تمہارے سروں پر سوار رہیں گے۔''

بشیرا تلملا کر رہ گیا تھا۔ وہ اور اس کے آدمی فوں فوں کرتے ہوئے چلے گئے۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد داراب کو بستی والوں نے گھیر لیا تھا۔ وہ سب اس کا شکریہ ادا کررہے تھے۔ اس کی دلیری کو سراہ رہے تھے کہ جس نے بشیرا جیسے بندے کو نکیل ڈال دی تھی۔

''داراب بھائی یہ تو بتاؤ۔ وہ کون لوگ تھے جو بشیرا کے گھر میں گھس گئے تھے۔'' بستی کے ایک نوجوان نے پوچھا۔

''وہ سب میرے اسٹوڈنٹ تھے۔'' داراب نے بتایا۔

''شہر میں میرا ایک کلب ہے۔ جہاں میں جوڈو اور کراٹے سکھایا کرتا ہوں۔ میں نے ان ہی لوگوں کو بشیرا کے گھر بھیج دیا تھا۔ اب میں وہ کلب چھوڑ چکا ہوں لیکن میرے اسٹوڈنٹ تو ہیں نا۔ وہ سب میرے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔''

''داراب بھائی۔ یہ تو بتاؤ کہ شہر کی زندگی چھوڑ کر تم اس بستی میں رہنے کے لیے کیوں آ گئے ہو؟'' اس سے دوسرا سوال کیا گیا۔

''ہاں۔ یہ ایک سوچنے والی بات ہے۔'' داراب نے کہا۔ ''اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے گاؤں کی زندگی شروع سے پسند رہی ہے۔ یہاں کی کھلی فضا اور آپ جیسے لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ اسی لیے میں نے یہاں مکان کرائے پر لیا ہے۔''

بستی والوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ سب اس دلیر نوجوان کی تعریف کررہے تھے جس نے بغیر کسی لالچ کے بستی والوں کو بشیرا جیسے خبیث سے چھٹکارا دلوا دیا تھا۔

''ہاں۔ اب ایک بات اور کہنا ضروری ہے۔'' داراب نے کہا۔

''بولو داراب بھائی۔''

''بشیرا آپ لوگوں سے ہر مہینے پانچ سو روپے لیا کرتا ہے؟''

''ہاں۔'' سب نے ایک آواز میں کہا۔

''اس کے علاوہ میں نے سنا ہے کہ اس کے بندے جس دکان سے جو چاہیں اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ وہ اور اس کے بندے آپ لوگوں کی توہین کرتے رہتے ہیں۔''

''ہاں داراب بھائی یہی بات ہے۔ ہم تو اس سے تنگ آ چکے ہیں۔ ماسٹر صاحب اس کے خلاف شکایت لے کر کمشنر صاحب کے پاس بھی گئے تھے۔ بلکہ ہم لوگوں نے اب ایک فیصلہ بھی کرلیا ہے۔''

''وہ کیا۔''

''یہی کہ اب بہت ہوگئی۔ انسان کہاں تک برداشت کرے۔'' ایک بوڑھے نے کہا۔ ''اب ہم اس شخص کو ایک پیسا بھی نہیں دیں گے۔ چاہے کچھ ہو جائے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا ناں کہ وہ ہم میں سے کسی ایک کو مار دے گا۔ کسی کو زخمی کردے گا۔ اس سے زیادہ کیا کرسکتا ہے؟''

''ہاں...... ہاں...... اس سے زیادہ کیا کرلے گا۔'' سب نے کہا۔

''اب میں آپ لوگوں سے ایک بات کہوں۔ آپ لوگ میری بات مان لیں گے؟''

''کیوں نہیں داراب بھائی۔ آپ تو ہمارے محسن ہیں۔''

''اب آپ لوگ مجھے ایک ہزار روپے ماہانہ دیا کریں۔'' داراب نے کہا۔ ''کم از کم میرا اتنا تو حق بنتا ہے نا؟''

سب خاموش ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تھے۔ اس خاموشی کو شنگھائی ٹیلرنگ والے نے توڑا تھا۔ ''ہاں...... ہاں...... داراب بھائی۔ تمہارا تو حق بنتا ہے۔ تم نے بشیرا سے ہماری جان چھڑا دی ہے۔ کم از کم میں تو ہزار دے دیا کروں گا۔''

داراب مسکرا دیا۔

اب اس بستی کے لوگ ہر مہینے پانچ سو کی بجائے ہزار روپے دیا کرتے ہیں۔

پہلے تو داراب اکیلا تھا۔ اب اس کے کئی ساتھی بھی اسی بستی میں آ کر رہنے لگے ہیں۔ اور بستی والے آپس میں یہی باتیں کرتے ہیں۔ ''بھائیو...... اس سے بہتر تو وہی بشیرا تھا۔''

ایک بات بتائیں۔ کیا ہمارے معاشرے میں اور ہمارے ملک میں یہی نہیں ہو رہا ہے؟

کیا ہم ہر نئے آنے والوں کے ہاتھوں پہلے سے زیادہ لٹ نہیں رہے ہیں؟



شریف

محترم مدیر السلام علیکم
یہ سچ بیانی جس شخص کی ہے اسے میں قابل احترام سمجھتی ہوں کیونکہ محمد شریف صرف نام کا ہی شریف نہیں ہے بلکہ حقیقتاً شریف ہے تبھی تو اس نے اتنی بڑی قربانی دی۔ شریف کی روداد پڑھ کر آپ بھی میرے ہم خیال ہو جائیں گے۔

راحت وفا راجپوت
(لاہور)

لوگ کہتے ہیں شریف آدمی وہ ہوتا ہے جسے موقع نہیں ملتا، دوسرے لفظوں میں ہر شریف آدمی کے اندر ایک برا آدمی چھپا ہوتا ہے جو موقع ملنے پر باہر آجاتا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ بات سچ ہو مگر کچھ شریف آدمی میرے جیسے بھی ہوتے ہیں جن کو موقع مل بھی جائے تو بھی وہ فائدہ نہیں اٹھاتے۔ آپ سمجھے نہیں؟ ٹھہریئے میں آپ کو اپنی کہانی سناتا ہوں۔

میرا نام شریف ہے۔ صرف نام ہی شریف نہیں، میں ہوں بھی بہت شریف۔ ایسا شریف جسے بزدل کہنا زیادہ

مناسب ہوگا۔ بچپن سے ہی ہر کوئی میری شرافت کا فائدہ اٹھاتا رہا ہے۔

ہم تین بہن بھائی تھے۔ سب سے بڑی جمیلہ جسے ہم آپا کہتے تھے۔ پھر میں یعنی شریف اور سب سے چھوٹا حنیف۔ ابا بازار میں دہی بھلے کی ریڑھی لگاتے تھے۔ اماں سیدھی سادی گھریلو عورت تھی جو سارا دن کام میں مصروف رہتی تھی۔ جمیلہ آپا نے آٹھ جماعتیں پڑھ کر پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ اب وہ اماں کے ساتھ گھر کے کام کراتی تھی۔ میں اس وقت آٹھویں کلاس میں تھا جب جمیلہ آپا کی شادی ہوگئی اور وہ دوسرے شہر چلی گئی۔ حنیف اس وقت پانچویں جماعت میں تھا۔ وہ بہت خوبصورت، تیز طرار اور ہر جگہ نمایاں رہتا تھا جبکہ میں کسی سے زیادہ دیر بات بھی نہ کرسکتا تھا۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی تھی۔ اسکول میں بھی سہما سہما رہتا۔ میری شکل بھی عام سی تھی اور عمر کے مطابق قد بھی چھوٹا تھا۔ ہر اتوار کو ابا سبزی منڈی جاتے اور وہاں سے ہفتے بھر کا سامان یعنی آلو، پیاز، ٹماٹر وغیرہ لاتے تھے۔ رات کو وہ ہم دونوں بھائیوں کو کہہ دیتے کہ صبح جلدی اٹھنا ہے، میرے ساتھ منڈی چلنا۔ اور صبح عین وقت پر حنیف کو کہیں نہ کہیں درد ہونے لگتا یا وہ دوستوں کے ساتھ کرکٹ میچ کھیلنے چلا جاتا۔ ابا اسے دو چار گالیاں دیتے۔ اماں کہتی ابھی چھوٹا ہے، بچہ ہے کوئی بات نہیں۔ شریف ہے نا، یہ جائے گا ساتھ۔ اور میں خاموشی سے ابا کے ساتھ چل پڑتا۔ ابا سستی سے سستی چیز خریدنے کے لیے گھنٹوں منڈی میں پھرتا۔ میں بڑے بڑے تھیلے پکڑے ساتھ ساتھ رہتا۔ گھر آکر اماں سارا سامان الگ الگ کرتی۔ مجھے ساتھ لگائے رکھتی۔ ابا روزانہ سہ پہر چار بجے دہی بھلے کی ریڑھی لگاتے اور رات بارہ بجے تک گھر واپس آتے تھے۔ میں اسکول سے گھر آتا تو اماں آلو اور چنے ابال چکی ہوتی تھی۔ میں اماں اور ابا سارا سامان تیار کرتے اور چار بجے تک ریڑھی پر ہر چیز تیار ہوتی تھی۔ ابا کے جانے کے بعد میں کتابیں لے کر بیٹھتا تو تھکاوٹ کے مارے کوئی سبق نہ یاد کرپاتا اور نتیجتاً اگلے دن اسکول میں ٹیچر سے مار کھاتا۔ حنیف گھر آکر میری کارکردگی کی پوری رپورٹ دیتا تھا۔ روز روز کی شکایتوں سے تنگ آکر ابا نے کہا۔ ”بس بہت ہوگئی پڑھائی۔ میرے ساتھ ریڑھی لگایا کر۔“

یوں پڑھائی بھی ختم ہوگئی۔ اب میں ابا کے ساتھ ریڑھی لگانے لگا تھا۔ ابا اب کمزور اور بوڑھا ہوگیا تھا اور متواتر کھڑا رہنے سے اس کے گھٹنوں میں تکلیف رہنے لگی تھی۔ اب میں سارا وقت کھڑا رہتا اور ابا ایک اسٹول پر بیٹھا رہتا۔ وقت گزرتا رہا، جمیلہ آپا کے تین بچے ہوگئے تھے۔ حنیف نے میٹرک کے بعد آگے پڑھنے سے انکار کردیا تھا۔ رات کو دیر تک دوستوں کے ساتھ باہر رہتا اور دن کو سویا رہتا۔ جب اماں ابا نے چند دن کے بعد ریڑھی کا سامان تیار کرنے میں ہاتھ بٹانے کا کہا تو اگلے ہی دن کمپیوٹر کورس کرنے کا اعلان کردیا۔ اس کے لیے ابا سے چار ہزار فیس کے نام پر بھی لے لیے۔ بقول اس کے کہ یہ کورس کرنے کے بعد اسے بہت اچھی تنخواہ پر نوکری مل جائے گی۔ اماں ابا ہمیشہ کی طرح اس کی ہر بات پر آمین کہتے رہے۔ اب وہ صبح دس بجے تیار ہوکر بہترین ناشتا کرکے گھر سے نکل جاتا اور رات گئے ہی واپس آتا تھا۔

میں عمر میں اس سے بڑا ہونے کے باوجود اس سے چھوٹا لگتا تھا۔ وہ لمبا اونچا ہوگیا تھا۔ میری زندگی ایک روبوٹ کی طرح تھی جو روزانہ ایک جیسے کام کرتا ہے۔ جو اسے ہدایت ملتی ہے اسی کے مطابق حرکت کرتا ہے۔ میری روزانہ کی روٹین میں اس دن تبدیلی آتی جب میں جمیلہ آپا کو لینے ان کے سسرال جاتا تھا۔ آپا دوسرے شہر میں بیاہی گئی تھیں۔ ان کا شوہر ٹھیکیدار تھا اور سنا تھا کہ ہر وقت مصروف ہوتا ہے۔ لہٰذا جب بھی آپا کو میکے آنا ہوتا تھا وہ مجھے فون کردیتیں اور میں جاکر انہیں لے آتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے بچے اور سامان بڑھتا جارہا تھا اور باقی کاموں کی طرح یہ ذمہ داری بھی میرے ہی سر پر تھی۔ کئی بار میں نے کوشش کی کہ اماں سے کہوں حنیف کو بھیج دیں مگر ہمت ہی نہ پڑی اور کبھی کبھار دبے لفظوں میں کچھ کہنے کی کوشش کی بھی تو آگے سے یہی سننے کو ملا کہ وہ تمہاری طرح فارغ نہیں ہے۔ کمپیوٹر کورس کررہا ہے جو کہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کے پاس اتنا ٹائم کہاں ہے۔ تو میں چپ ہوجاتا۔ میں آپا کے گھر پہنچتا۔ وہ سامان باندھے تیار ہوتی تھیں۔ چائے پانی سے فارغ ہوتا تو واپسی کے لیے چل پڑتے۔ رات ہونے سے پہلے پہلے گھر آجاتے۔ آپا کی ساس اچھی عورت تھیں۔ وہ کہتی۔
”ارے بہو! بھائی ابھی ابھی آیا ہے۔ تھکا ہوا ہے۔ ذرا آرام کرنے دو۔ کھانا کھا کر چلے جانا۔“

وہ کبھی کبھی روک بھی لیتیں۔ آپا مجبوراً رک جاتیں حالانکہ ان کا بالکل بھی موڈ نہیں ہوتا تھا کچھ دیر رکنے کا۔

اور پھر ایک دن میری بے رونق اور سپاٹ زندگی میں

ایک خوبصورت موڑ آیا اور اس موڑ کا نام تھا ''رانو''۔ رانو کا مکمل نام کیا تھا میں نہیں جانتا تھا۔ وہ جمیلہ آپا کی چھوٹی نند تھی۔ شوخ چنچل اور خوبصورت۔ مہینے میں دو بار تو میرا جمیلہ آپا کے گھر جانا ہوتا تھا۔ ایک بار آپا کو لینے کے لیے اور دوسری بار واپس چھوڑنے کے لیے۔ آپا کے سسرال میں سب میری روٹین کے عادی تھے اور اب اجنبیت بھی کم ہوگئی تھی۔ میرے بہنوئی تو کبھی کبھار ہی گھر ملتے تھے البتہ آپا کی ساس اور نند سے ہر بار ملاقات ہوجاتی تھی۔ رانو اپنی ماں کے کہنے پر کئی بار میرے لیے کھانا لے کر آئی تھی۔ وہ مجھے ہمیشہ شریف جی کہہ کر بات کرتی۔ ''کیا حال ہے شریف جی، چائے پئیں گے شریف جی۔'' اور میں شرمندہ سا بیٹھا رہتا۔ مجھے لگتا تھا جیسے وہ میرا مذاق اڑا رہی ہو۔ پھر آہستہ آہستہ مجھے اس کی شوخ عادت کا اندازہ ہوگیا۔ وہ جب بھی مجھے مخاطب کرتی تو مجھے اپنا آپ بڑا معتبر لگتا اور پھر میں خواب دیکھنے لگا۔ مجھے رانو بہت اچھی لگنے لگی۔ اب میں کوشش کرتا کہ آپا کے گھر زیادہ دیر رکوں اور کھانا کھالوں۔ خیالوں میں اس سے ڈھیروں باتیں کرتا مگر اس کے سامنے بول نہ پاتا۔ ہر بار یہ سوچ کر جاتا کہ اس بار دل کا حال ضرور کہوں گا۔ پھر کچھ نہ کہہ پاتا۔

ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ حنیف کا ابھی تک کمپیوٹر کورس جاری تھا کہ ایک رات اچانک ابا کو دل کا اٹیک ہوگیا۔ اسپتال لے جانے اور ایک ماہ وہاں علاج ہونے سے زندگی تو بچ گئی مگر اب ابا کو ڈاکٹر نے صرف آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ زیادہ دیر چلنے پھرنے، کوئی مشقت والا کام کرنے اور ٹینشن لینے سے سختی سے منع کردیا تھا۔ لہٰذا اب دہی بھلے کی ریڑھی میں اکیلا ہی لگانے لگا۔ میں اور اماں ساری تیاری کرتے۔ ابا تھوڑا بہت ہاتھ بٹا دیتے تھے۔ چند ماہ تو ابا کی پریشانی اور اکیلے کام سنبھالنے کی وجہ سے کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ اس دوران جمیلہ آپا اپنے میاں کے ساتھ خود ہی دو تین بار ابا کی خبر لینے آگئیں۔ ذرا حالات سیٹ ہوئے تو رانو کا خیال آیا۔ میں نے سوچا اس بار جاؤں گا تو آپا سے کہوں گا اپنی ساس سے رانو اور میرے رشتے کی بات کریں۔ مگر اس سے پہلے ہی آپا کی ساس بہت بیمار پڑ گئیں۔ اب ریڑھی کا کام تھا اور ابا کی طبیعت بھی ٹھیک نہ تھی سو اس بار اماں نے حنیف کو ساتھ چلنے کو کہا۔ پہلے تو وہ ٹال مٹول کرتا رہا پھر جب اماں نے یہ کہا کہ ٹھیک ہے شریف میرے ساتھ چلا جاتا ہے تم دو دن ریڑھی لگالو، تو وہ جانے کو راضی ہوگیا۔

اماں دوسرے دن واپس آگئیں اور چند دن بعد جمیلہ آپا اچانک آگئیں تو سب حیران ہوگئے کیونکہ انہیں گئے ابھی پندرہ دن ہوئے تھے اور اب تو اماں اور حنیف بھی مل آئے تھے۔ آپا کے میاں بھی ساتھ تھے۔ چند گھنٹوں کے بعد آپا واپس چلی گئیں اور دوسرے ہی دن ایک حیران کن بات ہوئی کہ سارا سامان ریڑھی پر رکھ کر جب میں بازار کی طرف نکلنے لگا تو حنیف بھی میرے ساتھ آگیا۔ چلو آج میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ آج کل فارغ ہوں۔ میں خوش ہوگیا۔ وہ میرے ساتھ گیا اور سارا ٹائم اسٹول پر بیٹھ کر مجھے دیکھتا رہا۔ اس نے ذرا سا بھی کام نہیں کیا۔ میں گاہکوں کو نمٹاتا، پلیٹیں دھوتا، وہ دیکھتا رہا، پھر بولا، شریف تم کتنے بے وقوف ہو۔ خود ہی سارا کام کرتے ہو۔ روزانہ دہاڑی پر کوئی لڑکا برتن دھونے اور پلیٹیں پکڑانے کے لیے رکھ لو۔ تم صرف دہی بھلے ڈال کر دیا کرو۔ میں تو حیران ہی رہ گیا۔ یہ بات تو کبھی میرے ذہن میں آئی ہی نہیں تھی اور نہ ہی کبھی ابا نے ایسا کہا تھا۔ گھر آکر وہ کافی دیر تک ابا سے بات کرتا رہا۔ ہمارے دہی بھلے کافی مزیدار ہوتے تھے اور صاف ستھرے بھی۔ آمدنی بھی ٹھیک ہی ہوتی تھی۔ جہاں ریڑھی کھڑی کرتے تھے وہ بازار کے درمیان میں جگہ تھی اور ایک پراپرٹی ڈیلر کی دکان کا اگلا حصہ تھا۔ وہ شام کو دکان بند کردیتا تھا اور وہاں ہم ریڑھی لگاتے تھے۔ گاہک آتے اور وہیں کھڑے ہوکر دہی بھلے کھاتے تھے۔ اس جگہ کا ہم کرایہ دیا کرتے تھے اور بہت سالوں سے یہی معمول تھا۔ مگر اب حنیف ساتھ جانے لگا۔ اس نے سارے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

اس نے ایک درجن پلاسٹک کی کرسیاں اور تین میز منگوائے۔ شام کو ریڑھی کے قریب دیوار کے ساتھ کرسیاں اور میز لگا دیے۔ اس کے علاوہ اس نے نزدیکی دکان جو کہ پان، سگریٹ اور بوتلوں کی تھی اس سے بات کرلی کہ اس سے بوتلیں لے کر دہی بھلوں کے ساتھ بیچا کریں گے۔ اب یہ ہونے لگا کہ حنیف پہلے ہی پوچھ لیتا کہ دہی بھلے کے ساتھ بوتل لیں گے۔ جو گاہک کہتا اسے بوتل منگوادی جاتی۔ اوپر کے کام اور برتن دھونے کے لیے روزانہ اُجرت پر ایک تیز طرار لڑکا رکھ لیا۔ یوں دہی بھلے کی ریڑھی اچھی خاصی دکان بن گئی اور آمدنی بھی زیادہ ہونے لگی۔ میں حیران تھا۔ اب میں صرف دہی بھلے ڈال کر دیتا تھا۔ لڑکا گاہکوں کو پلیٹیں پکڑاتا اور برتن دھوتا۔ حنیف ایک طرف بیٹھا سارا عمل

دیکھتا اور کیش وصول کرتا تھا۔ اب ساری کمائی اسی کے ہاتھ میں جاتی تھی۔ وہی سودا لانے کے لیے مجھے پیسے دیتا تھا۔ سارے معاملات اس کے ہاتھ میں تھے۔

مجھے تو وہ کوئی جادوگر لگتا تھا جس نے جیسے جادو کی چھڑی سے سارا کچھ بدل دیا تھا۔ حالانکہ یہ سامنے کی بات تھی مگر بات وہی ہے نا کہ ابا اور میں لکیر کے فقیر تھے۔ اور میں تو کسی بھی معاملے میں اپنا فائدہ سوچتا ہی نہیں تھا۔ آپا جمیلہ کی طرف گئے دو ماہ ہو گئے تھے۔ حیرت انگیز بات تو یہ ہوئی تھی کہ اس بار حنیف آپا کو لینے گیا تھا۔ ابھی میں وہاں جانے کا بہانہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک رات آپا کا فون آیا اور دوسری صبح اماں اور ابا ان کے گھر چلے گئے۔ مجھے کچھ نہ بتایا۔ میں نے بھی دھیان نہ دیا۔ اگلے دن واپس آ کر جو خبر اماں نے سنائی، مجھے لگا جیسے میری سماعت چلی گئی ہو۔ کافی دیر مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا کہہ رہی ہیں اماں۔ اور جب سمجھ میں آیا تو دل ہی اجڑ گیا۔ حنیف کا رشتہ آپا کی نند رانو سے پکا ہو گیا تھا۔ چھ ماہ بعد شادی تھی۔ ابا کے سسرال والوں کے اعتراض پر کہ لڑکا ابھی کچھ کرتا نہیں ہے، حنیف نے وہی ٹھیلے کا کام اپنی نگرانی میں لے کر بتا دیا تھا کہ وہ پڑھا لکھا، کمپیوٹر کا ماہر اور چلتی ہوئی دکان کا مالک ہے۔ ہزاروں کی آمدنی والا کام ہے اس کا۔ ان کو اور کیا چاہیے تھا۔ خوبصورت، لمبا، اونچا، پڑھا لکھا، کماؤ لڑکا انہیں اور کہاں ملتا سو انہوں نے فوراً ہاں کر دی۔ اس رات میں تکیے میں سر دے کر بہت رویا۔ تعبیر سے پہلے ہی میری زندگی کا خوبصورت خواب ٹوٹ چکا تھا۔ میں روتا رہا، پچھتاتا رہا۔ اگر میں چپ نہ رہتا، اماں کو رانو کے متعلق بتا دیتا تو آج رانو میرا مقدر ہوتی۔ اگلے دن مجھے بخار ہو چکا تھا۔ پھر اگلے چار دن میں ریڑھی لے کر نہیں گیا۔ گم صم لیٹا رہتا۔ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ حنیف آتے جاتے مذاق اڑاتا۔ میری شادی کا سن کر بیمار ہو گئے ہو۔ پھر اماں سے کہتا۔ شریف کا بھی کہیں رشتہ کر دو اماں۔ تو اماں کہتی، اس کا بھی کروں گی، پہلے کوئی کام تو کرے، کمائی کر کے لائے۔ میں حیران رہ گیا کہ اتنے سالوں سے ریڑھی لگا رہا ہوں، میری کوئی کمائی ہی نہیں ہے۔ اس بات نے مجھے بہت دکھی کیا مگر میں کچھ نہ کہہ سکا۔

چند دن حنیف نے دیکھا۔ جب میں ریڑھی کے ساتھ نہ گیا تو اس نے ایک اور لڑکا رکھ لیا۔ یوں اب ریڑھی مکمل اسی کی ملکیت ہو گئی تھی۔ میں رانو کے غم میں نڈھال رہنے لگا۔ بھوک بھی بہت کم ہو گئی تھی۔

کچھ دن تو اماں نے میری بیماری کو برداشت کیا۔ پھر ایک دن صاف کہہ دیا کہ اب جلدی سے ٹھیک ہو جا اور میرا ہاتھ بٹا۔ میں اکیلی ریڑھی کا سامان تیار نہیں کر سکتی۔ میں کبھی کبھی حیران ہوتا تھا کہ ماں اپنے بچوں میں اور بہن اپنے بھائیوں میں کس طرح فرق کر سکتی ہے اور کم یا زیادہ اہمیت دے سکتی ہے۔ ماں تو ماں ہی ہوتی ہے نا۔

بہرحال، میں نے ہمت کی اور پھر سے ماں کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرنے لگا مگر بہت دن تک بیمار رہنے اور مناسب دوا اور خوراک نہ ملنے کی وجہ سے میں ذرا سا کام کر کے ہانپنے لگتا اور مجھے ٹھنڈے پسینے آنے لگ جاتے۔ چند دن کے بعد ایک دن ابا مجھے ساتھ لے کر ایک جگہ گئے۔ وہاں ایک بڑے سے ہال کمرے میں کڑھائی کے کام کے اڈے لگے ہوئے تھے اور بہت سے لڑکے وہاں سلمہ ستارہ اور موتی ستارے کا کام کر رہے تھے۔ ابا نے مالک سے بات کی اور مجھے کڑھائی کا کام سیکھنے کے لیے وہاں بٹھا دیا۔ میں بغیر کسی اعتراض اور مزاحمت کے چپ چاپ وہاں بیٹھ گیا۔ ایک لڑکے نے میرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا اوزار دیا اور دھاگے کے ساتھ کپڑے کے اوپر کڑھائی کرنا سکھانے لگا۔

میں ایک شریف آدمی ہوں، شریف بھی اور بزدل بھی۔ کیونکہ شریف وہ ہوتا ہے جسے موقع نہ ملے اور میں ایسا شریف تھا کہ باپ کے بیمار ہونے کے بعد ریڑھی پر قبضہ نہ کر سکا، حالانکہ میں بچپن سے یہ کام کر رہا تھا۔ باپ کے بیمار ہونے پر میرے پاس اچھا موقع تھا کہ میں اکیلا ہی ریڑھی کا مالک بن جاتا۔ میں چونکہ بہت شریف تھا اس لیے جما جمایا کاروبار اپنے بھائی کے سپرد کر دیا۔ اپنی پسند اور محبت کو بھائی کے نام ہوتے دیکھتا رہا۔ سب کی طرف سے ہار مان کر اب نئے سرے سے مزدوری کرنے کے لیے تیار تھا۔

کڑھائی سیکھنے کی وہ جگہ کارخانہ کہلاتی تھی۔ وہاں تقریباً بیس لڑکے بیٹھتے تھے۔ کارخانے کا مالک بہت کم وہاں بیٹھتا تھا۔ سارا کام بہت ترتیب سے ہوتا تھا۔ دوپہر کو ایک گھنٹا کھانے کی چھٹی ہوتی تھی۔ میں بھی گھر آ جاتا اور کھانا کھا کر دوبارہ کارخانے چلا جاتا۔ وہاں سے رات کو نو بجے واپس آتا، کھانا کھاتا اور سو جاتا۔ آہستہ آہستہ مجھے کڑھائی کا کام دلچسپ لگنے لگا۔ میں پوری محنت سے کام سیکھنے لگا۔ تین ماہ میں مجھے کافی حد تک کام آ گیا اور میں موتی اور نگینے کا کام بہترین کرنے لگا۔ تب میری دہاڑی طے ہوئی اور مجھے

روزانہ کے حساب سے دو سو روپیا ملنے لگا جو کہ ہفتے کے بارہ سو روپے بنتے تھے۔ وہ بارہ سو روپے میں لا کر ابا کو دیتا تھا اور ابا اس میں سے مجھے دو سو روپے میرے خرچ کے لیے دے دیتے تھے۔ میں بغیر کسی سوال کے پیسے پکڑ لیتا۔ کھانا تو تینوں ٹائم گھر پر کھاتا تھا، کبھی کبھار کوئی چیز باہر سے کھا لیتا۔ کپڑے بھی میرے گنتی کے چار سوٹ تھے جو اماں دھو دیتی اور میں بغیر استری کے ہی پہن لیتا تھا۔

حالانکہ میں عمر کے اس دور میں تھا جب لڑکے اپنا بہت خیال رکھتے ہیں اور صاف ستھرے اور خوشبو لگا پہنتے ہیں۔ لڑکیوں کے پیچھے پھرتے ہیں، کارخانے میں تقریباً ہر لڑکے کا کہیں نہ کہیں کسی لڑکی کے ساتھ چکر چل رہا تھا۔ وہ آپس میں باتیں کرتے تھے، اور رہا میں تو عام سی شکل و صورت، کمزور سا جسم اور چھوٹا قد۔ مجھ میں کوئی ایسی کشش ہی نہ تھی جو صنف نازک کو متوجہ کرتی۔ خود میرا اپنا دل رانو کے معاملے کے بعد بجھ سا گیا تھا۔ گھر میں شادی کی تیاری ہو رہی تھی، میں تیاریاں دیکھتا اور بوجھل دل کے ساتھ گم صم بیٹھا رہتا۔

پھر ایک دن رانو حنیف کی بیوی بن کر آ گئی۔ میں اپنی بے بسی کے ساتھ سب کچھ دیکھتا رہا۔ گھر میں جیسے رنگ سے اتر آئے تھے۔ وہ سارے گھر میں ہنستی مسکراتی پھرتی۔ حنیف سب کے سامنے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا یا کوئی بات ایسی کہہ دیتا کہ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ یہ منظر مجھ پر بجلی بن کر گرتا۔ اور پھر میں نے دوپہر کو کھانے کے لیے گھر آنا بھی چھوڑ دیا۔ کارخانے میں ہی لڑکوں کے ساتھ مل کر کچھ نہ کچھ کھا لیتا۔ رانو مجھ سے بے تکلفی سے مخاطب ہونے کی کوشش کرتی مگر میں اسے کم ہی جواب دیتا تھا۔ پھر وہ بھی زیادہ بات نہ کرتی۔ جب وہ اُمید سے ہو گئی تو حنیف اور گھر والے اس کے اور نخرے اٹھانے لگے۔ دہی بھلے کا کام زبردست جا رہا تھا۔ حنیف مجھے بتاتا رہتا تھا اس کا کہنا تھا کہ میری وجہ سے کام بہت بڑھ گیا ہے۔ اب میں جلد ہی ایک دکان کرائے پر لے کر کام کو اور بڑھاؤں گا۔ میں یہ بھی نہ کہہ سکا کہ میں نے محنت سے اس کام کو چلایا ہے، تم تو پکی پکائی پر آبیٹھے ہو۔ مگر نہ کہہ سکا۔

☆......☆

کارخانے میں ایک نئے لڑکے کا اضافہ ہوا تھا۔ اس کا نام عامر تھا۔ عامر آری کے کام میں ماسٹر تھا۔ وہ ایک خوبصورت اور ہنستا مسکراتا نوجوان تھا۔ بہت جلد وہ سب

بھارت کے لیے سیاہ جمعہ

1960ء میں روم اولمپکس کے ہاکی فائنل میں پاکستان کے ہاتھوں بھارت کی شکست نے بھارت میں افسردگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ ہر کوئی بے یقینی کی حالت میں تھا خاصے دنوں تک بھارتی عوام اس شکست پر افسردہ دکھائی دیے اخبارات نے بھی بہت کچھ لکھا، بھارت کے ایک بڑے اخبار انڈین ایکسپریس نے اپنی اشاعت میں پاکستان اور بھارت کے درمیان کھیلے گئے فائنل میچ والے دن کو سیاہ دن قرار دیا۔ یہ فائنل مقابلہ 9 ستمبر بروز جمعہ کو کھیلا گیا تھا۔ اخبار لکھتا ہے 9 ستمبر جمعہ کا دن بھارت کے لیے سیاہ جمعہ تھا کیونکہ اس 9 ستمبر کے سیاہ جمعہ نے اولمپکس ہاکی میں 1928ء سے جاری بھارت کے اقتدار کو ختم کر دیا جبکہ پاکستانیوں کے لیے یہی جمعہ مبارک ثابت ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ اخبار نے یہ بھی بتایا کہ فائنل کے اختتام پر پریس باکس پر بیٹھا ہوا ایک بھارتی صحافی پنکج گپتا بھارت کی اس شکست پر آنسوؤں سے رو پڑا۔

مرسلہ: احسن حبیب، پشاور

وننگ گول اور بچے کی پیدائش

روم اولمپکس میں پاکستان اور بھارت کے درمیان فائنل میں پاکستان نے صرف ایک گول سے کامیابی حاصل کی، پاکستان کا یہ واحد گول لیفٹ ان نصیر بندہ نے کھیل کے 11 ویں منٹ پر نور عالم کے پاس پر بنایا تھا۔ ایک اطلاع کے مطابق جس وقت نصیر بندہ نے بھارت کے خلاف پاکستان کے لیے گول اسکور کر کے گولڈ میڈل جتوایا اسی وقت راولپنڈی میں ان کے گھر ایک بچے نے جنم لیا اس بچے کا نام بعد میں آصف نصیر رکھا گیا جو آج خود پاکستان کسٹمز سے ہاکی کھیلتا ہے۔

مرسلہ: رانا بشیر، ملتان

لڑکوں سے گھل مل گیا۔ وہ باتیں بھی بہت دلچسپ کرتا تھا۔ کبھی لطیفے اور کبھی شعر سناتا۔ سب اسے پسند کرتے تھے۔ مالک اس پر بہت بھروسا کرتا تھا۔ تیار مال لے کر دوسرے شہر جانا ہوتا تو عامر مالک کے ساتھ جاتا تھا۔ اس کی دہاڑی بھی زیادہ تھی۔ میرے ساتھ بھی وہ باتیں کرتا۔ میں ہوں ہاں میں جواب دے دیتا مگر اس کی ہنس مکھ طبیعت نے میری جھجک بھی ختم کردی۔ اب میں بھی اس سے بات کرلیتا تھا۔ وہ اپنا دوپہر کا کھانا گھر سے لے کر آیا کرتا تھا کیونکہ اس کا گھر کارخانے سے کافی دور تھا۔ اگر وہ دوپہر کو گھر جاتا تو آنے جانے میں بہت ٹائم لگتا تھا۔ وہ جب کھانا کھانے لگتا تو مجھے ضرور شامل کرلیتا۔ میرے انکار کے باوجود وہ زبردستی کھانا کھلاتا۔ مجھے بھی اپنے آپ کو اہمیت دینا اچھا لگ رہا تھا اس لیے میں نے اس کی دوستی کو قبول کرلیا تھا۔

کارخانے کا دروازہ کافی بڑا تھا جو کہ کھلا رہتا تھا۔ باہر سڑک تھی۔ یہ کوئی مین سڑک نہیں تھی بلکہ چھوٹی سڑک تھی جہاں سے ٹریفک نہیں گزرتی تھی بس موٹر سائیکل اور لوگ آتے جاتے تھے۔ چند دن سے میں نے نوٹ کیا تھا کہ عامر کا دھیان دروازے کے باہر رہنے لگا ہے۔ پھر یہ ہونے لگا کہ ایک مخصوص وقت پر وہ اٹھ کر باہر نکل جاتا اور پانچ منٹ بعد آکر کام میں مشغول ہوجاتا۔

دوپہر کو دو بجے کھانے کی چھٹی ہوتی۔ کچھ وہیں کھالیتے، کچھ بازار چلے جاتے تھے۔ میں عامر کے ساتھ وہیں کھانا کھاتا تھا۔ ایک دن کھانے کے بعد اس نے مجھے ساتھ لیا اور کارخانے سے ذرا آگے کھڑا ہوگیا۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے۔ اس نے کہا بعد میں بتاؤں گا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لڑکی آتی دکھائی دی۔ ''دیکھو شریف! وہ لڑکی جو آرہی ہے سمجھ لو تمہاری بھابی ہے۔''

میں نے حیران ہوکر اسے دیکھا تو ہنس پڑا۔ ابے گھامڑ، میری معشوق ہے۔ اتنی دیر میں وہ قریب آگئی۔ میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ بے حد خوبصورت تھی جیسے دودھ میں گلابی رنگ ملا ہو، جیسے چمکتا ہوا چاند۔ میں تو رعب حسن سے مرعوب ہوگیا۔

''سحر، یہ میرا دوست شریف ہے۔'' عامر نے تعارف کرایا۔

اس نے مجھے سلام کیا۔ اچھا شریف میں آتا ہوں، تم چلو۔ عامر اس کے ساتھ آگے کی طرف چل پڑا۔ اس وقت اردگرد کوئی نہیں تھا۔ میں کارخانے میں آکر کام کرنے لگا۔

دل میں دونوں کی جوڑی کو سراہ رہا تھا۔ واقعی دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے۔ دونوں خوبصورت اور خوش قسمت تھے۔ پھر عامر سحر کے بارے میں اکثر میرے ساتھ بات کرنے لگا۔ ایک طرح سے میں اس کا رازداں تھا۔

اس نے بتایا کہ سحر میٹرک پاس ہے اور آج کل ایک بیوٹی پارلر میں بیوٹیشن کا کورس کررہی ہے۔ کچھ دن پہلے ہی میری اس سے دعا سلام ہوئی ہے۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہیں۔ بلکہ مجھ سے زیادہ سحر مجھے چاہتی ہے۔ اس کی ماں ہمارے بارے میں جانتی ہے مگر اس کے بھائی اور باپ کو خبر نہیں ہے۔ سحر اکلوتی بیٹی اور اکلوتی بہن ہے۔ اس کے تین بھائی ہیں۔ دو اس سے چھوٹے اور ایک بڑا۔ گھر میں سحر کی کافی بات مانی جاتی ہے۔

میں نے ابھی گھر والوں سے ذکر نہیں کیا۔ میری بڑی دو بہنیں ابھی کنواری ہیں۔ مناسب وقت پر اپنی امی سے بات کروں گا۔ مگر اس سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ کسی کو ہمارے بارے میں پتا نہ چلے۔ اس لیے میں نے تمہیں اس سے ملوایا ہے کہ کبھی کوئی ایسا وقت آجائے کہ میرا اس سے رابطہ نہ ہوسکے تو تم اس تک میرا پیغام پہنچا سکو۔

مجھے عامر کی بات سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ مگر یہ الجھن تھی کہ مجھے سحر سے ملوانے کا کیا مقصد تھا، وہ ختم ہوگئی۔

اب اکثر ہی عامر سحر کی باتیں میرے ساتھ کرنے لگا۔ وہ مختلف جگہوں پر بڑے محتاط طریقوں سے ملاقات بھی کرچکے تھے۔ وہ اپنی ہر ملاقات کا احوال مجھے سناتا تھا۔ ایک دن اس نے مجھے بہت مشکل امتحان میں ڈال دیا۔ اس نے کہا کہ جس دن مالک مال لے کر جائے گا اس دن دوپہر کو کھانے کے وقت جب لڑکے گھر اور بازار وغیرہ چلے جائیں گے تو کارخانہ خالی ہوجائے گا۔ میں سحر سے ملنا چاہتا ہوں۔ ہم نے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ تم دروازے پر کھڑے ہوجانا اور جیسے ہی کوئی آتا دکھائی دے ہمیں بتادینا۔ میں تو یہ بات سن کر ہی ڈر گیا۔ اگر وہ دونوں پکڑے جاتے اور ان کا ساتھ دینے کے لیے ابا تو میری جان نکال لیتا۔ میں نے انکار کردیا مگر وہ اصرار کرتا رہا۔ اپنی دوستی کے طعنے دیتا رہا۔ اس نے مجھے بے حد مجبور کردیا تھا۔ میں زیادہ دیر مزاحمت نہ کرسکا اور ہاں کردی۔

پھر ایک دن جب مالک نہیں تھا اور لڑکے بھی کھانا کھانے نکل گئے تو میں اور عامر وہیں رہ گئے۔ اکثر ہی ہم

وہاں ٹھہر جاتے تھے۔ سحر کو پہلے ہی بتا دیا تھا اس نے۔ میں دروازے میں کھڑا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی آئی۔ اس نے چادر میں اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ وہ کارخانے کے اندر آ گئی۔ عامر اسے ساتھ لے کر پچھلی طرف بنے ایک کمرے کی طرف لے گیا۔ وہ استاد کا کمرا تھا جہاں وہ آرام کرتا تھا۔ میں دروازے پر کھڑا لرز رہا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا پسینا میرے جسم کے ہر مسام سے نکل کر میرے سارے وجود کو گیلا کر چکا تھا۔ میں انتہائی خوف زدہ تھا۔ اگر مالک آ گیا یا کوئی لڑکا تو پھر کیا ہوگا۔ اماں ابا تو مجھے گھر سے نکال دیں گے۔ پندرہ منٹ کا وہ وقت پندرہ صدیاں بن گیا۔ عامر نے پندرہ منٹ کا وعدہ کیا تھا اور پندرہ منٹ کے بعد سحر تیزی سے دروازے کی طرف آئی۔ میں نے باہر دونوں طرف دیکھا، کوئی نہیں تھا، میں نے سحر کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے نکل کر ایک طرف چل دی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرا جسم بے جان ہو گیا ہو۔ میں وہیں دروازے میں بیٹھ گیا۔ لمبے لمبے سانس لینے لگا، میں کافی دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ عامر باہر نہیں آیا۔ میں نے اٹھ کر کولر سے پانی پیا۔ سانس بحال ہوئی تو عامر کو آواز دی۔ وہ مسکراتا ہوا آیا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور سرمستی کی کیفیت تھی۔ اس نے آتے ہی مجھے گلے لگا لیا۔ ''شکریہ دوست! تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ آج محبوب سے ملاقات ہوئی ہے کھل کے۔'' وہ ہنس رہا تھا اور میں اسے حیرانگی سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے رانو کا خیال آ گیا۔ پھر میں نے اپنے آپ کو ڈانٹا۔ اب وہ میری بھابی ہے۔

☆......☆

اس ملاقات کی کامیابی نے عامر کے حوصلے کو بڑھا دیا تھا۔ میرا بھی اب وہ پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگا تھا۔ اگلے چھ ماہ میں عامر اور سحر کی کارخانے میں تین ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ ہر بار میری حالت خراب ہو جاتی تھی۔ اس دوران رانو کی گود میں ایک پیاری سی بیٹی آ چکی تھی۔ میرا گھر سے بس اتنا سا تعلق رہ گیا تھا کہ صبح و شام کھانا کھاتا اور سو جاتا۔ پیسے لا کر ابا کو دے دیتا۔ اماں کو دہی بھلے کے کام سے اب کچھ فراغت مل گئی تھی کیونکہ رانو نے کافی کام سنبھال لیا تھا۔ اب اماں پوتی کے ساتھ مگن رہتی تھیں۔ میری شادی کا کسی کو کوئی خیال نہیں تھا۔ کبھی کبھار کوئی ملنے والی کہہ بھی دیتی تو اماں کہتیں ابھی کام سیکھ رہا ہے۔ کر لوں گی۔ کچھ کمائی تو کر کے لائے۔ اتنے سے پیسوں میں گھر گرہستی کہاں چلتی۔

میں چپ چاپ دیکھتا رہتا کہ ماں کی محبت پر شک کرنا گناہ عظیم ہے۔ ایک دن عامر نے ایک دھما کا خیز خبر سنائی کہ اس نے اور سحر نے گھر سے بھاگنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں تو ہکا بکا رہ گیا۔

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''یار بڑی بہنوں کے ہوتے ہوئے میری ماں تو میری شادی کسی صورت نہیں کرے گی۔ ادھر سحر کے گھر والے اس کے لیے رشتہ دیکھ رہے ہیں۔ وہ مجھے کہتی ہے اپنے گھر والوں کو بھیجو، میری اماں میرے ساتھ ہے۔ مگر ایسا ممکن نہیں ہو رہا۔ لہٰذا ہم نے سوچا ہے کورٹ میرج کر لیں گے۔ بس چند دن کی بات ہے۔''

میں کیا کہتا، خاموشی سے سنتا رہا۔ چند دن بعد عامر نے مجھے بتایا کہ سارا پروگرام طے ہو چکا ہے۔ تم سحر کو ساتھ لے کر رات آٹھ بجے بس اڈے پر پہنچ جانا۔ سحر تمہیں کارخانے والی سڑک پر ملے گی، میں الگ وہاں پہنچوں گا اور پھر جو بھی بس ملی ہم دونوں بیٹھ کر دوسرے شہر چلے جائیں گے۔ سحر پیسے اور کچھ زیور ساتھ لائے گی۔ ایک بار نکاح ہو جائے پھر کچھ نہیں کر سکیں گے ہم دونوں کے گھر والے۔ میری اماں میرے بغیر رہ نہیں سکتی اور سحر کی ماں بھی اس کے ساتھ ہے۔ میں تو عجیب کشمکش میں پڑ گیا۔ میں کیسے سحر کو ساتھ لاؤں گا۔ میرے ابے نے تو میرا کچومر نکال دینا ہے اور حنیف وہ بھی مجھے نہیں چھوڑے گا۔

''کیا سوچنے لگے۔ تم اس سے ذرا ہٹ کر چلنا۔ اڈے پر پہنچ کر اس سے ذرا فاصلے پر کھڑے رہنا۔ میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔ سحر کو ایک محفوظ جگہ پر پہنچا کر میں صبح ہونے سے پہلے آ جاؤں گا۔ کسی کو مجھ پر شک نہیں ہوگا۔ پھر بعد میں باقی پروگرام پر عمل ہوگا۔''

مجھے تو رات بھر نیند نہ آئی۔ اگلا سارا دن بھی پریشانی میں گزرا۔ میری تو بھوک پیاس اڑ گئی تھی جبکہ عامر ویسے ہی خوش باش تھا۔

جوں جوں شام ہو رہی تھی میرا دل ڈوب رہا تھا۔ رات آٹھ بجے سے پہلے ہی عامر کارخانے سے چلا گیا۔ آٹھ بجے سب کی چھٹی ہو جاتی تھی۔ البتہ جو اوور ٹائم لگانا چاہتا تھا وہ لگا لیتا۔ میں آٹھ بجے مرے مرے قدموں سے باہر نکلا۔ کچھ دوری پر سحر کھڑی نظر آئی۔ میں اس کے قریب پہنچا تو وہ کہنے لگی۔ ''تم ذرا ہٹ کے میرے ساتھ چلو۔'' اور پھر تیز قدموں سے چلنے لگی۔ اس کے انداز میں کوئی گھبراہٹ نہیں

تھی۔ وہ بڑے اعتماد سے چل رہی تھی جیسے گھر جا رہی ہو۔ میں اس کی ہمت پر حیران تھا۔

بس اڈا شہر کی رونق سے ذرا الگ اور دور تھا۔ وہاں پر دو تین بسیں کھڑی تھیں۔ مسافر بھی آ جا رہے تھے۔ اڈے سے آخری بس گیارہ بجے نکلتی تھی جو لاہور جاتی تھی۔ سحر ایک کونے میں کھڑی ہوگئی۔ میں اس سے ذرا ہٹ کے کھڑا تھا اور دل میں دعائیں کر رہا تھا کہ عامر جلدی سے آ جائے تو میں اپنے گھر جاؤں۔ مگر عامر کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ وقت گزر رہا تھا اور میری حالت خوف سے پتلی ہو رہی تھی۔ میرے ایک جانب کھڑا اڈے کا ٹھیکیدار نظر آیا مگر قریب نہ آیا۔ میں سہما ہوا کھڑا تھا۔ پیٹ میں گرہیں پڑ رہی تھیں۔ ابھی تک مجھے کوئی میرا شناسا نظر نہیں آیا تھا۔ سحر کے پاس چونکہ اور بھی عورتیں کھڑی تھیں اس لیے کسی کو نہیں لگا کہ وہ اکیلی ہے۔ البتہ مجھے اڈے کے ٹھیکیدار نے دو چار بار گھور کر دیکھا مگر کہا کچھ نہیں۔ نو بج گئے۔ عامر نہیں آیا۔ اس وقت موبائل بھی نہیں ہوتے تھے جو رابطہ ہو جاتا۔ ساڑھے نو بجے سحر میری طرف آئی۔

"کہاں ہے عامر، آیا کیوں نہیں ابھی تک؟" وہ بڑے رعب سے بولی۔

میں گڑبڑا گیا۔ "مجھے کیا پتا۔ اس نے تو آٹھ بجے کے بعد آنے کا کہا تھا۔"

"دیکھو میرے ساتھ کوئی گیم کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ تم مجھے جانتے نہیں ہو۔" اس نے بڑے غصے سے کہا۔

میں تو ہکا بکا رہ گیا۔ مجھے بھلا اتنی باتیں سنانے کی کیا وجہ۔ میں تو ان کی مدد کر رہا تھا۔

"دیکھیں جی۔" میں نے گلا صاف کیا۔ "مجھے اس نے صرف آپ کے ساتھ اڈے تک آنے کا کہا تھا، وہ میں آ گیا۔ اب وہ کہاں ہے مجھے کیا پتا۔ اور کیوں نہیں آ رہا، میں تو خود پریشان ہوں۔" میں نے بھی ہمت کر کے جواب دیا۔

وہ مجھے گھور کر دیکھنے لگی اور پھر واپس اپنی جگہ پر چلی گئی۔ پھر وقت قیامت کی طرح گزرنے لگا۔ ہر آدمی مجھے ابا ہی لگ رہا تھا۔ پھر دس بج گئے، عامر نہیں آیا۔

سحر پھر میری طرف آئی۔ "دیکھیں جی! پتا نہیں وہ کہاں ہے۔"

"کوئی مسئلہ نہ ہو گیا ہو۔ آپ ایسا کریں اپنے گھر چلی جائیں۔" اس کے بولنے سے پہلے ہی میں نے کہا۔

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے یا تم پاگل ہو۔ مجھے گھر سے نکلے ڈھائی گھنٹے ہو چکے ہیں۔ آدھے گھنٹے کا کہہ کر آئی تھی کہ سہیلی کے گھر جا رہی ہوں، اب تو میری تلاش بھی شروع ہو چکی ہوگی اور جب میرے گھر والوں کو پتا چلے گا کہ میں سہیلی کی طرف گئی نہیں تو پھر تو وہ ہر طرف مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔

"آپ کی امی کو تو پتا ہوگا کہ آپ یہاں ہیں۔" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ امی کو صرف میری اور عامر کی محبت کا پتا ہے مگر میرے آج کے پروگرام کا انہیں کوئی علم نہیں ہے۔ وہ اطمینان سے بولی۔

میں دیکھ رہا تھا کہ اس نازک وقت میں بھی اس کے چہرے پر کوئی پریشانی نہیں تھی۔ ابھی ہم بات کر رہے تھے کہ سارا پانسہ ہی پلٹ گیا۔ ایک آدمی اور عورت تیزی سے ہماری طرف آ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں وہاں سے بھاگنے کی کرتا، آدمی نے میرا گریبان پکڑ لیا اور اندھا دھند مارنا شروع کر دیا۔ اردگرد لوگ اکٹھے ہو گئے۔ اس عورت نے سحر کو بالوں سے پکڑا اور اپنے ساتھ لے گئی۔ آدمی مجھے مارتا رہا۔ لوگوں نے چھڑانے کی کوشش کی مگر اس پر تو جنون طاری تھا۔ پھر چند لڑکوں نے زبردستی اسے پیچھے کیا۔ میرا برا حال ہو چکا تھا۔

"ارے یہ تو حنیف دہی بھلے والے کا بھائی ہے۔" ایک لڑکے نے اونچی آواز میں کہا۔

وہ آدمی مجھے مار مار کر تھک چکا تھا اور ہانپ رہا تھا۔ یہ وہ سحر کا باپ تھا۔ اس کی ماں سحر کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ میں نے ان دونوں میاں بیوی کو اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے گھر کا کیسے پتا ہے۔ سحر کے باپ نے پوچھا۔

جس لڑکے نے مجھے پہچانا تھا وہ فوراً بولا۔ "میں لے جاتا ہوں آپ کو۔" اور یوں سحر کا باپ اور چند لڑکے مجھے ساتھ لے کر گھر آ گئے۔ اماں اور ابا پہلے ہی اتنی رات تک میرے گھر نہ آنے پر شدید غصے میں تھے۔ اتنے لوگوں کو میرے ساتھ دیکھ کر اور میری حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

"کیا ہوا ہے شریف کو؟" امی فوراً آگے بڑھیں۔

"اندر کمرے میں چلیں، سب پتا چل جائے گا۔" ایک لڑکے نے ابا سے کہا۔

سب کمرے میں آ گئے۔ حنیف رانو کو لے کر میکے گیا ہوا تھا۔ ماں نے مجھے پانی پلایا۔ میں رونے لگا۔ "اماں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

اماں مجھے کمرے سے باہر بٹھا کر خود کمرے میں ابا

لوگوں کے پاس چلی گئی۔ کافی دیر اندر باتیں ہوتی رہیں، کبھی اونچی آواز میں کبھی نیچی آواز۔ میں خوف زدہ بیٹھا انتظار کرتا رہا کہ اب آگے میرے ساتھ کیا ہوگا۔ کافی دیر بعد سحر کا باپ دوسرے لوگوں کے ساتھ باہر نکلا اور مجھے گھورتے ہوئے گھر سے چلا گیا۔ ابا نے میرے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔ اماں بھی چپ تھی۔ اماں نے مجھے کھانا کھلایا اور چائے کے ساتھ درد کم کرنے والی ٹیبلٹ دی۔ میں کراہتا کراہتا نہ جانے کب سو گیا۔

☆......☆

سیانے کہتے ہیں کہ عورت نے اگر کسی کی طرف متوجہ نہ ہونا ہو تو بھرے میدان میں نظر اٹھا کر نہیں دیکھتی اور اگر کسی سے ملنا چاہتی ہو تو بند قلعے میں رہ کر بھی مل لیتی ہے۔

دور کہیں اذان کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ چند لمحے تو میں نے خود کو عامر کے اور سحر کے ساتھ پایا۔ دوسرے ہی لمحے پورے جسم میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھیں تو یاد آیا کہ میرے ساتھ کیا حادثہ ہو چکا ہے۔ عامر نے ایسا کیوں کیا۔ سحر کو بلا کر خود کیوں نہیں آیا۔ یہ ایک ایسا راز تھا جس کا علم صرف عامر کو ہی تھا۔ اور سحر کس قدر بہادر اور نڈر نکلی کہ اس کے ایک اشارے پر سب کچھ چھوڑ کر چلی آئی۔ مگر میرا کیا کردار تھا اس لو اسٹوری میں۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

عامر نے مجھے کیوں استعمال کیا اور پھر خود کہاں گیا۔ اس کے ذہن میں کیا تھا۔ یہ سب باتیں سوچ سوچ کر میرا دماغ بھی دکھنے لگا تھا۔ اب ابا اور اماں میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ حنیف اور رانو میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ میں نے سحر کے ساتھ جانے سے کیوں انکار نہ کیا۔ جاتی رہتی اکیلی۔ گھر سے اکیلی آئی تھی تو وہاں اڈے پر بھی اکیلی چلی جاتی۔ مجھے کیوں ساتھ گھسیٹا۔ میں دل میں عامر کو گالیاں دینے لگا۔ مگر دل کی گالیاں کون سنتا ہے سوائے اپنے آپ کے۔

اگلے دن میں کام پر بھی نہیں گیا۔ میرا جسم دکھ رہا تھا۔ عامر کہاں تھا اور سحر کے ساتھ کیا ہوا، مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ ابا اور اماں کی خاموشی بھی میرا دل دہلائے جا رہی تھی۔ میں رات کے وقت سحر کے ساتھ بس اڈے پر تھا اس بات کی سب کو خبر ہو گئی ہوگی۔ دو دن چارپائی پر ہی گزرے۔ تیسرے دن صبح ہی اماں میرا ایک دھلا ہوا سوٹ لے کر آگئی۔ ''یہ پہن لے شریف، آج شام تک تیرا نکاح ہے سحر کے ساتھ۔''

مجھے لگا جیسے میرے سر پر آسمان گر پڑا ہو۔ ''اماں!'' میں ماں کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ''خدا کی قسم میرا کوئی قصور نہیں ہے، میں تو......''

''شریف!'' اماں نے کہا۔ ''سحر نے خود اپنے ماں باپ سے کہا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ بھاگ رہی تھی اور تمہارے ساتھ اس کا کئی مہینوں سے رابطہ ہے۔''

''ہیں؟'' میں ششدر رہ گیا۔ سحر عامر کا قصور میرے سر پر کیوں تھوپ رہی ہے۔ میں حیرانگی سے سوچ رہا تھا۔

''وہ جھوٹ بول رہی ہے اماں، میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''تعلق نہیں ہے، بے غیرت اس کو لے کر بھاگ رہا تھا اور کہتا ہے تعلق نہیں ہے۔'' پتا نہیں کب ابا کمرے میں آیا اور اتنا زوردار تھپڑ مجھے پڑا کہ میرے چاروں طبق روشن ہو گئے۔ پھر ابا نے مجھے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ ''بے غیرت، ہماری عزت دو کوڑی کی کر دی ہے۔''

حنیف بھی اپنے کمرے سے نکل آیا۔ ''مت ماریں ابا اسے۔'' وہ ابا کو پیچھے کرنے لگا۔ دروازے کے باہر رانو کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔ میں تو جیسے زمین میں گڑ گیا۔ ابا گالیاں دیتے ہوئے باہر نکل گئے اور اماں مجھے چپ کرانے لگیں۔ حنیف نے پانی دیا۔ میں زار و قطار رو رہا تھا۔ شرمندگی، ذلت اور بے بسی کے احساس سے میرا سارا وجود پانی پانی ہو رہا تھا۔

اماں بھی جب کمرے سے نکل گئیں تو حنیف کہنے لگا۔ ''دیکھ شریف! میں جانتا ہوں کہ تم نے کچھ نہیں کیا۔ تم میں ایسا کچھ کرنے کی ہمت ہی نہیں ہے۔ تم کسی لڑکی کو مخاطب نہیں کر سکتے۔ تمہاری آواز کانپنے لگتی ہے، تم کسی لڑکی کو بھگانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے مگر اب جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے دو ورنہ ابا نے تجھے گھر سے نکال دینا ہے اور لڑکی کے گھر والوں نے تمہیں پولیس میں دے دینا ہے۔ ذرا تھانے اور جیل کا تصور کرو۔ میری بات مانو اور خاموشی سے ابا کی ہر بات مانتے جاؤ۔ بعد میں دیکھنا جو کرنا ہوگا کر لینا۔ اس وقت یہ کڑوا گھونٹ تمہیں پینا ہی پڑے گا۔'' میں نے حنیف کی بات پر ہاں میں سر ہلا دیا۔ شام کو گھر والوں کے ساتھ سحر کے گھر گیا اور میرا نکاح سحر کے ساتھ ہو گیا۔ رخصتی پندرہ دن بعد رکھی گئی تھی۔ سحر کے والد نے مجھے مخاطب بھی نہیں کیا۔ اس کی ماں بھی بجھی بجھی سی تھی۔ عجیب سوگوار نکاح تھا۔ خود میں روبوٹ کی طرح جو کہتے گئے کرتا گیا۔

میں نے کارخانے جانا شروع کردیا۔ وہاں سب نے مجھے نکاح کی مبارک باد دی۔ عامر وہاں نہیں تھا، پتا چلا کہ وہ اپنے ماموں کے پاس کراچی چلا گیا ہے۔

پندرہ دن سے پہلے ہی ابا نے میرے لیے ایک کرائے کا چھوٹا سا گھر دیکھ لیا۔ سحر رخصت ہوکر اسی گھر میں آگئی۔ ابا نے کہہ دیا کہ اب اپنی گھر گرہستی خود چلاؤ۔ مجھے کوئی پیسے دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ سحر کے جہیز کا بیڈ اور ڈریسنگ ٹیبل تھا اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں تھی۔ رانو اور اماں نے ہمارا کمرا تیار کردیا تھا۔

سحر گھر آگئی تو اماں ہمارے پاس رک گئیں۔ سحر اندر کمرے میں تھی اور میں باہر چھوٹے سے صحن میں چارپائی پر لیٹا اپنے ساتھ ہونے والے حادثے کے بارے میں سوچتا رہا۔ اماں نے بھی مجھے سحر کے پاس جانے کا نہ کہا۔ صبح ہوئی تو سحر کی امی ناشتا لے کر آگئیں۔ مجھے اس عورت پر بھی بہت غصہ تھا جو بیٹی کے ساتھ ہر کام میں شامل تھی۔ بھاگنے میں اس کی مددگار تھی اور اب کتنے آرام سے میرے ساتھ نکاح پڑھادیا۔ میں نے ناشتا نہیں کیا۔ دوپہر کو قورمے کی ایک دیگ کے ساتھ میرا ولیمہ ہوگیا۔ سحر کو اس کے گھر والے اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ اگلے چار دن وہ وہیں رہی۔ پانچویں دن اماں مجھے ساتھ لے کر وہاں گئیں اور سحر کو لے آئیں۔ اماں نے گھر سے رات کا کھانا بھیج دیا۔ اب ہم گھر میں اکیلے تھے۔ سحر کمرے میں تھی۔ میں باہر تھا۔

میں سوچوں میں گم چارپائی پر ہاتھوں کا تکیہ بنائے لیٹا تھا۔ اماں نے ضرورت کا کچھ سامان دے دیا تھا جن میں دو چارپائیاں بھی تھیں۔ ایک میرے کپڑوں کا صندوق تھا لوہے کا، دو گدے اور چادریں تھیں۔

''شریف!'' مجھے لگا کوئی مجھے پکار رہا ہے۔ آنکھیں کھولیں تو سامنے سحر کھڑی تھی۔ گلابی رنگ کے ریشمی سوٹ میں وہ گلاب کا پھول لگ رہی تھی۔ آج پہلی بار اسے کھلے منہ اور سرتاپا دیکھا تھا۔ وہ واقعی بے حد خوبصورت تھی۔

''کمرے میں آؤ۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹ گئی۔ میں اٹھ کر کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے آگیا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

''ادھر آؤ، بیٹھو۔'' اس نے مجھے بھی بیڈ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ مجھ میں قوت مدافعت تھی نہیں اس لیے کسی بھی بات کی مزاحمت نہ کرسکتا تھا حالانکہ مجھے اس وقت شدید غصہ دکھانا چاہیے تھا مگر میں گم صم بیٹھا رہا۔

''عامر کا پتا چلا، وہ کارخانے آتا ہے یا نہیں۔'' اس نے پوچھا تو میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ کیسی دیدہ دلیر عورت تھی۔ شوہر کے سامنے بیٹھ کر اپنے عاشق کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ میں کافی دیر کچھ بولنے کے قابل نہ رہا۔

''کہاں ہے عامر؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''وہ اپنے ماموں کے پاس کراچی چلا گیا ہے۔'' یہ کہہ کر میں کھڑا ہوگیا۔ وہ خاموش ہوگئی تھی میرا جواب سن کر۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے میں نے مڑ کر دیکھا، وہ رو رہی تھی۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ کتنا ذلیل نکلا تھا عامر، اتنی پیاری لڑکی کو دھوکا دے کر چلا گیا۔ میں باہر آکر دوبارہ چارپائی پر لیٹ گیا۔

میری شادی شدہ زندگی عجیب سی تھی۔ لوگوں کو یہی معلوم تھا کہ ہم نے لومیرج کی ہے۔ محبت کرتے تھے اس لیے گھر سے بھاگ رہے تھے۔ کارخانے کے لڑکے مذاق اڑاتے اور اس بات پر فقرے کستے کہ اتنی خوبصورت لڑکی کیسے پھنسائی ہے۔ میں چپ رہتا۔ چند دن تک سحر نے عامر کا بہت سوگ منایا، کھانا میں بازار سے لے آتا اور ناشتا بھی۔ ناشتے کے بعد میں کارخانے چلا جاتا اور رات کو گھر آتا۔ وہ سارا دن کیا کرتی تھی مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ ہم دونوں میں بہت کم بات چیت ہوتی تھی۔ وہ کمرے میں سوتی تھی اور میں باہر۔ دو ماہ تو اسی طرح گزر گئے۔ اس دوران وہ کچھ بیمار بیمار لگنے لگی تھی۔ کافی دنوں سے ماں کے گھر گئی ہوئی تھی۔ میں کارخانے سے چھٹی کے بعد اماں سے ملنے آگیا۔ کافی دن بعد آیا تھا۔ اماں میرے لیے کھانا لے آئی۔ نکاح کے بعد سے ابا مجھے کم ہی مخاطب کرتا تھا۔ اماں میرے پاس بیٹھی تھی۔

''سحر کیسی ہے، اسے بھی لے آتے۔'' اماں نے کہا۔

''وہ اپنی ماں کی طرف گئی ہوئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''شریف! آج مجھے بڑا دکھ ہوا، تجھ سے یہ اُمید نہیں تھی مجھے۔'' اچانک اماں نے گلہ کیا۔

''کیا بات ہے اماں! اب مجھ سے کیا غلطی ہوگئی ہے۔''

''آج سحر اور اس کی ماں مجھے بازار میں ملی تھیں۔ ڈاکٹر کے پاس آئی ہوئی تھیں۔ تو نے اتنی بڑی خوش خبری مجھ سے چھپائی۔ تو باپ بننے والا ہے۔ میں دادی ہوں، اس خبر کو سننے کا پہلا حق میرا تھا۔''

نوالہ میرے ہاتھ سے گر پڑا۔ مجھے تو خود اس بات کی خبر نہیں تھی اور ہم میں تو میاں بیوی والا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ میں نے اماں سے یہ بات نہ بتانے کی معافی مانگی اور اپنے

گھر آ گیا۔

مجھے شدت سے رونا آرہا تھا۔ میں روتا رہا اور کارخانے میں سحر اور عامر کی ہونے والی ملاقاتیں یاد کرتا رہا۔ اسی لیے سحر نے مجھ سے شادی کی اور اس کی ماں بھی راضی ہو گئی۔ اپنا گناہ چھپانے کے لیے سحر نے مجھے استعمال کیا۔ اسے اپنے ہونے والے بچے کے باپ کا نام چاہیے تھا۔

دو دن بعد سحر گھر واپس آئی۔ اس دن اماں بھی گھر آئی ہوئی تھی۔ میرے سامنے ہی اماں نے سحر کو ڈانٹا کہ مجھے کیوں نہ بتایا، میں خود ڈاکٹر کے پاس لے جاتی۔ وہ اطمینان سے بولی۔ ''اچھا اماں! اگلی بار آپ کے ساتھ چلی جاؤں گی۔''

اماں اسے کچھ احتیاط بتا کر اور نصیحتیں کر کے چلی گئی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ سحر کو اپنے کسی بھی فعل پر کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ مجھے اپنی حالت پر پھر رونا آنے لگا۔

''دیکھو شریف! تم جان گئے ہو کہ میں نے تمہارے ساتھ شادی کرنے کی ہامی کیوں بھری۔ میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس بچے کی پیدائش تک مجھے ادھر رہنا ہے۔ بعد میں خود ہی چلی جاؤں گی۔''

میں نے جواب دینے کی بجائے سر جھکا لیا۔

''تم بہت اچھے ہو شریف۔ میں تمہارا یہ احسان تمام عمر یاد رکھوں گی۔'' میں بھلا کیا کہتا۔ چپ رہا۔

☆......☆

اب سحر نے باقاعدہ گھر سنبھال لیا تھا۔ مجھ سے راشن منگوا کر اس نے کھانا بھی پکانا شروع کر دیا تھا۔ بظاہر ہم دونوں بہت خوش باش کپل دکھتے تھے مگر اندر کا حال خدا ہی جانتا تھا۔ ڈلیوری سے دو ماہ پہلے ہی وہ اپنی امی کے پاس چلی گئی اور ہمارے نکاح کے پورے سات ماہ بعد سحر نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ اماں بھی اس دن وہیں تھیں۔ میرے احساسات عجیب سے تھے۔ نہ خوشی نہ غمی۔ سب لوگ مجھے مبارک باد دے رہے تھے۔ دنیا دکھاوے کو میں نے کارخانے میں مٹھائی بھی کھلائی۔ شام کو میں سحر کے پاس گیا۔ مجھے دیکھ کر شادی کے بعد پہلی بار اس کے والد نے مجھے گلے لگا کر مبارک باد دی۔ وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔ مجھے اپنا آپ بڑا معتبر محسوس ہوا۔ سحر آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ کیس نارمل تھا۔ مجھے دیکھ کر بیٹھ گئی۔ میری ساس نے بچی کو میری گود میں ڈال دیا۔ میں نے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ بہت پیاری اور خوبصورت بچی تھی اور جب اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا تو میرے ہاتھ لرز گئے۔ اس کی آنکھیں بالکل عامر جیسی تھیں۔ بہت ضبط سے اپنے آپ کو سنبھال کر میں نے سحر کو مبارک باد دی اور کچھ دیر بیٹھ کر واپس آ گیا۔

☆......☆

اب کیا ہوگا؟ میرے آگے یہ بہت بڑا سوالیہ نشان تھا۔ کیا سحر اپنے گھر چلی جائے گی۔ مجھ سے طلاق لے لے گی، طلاق لے لی تو لوگ کیا کہیں گے۔ ابا اماں کو کیا جواب دوں گا۔ میں یہی باتیں سوچتا رہا۔ سوا مہینے تک سحر اپنی ماں کے گھر ہی رہی۔ بعد میں ابا، اماں، رانو، حنیف اور میں بہت سے سامان کے ساتھ اسے لینے گئے۔ بچی نے میرے ابا کا دل بھی موم کر دیا تھا۔ سحر کو آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ اس نے دوبارہ سے گھر کا کام کرنا شروع کر دیا۔ میں گھر آتا تو بچی کو گود میں لیے بیٹھا رہتا۔ وہ بھی مجھے پہچاننے لگی تھی۔ دن بدن بچی کی محبت میرے وجود میں بھرتی جا رہی تھی۔ مجھے بچی سے عشق ہونے لگا تھا۔ مجھے دیکھ کر ہنس پڑتی۔ ننھے ہاتھوں سے میرا چہرہ پکڑنے کی کوشش کرتی۔ سحر میری بچی کے لیے محبت دیکھ رہی تھی۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ میں نے سوچ لیا کہ غلطی ہر انسان سے ہوتی ہے۔ اگر سحر میرے ساتھ رہنا چاہے تو میں پوری عزت سے اسے رکھوں گا۔ بچی چار ماہ کی تھی جس رات سحر نے مجھ سے کھل کر بات کی۔

''شریف! میں نے بچی کی پیدائش تک مہلت مانگی تھی۔ تم نے میرا بہت ساتھ دیا۔ اب تم فیصلہ سناؤ۔ جیسا تم کہو گے ویسا ہوگا۔''

''اگر میں کہوں کہ ماضی کو بھول کر نئی زندگی شروع کر لیں تو تم کیا کہو گی؟'' میں نے کہا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے گی۔ اس نے کہا۔

''شریف! تم نے اس وقت میرا ساتھ دیا جب بدنامی اور ذلت میرا مقدر بننے والی تھی۔ میں نے جو کیا غلط کیا۔ میں اپنے ماضی پر شرمندہ ہوں۔ اگر تم میرا ماضی بھلا کر مجھے قبول کر رہے ہو تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ پوری ایمانداری سے تمہارے ساتھ تعلق نبھاؤں گی۔'' یہ کہہ کر وہ میرے گلے لگ گئی اور مجھے یوں لگا جیسے ابھی ابھی میری شادی ہوئی ہو۔

☆......☆

میری بے رنگ بے بس زندگی میں اتنی بڑی اور خوشگوار تبدیلی آئی تھی کہ دیکھنے والے چونک اٹھتے تھے۔ اب میں پوری خوشی سے زندگی جی رہا تھا۔ سحر نے تمام کوتاہیوں کی تلافی کر دی تھی۔ بچی جس کا نام رابعہ تھا، اس میں میری

جان تھی۔ اب آگے خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ جتنی تلخ زندگی پہلے گزری تھی اس نے اللہ تعالیٰ نے بہت خوبصورت ازالہ کردیا تھا۔

سحر کے والدین نے بیٹی کا حصہ نکالا اور میرے ابا نے مکان کی قیمت لگوا کر میرے حصے کی رقم مجھے دے دی۔ ان پیسوں سے ہم نے اپنا چھوٹا سا گھر خرید لیا۔ نئے گھر میں جاکر ہم نے رابعہ کا عقیقہ کیا۔ میرے گھر میں ضرورت کی ہر چیز تھی۔ تین کمروں کا گھر تھا جس کے ڈرائنگ روم میں میری اجازت سے سحر نے بیوٹی پارلر بنالیا۔ اس نے مکمل کورس کیا ہوا تھا۔ چند دنوں میں ہی عورتیں گھر آنے لگیں اور یوں ہم دونوں مل کر کمانے لگے۔ دو سال کا عرصہ گزر گیا۔ ایک دن ابا اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اماں ہمارے گھر آکر رہیں مگر وہ حنیف اور اس کے بچوں کو چھوڑ کر نہ آئیں۔ زندگی پرسکون تھی۔ اب میری ماہانہ تنخواہ بھی اچھی خاصی ہوگئی تھی۔

اور پھر ایک دن پورے ڈھائی سال کے بعد میں نے عامر کو دیکھا۔ وہ کارخانے آیا تھا۔ سب اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ پہلے سے زیادہ صحت مند ہوگیا تھا۔ شوخی اور شرارت کی جگہ کچھ سنجیدگی آچکی تھی اس میں۔ اسے دیکھ کر میرا دل جیسے ڈوبنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور رسماً اسے گلے لگا کر ملا۔ سب سے ملنے کے بعد وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کارخانے سے باہر لے آیا۔ میں چپ چاپ اس کے ساتھ چلا آیا۔

''کیسا ہے شریف!'' کچھ دور جاکر وہ بولا۔

''ٹھیک ہوں۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''شریف!'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ تیرے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ میں پچھلے ہفتے کا آیا ہوں مگر تمہارا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ مجھے ساری کہانی کا علم ہوچکا ہے۔ میرے کیے کی سزا تمہیں ملی۔ تم نے ناکردہ جرم کی سزا کاٹی۔ مجھے معاف کردو، میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں نے اسے دیکھا وہ واقعی بہت شرمسار لگ رہا تھا۔

''ڈھائی سال میں اپنے گھر آنے کی ہمت نہ کرسکا مگر اب ماں بہت بیمار ہے تو آنا پڑا۔ وہاں ماموں کی بیٹی سے میرا نکاح ہوچکا ہے۔ جلد ہی شادی ہوجائے گی۔''

''تم اس دن آئے کیوں نہیں۔'' میرے منہ سے اچانک نکل گیا۔

''میں ڈر گیا تھا شریف، عین ٹائم پر میری ہمت جواب دے گئی تھی۔ میں پولیس کے خوف اور مار کے ڈر سے کمزور پڑ گیا تھا۔ کچھ باتیں کہنے میں آسان اور کرنے میں بہت مشکل ہوتی ہیں۔ میں تمہیں بزدل سمجھتا تھا مگر تم مجھ سے زیادہ بہادر نکلے۔ مگر اب وہ تمہاری بیوی ہے۔ میرے لیے قابل احترام ہے۔ تم مجھے معاف کردو اور سب بھول جاؤ۔ میں کوشش کروں گا میرا تمہارا سامنا کم ہو۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

میں پریشان سا گھر آگیا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل بھر بھر آرہا تھا۔ سحر مجھے بے وقت گھر دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ اس نے مجھے چائے بنا کر سر درد کی گولی دی۔ میں چپ چاپ لیٹ گیا۔ عامر نے بچے کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ شاید اسے علم ہی نہ ہو۔ میں نے سوچا۔ چند دن میں ایسے ہی بے کل رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اپنے آپ کو سنبھالا۔ کچھ سحر کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ پاکر میں مطمئن ہوگیا۔ اس دن کے بعد عامر مجھے نہیں ملا۔ میں کارخانے میں اور سحر بیوٹی پارلر میں کام کرتے رہے۔ ہر بات بھلا کر میں زندگی میں مگن تھا۔

رابعہ تین سال کی تھی جب دوبارہ سحر اُمید سے ہوئی۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اب میں اپنے آپ کو بہت طاقتور محسوس کررہا تھا۔ خدا نے میرے وجود کا حصہ زمین پر اتارنے کی خوشخبری سنائی تھی۔ سحر بھی خوش تھی۔ میں نے پورا وقت اس کا بہت خیال رکھا۔ اسے زیادہ سے زیادہ آرام دینے کی کوشش کی۔ اماں بھی بہت خوش تھی۔ وہ دن رات دعا کرتی تھیں کہ اللہ مجھے بیٹا دے۔ خود میری بھی یہی خواہش تھی۔ اس بار ڈاکٹر نے آپریشن تجویز کیا تھا۔ میں نے بہت اچھے پرائیویٹ کلینک میں آپریشن کروایا اور جب نرس نے مجھے آکر بتایا کہ بیٹا ہوا ہے تو میں بے اختیار رو پڑا۔ خوشی کی شدت سے میرے منہ سے الفاظ نہ نکلے۔ اماں نے مجھے گلے لگالیا۔ سحر کی امی نے سر پر پیار دیا اور پھر کافی دیر انتظار کے بعد کپڑے میں لپٹے میرے بیٹے کو نرس لے کر باہر آئی۔ سحر ابھی ہوش میں نہیں آئی تھی، آپریشن ٹھیک ہوگیا تھا۔

میں نے بے تابی سے اپنے بچے کو گود میں لے لیا۔ گورا چٹا خوبصورت سا بچہ۔ میرا بیٹا۔ میں نے جھک کر اس کے نرم گال چوم لیے۔ اللہ تعالیٰ نے میری خاموشی اور شرافت کا انعام دے دیا تھا۔ اگر میں پہلے ہی دن شادی نہ کرنے پر اڑ جاتا یا سحر کے راز سے پردہ ہٹا دیتا تو مجھے اتنی خوبصورت بیوی اور بچہ کبھی نہ ملتا۔

اس وقت رات کے دس بجے تھے۔

میں ٹی وی دیکھ رہا تھا جب میرا بیٹا علی میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔

"کیا بات ہے بیٹا۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"خیریت تو ہے نا۔"

"بابا پہلے یہ دیکھیں، یہ کیسا ہے۔" اس نے اپنی جیب سے ایک بریسلیٹ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

کیا خوب صورت بریسلیٹ تھا۔ اٹلی کا بنا ہوا۔ اس میں قیمتی پتھر جگمگا رہے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی قیمت ڈیڑھ دو لاکھ سے کم نہیں ہو گی۔ ایسے بریسلیٹ دیکھنے میں بھی کم ہی آتے ہیں۔

"واہ بہت زبردست۔" میں نے تعریف کی۔

"لیکن کس کا ہے؟" میں نے بیٹے سے پوچھا۔

"میرے ایک دوست کا ہے۔" اس نے بتایا۔ "وہ بیچنا چاہ رہا ہے۔ پلیز پاپا میرے لیے خرید لیں نا۔"

"کتنے کا دے رہا ہے؟"

"صرف دس ہزار کا۔" بیٹے نے کہا۔ "بتا رہا تھا کہ اس کے گھر والوں کو اچانک دس ہزار کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ کوئی ایمرجنسی ہے۔"

دس ہزار اس وقت تو میرے پاس نہیں تھے لیکن یہ کوئی

بریسلیٹ

جناب ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم

میں آج آپ کی خدمت میں ایک ایسا واقعہ بھیج رہا ہوں جو سبق آموز ہے۔ اس واقعے کے اصل کردار اشرف صاحب ہیں لیکن میرا کردار بھی اس واقعے میں ہے اسی لیے میں اس واقعے کو سرگزشت میں چھپا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔ گو کہ اشرف جیسی حماقت میں مبتلا ہزاروں لوگ اس شہر میں مل جائیں گے پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ یہ واقعہ شاملِ اشاعت ہو جائے اور لوگ سنبھل جائیں۔

عقیل احمد

(کراچی)



مسئلہ نہیں تھا۔ بینک گھر سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ میں اے ٹی ایم سے دس ہزار نکال سکتا تھا۔ پھر نہ جانے کیوں کچھ کھٹک سی ہوگئی۔ یوں ہی جیسے کوئی دل کے اندر بیٹھا ہوا منع کر رہا ہو۔

"نہیں بیٹا، جاؤ اسے منع کر دو۔" میں نے کہا۔ "کہاں ہے تمہارا وہ دوست؟"

"وہ بلڈنگ کے گیٹ پر کھڑا ہے۔" اس نے بتایا۔

"کیوں پاپا، کیوں نہیں لے رہے؟"

"بس بیٹا دل نہیں چاہ رہا۔" میں نے کہا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک لاجواب بریسلیٹ ہے لیکن طبیعت میں کچھ بے چینی سی ہو رہی ہے۔ جاؤ اسے منع کر دو۔"

بیٹا چلا گیا۔ میں پھر ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگیا تھا کچھ دیر بعد وہ پھر وہی بریسلیٹ لیے واپس آ گیا تھا۔

"اچھا ایسا کرو اس کو بلا کر لے آؤ۔"

علی اس کو بلا کر لے آیا۔ وہ ایک دبلا پتلا کمزور سا لڑکا تھا۔ اس کا لباس بھی یوں ہی سا تھا اور جس معیار کا بریسلیٹ اس کے پاس تھا اس کو استعمال کرنے والے اس انداز کے نہیں ہوتے۔

"السلام علیکم انکل۔" اس نے بڑے ادب سے سلام کیا۔

میں نے بڑی شفقت سے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ "بیٹا یہ بریسلیٹ کس کا ہے۔"

"میری امی کا ہے انکل، وہ اسے بیچنا چاہتی ہیں۔"

"بیٹا کل دن میں اسے کسی سنار کے پاس لے جاؤ وہ اس کی بہت اچھی قیمت دے دیں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے انکل لیکن ضرورت تو ابھی کی ہے نا۔ ایک ایسی ایمرجنسی ہوگئی ہے ورنہ امی کبھی بیچنے کے لیے تیار نہیں ہوتیں۔ یہ ہمارے نانا کی یادگار ہے۔ انہوں نے امی کو تحفے میں دیا تھا۔"

میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔

"چلیں انکل آپ ایسا کریں پانچ ہزار میں لے لیں۔" اس نے کہا۔ "دو ہزار ابھی دے دیں تین ہزار بعد میں دے دیجیے گا۔"

"نہیں بیٹے سوری۔" اس بار میں نے بہت ہی خشک لہجے میں انکار کیا تھا۔ "تم کسی اور کے پاس لے جاؤ۔"

میرے بیٹے کے تاثرات بھی ذرا تلخ ہو رہے تھے لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ بات ختم ہوگئی۔ دو چار دنوں کے بعد میرے پڑوسی اشرف صاحب میرے پاس آئے۔

ان کا آنا میرے لیے ہمیشہ کوفت کا سبب بنتا تھا حالانکہ بے ضرر سے انسان تھے۔ انہوں نے اگرچہ کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا لیکن ان کے ساتھ پرابلم یہ تھی کہ بہت بڑبولے اور شو آف قسم کے انسان تھے۔

ایک بار وہ میرے پاس اپنے جوتے دکھانے کو لے آئے۔ "عقیل صاحب کیا خیال ہے ان جوتوں کے بارے میں۔"

"ہاں اچھے ہیں۔" میں نے تعریف کر دی۔

"اچھے نہیں جناب بہت اچھے ہیں۔" انہوں نے کہا۔ "میرا بھتیجا ہے اٹلی میں۔ اس نے بھیجے ہیں۔ میں نے یہاں ان کی قیمت معلوم کی تھی ایک لاکھ کے لگ بھگ ہے۔"

"اشرف صاحب! اتنے قیمتی جوتے کس کام آتے ہیں۔ آپ کو ننگے پیروں سے بچنا ہے تو پھر کوئی سا بھی پہن لیں۔"

"بھائی عقیل! یہی تو اعلیٰ اور گھٹیا ذوق میں فرق ہے۔ میں نے تو بزرگوں سے یہی سیکھا ہے کہ پہنو جگ بھاتا، یعنی ایسی چیزیں استعمال کرو جن کو دیکھ کر لوگ واہ واہ کرنے لگیں۔"

"ہاں اس معاملے میں تو آپ کے ذوق کا کوئی جواب نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

وہ عام طور پر اس قسم کی کوئی چیز دکھانے کے لیے میرے پاس آیا کرتے تھے۔ میرے خیال میں یہ ان کا چھچھورا پن تھا لیکن برداشت کرنا پڑتا تھا۔

انہوں نے جس قسم کے جوتے مجھے دکھائے اور جن کی قیمت ایک لاکھ بتائی تھی بالکل ویسے ہی جوتے مجھے طارق روڈ کی ایک چھوٹی سی دکان میں دکھائی دیئے تھے۔ میں نے اس کی قیمت دریافت کی تو دکاندار نے صرف پندرہ سو روپے بتائی۔

"صرف پندرہ سو روپے!" میں اتنی کم قیمت سن کر حیران رہ گیا تھا۔

"جی جناب اٹلی کے ہیں۔" اس نے بتایا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے خود ہی بتانا شروع کر دیا۔ "بھائی جان! آپ تو جانتے ہیں کہ اس قسم کے جوتے لوکل نہیں ہوتے۔ یہ باہر سے آتے ہیں۔ آپ ان کو لنڈا کا مال سمجھ لیں۔"

"کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ لنڈا والے جوتے ہیں؟"

"جی جناب! اب میں آپ کو بتاؤں۔ لنڈا میں پوری کھیپ آتی ہے۔ ان میں سے جس کی کنڈیشن یوں ہی ہوتی

ہے وہ لنڈا مارکیٹ میں ہی بک جاتے ہیں اور جو صاف ستھرے اور بہت بہتر کنڈیشن میں ہوتے ہیں وہ شہر کی مشہور مارکیٹوں میں سپلائی کردیئے جاتے ہیں۔ اب ہم اگر چاہیں تو ان ہی جوتوں کو بیس ہزار کا بھی دے سکتے ہیں لیکن ہم ایسا نہیں کرتے۔ یہ ہمارے اصول کے خلاف ہے۔ ہم ان کو رکھ تو لیتے ہیں لیکن الگ شوکیس میں۔ یہ دیکھیں۔'' اس نے شوکیس کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس شوکیس میں اور اس کے بعد والے شوکیس میں آپ کو اسی قسم کا مال ملے گا۔''

اشرف صاحب کے اعلیٰ ذوق اور ان کے قیمتی جوتوں کا راز کھل چکا تھا لیکن میں نے ان پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ خوامخواہ شرمندہ ہوجاتے۔

وہ اس قسم کی فضول حرکت اکثر کیا کرتے تھے۔ نہ جانے انسان اس میں کیسا فخر محسوس کرتا ہے۔ ہاں میرے نزدیک فخریہ طور پر بتانے اور دکھانے کی صرف ایک چیز ہوتی ہے اور وہ ہیں قیمتی اور نایاب کتابیں۔ اگر آپ کے پاس ان کا کلیکشن ہے تو پھر آپ خوش نصیب ہیں۔ ایک بہت بڑی دولت آپ کے پاس ہے۔

لیکن یہ ایک الگ بحث ہے۔ ہر شخص کی پسند الگ ہوا کرتی ہے۔ اس کی ترجیحات مختلف ہوتی ہیں۔ کسی کے لیے جوتے، گھڑیاں اور گاڑیاں اہمیت کی حامل ہوتی ہیں تو کسی کے لیے کتابوں کا کلیکشن یا موسیقی کا ذخیرہ۔

اشرف صاحب سے شروع شروع میں بہت مرعوب ہوا کرتا ایسا لگتا جیسے ان کا تعلق انٹرنیشنل کمیونٹی سے ہے۔ ان کے دو بھائی برطانیہ میں تھے۔ ایک بہن فرانس میں تھی۔ بھتیجے اٹلی اور جرمنی میں تھے۔

ایک دن میں نے ان سے پوچھ ہی لیا۔ ''اشرف صاحب! ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ جب آپ کا سارا خاندان ملک سے باہر ہے تو پھر آپ یہاں کیا کررہے ہیں۔''

''اس لیے کہ میں محبِ وطن ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اس ملک کے در و دیوار، راستوں، پہاڑوں اور گلی کوچوں سے محبت ہے مجھے۔''

''اگر ایسا ہی ہے تو پھر آپ برانڈڈ چیزیں کیوں استعمال کرتے ہیں، ملکی چیزیں استعمال کریں؟''

اس سوال کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

بہرحال بریسلیٹ والے واقعے کے بعد کی کہانی یہ ہے کہ ایک دن وہ آئے تو کچھ الجھے ہوئے تھے جیسے کسی بات نے پریشان کردیا ہو۔

''کیا ہوا اشرف صاحب خیریت تو ہے نا؟''

''عقیل بھائی پاگل پن کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اب میں سمجھا بھی رہا ہوں کہ خدا کے لیے اس قسم کی حرکت مت کرو۔ میری یہ عمر نہیں رہی، لیکن نہیں محبت دکھا کر رہیں گے۔''

''کس کی بات کررہے ہیں؟''

''خورشید کی۔ میں نے شاید آپ کو اس کے بارے میں بتایا ہو۔''

''نہیں تو، میں تو پہلی دفعہ یہ نام سن رہا ہوں۔''

''میرا بھتیجا ہے۔ فرانس میں رہتا ہے۔ اس نے میرے لیے ایک قیمتی بریسلیٹ خریدا ہے۔ میں نے کہا بھی کہ بیٹا میری عمر بریسلیٹ وغیرہ کی نہیں ہے۔ یہ تو نوجوانوں کے شوق ہیں۔ لیکن وہ کہاں ماننے والا ہے لیکن اس نے وہ خرید لیا ہے اور پرسوں کی فلائٹ سے اس کا دوست کراچی آرہا ہے۔ وہ لے کر آئے گا۔''

''اشرف صاحب یہ تو اچھی بات ہے کہ آپ کے بھتیجوں کو آپ سے اتنی محبت ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں بھائی سب کا یہی حال ہے۔ آخر کیوں نہ کریں۔ میں نے بھی تو ان کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔''

چار پانچ دنوں کے بعد اشرف صاحب بریسلیٹ دکھانے آگئے اور یہ وہی بریسلیٹ تھا جو علی کا دوست دو ہزار میں بیچنے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔

''اشرف صاحب یہ بریسلیٹ۔'' میں نے حیران ہوکر پوچھا۔ ''یہ کہاں سے لیا؟''

''ارے بھائی یہ وہی بریسلیٹ ہے جس کے بارے میں آپ کو بتایا تھا کہ میرا بھتیجا اسے بھیجنا چاہتا ہے لیکن میں نے منع کردیا تھا۔ پھر بھی اس نے بھیج ہی دیا۔ بتائیں کیسا ہے؟''

''بہت زبردست۔'' میں نے ان کو جھٹلانا مناسب نہیں سمجھا۔ ''لگتا ہے آپ کے بھتیجے کا ذوق بھی آپ ہی کی طرح اعلیٰ ہے۔''

''ظاہر ہے۔ خون ہے اپنا۔'' اشرف صاحب فخر سے بولے۔

اشرف صاحب کے جانے کے بعد میں نے اپنے بیٹے علی کو بلایا۔ ''علی تم ذرا اپنے دوست سے معلوم کرو کہ اس کے پاس وہ بریسلیٹ ہے یا نہیں۔''

علی نے ایک گھنٹے بعد آکر رپورٹ دی تھی۔ ''نہیں پاپا! اس نے وہ بریسلیٹ تو دو ہزار روپے میں بیچ دیا۔'' اس نے

بتایا۔ ''اور وہ جو آپ کے دوست ہیں نا اشرف انکل، ان کو بیچا ہے۔''

''یہ اشرف انکل اس کو کہاں سے مل گئے۔''

''وہ بتا رہا تھا کہ وہ کسی دکان والے کے پاس بریسلیٹ بیچنے گیا تھا۔ وہاں اشرف انکل بھی کھڑے تھے۔ انہوں نے فوراً ہی وہ بریسلیٹ خرید لیا۔''

''چلو اچھا ہوا۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔

کچھ دنوں تک سکون رہا۔ ایک شام میں گھر ہی میں تھا کہ علی باہر سے تقریباً دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔ ''پاپا...... پاپا...... اشرف انکل کے ہاں چھاپہ پڑا ہے۔ پولیس آئی ہے۔''

''کیا۔'' میں اچھل پڑا تھا۔ ''لیکن کیوں! کیا پتا چلا۔''

''پاپا وہ اس بریسلیٹ کا چکر ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ بریسلیٹ چوری کا تھا۔ اس لڑکے نے وہ اشرف انکل کو بیچ دیا تھا۔ پولیس کو وہ بریسلیٹ اشرف انکل کے گھر سے مل گیا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ اب تمہاری سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ میں لینے سے کیوں انکار کر رہا تھا۔'' میں نے کہا۔

''جی پاپا۔''

''جانتے ہو اگر لے لیتا تو کیا ہوتا۔ پولیس والے اشرف کی جگہ میرے گھر آتے۔ یہاں چھاپہ پڑتا۔ چوری کا مال ہمارے گھر سے برآمد ہوتا۔ اس کے بعد کیا ہوتا۔''

علی نے اپنی گردن جھکا لی تھی۔

''دیکھو بیٹا! جو چیز ان نیچرل ہو، اس میں کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''فرض کرو اگر کوئی شخص کسی سرکاری محکمے میں کام کر رہا ہے اور اس کی تنخواہ بیس ہزار روپے ماہانہ ہے اور دوسرے ہی مہینے اس کے پاس ایک نئی بائیک آ جاتی ہے تو یہ ان نیچرل ہے۔ آخر کہاں سے آئی۔ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔''

''جی ہاں۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کے پاس دو نمبر کے پیسے آ رہے ہیں۔''

''بالکل اسی طرح اگر کوئی ایک لاکھ کی چیز صرف دو ہزار میں دے رہا ہے۔ تو یہ بھی ان نیچرل ہے۔''

''جی ہاں۔ بات سمجھ میں آ گئی۔''

''اب آئندہ اس لڑکے سے کوئی تعلق مت رکھنا۔'' میں نے کہا۔

اشرف صاحب اس کے بعد بہت دنوں تک محلے میں دکھائی نہیں دیئے۔ پھر یہ پتا چلا کہ ان کی ضمانت ہو گئی ہے۔ کیونکہ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ انہوں نے کوئی چیز سستے داموں خرید لی تھی۔ یہ ان کی قسمت تھی کہ وہ چیز چوری کی نکلی اور وہ اس لپیٹے میں آ گئے۔

کئی دنوں کے بعد وہ محلے میں دکھائی دیئے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے اچانک آ گئے تھے۔ اس وقت میں نے انہیں کریدنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ویسے وہ بہت شرمندہ شرمندہ دکھائی دے رہے تھے۔

''اشرف صاحب! آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ہاں بالکل ٹھیک ہوں۔'' انہوں نے کہا۔

''تشریف لائیں۔ گھر چل کر بیٹھتے ہیں آپ سے باتیں ہوں گی۔''

''نہیں عقیل صاحب اس وقت تو فرصت نہیں ہے۔ میں ائرپورٹ جا رہا ہوں۔''

''خیریت تو ہے نا، کوئی آ رہا ہے کیا یا کسی کو سی آف کرنے جا رہے ہیں۔''

''ارے بھائی اب کہاں کا سی آف، میرے دو ماموں اور ایک چاچا کینیڈا سے واپس آ رہے ہیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔''

''کیوں ایسی کیا بات ہو گئی؟''

''یہ تو خود میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میرے خاندان کا ایک ایک فرد واپس آ رہا ہے۔ کوئی ہالینڈ سے، کوئی فرانس سے، کوئی جرمنی سے، جس طرح باہر گئے تھے اسی طرح سب واپس بھی آ رہے ہیں۔ ایک مہینے کے بعد ملک سے باہر میرا کوئی بھی نہیں ہوگا۔ سب یہیں آ جائیں گے۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ یہ سمجھ .... گئے ہوں گے کہ یہ سب کیا ہوا ہے۔''

بے چارے اشرف صاحب کا چونکہ پورا خاندان اپنے ہی ملک میں واپس آ گیا ہے۔ اس لیے ان کے پاس اب کوئی برانڈڈ چیز نہیں ہوتی۔ اب باہر سے ان کے پاس کوئی تحفہ نہیں آتا۔

صرف ایک ہی بار کی تھانہ یاترا نے ان کے پورے خاندان کو واپس بلا لیا ہے۔ یعنی اس بریسلیٹ نے دو کام کر دکھائے۔ ایک تو اشرف صاحب کا خیالی خاندان واپس آ گیا۔ دوسرے میرے بیٹے علی کو یہ احساس ہو گیا ہے کہ بریسلیٹ سے زیادہ قیمتی چیز اپنی عزت ہوتی ہے۔



کرن سے آفتاب

محترم و مکرم مدیر سرگزشت
السلام علیکم
یہ داستان ایک ایسے نکتے کے گرد گھوم رہی ہے جو خود میں اہمیت کا حامل ہے۔ اُمید ہے آپ کو بھی یہ سچ بیانی پسند آئے گی۔
حبیب الرحمن
(کراچی)

میرے سامنے گودام میں آئے مال کے رجسٹر کھلے ہوئے تھے۔ میں ان میں اندراج کرتا جارہا تھا کہ ایک نام سنائی دیا اور میں سکتے میں رہ گیا۔ میں نے پلٹ کر اسے دیکھا، دیر تک دیکھتا رہا اور جیسے ہی میں نے اسے پہچانا مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں خلاؤں میں الٹی پرواز کرتا ہوا نہایت برق رفتاری سے ماضی کی جانب لوٹ رہا ہوں۔

میری عمر کوئی آٹھ برس ہوگی جب وہ خونی ڈراما ہمارے گاؤں میں کھیلا گیا۔ اس دن صبح سے مجھ سمیت میرے سب

گھر والوں کو ایسا لگ رہا تھا کہ اگلا سورج نکلنے سے قبل ہی کچھ ہونے والا ہے۔ پورے گاؤں پر ایک خوف کی فضا طاری تھی اور یوں لگتا تھا جیسے قیامت صغریٰ برپا ہونے والی ہے۔ مجھے تو شاید ان باتوں کا اتنا ادراک بھی نہیں تھا لیکن ماں باپ اور دیگر آنے جانے والوں کی باتیں سن کر اور ان کے چہروں پر فکرمندی کے آثار دیکھ کر میں بھی اندر سے لرز رہا تھا۔

''بھائی صاحب کچھ بھی ہو، ہمیں معصوموں کو کچھ نہیں کہنا چاہیے، ہم صدیوں سے ایک ساتھ رہتے آئے ہیں۔ اگر کسی دوسرے دیش والوں نے ہم مسلمانوں کے ساتھ کوئی ناروا سلوک کر دیا ہے اور اپنی بربریت دکھا دی ہے تو ہمارے ساتھ رہنے والے معصوموں کا اس میں کیا قصور؟'' میرے والد صاحب کی یہ بات سن کر آنے والوں کے لہجے یک دم بدل گئے۔ ممکن تھا کہ وہ اشتعال میں آکر والد صاحب کے ساتھ کوئی سنگین کارروائی کر گزرتے کہ ایک نہایت متین شخصیت نے کچھ یوں بات بنائی۔

''گو کہ بزرگوار درست کہہ رہے ہیں لیکن آپ لوگوں کا جلال میں آجانا بھی فطری بات ہے۔ ایک دوسرے پر غصہ مت اتاریں اور اللہ سے خیر مانگیں۔''

میرے والد صاحب بھی لوگوں کی نیلی پیلی آنکھیں دیکھ کر خاموش ہو گئے تھے اور سمجھ لیا تھا کہ اس وقت کسی کو سمجھانا فضول ہی ہے۔

یہ سندھ کے ایک چھوٹے سے شہر نما گاؤں کھپرو کا ایک نواحی علاقہ تھا اور ہمارا گاؤں کھپرو سے دو تین کلو میٹر دوری پر رہا ہوگا۔ اس وقت مجھے یہ فاصلہ بیسیوں میل کا لگا کرتا تھا۔ میں اپنی چند کتابیں بستے میں ڈال کر چھٹی کے دن کے علاوہ ہر روز اسکول جایا کرتا تھا۔ شدید سردیوں اور شدید گرمیوں میں یہ فاصلہ اور بھی طویل ہو جایا کرتا تھا۔ واپسی پر شام کے وقت میں قریب کی ایک مسجد میں مولوی صاحب سے سیپارہ پڑھنے بھی جایا کرتا تھا۔ گاؤں کا ماحول کوئی مثالی نہیں تھا۔ لوگوں کو پڑھنا لکھنا بہت اچھا نہیں لگتا تھا لیکن اتنا برا بھی نہیں لگتا تھا کہ وہ میرے آنے جانے کے مخالف ہو جاتے البتہ اگر میں نہیں جاتا تو کوئی میرے ساتھ زبردستی بھی نہیں کرتا۔ گاؤں کے سارے بچے سارا سارا دن دھول مٹی میں دھولم نظر آتے تھے اور کوئی ان کو ٹوکنے والا نہیں تھا۔ ایسے میں وہ گالم گلوچ کے علاوہ اور کیا سیکھ سکتے تھے۔ یہی حال گاؤں کے بڑوں کا تھا۔ میرے والدین پڑھے لکھے تو نہیں تھے لیکن وہ جاہلانہ باتوں سے بہت دور تھے۔ بے شک وہ اور گاؤں والوں کی طرح پڑھائی لکھائی کی جانب بہت رغبت نہیں رکھتے تھے لیکن انھیں میرے آنے جانے پر نہ تو کوئی اعتراض تھا اور نہ ہی وہ گاؤں کے دیگر بزرگوں کی طرح میرا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ میں نے کبھی انھیں گالی دیتے بھی نہیں دیکھا اور گھر میں خواتین کے ساتھ کسی ایسے لہجے میں گفتگو کرتے بھی نہیں دیکھا تھا جس طرح یہاں کے دیگر مردوں کو اپنی خواتین کے ساتھ چیختے چلاتے یا مار پیٹ کرتے دیکھا کرتا تھا۔

جب بچہ تھا تب یہ بات کسی حد تک میرے لیے تعجب خیز ضرور تھی لیکن کبھی اس بات کی کھوج نہیں رہی کہ آخر اتنا تفاوت کیوں ہے لیکن جوں جوں میں نے لڑکپن سے شعور میں قدم رکھنا شروع کیا، اس بات کی جستجو ہوئی کہ میرے والدین عادات و اطوار اور حسن سلوک میں دوسروں سے ہر لحاظ سے مختلف کیوں ہیں؟ ایک دن میں نے موقع پا کر اپنے والد سے پوچھ ہی لیا کہ بابا مجھے بتائیں کہ آپ اور دیگر گاؤں والوں میں فرق کیوں ہے؟

''کیسا فرق؟'' انہوں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے سوال کیا۔

میں نے بھی کسی جھجک کے بغیر اپنی مادری زبان میں کہہ ڈالا۔ ''بابا نہ تو آپ اوروں کی طرح بری عادات کا شکار نظر آتے ہیں، نہ ہی ان کی طرح زبان کے تلخ ہیں اور نہ ہی گھر والوں کے ساتھ ناروا سلوک کرتے ہیں یا اونچی آواز کے ساتھ بات کرتے ہیں۔''

انہوں نے میری بات کو اتنی حیرانی سے سنا جیسے میں نہیں کوئی بہت پختہ سوچ رکھنے اور بڑی عمر والا بول رہا ہے۔ وہ اس وقت اپنے کام کے لیے روانہ ہونے والے تھے۔ میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا، پیار بھری حیرت سے دیکھا اور بہت شیریں آواز میں کہا۔ ''بیٹے مجھے حیرت ہے کہ تم ایک ایسا سوال کر رہے ہو جو مجھ سے آج تک کسی نے بھی نہیں پوچھا، میں ابھی تو کام پر جا رہا ہوں واپسی پر تمہیں اس سوال کا جواب ضرور دوں گا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے اللہ حافظ کہا اور چلے گئے۔

یہ بات صرف میرے اور ان کے درمیان ہی ہوئی تھی، باقی گھر والے تو اپنے اپنے معمول کے کام میں ہی مصروف تھے۔ اللہ جانتا ہے وہ سارا دن میں نے بہت بے چینی میں گزارا، شام تھی کہ ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی، سائے تھے کہ جیسے پھیلنا اور سمٹنا ہی بھول گئے تھے اور سورج تھا کہ وہ ڈھلنے میں ہی نہیں آرہا تھا۔

رات کا کھانا سر شام ہی کھا لیا جاتا تھا اور عشا کی نماز

کے بعد سب سونے کی تیاری کرنے لگتے تھے۔ کھانا تو سورج غروب ہونے سے پہلے ہی کھالیا گیا تھا اور مغرب کی نماز بھی ادا کرلی گئی تھی۔ مجھے تو والد کا وعدہ یاد ہی تھا لیکن وہ بھی اسے نہیں بھولے تھے اس لیے وہ مجھے لے کر اپنی چارپائی پر آ گئے۔ کہنے لگے۔ ''میری پیدائش اسی گاؤں کی ہے لیکن میرے والدین پاکستان بننے سے پہلے ''گجرات'' میں آباد ہوا کرتے تھے۔ یہ وہ گجرات نہیں جو اس وقت پاکستان کا ایک مشہور شہر ہے بلکہ اس کا تعلق بھارت سے ہے۔ بات یہ ہے کہ پاکستان بننے سے قبل یہ سارا خطہ جس کو اب پاکستان کہا جاتا ہے بھارت کا ہی حصہ تھا۔ جس کو اب ہم کشمیر کہتے ہیں وہ بہت بڑا کشمیر تھا، جس کو ہم پنجاب کہتے ہیں وہ بھی بہت بڑا پنجاب تھا اور جس کو ہم سندھ کہتے ہیں یہ بھی بہت بڑا سندھ تھا لیکن ہندوستان تقسیم ہوا تو پنجاب، سندھ اور کشمیر بھی تقسیم ہو گئے۔ جس حصہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہ پاکستان کا حصہ بنا دیا گیا اور جس میں ہندوؤں کی اور سکھوں کی تعداد زیادہ تھی وہ علاقے ہندوستان میں شامل کر دیئے گئے۔ ہماری مادری زبان بھی ''گجراتی'' تھی جو یہاں کے لوگوں کی زبان سے بہت مختلف تھی لیکن میرے والد گھر اور باہر یہاں کی مقامی زبان ہی بولا کرتے تھے جس کو عرف عام میں سندھی کہا جاتا ہے۔ میں نے بھی اسی کو اپنایا اور اب تم سمیت سارے لوگ سندھی ہی بولتے ہیں۔ مجھے تو پھر بھی اپنی زبان آتی ہے، اگر میرے علاقے کے لوگ کسی شہر یا بازار میں مل جائیں تو ان کے ساتھ مجھے باتیں کرنے میں بہت مزہ آتا ہے لیکن میں نہیں چاہتا کہ تمہاری پہچان میرے جیسی بن سکے۔ جس سرزمین میں انسان رہے اسے وہاں کی بود و باش ہی اختیار کرنا چاہیے اس سے فاصلے کم ہوتے ہیں اور محبتیں پروان چڑھتی ہیں۔ یہ میرا اپنا خیال ہے لہٰذا اس سے اختلاف رکھنا تم سمیت ہر ایک کا حق ہے اور ہمیں ایک دوسرے کے خیالات کا احترام کرنا چاہیے۔''

میرے والد صاحب مجھے یہ ساری باتیں اس طرح بتا رہے تھے جیسے میں ایک پختہ کار سوچ کا حامل ہوں مگر میرا سوال تو کچھ اور ہی تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ وہ آخر کب میرے سوال کی جانب لوٹیں گے۔

والد صاحب اچانک جیسے چونک پڑے ہوں، خیالات کے تیز بہاؤ سے ذرا سنبھلے تو انہوں نے میری جانب دیکھا اور شاید خود ہی اپنی باتوں کا اعادہ کرنے لگے اس لیے آہستہ سے گویا ہوئے، ''میں بھی کہاں سے کہاں نکل گیا، بات یہ ہے کہ

ٹیسٹ میچ

کھیلوں کی اصطلاح۔ جب کسی ملک کی ٹیم دوسرے ملک کا دورہ کرتی ہے تو کئی میچ کھیلتی ہے۔ ان میں سے کچھ تو علاقائی ٹیموں کے خلاف ہوتے ہیں اور کچھ میزبان ملک کی قومی ٹیم کے خلاف، یہ میچ ٹیسٹ میچ کہلاتے ہیں، کیونکہ ان میں دو ملکوں کی قومی ٹیمیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوتی ہیں۔ ایک دورے میں کئی ٹیسٹ میچ ہوسکتے ہیں۔ دورے کے ختم ہونے پر جو ملک زیادہ ٹیسٹ میچ جیتا ہو وہ مقابلہ جیت جاتا ہے۔ یوں تو ٹیسٹ میچ کی اصطلاح ہر کھیل کے لیے استعمال کی جاتی ہے، لیکن خصوصاً کرکٹ کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ ایک دورے کے درمیان عموماً (اس میں کمی بھی ہوسکتی ہے) پانچ ٹیسٹ میچ کھیلے جاتے ہیں۔ ان کو دوسرے میچوں کی نسبت زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ کرکٹ ٹیسٹ میچ تین سے لے کر پانچ روز تک کھیلے جاتے ہیں۔

مرسلہ: شاہین ممتاز، سید آباد

کولوراڈو یونیورسٹی کے ماہرین کی تحقیق میں بتایا گیا کہ برمودا پر پھیلے شش پہلو بادل 65 میل فی گھنٹا کی رفتار سے چلنے والی ہوائیں پیدا کرتے ہیں جو ہوائی بم ' کی طرح کام کرتے ہوئے بحری جہازوں کو غرق اور طیاروں کو گرا دیتی ہیں۔ خیال رہے کہ فلوریڈا، برمودا اور پیورٹو ریکو کے سمندری خطے کی تکون کو برمودا ٹرائی اینگل کا نام دیا گیا ہے جہاں دہائیوں سے بحری جہاز اور طیارے پراسرار طور پر غائب ہونے کی رپورٹس سامنے آتی رہی ہیں اور ان کا ملبا بھی تلاش نہیں کیا جاسکا۔ اب سائنسدانوں نے ناسا کے سیلائیٹ کا استعمال کرتے ہوئے اس خطے کا ڈیٹا اکٹھا کیا اور شش پہلو بادلوں کو دریافت کیا جو کہ 32 اور 88 کلومیٹر رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ محققین کا کہنا تھا کہ اس طرح کے بادل انتہائی غیر معمولی ہیں 'آپ عام طور پر بادلوں کے ایسے کونے نہیں دیکھتے۔ انہوں نے مزید بتایا 'اس طرح کے بادل سمندر کے اوپر ہوائی بموں کی طرح کام کرتے ہیں، وہ ہوا کے دھماکے کرتے ہیں اور نیچے آ کر سمندر سے ٹکرا کر ایسی لہریں پیدا کرتے ہیں جو کہ بہت زیادہ بلند ہوتی ہیں۔

مرسلہ: وسیم بن اشرف۔ ملتان

میرے والد صاحب ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے علاقے میں ایک معتدل مسلمان کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ ان کے گاؤں میں بہت سے گھرانے مسلمانوں کے تھے اور وہ سارے کے سارے بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ گو کہ اس علاقے میں بھی ہندوؤں کی اکثریت تھی لیکن وہ سب میرے گھرانے اور اہل محلہ کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ پھر ایک بڑی آہ بھر کر بولے، پاکستان بنانے کی تحریک زور پکڑتی جارہی تھی، جوں جوں تحریک زور پکڑتی جارہی تھی اور مسلمانوں کی زبان پر یہ نعرہ عام ہوتا جارہا تھا کہ ''پاکستان کا مطلب کیا لاالہ الا اللہ'' توں توں ماحول میں کبیدگی بڑھتی جارہی تھی اور مقامی لوگوں کے رویے میں تیزی کے ساتھ تبدیلی آتی جارہی تھی۔ والد صاحب اور اہل محلہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ آنے والے دنوں میں کیا ہونے والا ہے۔ پہلے پہل تو بس ایک دوسرے سے بول چال ہی ختم ہوئی، پھر آنکھیں ملانا بھی بند ہوگیا۔ اہل محلہ نے غیر مسلموں کو جتنا بھی سمجھانے کی کوشش کی کہ آخر مسلمانوں کا الگ وطن کیوں نہیں ہونا چاہیے اتنا ہی ماحول کشیدہ ہوتا چلا گیا۔ سب میں پھر یہی طے پایا کہ بہتر یہی ہے کہ یہاں سے کسی محفوظ مقام پر نکل جانے میں ہی عافیت ہے ورنہ کوئی بھی بڑا سانحہ جنم لے سکتا ہے۔ جو پیسا اور صلاحیت رکھتے تھے وہ محفوظ مقامات کی جانب منتقل ہونا شروع ہوگئے مگر ایسے گھرانے کم ہی تھے۔ میرے والد صاحب گو کہ ایسا کر سکتے تھے لیکن وہ اہل محلہ کو چھوڑ کر جانا گوارہ نہ کر سکے۔ پاکستان بنتے ہی جیسے آگ سی بھڑک اٹھی اور ہر جانب سے بہت خوفناک خوفناک خبریں آنا شروع ہوگئیں۔ ہمارا محلہ ابھی تک تو بہت محفوظ تھا لیکن غیر یقینی کی سی صورتِ حال تھی کہ ہم زندہ ہونے کے باوجود بھی جیسے مرے گئے تھے۔ صدیوں سے اسی بستی میں آباد ہونے اور ایک معتدل مسلمان ہونے کی وجہ سے آگ ابھی تک گھر میں تو نہیں لگی تھی لیکن اس کی آنچ اور حدت صاف محسوس ہورہی تھی۔ جس رات ہمارے محلے کو بھی تعصب اور نفرت کی آگ لپیٹ میں لینے والی تھی میرے گھر اہل محلہ میں سے کئی معزز اور محبت رکھنے والے ہندو برادری کے بزرگ آئے اور ہم سب کو یہاں سے چلے جانے کا مشورہ دیا۔ ہمیں آمادہ نہ دیکھ کر ہمارے پیر پکڑ لیے اور کہا کہ انکار نہ کریں۔ مجبوراً ان کے مشوروں پر عمل کرنا پڑا اور سب لوگ انھیں کی نگرانی میں محفوظ مقام کی جانب چل دیے۔ میرے والد اور والدہ کو روک لیا اور کہا کہ آپ کے لیے پاکستان جانے کا بندوبست کر لیا ہے۔ اسی رات انہوں نے انھیں نہایت افسوس کے ساتھ یہ خبر بھی دی کہ نفرت کی اس آگ کی وجہ سے پاکستان کی جانب جانے والی ساری ٹرینیں لاشوں سے پٹی ہوئی اپنی اپنی منزلوں کی جانب آ اور جارہی ہیں۔ خدا جانے کہ اس میں پہل کس کی ہے، دونوں جانب سے شرارت کی پہل کی شکایت سنائی دے رہی ہے اور نتیجے میں بے گناہ و معصوم لوگ مارے جارہے ہیں۔ والد صاحب اپنی کہانی سناتے جارہے تھے اور میں ان کی کہانی میں اس قدر محو تھا کہ مجھے اپنے آس پاس کی خبر تک نہیں تھی۔ مجھے یوں معلوم ہورہا تھا جیسے میں بھی اپنے دادا کے ساتھ اسی قافلے میں شامل ہوں جو پیار کرنے والے، انسانیت کے پتلوں یعنی ہندوؤں کے ساتھ ساتھ رواں دواں تھا۔ والد صاحب کہنے لگے کہ میرے والد، والدہ کے علاوہ اور کوئی بھی ان کے ساتھ نہیں تھا۔ ان کے محلے میں رہنے والے کچھ تو حالات کا رخ دیکھ کر پہلے ہی محفوظ مقامات کی جانب منتقل ہوگئے تھے اور باقی یا تو بلوائیوں کے ہاتھ لگ گئے تھے یا پھر جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئے ہوں گے، ان کے متعلق کوئی خبر آج تک نہیں مل سکی۔ ہم ہفتوں کی مسافت کے بعد پاکستان کی سرحدوں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ پروگرام کے مطابق ہمیں ساتھ لانے والے ہندوؤں کے رشتے دار سرحد پر ہی موجود تھے جنھوں نے ہمیں ریسیو کیا اور ہمارے حلیے تبدیل کر دیے۔ میرے والد اور والدہ نے وہ سارا سفر ہندوؤں کا سوانگ رچا کر ہی طے کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم ہوا کہ ابھی تک اس جانب کی سرحدوں تک نفرت کی آگ کی آنچ نہیں پہنچی تھی اس لیے عمر کوٹ تک آنے میں انھیں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ کچھ عرصے بعد والد صاحب کھپرو آگئے۔ یہاں میری پیدائش ہوئی۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے اپنے آپ کو اسی شہر میں پایا ہے۔ میرے والد نے یہاں اپنے کاروبار کا آغاز کیا جس کی بدولت ہمارا گھر چل رہا ہے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد کاروبار کو میں نے سنبھال لیا۔ جب مناسب آمدنی ہونے لگی تو میری والدہ یعنی تمہاری دادی نے میری شادی کرادی۔ تمہاری والدہ اسی گاؤں کے ایک اوسط درجے کے معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہمارے زمانے میں یہاں تعلیم کا رواج نہیں تھا اور خواتین اور بچیوں کے لیے تو تعلیم حاصل کرنا ناممکن تھا جبکہ ہم جہاں سے آئے تھے وہاں ایسی کوئی پابندی نہیں تھی۔ والدہ کا اپنا شوق تھا جو انہوں نے گھر میں کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ شادی کے بعد مجھ سے بھی کافی لکھنا پڑھنا سیکھا۔ جن حالات

سے میرے والدین گزرے اس میں میرا بھی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنا ممکن نہیں رہا اور والد صاحب کے انتقال کے بعد تو معاشی ضرورتوں کو پورا کرنا ہی جیسے زندگی کا مشن بن کر رہ گیا۔ تمہاری پیدائش 1984 میں ہوئی۔ اب ماشاءاللہ تم آٹھ برس کے ہوچکے ہو۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم اس عمر میں بھی عقل و سمجھ کے اعتبار سے اپنے ہم عمروں سے بہت آگے ہو۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا بیٹا کڑیل جوان ہو چکا ہے۔" کہتے کہتے والد صاحب خراٹے لینے لگے اور پھر میں بھی سوگیا۔

کھپرو کے قریب کا یہ چھوٹا سا گاؤں مخلوط آبادی پر مشتمل تھا۔ اس میں ہندو، عیسائی اور مسلمان سب ہی آباد تھے۔ ہم سب اس طرح رہتے تھے کہ بعض اوقات اس بات کا دھیان تک ہی نہیں رہ پاتا تھا کہ کون کیا ہے۔ ایک دوسرے کے گھر آنا جانا، میل جول، پیار کا ماحول تھا۔ عبادات کے لیے کوئی چرچ جاتا، کوئی مندر تو کوئی مسجد کی جانب لپکتا۔ کسی کو کسی کے دین دھرم پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ پاکستان بننے کے بعد پورے پاکستان میں کشیدگی پیدا ہوئی تھی اور اس کشیدگی کی وجہ سے بہت ساری جانوں اور مال کا زیاں ہوا تھا لیکن اس علاقے کے بزرگوں کا کہنا ہے کہ اس گاؤں میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہر دین دھرم والے ایک ساتھ مل کر بیٹھے اور یہ عہد کیا کہ کوئی کسی کو کچھ نہیں کہے گا بلکہ ہر دین دھرم والا دوسرے کا محافظ ہوگا اور پھر چشم فلک نے دیکھا کہ سب نے اپنا اپنا عہد نبھایا اور سب ہی ایک دوسرے کے محافظ بن گئے۔ ماہ سال کے ساتھ ساتھ ماحول میں تبدیلی آجایا کرتی ہے۔ اب وہ مثالی ماحول نہیں رہا... گاؤں اور گاؤں والے بھی اب وہ نہیں رہے۔ کتنے گھرانے اپنی اپنی ضرورت اور پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے گاؤں چھوڑ کر سندھ کے مختلف شہروں میں چلے گئے اور کتنے ہی نئے آنے والے گھرانوں کو اس گاؤں سے ان کی قسمت کا لکھا ملنے لگا ہے۔ پرانے رہ جانے والوں میں چند ہی گھرانے رہ گئے تھے جس میں میرا گھرانا یا پھر دھیان چند کا گھرانا رہ گیا تھا۔ دھیان چند میرے والد صاحب سے دو چار برس ہی چھوٹے رہے ہوں گے لیکن ان کی شادی کم عمری میں ہونے کی وجہ سے ان کے دو بیٹے مجھ سے کافی بڑے تھے۔ ان کی ایک بیٹی بھی تھی۔ وہ مجھ سے چار سال چھوٹی تھی۔ ہمارے سب گھر والوں کا ان کے گھر آزادانہ جانا آنا تھا۔ یہ وہی گھرانا تھا جن کے رشتے دار میری دادی دادا کو ہندوستان سے بحفاظت پاکستان پہنچا کر گئے تھے۔ بس یہی وجہ ہے کہ ان کے اور ہمارے گھر والوں کے بہت ہی گہرے مراسم تھے۔ میں گو کہ ان کی بیٹی سے چار سال ہی بڑا تھا لیکن میں اس کو گودوں میں لیے پھرتا تھا شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا، نہ کوئی بھائی اور نہ ہی کوئی بہن۔ میں دھیان چند کو چاچا کہا کرتا تھا لیکن ان کی بیوی کو خالہ کیونکہ میری کوئی خالہ بھی نہیں تھیں۔ میری اس بات پر دھیان چند اور ان کی بیوی مسکرایا کرتے تھے۔

یہ گھرانا ہماری اور ہم اس کی اتنی عزت کیا کرتے تھے کہ ایک دوسرے کی دعوت تک میں کھانوں کا انتخاب ایک دوسرے کے مشوروں سے ہوتا، حتیٰ کہ برتن بھی وہ استعمال ہوتے جو ہم دونوں نے ایک دوسرے کے لیے مختص کر دیے ہوتے تھے کہ کسی قسم کی کراہیت کا احتمال نہ ہو۔

لیکن آج معاملہ ہی کچھ اور لگ رہا تھا اور حالات کہہ رہے تھے کہ بہت بڑا طوفان برپا ہونے والا ہے۔ بابری مسجد توڑنے کے بعد نذر آتش کردی گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ نہیں تھا جب خبر ایک دوسرے تک پہنچنے تک دن اور ہفتے لگا کرتے تھے۔ اب تو دنیا کے کسی گوشے میں کوئی معمولی حادثہ بھی ہو جائے تو لمحے بھر میں خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ یہی ہوا بھی۔ خبر کے پھیلتے ہی برس ہا برس کی دوستیاں، تعلقات اور میل جول کدورتوں، عداوتوں اور نفرت میں بدل گئے۔ ماحول کہہ رہا تھا کہ آج بہت کچھ ہو کر رہے گا۔ گھر میں بھی پریشان تھے۔ میرے والد صاحب اور والدہ تو بہت ہی فکر مند تھے۔ وہ اسی سوچ میں تھے۔ وہ کسی اور کے لیے کچھ کرسکیں یا نہیں لیکن دھیان چند اور اس کے گھرانے.... کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کر دکے۔ تمام خطرات مول لیتے ہوئے انہوں نے دھیان چند سے کہا کہ وہ سب ان کے گھر آجائیں۔ اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "بھائی! آپ کا بہت بہت شکریہ، میں آپ کو کسی آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا۔" میں نے اپنے تئیں کچھ کرلیا ہے اور بھگوان نے چاہا تو خیریت کے ساتھ یہاں سے کسی محفوظ مقام کی جانب نکل جاؤں گا اور اگر زندگی رہی تو آپ سے ضرور ملاقات کروں گا۔"

والد صاحب نے گھر آکر ساری بات بتائی اور ساتھ ہی ساتھ یہ کہا کہ یہ وہی حالات ہیں جس سے کبھی میرے والدین گزرے تھے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ میرے دادا دادی کو تو دھیان چند کے رشتے داروں نے حفاظت کے ساتھ پاکستان تک پہنچا دیا تھا لیکن آج میں کتنا بدقسمت ہوں کہ اس

کے لیے کچھ بھی کرنے کی حالت میں نہیں اور ماحول کہہ رہا ہے کہ وہ یہاں سے شاید ہی خیریت کے ساتھ نکل سکیں۔

دھیان چند کا چھوٹا سا مکان ہمارے گھر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ میں اپنے گھر کی چھت سے اس کے چھوٹی سی چھونپڑی نما گھر کے اندر تک کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ دھیان چند چاچا، چاچی جس کو میں خالہ کہا کرتا تھا، اس کے دو بیٹے اور ایک جانب سہمی کرن جو چار سال کی تھی وہ تیزی کے ساتھ اپنے مال واسباب کو سمیٹ رہے تھے لیکن لگ رہا تھا کہ وقت ایسا نہیں کرنے دے گا کیونکہ میں دوسری جانب مشتعل افراد کو دیکھ رہا تھا جو تھے تو کافی فاصلے پر لیکن وہ اسی جانب بڑھ رہے تھے اور ان کے ارادے بہت خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔ ٹھیک اسی لمحے جب وہ ان کے گھر پہنچا ہی چاہتے تھے، میں نے دیکھا کہ ایک ہیوی جیپ نما پک اپ ان کے گھر کے قریب آکر رکی اور اس میں سوار دو افراد برق رفتاری کے ساتھ اتر کر جو کچھ جیپ میں رکھ سکتے تھے وہ انہوں نے رکھا اور تقریباً دھکا دیتے ہوئے دھیان چند، اس کی بیوی اور بچوں کو گاڑی میں سوار کیا لیکن بدقسمتی سے ''کرن'' گھر میں ہی رہ گئی۔ ہجوم سر پر پہنچ چکا تھا۔ ڈرائیور کے پاس کوئی اور راستہ ہی نہیں تھا اس کے علاوہ کہ وہ وہاں سے سرپٹ دوڑ جائے۔ میں نے اتنا ہی دیکھا کہ دھیان چند، اس کے بیٹے اور بیوی گاڑی سے جیسے چھلانگ ہی لگا دیں گے لیکن ان کو جیپ نما پک اپ میں سوار لوگوں نے اتنی مضبوطی کے ساتھ پکڑ کر رکھا تھا کہ وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے اور جیپ لمحے بھر میں بلوائیوں کی پہنچ سے دور جا چکی تھی۔ دوسرا منظر جو میری آنکھوں نے محفوظ کرلیا تھا وہ یہ تھا کہ کرن کو میں نے گھر میں لگی کیکر کی گھنی جھاڑیوں میں چھپتے دیکھ لیا تھا۔ ایک چھوٹی سی بچی کو اللہ تعالیٰ نے جانے کیسے یہ بات سمجھائی کہ وہ بجائے رونے چلّانے کے اپنی حفاظت کا بندوبست کرے۔

ہجوم نے گھر میں گھس کر قیامت برپا کردی اور گھر کی ہر شے تہس نہس کر کے رکھ دی اور چند ظالموں نے جو تھوڑی بہت قیمتی اشیا تھیں ان کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ جب جنونی لوٹ پاٹ میں پڑجائیں تو پھر ان کا جنون کسی حد تک ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور شاید یہی ہوا بھی۔ جب سب لوگ کارروائی کر کے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تو میں چھت سے نیچے اترا۔ مجھے اس بات کا بھی احساس نہیں ہوسکا کہ میری غیر حاضری پر میرے گھر والے میرے لیے کس قدر پریشان تھے۔ مجھے دیکھ کر جیسے ان کی آنکھوں اور چہروں پر ایک اطمینان کی رمق سی آگئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کرتے میں نے گھر سے باہر دوڑ لگائی۔ گھر والے ارے ارے ہی کرتے رہ گئے لیکن میں جو کچھ دیکھ چکا تھا اس کے بعد میرا ایک لمحہ بھی ضائع کرنا میرے اختیار میں نہیں تھا۔ میں نہایت برق رفتاری کے ساتھ ان جھاڑیوں کی جانب دوڑا جہاں میں نے کرن کو چھپتے ہوئے دیکھا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا لیکن ماحول اب بھی روشن تھا۔ قریب پہنچ کر میں نے آہستہ سے کہا۔ کرن، کرن کرن میری دوسری تیسری آواز پر وہ چھوٹی سی بچی باہر نکلی، اس کا سارا بدن پسینے سے شرابور تھا اور وہ کسی سردی کھائے بدن کی طرح کانپ رہی تھی۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ باہر آکر وہ میرے پاؤں سے لپٹ گئی تھی اور بیہوش ہوگئی تھی۔ میں ابھی اسے اٹھانے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ میرے والد اور والدہ پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے کوئی بات کیے بغیر اس کو گود میں اٹھایا اور بہت تیزی کے ساتھ گھر کی جانب لوٹے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے تھا۔

اس واقعے کو گزرے اٹھارہ برس بیت چکے تھے۔ میں جوان ہو چکا تھا اور کرن بھی جوان ہو چکی تھی۔ وہ اب ہم سب میں گھل مل چکی تھی۔ ماضی کو فراموش کرنا شاید ہی کسی کے بس میں ہو۔ وہ بھی یقیناً کوئی ایک بات بھی نہیں بھولی ہوگی لیکن کبھی اس کا تذکرہ کسی سے نہیں کیا۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔ جب بھی اس کو دیکھا مطمئن اور خوش دیکھا۔ جس اللہ نے اس کو محفوظ رکھا اس اللہ نے اس کو بڑا صبر بھی دیا۔

کرن معمولی شکل وصورت والی تھی۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اس اٹھارہ سال کے عرصے میں اس نے ایک بار بھی مجھے بھائی نہیں کہا اور نہ جانے میرے منہ سے جب بھی نکلا اس کا نام ہی نکلا۔ کبھی کوئی ایسا تاثر بھی نہیں ملا کہ وہ مجھ سے بہت قریب ہے اور نہ ہی کبھی میرے دل میں کوئی گمان گزرا۔ ایک مرتبہ میری والدہ نے کہا کہ اب تو بڑا ہو چکا ہے تو کیوں نہ تیری شادی کرن سے کردی جائے۔

میں نے حیران ہو کر کہا۔ ''ماں یہ کیسے ممکن ہے، لوگ بھلے نہ جانتے ہوں لیکن آپ تو جانتی ہیں کہ وہ ہندو ہے اور میں مسلمان۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔''

ماں نے کہا۔ ''کوشش کرتے ہیں، شاید وہ مسلمان ہو جائے۔''

میں نے ماں سے کہا کہ یہ بات میں اس کے سامنے رکھ چکا ہوں لیکن اس نے مجھ سے ایسی بات کہی کہ مجھے دوبارہ

نہ صرف یہ کہ ایسا کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی بلکہ میں اس دن سے آج تک اکثر راتوں کو اٹھ کر دعا کرتا ہوں کہ اللہ کرن کی تمنا پوری ہو جائے۔"

ماں نے حیرت سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔" آخر اس نے ایسا کیا کہہ دیا جو تو ایسا کرتا ہے۔"

میں نے کہا۔"ماں! جب میں نے اس سے کہا کہ تم مسلمان کیوں نہیں ہو جاتیں تو اس نے مجھے آنکھ بھر کر بہت دیر تک دیکھا، پھر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں اور اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا کہ اس کی آنکھیں اپنے والدین کو دیکھنے کو ترس رہی ہیں۔ کیا معلوم وہ کس حالت میں ہوں گے۔ دل کہتا ہے کہ وہ زندہ ہیں کیونکہ جو لوگ ان کو لے کر گئے تھے وہ بہت بہادر اور مضبوط لوگ تھے، پاکستانی تھے اور مسلمان بھی۔ وہ ضرور زندہ ہوں گے لیکن تم لوگوں نے اس واقعے کے بعد گاؤں ہی چھوڑ دیا تھا اور ٹنڈو محمد خان آ کر آباد ہو گئے تھے۔ ممکن ہے کہ وہ حالات معمول پر آنے کے بعد ہماری تلاش میں نکلے ہوں۔ جب ہم نہیں ملے تو مایوس ہو کر لوٹ گئے ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے ضرور ملیں گے اور میں نے اپنے دل میں یہ عہد کیا ہے کہ کب وہ لوگ ملیں گے تو میں خود بھی مسلمان ہو جاؤں گی اور اپنے والدین سے بھی کہوں گی کہ وہ بھی اپنا دھرم چھوڑ کر مسلمان ہو جائیں۔ تم سب بہت اچھے اور خدا ترس ہو۔ بس اتنا کہہ کر وہ اپنے آنسوؤں کو اپنے پلو سے پونچھتی ہوئی دوسرے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی۔ اس دن سے پہلے اور اس کے بعد آج تک میں نے اسے کبھی روتے اور آنسو بہاتے نہیں دیکھا۔"

"کمال ہے۔" میری والدہ نے کہا۔" ہم تو یہ گمان کیے ہوئے تھے کہ اسے اپنا ماضی یاد ہی نہیں ہے۔ آج سے میں بھی اپنے رب سے رات دن دعا کروں گی کہ اسے اس کے والدین سے ملا دے۔"

دھیان چند کے گھر پر حملے کے بعد میرے والد اور والدہ اتنے بددل ہوئے تھے کہ چند ماہ کے اندر اندر ہی اپنا سب کاروبار لپیٹ کر "ٹنڈو محمد خان" آن بسے۔

یہاں آ کر والد صاحب نے پھر دکانداری شروع کر دی تھی اور میں ایک چاول کے گودام میں ملازم ہو گیا تھا۔ کسی حد تک پڑھ لکھ گیا تھا لہٰذا گودام میں ہر قسم کی لین دین، آمد و خرچ کا حساب کتاب میرے حوالے کر دیا گیا تھا ساتھ ہی گودام کی بھال بھی میرے حوالے کر دی گئی تھی۔ یہ ایک زمیندار کا گودام تھا اور یہاں زیادہ تر وہ لوگ آباد تھے جو ہندوستان کے پنجاب سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے تھے اور اپنے آبائی پیشے یعنی کھیتی باڑی سے وابستہ ہو گئے تھے۔ کلیم میں حاصل زمینوں پر نہایت مہارت اور کامیابی کے ساتھ فصلیں کاشت کر رہے تھے۔ ان ہی میں سے ایک زمیندار نے ایک درمیانہ گودام بھی بنایا ہوا تھا اور میں اس کے پاس اپنی محنت اور صلاحیت کا مناسب صلہ پا رہا تھا۔

اس دن میں رجسٹر کھولے اندراج کر رہا تھا کہ وہ داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی میں گودام کا حساب کتاب بھول کر اس کو گھورنے لگا۔ میرے تحت الشعور سے کئی چہرے ابھر ابھر کر شعور کی آنکھوں میں آ کر کبھی ٹوٹ کر بکھر رہے تھے اور کبھی ٹوٹے ہوئے، بکھرے ہوئے چہرے دوبارہ مجسم ہو رہے تھے۔ میں ایک ٹک اسے گھورے جا رہا تھا اور وہ میرے گودام کے مالک سے محو گفتگو تھا۔ وہ اس سے کیا باتیں کر رہا تھا مجھے معلوم نہیں لیکن مجھے احساس ہوا جیسے گودام کا مالک بھی اسے پہچان جانے والی نگاہوں سے دیکھ رہا ہو۔ اچانک گودام کا مالک حیرت اور خوشی سے کھڑا ہو گیا اور دھیان چند کہہ کر اس سے یوں بغل گیر ہوا جیسے اب سانس کا رشتہ ٹوٹ جانے پر ہی وہ جدا ہو گا۔ میں بس اتنا دیکھ سکا کہ ان دونوں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسوؤں کا نہ تھمنے والا سلسلہ رواں ہو چکا ہے۔

دھیان چند کا نام سنتے ہی میں بھی جیسے ہل کر رہ گیا تھا۔

سندھ پر پہلا بحری حملہ

عثمان بن ابی عاص نے اپنے بھائی مغیرہ کی سرکردگی میں ایک بحری بیڑہ دیبل پر حملے کے لیے روانہ کیا اور خود بروص (بروچ) پر حملہ کیا۔ دیبل اس زمانے میں سندھ کی مشہور بندرگاہ تھا۔ اس وقت سندھ میں راجا چچ کی حکومت تھی اور اس کو حکومت کرتے ہوئے پینتیس سال گزر چکے تھے۔ صاحب چچ نامہ نے اس لڑائی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "جس زمانے میں مغیرہ نے دیبل پر حملہ کیا، اس وقت چچ کی جانب سے دیبل کا حاکم سامہ بن دیواج تھا، دیبل کے لوگ زیادہ تر تجارت پیشہ تھے۔ جب مغیرہ کا لشکر دیبل پہنچا تو سامہ اپنے لشکر کے ساتھ قلعے سے نکل کر مقابل ہوا۔ مغیرہ نے تلوار نکالی اور بسم اللہ و فی سبیل اللہ کہہ کر دشمن پر ٹوٹ پڑے، یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔"

مرسلہ: سلطان اشرف، لاڑکانہ

میرا رواں رواں خوشی سے بے حال ہوئے جارہا تھا۔ تحت الشعور سے ابھر کر شعور کی آنکھوں میں ٹوٹ کر بکھرنے...... والا چہرہ ایک حقیقت کا روپ دھار چکا تھا۔ میں خوشی سے بے قابو ہو کر اٹھا تو ایک زوردار آواز کے ساتھ میری کرسی اور میز دونوں الٹ گئیں۔ آواز سن کر وہ دونوں میری جانب متوجہ ہوئے لیکن میں بے قابو ہو چکا تھا اس لیے کہ میں اپنے چاچا دھیان چند کو پہچان چکا تھا۔ میں نے چاچا چاچا کا نعرہ لگایا اور جا کر دھیان چند سے لپٹ گیا۔ اٹھارہ برس کی دوری پر میرا سب کچھ بدل چکا تھا اس لیے وہ مجھے کیا پہچان سکتے تھے۔ دھیان چند کی جو حالت ہوئی ہو ہوئی ہو، لیکن گودام کا مالک بھی یہ سارا منظر بہت حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔

"چاچا میں ہوں مہتاب، آپ کے دوست عبدالرحیم کا بیٹا۔"

"بس اتنا کہنا تھا کہ وہ تو جیسے بکھر گیا۔ مجھے اس زور سے سینے سے لگایا کہ جیسے وہ اپنے سینے کے اندر ہی اتار لے گا۔ بس وہ مہتاب، مہتاب کہے جاتا تھا اور روئے جاتا تھا مگر یہ ساری سسکیاں اور آنسو خوشی کے اظہار کے علاوہ اور کچھ نہیں تھے۔

میں نے اپنے جذبات پر قابو پانے کے بعد پوچھا کہ میری خالہ کہاں ہیں۔ جواب ملا کہ وہ بھی پاکستان میں ہی ہیں۔ میں بھی پاکستان میں ہی تھا، ہندوستان نہیں گیا تھا۔ مجھے ساتھ لے جانے والے مسلمان ہی تھے جو مجھے اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو یہ جانتے تھے کہ کبھی تمہارے دادا دادی کو ہمارے رشتے دار لائے تھے۔ احسان چکانے کا اس سے اچھا کوئی موقع نہیں تھا، یہ تینوں سگے بھائی تھے اور اچھے فائیٹر تھے۔ جونہی انھیں گاؤں کے حالات کا علم ہوا یہ فوراً حرکت میں آ گئے تھے۔ انھیں اگر چند منٹ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو ہم جنونیوں کے ہاتھوں کام آ چکے ہوتے۔ ہمارا سفر بڑی خیریت کے ساتھ گزر رہا تھا کہ اچانک ہمیں سات آٹھ جنونیوں نے گھیر لیا اس سے پہلے کہ وہ ہمیں یا ہماری گاڑی کو کوئی نقصان پہنچا سکتے، گاڑی سے کود کر ان تینوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا ان میں جو بڑا بھائی تھا اسے سخت گھاؤ لگے لیکن اس نے ان لوگوں کو بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ سب ہندو تھے اور ہمیں مسلمان سمجھ کر نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ خیر، ہم کسی نہ کسی طرح اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ عمر کوٹ بہت پُرسکون تھا۔ وہاں پہنچ کر سب نے سکون کا سانس لیا۔ ان کے زخمی بھائی کو فوری طور پر اسپتال لے جانا پڑا۔ اسے ٹھیک ہونے میں کئی ہفتے لگے لیکن وہ اب تک بغیر سہارے چلنے کے قابل نہیں ہو سکے ہیں۔" پھر وہ اچانک خاموش ہو گئے جیسے انھیں کچھ یاد آ گیا ہو۔ لبوں پر کپکپی سی آئی اور آنکھیں ڈبڈبا سی گئیں۔

میں سمجھ چکا تھا کہ انھیں کیا بات یاد آئی ہو گی لیکن میں نے فوری طور پر ان کو کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا کیونکہ میں انہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ "دھیان چند چاچا آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیں، میرے والدین آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے اور میں آپ کو ایک سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔"

انہوں نے مجھے غور سے دیکھا لیکن کچھ بولے نہیں۔ کہنے لگے اس وقت میں جلدی میں ہوں، کل آؤں گا اور ہاں میرے پاس بھی تمہارے لیے حیران اور خوش کر دینے والی خبر ہے لیکن میں کل ہی وہ خبر تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو سناؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ میری آنکھوں میں حیرانی کے چاند ستارے چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔

میں جب گھر پہنچا تو اپنی کیفیت الفاظ میں بیان ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اللہ دعائیں قبول کرنے والا ہے، انہونی ہونی ہو گئی، کرن کو اس کی دنیا مل گئی تھی۔ میں سجدہ شکر ادا کرنے مسجد جا پہنچا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے کہ ہم نے کتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر لی تھی اور اللہ نے اس کی حفاظت کرنے کی کیسی توفیق ہم سب گھر والوں کو دی۔ لب ہلے اور دعا کے بول ابھرے۔ "اے اللہ تو بس ہم سے راضی ہو جا۔ میری ماں سے راضی ہو جا، میرے باپ سے راضی ہو جا۔ کرن پر مہربان ہو جا۔ اس کی مراد پوری ہونے والی ہے۔ تجھ سے شرط لگانا بہت گناہ ہے لیکن ایک غیر مسلم کی شرط کو تو نے اگر قبول کر ہی لیا ہے تو اسے صاحب ایمان بھی کر دینا۔"

میں عشا کی نماز سے فارغ ہو کر سجدے کی حالت میں نہ جانے کیا کیا دعا مانگے جا رہا تھا۔ کیسے کیسے اپنے رب کا شکر ادا کیے جا رہا تھا۔ کیسے کیسے گڑگڑائے جا رہا تھا اس کا علم یا مجھے تھا یا میرے رب کو۔ میں نے عہد کر لیا تھا کہ کل تک میں اتنی بڑی خبر کسی کو بھی نہیں بتاؤں گا لیکن کیا میں اسے چھپا پاؤں گا۔ یہ تھا وہ سوال جو میرا دل مجھ سے بار بار کر رہا تھا اور میں اسے بار بار بہلا رہا تھا۔

میں حسب معمول گودام پر اپنے فرائض ادا کر رہا تھا، دوپہر ڈھل چکی تھی، اب سورج بھی مغرب کی جانب ڈھلتا جا رہا تھا، چھٹی میں بمشکل بیس منٹ رہ گئے تھے۔ میرا اضطراب اب صبر کی ساری حدیں پار کرتا جا رہا تھا لیکن دھیان چند چاچا

ابھی تک نہیں آئے تھے۔ دل کی وحشت بڑھتی جارہی تھی۔
میں نے اپنے پھیلے ہوئے کھاتہ رجسٹر سمیٹ لیے تھے اور نہایت افسردگی کی حالت میں گودام سے باہر نکلا ہی تھا کہ ایک پرانی سی کار میرے سامنے آکر رکی۔ ''دھیان چند چاچا'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا، کار میں ایک خاتون بھی بیٹھی نظر آئیں، کالے برقعے میں، یہ کون ہیں، میں سوچنے لگا کیونکہ برقع ہندو خواتین نہیں پہنتیں۔ میں ابھی کسی سوچ میں ہی گم تھا کہ چاچا بولے، ''یہ ہیں تمہاری خالہ (چاچی)۔''
میرا سر جھک گیا اور انہوں نے اپنا ہاتھ میرے سر پر پھیرا۔
گھر والوں کو میں یہ بتا کر آیا تھا کہ میرے ساتھ کل مہمان آئیں گے، مہمان بھی ایسے ہوں گے جنہیں دیکھ کر آپ حیرتوں کے سمندر میں ڈوب جائیں گے۔ پھر کرن سے کہا تھا۔ مجھے ڈر ہے کہیں تم خوشی سے مرہی نہ جاؤ۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتے میں سب کو نہایت حیرانی کے عالم میں چھوڑ کر گودام کی جانب نکل آیا تھا۔
مہمان خانہ سجا ہوا تھا، سب کو میں نے ڈرائنگ روم میں ہی بٹھایا تھا۔ پھر اندر گیا، امی ابو کو ایک ساتھ ہی لے کر آیا۔ کرن سے کہا کہ وہ تیار رہے، اس کے لیے بہت ہی بڑی خبر ہے۔
ابا نے میرے ساتھ آئے مہمان کو دیکھا اور مہمان نے میرے ابا کو۔ یوں لگا جیسے دونوں کی آنکھوں میں خوشیوں کی پھلجھڑیاں پھوٹ پڑی ہوں۔ امی نے خالہ کو دیکھا تو وہ بھی جیسے مارے حیرت اور خوشی کے پتھر کی سی بن گئیں۔ لمحہ بھر کے توقف کے بعد ایک زوردار آواز بیک وقت میرے والد اور دھیان چند چاچا کے منہ سے نکلی۔ اللہ اکبر، اور پھر وہ اس زور سے روئے کہ کرن میرے بلائے بغیر ہی ڈرائنگ روم میں آگئی۔ چاروں کے چاروں زاروقطار رو رہے تھے۔ میرے آنسو بھی تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے اور کرن کا یہ عالم تھا کہ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک ایک کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہورہا ہے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے نہ صرف مجھے چھوا تھا بلکہ پاگلوں کی طرح جھنجوڑ کر پوچھا تھا کہ یہ سب کیا ہورہا ہے۔ ایک نئے فرد کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر سب لوگ اس کی جانب متوجہ ہوگئے تھے۔
''چاچا۔'' میں نے اپنے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھیں آپ کی بیٹی کرن۔''
''کرن اور اس نے ماں باپ کے منہ سے ''کیا کہہ رہے ہو'' کے الفاظ اتنی زور سے نکلے کہ کائنات کی ساری گردش جیسے تھم سی گئی ہو اور ذرہ ذرہ کن کی اس انوکھی اور حسین گھڑی کا نظارہ کرنے کے لیے ساکت ہوگیا ہو۔
یہ لمحات اتنے حیران کن تھے کہ چاچا ہمیں اپنا سرپرائز دینا بھول ہی گئے۔ کرن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا، جب وہ جانے لگے تو کرن ہم سب کو چھوڑ کر جانے کے لیے کسی بھی صورت راضی نہیں ہو رہی تھی لیکن ہم سب نے سمجھایا کہ والدین والدین ہوتے ہیں۔ یہ بھی تمہارا گھر ہے۔ جب دل کرے اور جتنے دن کے لیے کرے، تم آجایا کرو۔
کرن کو گئے دو ہفتے ہوگئے تھے۔ ہم سب کرن سے اتنے مانوس ہوگئے تھے کہ اس پورے عرصہ میں کسی نے کسی سے کھل کر کوئی بات ہی نہیں کی۔ معلوم نہیں اب وہ لوگ کب آئیں اور کب ان سے ملاقات ہو۔ یہ بات میں ہی نہیں سب ہی سوچ رہے تھے۔ گھر ویران ویران سا ہوگیا تھا۔
مغرب اور عشا کا وقت تھا کہ دھیان چند اپنے بیٹوں کے ساتھ ہمارے گھر آیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اب اس کے چہرے پر داڑھی سج چکی تھی۔ پہلے تو ہم سب یہی سمجھے کہ شاید شیو بڑھ گئے ہیں لیکن جب غور کیا تو خط بڑے سلیقے سے بنا نظر آیا۔ بچے بھی ایسے ہی حلیے میں نظر آئے۔ اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی کسی نتیجے پر پہنچتا، وہ خود گویا ہوئے۔ ''آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے کہ ہم سب نے کلمہ پڑھ لیا ہے۔''
یہ سن کر سب کے منہ سے بے ساختہ اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہمارا گھر نور سے بھر گیا ہو۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہم نے اللہ کے آگے شرط رکھی تھی کہ اگر تو نے ہمیں ہماری بیٹی دلا دی تو ہم مسلمان ہونے میں دیر نہیں لگائیں گے۔ یہ ہماری نادانی ہے کہ ہم اللہ سے شرط لگا بیٹھے۔ اللہ معاف کرنے والا ہے۔
ابھی ہم سب اسی خوشی میں مٹھائیاں بانٹ رہے تھے کہ دھیان چند جو اب عبداللہ بن چکے تھے انہوں نے کہا کہ لوگ بیٹیوں کا رشتہ مانگنے جاتے ہیں، میں آپ سے آپ کا بیٹا مانگنے آیا ہوں۔ اس دنیا کو بھی جنت بنانے کے لیے اور دوسری دنیا میں ساتھ رہنے کا عہد کرنے کے لیے۔ مجھے اُمید ہے آپ میری درخواست کو رد نہیں کریں گے۔ وہ والد اور والدہ سے یہ درخواست کر رہے تھے اور میں کمرے سے باہر جا چکا تھا۔ میرا دل اپنی مراد پا چکا تھا۔



آئینہ

مکرمی ایڈیٹر سرگزشت السلام علیکم
ایک اور سچ بیانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ حقیقتاً یہ سچ بیانی ایک آئینہ ہے جس میں معاشرے کا سچا عکس نظر آئے گا۔

ایم فاروق انجم
(فیصل آباد)

صبح کا سہانا وقت تھا اور سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اس کی کرنیں رفتہ رفتہ پھیل رہی تھیں۔ اس خوبصورت نظارے کو اپنے گھر کی چھت پر کھڑی صدف ناز ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ صدف کا خوبصورت چہرہ دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ خود بھی سورج کی ایک کرن ہو۔ وہ اس حسین منظر کو دیکھتی ہوئی اپنے دماغ میں ایک نظم تخلیق کر رہی تھی۔

صدف ناز بہت خوبصورت لب و لہجے کی شاعرہ تھی۔ اس کی شاعری سبھی کو پسند آتی تھی۔ وہ میٹرک میں تھی

جب اس نے پہلا شعر کہا تھا اور کالج پہنچ کر اس نے نا صرف کئی غزلیں کہہ لی تھیں بلکہ وہ کالج میں ہونے والے مشاعروں میں بھی شرکت کرنے لگی تھی۔ صدف کی ماں اسے باتوں باتوں میں سمجھاتی تھیں کہ وہ شعر و شاعری لکھنا چھوڑ دے۔ شادی ہوگئی تو جانے تمہارا شوہر یہ سب کرنے دے یا پابندی لگا دے۔ صدف اپنی لگن میں مگن رہی اور اس کا اچھا نام بن گیا۔ شہر کے ادبی حلقے میں وہ مشہور ہوگئی۔

صدف ناز کے دماغ کے کسی کونے میں اپنی ماں کی یہ بات ہر وقت کھٹکتی رہتی تھی کہ اس کا ہونے والا شوہر اسے شاعری کی اجازت دے گا یا اس پر پابندی لگا دے گا۔ شاعری صدف کے جسم میں دوڑنے والے خون کے ساتھ سفر کرتی تھی۔ وہ جب تک کچھ پڑھ اور لکھ نہ لے اسے سکون نہیں ملتا تھا۔ صدف کی منگنی کو چار ماہ ہوگئے تھے اور اب اگلے ہفتے اس کی شادی تھی۔ لیکن ڈر اور خوف اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ وہ سوچتی تھی اگر اس کے شوہر نے اس پر شعر کہنے کی پابندی لگادی تو وہ زندہ کیسے رہے گی؟

اس کے گھر والے کہتے تھے کہ اس کا ہونے والا شوہر بہت اچھا ہے اس کا دھیما مزاج ہے اور تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے وہ باشعور ہے۔ ان باتوں سے صدف حوصلہ پکڑ لیتی تھی۔

وہ دن بھی آگیا اور صدف کی شادی ہوگئی۔ وہ حجلہ عروسی میں دلہن بنی بیٹھی تھی اور اس کے سامنے اس کا شوہر بیڈ پر براجمان تھا اور اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کچھ باتوں کے بعد اس نے دھیمے اور مسکراتے لہجے میں کہا۔ ''آپ شاعری بھی کرتی ہیں۔ مجھے ایسے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں جو تخلیق کار ہوں۔ ایسے لوگوں کے پاس قدرت کا دیا ہوا خاص دماغ ہوتا ہے، ایک عام آدمی ایسا نہیں سوچ سکتا جیسا وہ سوچ لیتے ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' صدف ناز نے جھکی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا تھا۔

''سنا ہے آپ مشاعروں میں بھی جاتی ہیں؟'' الیاس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی جاتی ہوں۔'' صدف ناز نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''اب آپ کی شادی ہوچکی ہے۔ اب بھی آپ مشاعروں میں جائیں گی؟'' الیاس نے جاننا چاہا۔

صدف ناز سوچ کر بولی۔ ''میں نے بڑی محنت اور لگن سے اپنا نام بنایا ہے۔ میری شاعری کو لوگ پسند کرتے ہیں۔''

''میری طرف سے آپ کو کبھی کسی پابندی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ میں آج آپ کو اجازت دیتا ہوں آپ اپنا تخلیقی سفر اسی طرح جاری رکھیں جس طرح سے جاری ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوگی جب میں دیکھوں گا کہ میری بیوی کا ادب کی دنیا میں نام ہے اور میری بیوی کی وجہ سے میری بھی پہچان ہے۔ مجھے فخر ہوگا۔'' الیاس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

الیاس کی بات سن کر صدف ناز کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس نے تو ایسا سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کا شوہر اتنا خلیق اور ادب سے لگاؤ رکھنے والا ہوگا۔ وہ تو ابھی اسی سوچ میں تھی کہ وہ شاعری کرنے اور مشاعروں میں جانے کی اجازت کیسے طلب کرے گی مگر اس کی مشکل تو الیاس نے ایسے حل کردی تھی کہ صدف ناز کو بھی یقین نہیں آرہا تھا۔

''کیا واقعی مجھے اجازت ہوگی؟'' صدف ناز کو جیسے یقین نہیں آیا۔

''میں کہہ رہا ہوں نا آپ کو اجازت ہے، بالکل اجازت ہے۔'' الیاس نے پیار.... بھرے لہجے میں اپنے الفاظ دہرائے۔ صدف خوش ہوگئی اور اس کے اندر جو ابہام براجمان تھا وہ معدوم ہوگیا۔

الیاس ایک کمپنی میں مارکیٹنگ کی جاب کرتا تھا۔ اس کے چھ بھائی تھے، ان کی بیویاں بھی اسی گھر میں رہتی تھیں۔ صدف کے آجانے سے گھر میں جگہ کم پڑ گئی تھی۔ بڑا بھائی اپنی بیوی اور بچے لے کر گھر سے الگ ہوا تو الیاس کو بھی موقع مل گیا اور اس نے کرایہ کا گھر تلاشنا شروع کردیا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر مناسب کرائے پر ایک فلیٹ مل گیا۔ وہ صدف ناز کو وہاں لے گیا اور دونوں ایک دوسرے پر محبت کے پھول نچھاور کرتے زندگی گزارنے لگے۔

شادی کو پندرہ دن ہوگئے تھے جب پہلی بار صدف ناز نے ایک مشاعرے میں جانے کی بات کی۔

الیاس مسکرایا۔ ''میں بھی چلوں ساتھ؟''

''آپ نے کام پر نہیں جانا؟'' صدف ناز نے پوچھا۔

''آج میری چھٹی ہے۔ اس لیے میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔'' الیاس بولا۔

''مشاعرہ شام پانچ بجے ہے۔'' صدف ناز نے کہا۔

الیاس سوچنے لگا اور پھر بولا۔ ''میں ایک دو کام کرلیتا ہوں۔ ساڑھے چار بجے آجاؤں گا پھر ہم ایک ساتھ چلیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' صدف ناز مسکرائی۔

زندگی میں پہلی بار الیاس کسی مشاعرے میں گیا تھا۔سب سے پہلے تو وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ صدف کی خواتین وحضرات میں خوب جان پہچان ہے۔ ہر کوئی صدف سے خوش ہوکر مل رہا تھا۔صدف ہر ایک سے اپنے شوہر کا تعارف بھی کرا رہی تھی۔

مشاعرہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا کہ اس مشاعرے میں شرکت کرنے آئے شعراء ایک طرف بیٹھے تھے اور وہ آپس میں ہنسی مذاق بھی کر رہے تھے۔الیاس یہ سب حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

اسی اثنا میں احمد نواز بھی آگیا۔اس کی عمر پچاس سال کے قریب تھی۔وہ ایک عرصہ شگاگو میں رہا تھا اور اب بھی اس کی بیوی بچے وہیں تھے۔وہ پچھلے چھ ماہ سے واپس نہیں گیا تھا بلکہ یہاں ایک پبلشنگ ادارہ قائم کرلیا تھا۔وہ خود بھی شاعر تھا اور اچھی شاعری کرتا تھا۔

نواز کے پاس پیسا بھی تھا اور وسائل بھی، اس لیے اسے کسی چیز کی فکر نہ تھی۔نواز کے اندر ایک خامی تھی کہ وہ دل پھینک وحسن پرست تھا۔وہ کئی خواتین شعرا کو اپنی لچھے دار باتوں میں الجھا چکا تھا اور اب اس کی نظر صدف ناز پر تھی۔

وہ صدف کے حسن کا دیوانہ تھا۔جب بھی وہ کسی مشاعرے یا کسی تقریب میں شریک ہوتا تو اور اس جگہ صدف بھی ہوتی تو اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اس کے دائیں بائیں رہے۔آخری ملاقات میں اس نے صدف سے کہا تھا کہ وہ اپنی شاعری کو ایک جگہ جمع کرے،وہ اسے کتاب کی صورت میں شائع کرا کے پورے ملک میں پھیلا دے گا۔نواز کا خواتین کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا یہ پہلا باب ہوتا تھا۔مجموعہ شائع کرانے کی شوقین لڑکیاں اور خواتین اس بات پر فوراً نواز کی طرف متوجہ بھی ہوجاتی تھیں اور کتاب شائع کرانے کے چکر میں وہ خود اس کے ارد گرد منڈلانے لگتی تھیں۔

صدف نے اس کی بات سن کر کہا تھا۔''اس کے پاس مسودہ تیار ہے لیکن ابھی وہ اس میں مزید اپنی شاعری شامل کرنا چاہتی ہے اس لیے اسے ابھی کتاب شائع کرانے کی جلدی نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں، آپ جب بھی اپنی کتاب شائع کرائیں گی میرے ادارے سے شائع کرائیں گی۔میں آپ کو آپ کی کتاب کا اچھا معاوضہ بھی دوں گا۔''

''وقت آئے گا تو دیکھ لیں گے۔'' صدف نے جواب دیا تھا۔

اس وقت بھی نواز کی نظریں صدف کے خوبصورت چہرے پر تھیں۔جب صدف نے نواز کا تعارف اپنے شوہر الیاس سے کرایا تو وہ اس سے بڑی گرمجوشی سے ملا اور الیاس کو لے کر ایک طرف بیٹھ گیا۔اس پہلی ملاقات میں نواز اور الیاس کے درمیان بے تکلف سی دوستی ہوگئی۔

مشاعرہ ختم ہوا تو الیاس اور صدف واپس آگئے۔صدف رات کا کھانا تیار کرنے لگی اور الیاس ٹیلی وژن دیکھنے لگا۔الیاس بہت چالاک تھا۔اس نے پہلی رات صدف کو مشاعروں میں جانے کی اجازت اس لیے دی تھی تاکہ وہ کسی دن اس کے ساتھ جا کر یہ دیکھے کہ وہاں ہوتا کیا ہے اور صدف کیا کرتی ہے ؟

الیاس کو اس کے ساتھ جانے کا جلدی ہی موقع مل گیا تھا اس لیے اس نے ایک ہی مشاعرے میں جا کر دیکھ لیا تھا کہ صدف کی جان پہچان کن لوگوں سے ہے۔

اب الیاس کو یہ بات کھل رہی تھی کہ وہ اتنے لوگوں میں جان پہچان بھی رکھتی ہے اور غیر مرد اس سے باتیں بھی کرتے ہیں، اس کے ساتھ ہنستے بھی ہیں اور صدف بھی ان کی باتوں پر ہنستی ہے۔

الیاس کو محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا قد صدف کے آگے بہت چھوٹا ہے۔اس کی حیثیت اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔کیونکہ اس کے حلقے میں بڑے بڑے لوگ ہیں۔

صدف نے جب کھانا لگا دیا تو دونوں کھانا کھانے لگے۔کھانے کے دوران الیاس نے سوال کیا۔''صدف تم کو ایک مشاعرے کے کتنے پیسے ملتے ہیں ؟''

صدف کو اس سوال نے چونکا دیا۔''کبھی مل جاتے ہیں اور کبھی نہیں ملتے۔''

''جب پیسے ملتے ہیں تو کتنے پیسے ملتے ہیں۔'' الیاس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

صدف اپنی جگہ سے اٹھی اور اپنے پرس سے ایک چیک نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔الیاس نے چیک کی طرف دیکھا اور منہ بنا کر بولا۔''بس اتنے ہی ملتے ہیں۔اس سے تو بہتر ہے تم مشاعرے میں جاؤ ہی نہیں۔''

الیاس کی بات سن کر صدف نے متانت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ؟ میں پیسوں کے لیے نہیں لکھتی۔لکھنا میرے ذہن کی تسکین کا باعث ہے۔''

''انسان کو وہ کام نہیں کرنا چاہیے جس میں اسے فائدہ

نہ ہو۔ اب دیکھو اگر مجھے میری کمپنی پیسے دینے چھوڑ دے تو کیا میں نوکری کروں گا؟ بالکل بھی نہیں کروں گا۔ میں مفت میں کام کرنے والا نہیں ہوں۔"

"آپ جو کام کرتے ہیں وہ آپ کا پیشہ ہے۔ لکھنا میرا پیشہ نہیں ہے۔" صدف بولی۔

"اگر پیشہ نہیں ہے تو تم لکھنا چھوڑ دو۔ اور جتنے کا تمہیں چیک ملا ہے یہ تو غیر مردوں کے ساتھ باتیں کرنے اور ان کے ساتھ ہنسنے کی بھی قیمت نہیں ہے۔" الیاس نے کہا۔

اس کی بات سن کر صدف ناز دم بخود اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ یہ اچانک اس نے کیا بات کہہ دی تھی۔ صدف کو لگا جیسے وہ الیاس کے سامنے نہیں بیٹھی...... کسی ایسے مرد کے سامنے بیٹھی ہے جس کی سوچ انتہائی پست ہے۔

"یہ کیا بات کہہ دی ہے آپ نے؟" صدف بولی۔

"میں نے وہی بات کہی ہے جو تم نے سنی ہے۔ میں تو سمجھتا تھا تم مشاعرے میں اپنی شاعری سنانے جاتی ہو اور بس......لیکن تم وہاں غیر مردوں کے ساتھ بیٹھتی ہو، ان سے باتیں کرتی ہو، ان کے ساتھ ہنستی ہو......" الیاس کے لہجے میں تغیر آ گیا تھا۔

"ہم ایک عرصے سے ایک ساتھ مشاعروں میں جاتے ہیں، ملتے ہیں۔ ہماری ایک دوسرے سے جان پہچان ہے مگر ہم سب ہی ایک حد میں رہ کر ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔"

"مجھے یہ سب اچھا نہیں لگا۔ اس لیے تم مشاعروں میں جانا چھوڑ دو۔" الیاس نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔

صدف اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ کھانا کھانا بھی بھول گئی تھی۔ الیاس کھانا کھاتا رہا، اطمینان سے اپنا کھانا ختم کرنے کے بعد وہ اُٹھا، ہاتھ دھوئے اور پھر ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھ گیا۔

صدف کچھ دیر کے بعد اُٹھی برتن سمیٹے اور بیڈ روم میں چلی گئی۔ اگلے مہینے لٹریری فیسٹیول تھا جس میں اس کی شرکت متوقع تھی، سبھی اس کا نام لے رہے تھے۔ اس ماہ بھی اس کے تین اہم مشاعرے تھے۔ جس کے لیے وہ ہاں کر چکی تھی۔

صدف اپنے بیڈ روم میں بہت دیر تک بیٹھی سوچتی رہی۔ الیاس کے کہے ہوئے الفاظ تیر بن کر اس کے سینے میں پیوست ہو گئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد صدف اُٹھی اور اپنی الماری سے ایک فائل نکالی جو پلاسٹک کے کور میں تھی۔ اس میں اس کی بہت سی غزلیں اور نظمیں تھیں، وہ اسے کتابی شکل میں شائع کرانا چاہتی تھی۔ صدف کو لگا جیسے اب اس کا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔ الیاس نے جو باتیں اس سے پہلی رات کی تھیں ان سے تو صدف کو ایسا حوصلہ ملا تھا جیسے اس کے سارے خواب پورے ہو گئے ہوں اور آج اس کے ایک جملے نے صدف کے خواب ہی نہیں بلکہ اسے بھی اندر سے توڑ دیا تھا۔

صدف نے وہ فائل پھر اسی جگہ رکھ دی۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور الیاس اندر آ گیا۔ اس نے صدف کی طرف دیکھا اور کہا۔ "اتنی اداسی کس بات کی ہے۔ میں نے مشاعروں میں جانے پر منع کیا ہے اس بات کا، یا مشاعروں میں جا کر جو دوسروں سے ہنس ہنس کر باتیں ہوتی تھیں اس کا غم ہے؟"

"آپ کی سوچ پر مجھے حیرت ہے۔"

"میری سوچ کو کیا ہوا ہے جو تم اتنی حیرت زدہ ہو؟" الیاس نے حیران ہونے کی اداکاری کی۔

"مجھے آپ کی یہ باتیں اچھی نہیں لگ رہی ہیں۔" صدف اپنی جگہ سے اُٹھی۔

الیاس تمسخرانہ انداز میں مسکرایا۔ "اچھا بتا دو مجھے کیسی باتیں کرنی چاہئیں جو تمہیں بری نہ لگیں؟ کیا میں ایسی باتیں کروں کہ تم مشاعروں میں جاؤ اور جن سے چاہو ہنس کر باتیں کرو۔"

"الیاس آپ ایسے تو نہیں تھے، یہ اچانک آپ کو کیا ہو گیا ہے؟" صدف کو غصہ آ گیا۔

الیاس اس کے قریب جا کر بولا۔ "میں ایسا ہی تھا اور ایسا ہی ہوں۔ بس تمہاری رسی اس لیے ڈھیلی چھوڑی تھی تاکہ یہ دیکھ سکوں کہ تم کرتی کیا ہو؟ تمہارا ملنا جلنا کن لوگوں سے ہے۔ شادی سے پہلے کے تمہارے تعلقات دیکھنا چاہتا تھا، اگر میں پہلی رات ہی تمہیں منع کر دیتا تو مجھے کیسے پتا چلتا کہ تم کن لوگوں سے ملتی ہو۔"

"اس کا مطلب ہے آپ نے میرے ساتھ جھوٹ بولا تھا۔" صدف اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"جب تک ہم پانی کے اندر نہیں اتریں گے تو کیسے پتا چلے گا پانی کتنا گہرا ہے۔" الیاس بولا۔ "اب جاؤ اور میرے لیے چائے بنا کر لاؤ اور آئندہ کسی مشاعرے کے لیے گھر سے قدم باہر مت رکھنا۔"

الیاس کہہ کر اپنے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ صدف غصے سے باہر نکل گئی۔ جو گھر اسے جنت معلوم ہو رہا تھا وہی گھر اسے قید خانہ

دکھائی دینے لگا تھا، ایسا قید خانہ جہاں وہ ہی نہیں اس کی صلاحیتوں کو بھی پابند سلاسل کردیا گیا ہو۔

تین دن کے بعد آرٹس کونسل میں مشاعرہ تھا۔ صدف ناز کا جانا لازمی تھا۔ صدف سوچ رہی تھی کہ الیاس نے اسے مشاعرے میں جانے سے منع کیا ہوا ہے، وہ کیا کرے۔

مشاعرہ شام پانچ بجے تھا۔ سارا دن صدف کا اسی شش و پنج میں گزر گیا کہ وہ کیا کرے۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو، وہ مشاعرے میں ضرور جائے گی۔ اس نے اپنی پہچان بنانے اور اپنی صلاحیتوں کو دوسروں پر ثابت کرنے کے لیے جو محنت کی ہے وہ اسے رائیگاں نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔

صدف تیار ہوئی اور جانے لگی تو اچانک الیاس آگیا۔ اسے تیار دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ''کہاں جارہی ہو۔''

''آرٹس کونسل جارہی ہوں۔''

''وہاں مشاعرہ ہے؟ میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ تم کسی مشاعرے میں نہیں جاؤ گی۔''

''میں ابھی جارہی ہوں۔ اس موضوع پر آکر بات کروں گی۔'' صدف کہہ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ الیاس نے آگے بڑھ کر اسے بازو سے پکڑا اور ایسے اپنی طرف کھینچا کہ اس کا پاؤں غیر متوازن ہوگیا جس سے اس کے پیر پر وزن پڑا اور وہ تکلیف سے چلا اُٹھی۔

صدف نے عجیب نظروں سے شوہر کو دیکھا پھر بیٹھ کر اپنا پیر سہلانے لگی۔ الیاس پاس کھڑا اسے گھورتا رہا۔ جب درد کم ہوا تو وہ اپنا ہینڈ بیگ پکڑ کر اُٹھی اور جانے لگی تو الیاس نے غصیلے انداز میں اس کے پیر پر ٹھوکر ماری اس بار صدف درد سے تڑپ اُٹھی۔

الیاس بڑبڑاتا ہوا کمرے میں چلا گیا۔ صدف بمشکل اپنی جگہ سے اُٹھی اور لنگڑاتی ہوئی صوفے تک گئی، کچھ دیر وہ بیٹھی اپنے پیر کو سہلاتی رہی۔ اس کے بعد اس نے درد کم کرنے والی ٹیوب دراز سے نکال کر اپنے پیر پر مالش کی پھر کچھ دیر اسی طرح بیٹھی رہی۔ اس کے پیر میں درد تھا لیکن وہ چلنے کے قابل ہوگئی تھی۔

صدف نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا اور ہمت کر کے اُٹھ کھڑی ہوئی پھر وہ لنگڑاتی ہوئی باہر چلی گئی۔

صدف جیسے تیسے رکشا اسٹینڈ تک پہنچی اور رکشا میں بیٹھ کر وہ آرٹس کونسل پہنچ گئی۔ ابھی وہ گیٹ سے داخل ہوئی ہی تھی کہ اسے رخشندہ مل گئی جو ایک خوش فکر شاعرہ تھی۔

''کیا ہوا صدف...... تم ٹھیک تو ہو؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔ بس آتے ہوئے اچانک پیر میں موچ آگئی۔'' صدف نے اصل بات چھپالی۔

''تو آرام کرلیتیں۔''

''میں گھر سے نکل کر رکشا اسٹینڈ کی طرف جارہی تھی کہ موچ آگئی، یہاں آنا بھی ضروری تھا ناں۔'' صدف نے مسکرا کر کہا اور بمشکل چلتی ہوئی وہ اندر چلی گئی۔ اس کے پیر کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پیر کی تکلیف کی بجائے الیاس کے رویے پر زیادہ آنسو نکلے تھے جو اس نے چھپالیے تھے۔

صدف نے وہ مشاعرہ جیسے تیسے پڑھا، بہت سی داد سمیٹی اور گھر جانے کے لیے باہر نکل آئی۔ قدم اٹھائے تو احساس ہوا کہ اس سے چلنا دوبھر ہورہا تھا۔ نواز تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

''آپ کے پیر میں تکلیف ہے، چلیے میں اپنی گاڑی میں چھوڑ آتا ہوں۔'' نواز نے کہا۔

''شکریہ میں چلی جاؤں گی۔'' صدف کہہ کر گیٹ کی طرف بڑھ گئی اور نواز اسی جگہ کھڑا اسے دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں کہتا رہا کہ ''تجھے قابو کر کے ہی چھوڑوں گا۔''

صدف بمشکل اپنے فلیٹ میں پہنچی تو الیاس اس کا منتظر تھا۔ اس نے صدف کو دیکھتے ہی غصے سے کہا۔ ''تم چلی ہی گئیں۔ میرے منع کرنے کے باوجود تم چلی گئی۔ ہاں...... ان مردوں سے باتیں جو کرنی تھیں، ان کے ساتھ بیٹھ کر دانت جو نکالنے تھے۔''

الیاس بولتا رہا، صدف خاموش رہی۔ اس نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور چپ چاپ اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئی۔ الیاس بولتا رہا۔ بولتے بولتے وہ خود ہی چپ ہوگیا لیکن وہ ایسے بھی الفاظ کہہ گیا تھا جنہوں نے صدف کو شدید گھائل کردیا تھا۔

☆......☆

دوسرے دن الیاس کو نواز کا فون آگیا۔ حال چال پوچھنے کے بعد نواز نے کہا۔ ''اگر آپ فری ہیں تو میرے آفس آجائیں۔ ساتھ مل کر چائے پیتے ہیں، باتیں کرتے ہیں اور آپ کے لیے ایک تحفہ بھی ہے میرے پاس۔''

تحفے کا لالچ پُرکشش تھا۔ چنانچہ الیاس بولا۔ ''اتفاق سے میں آپ کے آفس کے قریب ہی ہوں۔ دس منٹ میں آپ کے پاس آجاتا ہوں۔''

الیاس اس کے آفس سے دور تھا۔ اس نے اسی وقت

اپنی بائیک اس کے آفس کی طرف موڑی اور تیز رفتاری سے اس کے آفس میں پہنچ گیا۔نواز نے بھرپور انداز میں استقبال کیا،اس کی خوب خدمت کی اور باتوں باتوں میں بتانے لگا۔''میرا کاروبار شگاگو میں بھی ہے،جو میرے بچے سنبھال رہے ہیں۔ادب کی خدمت کا شوق مجھے یہاں لے آیا اور میں نے یہ ادارہ بنالیا لیکن یہاں آکر مجھے احساس ہوا کہ میں نے بہت بڑی غلطی کرلی ہے۔''

''کاروبار میں فائدہ نہیں ہوا کیا؟''الیاس نے پوچھا۔

''فائدے کو ایک طرف رکھ کر میں یہاں ہونے والے مشاعروں اور ادبی تقریبات کی بات کررہا ہوں۔یہاں لوگ خواتین کو ایسی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ بس کیا بتاؤں......اور بعض خواتین بھی ایسے تعلقات بڑھاتی ہیں تاکہ وہ ان سے اپنا مفاد حاصل کرسکیں۔میں تو شکر ادا کرتا ہوں میری بیوی شاعرہ نہیں ہے۔''نواز بولا اور سگریٹ سلگانے لگا۔

الیاس کو ذرا سی ہوا کی ضرورت تھی۔وہ بول پڑا۔''میں نے مشاعروں کا ماحول دیکھا تو صدف کو منع کردیا کہ وہ اب کسی مشاعرے میں نہیں جائے گی۔''

''آپ نے ان کو منع کیا ہے؟وہ تو رات مشاعرے میں موجود تھیں اور اتنی تکلیف میں تھیں کہ اگر وہ نہ بھی آتیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔''نواز نے جلتی پر تیل چھڑکا۔

''میرے منع کرنے کے باوجود وہ مشاعرے میں چلی گئی اور مجھے رات کا کھانا بازار سے لاکر کھانا پڑا۔''

''بہت افسوس ہے......ایک بیوی کو مشاعرہ عزیز ہے اور شوہر کی بھوک سے کوئی سروکار نہیں ہے۔''نواز نے ایسے کہا جیسے اسے واقعی دلی طور پر رنج ہوا ہو۔

الیاس کو اور بھی غصہ آگیا۔''مجھے لگتا ہے اب مجھے اور بھی سختی کرنی پڑے گی۔''

''آپ ان پر کوئی سختی نہ کریں۔''

''تو پھر کیا کروں۔''

''پہلے اس بات کا پتا لگائیں کہ ایسی کیا بات تھی کہ وہ پیر کی اتنی تکلیف کے باوجود مشاعرے میں پہنچیں۔''نواز نے اپنی بات کو مشکوک بناتے ہوئے کہا۔

الیاس نے نواز کو گھورا تو نواز نے جلدی سے ایک گفٹ پیک نکال کر مسکراتے ہوئے اس کے سامنے رکھ دیا اور بولا۔''اس میں بہترین کلون ہے......اور کچھ دوسری چیزیں ہیں جو آپ کو پسند آئیں گی۔یہ میں شگاگو سے لایا تھا۔''

الیاس نے گفٹ پیک کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا۔

''آپ نے تو ایسے ہی تکلف کردیا۔''

''اس میں تکلف کی کوئی بات نہیں ہے۔مجھے آپ پہلی ہی ملاقات میں اچھے اور معصوم لگے۔آپ ایسے معصوم ہیں جو اس دشت سے ناواقف ہیں،اس لیے میرے دل میں آپ کے لیے ہمدردی ہے۔''نواز نے سگریٹ کا کش لے کر اسے ایش ٹرے میں مسل دیا۔

الیاس نے گفٹ پیک کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔''آپ سمجھتے ہیں کہ مشاعروں اور ادبی تقریبات میں خواتین اور حضرات کی دوستیاں ہوجاتی ہیں؟''

نواز اس کی بات سن کر مسکرایا اور معنی خیز انداز میں بولا۔''دوستیاں؟یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔پھر کبھی اس پر بات کریں گے۔میرا مقصد آپ کو چائے پلانا اور یہ حقیر ساتحفہ دینا تھا۔''

''آپ کا شکریہ آپ نے مجھے قیمتی وقت دیا،چائے پلائی اور یہ تحفہ دیا۔''الیاس اُٹھ کھڑا ہوا۔دونوں نے ایک دوسرے سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔الیاس جانے لگا تو اس نے رک کر نواز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''میں ابھی صدف پر کوئی ایسی سختی نہیں کرتا۔''

''میری باتوں پر عمل کرکے دیکھیں آپ کو فائدہ ہوگا لیکن ہماری یہ ملاقات ہمارے درمیان ہی رہنی چاہیے۔''

''نواز کی بات کو وہ سمجھ گیا تھا۔الیاس اثبات میں سرہلا کر چلا گیا۔

☆......☆

ابھی الیاس راستے میں ہی تھا کہ نواز نے صدف کو فون کردیا۔دوسری طرف سے جب صدف نے فون آن کیا تو نواز نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔''آپ کی خیریت دریافت کرنی تھی۔آپ کے پیر کا درد کیسا ہے۔''

''اب بہتر ہے۔''صدف نے جواب دیا۔

''رات جو آپ نے غزل پڑھی تھی اس کی داد کی بازگشت میں ابھی تک سن رہا ہوں۔کچھ دوست یہاں آئے تھے،وہ بھی آپ کی غزل کی تعریف کررہے تھے۔''

''شکریہ......''

''آپ بھی کسی دن تشریف لائیں میرے آفس میں۔اس شہر کی ہر شاعرہ وشاعر میرے غریب خانے میں آچکے ہیں ایک آپ ہیں جنہوں نے ابھی تک اپنا مبارک قدم نہیں رکھا۔''

"کسی دن آؤں گی۔"

"خالی ہاتھ نہ آئیے گا۔ اپنا مسودہ ساتھ لائیے گا۔ اسے میرا ادارہ شائع کرے گا۔"

"جب میں سمجھوں گی کہ اچھا کلکشن ہو چکا ہے تو پھر اس بارے میں سوچوں گی۔"

"ایک بات پوچھنی تھی آپ سے اگر آپ ناراض نہ ہوں تو۔" نواز اصل بات کی طرف بڑھا۔

"جی پوچھیں۔"

"آپ کے شوہر آپ پر سختی کرتے ہیں کہ آپ مشاعروں میں جانا چھوڑ دیں۔"

"یہ بات آپ سے کس نے کی ہے؟" صدف چونکی۔

"آپ تو جانتی ہیں یہاں پڑھنے لکھنے والوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ایسے ہی بات ہوگئی تھی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جھوٹ بول رہا ہے وہ جس نے بھی یہ بات کی ہے۔" صدف کے الفاظ سخت ہوگئے۔

"میرا بھی یہی خیال تھا کہ وہ جھوٹ کہہ رہا ہے لیکن پھر بھی میں نے اپنی تسلی کے لیے پوچھنے کی جسارت کر ہی لی ......آپ تو وہ شاعرہ ہیں جن کی آواز صحرا میں پھیلے تو پھول اُگ آئیں۔ آپ پر پابندی لگانے والا انتہائی بدذوق اور بدنصیب شخص ہی ہوگا۔"

"نواز صاحب میں کچن میں مصروف ہوں ہم پھر بات کریں۔" صدف نے اکتا کر کہا۔

"کوئی بات نہیں میں پھر فون کرلوں گا۔ ویسے ایک تخلیق کار خاتون کے لیے کچن علاقہ غیر ہونا چاہیے، وہ قلم اور کاغذ کے قریب ہو تو بات بنتی ہے۔" نواز نے کہا اور صدف نے فون بند کردیا۔

صدف کے دماغ میں کبھی ایسی بات نہیں آئی تھی۔ اس نے اپنے گھر اور لکھنے پڑھنے کو الگ الگ رکھا تھا۔ اب الیاس کا رویہ اور نواز کی کہی ہوئی بات اس پر اثر کر رہی تھی۔ وہ بڑی بڑی لکھنے والیوں کے بارے میں سوچنے لگی۔ جو لکھ کر نام، شہرت اور دولت کما چکی تھیں۔ وہ ٹیلی ویژن کے مختلف پروگراموں میں بھی جلوہ افروز ہوتی تھیں تو ان کے ہنستے ہوئے چہروں کو دیکھ کر لگتا تھا ان کو کوئی غم نہیں ہے۔ وہ خوشحال ہیں ہر فکر سے آزاد......

اسی طرح احمد نواز کے پبلشنگ ادارے میں بھی روز خواتین اور مرد لکھنے لکھانے والے لوگ جمع ہوتے تھے، گپ شپ لگاتے تھے ایک وہی تھی جو ان کی طرح آزاد نہیں گھومتی تھی۔

صدف ان ہی خیالوں میں تھی کہ الیاس آگیا۔ اس کا مزاج خوشگوار تھا۔ وہ کچھ کھانے پینے کا سامان بھی لے کر آیا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے صدف سے اس کے پیر کی تکلیف کا حال پوچھا تو صدف کو حیرت ہوئی کہ اسے کیسے خیال آگیا۔

پھر اس نے کھانے کا سامان خود ہی پلیٹ میں ڈالا اور صدف کا بازو پکڑ کر کرسی تک لے گیا۔

"مجھے افسوس ہے میں نے تمہارے ساتھ سختی کی...... مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ تم کسی بھی ادبی تقریب اور مشاعرے میں جا سکتی ہو۔"

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟" صدف نے متحیر لہجے میں پوچھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" پہلے الیاس نے ایک قہقہہ لگایا اور پھر جواب دینے کے بعد اس نے وہ گفٹ پیک صدف کے سامنے کرتے ہوئے بتایا۔ "یہ میں نے اپنے لیے خریدا ہے۔ تمہارے لیے بھی کچھ خریدنا چاہتا تھا لیکن مجھے سمجھ نہیں آئی کہ میں کیا لوں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا تمہیں پیسے دے دوں گا، تم اپنی مرضی سے کچھ بھی خرید لینا۔"

صدف نے ایک نظر گفٹ پیک کی طرف دیکھا اور متانت سے بولی۔ "میرے لیے آپ مٹی کی ایک ڈھلی خرید لاتے تو بھی مجھے بہت خوشی ہوتی۔"

"اچھا یہ بتاؤ اب مشاعرہ کب ہے؟"

"ایک ہوٹل میں ایک ادبی تقریب ہے۔"

"تم جاؤ گی؟"

"دوبارہ اتنی ہی تکلیف سہہ کر جانا پڑا تو گھر ہی پڑی رہوں گی۔" صدف نے جواب دیا۔

الیاس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پیار.... بھرے انداز میں کہا۔ "مجھے شرمندہ نہ کرو۔ تم چلی جانا۔"

صدف کے لیے الیاس کے رویے کا تغیر سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس نے سوچا شاید اسے سمجھ آگئی ہو اور اسے اپنی غلطی کا احساس بھی ہوگیا ہو۔

صدف کچن میں چلی گئی اور الیاس اُٹھ کر بالکونی میں کھڑا ہوگیا۔ اس نے نواز کو فون کیا اور آہستہ سے بولا۔ "کل کوئی تقریب ہے؟"

"کل ایک کتاب کی رونمائی ہے۔ آپ آنا چاہتے

ہیں؟'' نواز نے جواب دیا۔
''دراصل صدف جانا چاہتی ہے۔''
''آپ جانے دیں۔''
''میں نے تو اجازت دے دی ہے لیکن......'' الیاس کہتے کہتے خود ہی جان بوجھ کر رک گیا۔
''میں سمجھ گیا، آپ بے فکر رہیں۔ جس شک کی بنیاد پر میں نے آپ سے بات کی تھی وہ ابہام دور کر کے رہوں گا۔''
''ٹھیک ہے پھر کل ملاقات ہوگی۔'' الیاس نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ وہ واپس آیا تو صدف کچھ لکھ رہی تھی۔ اس کے سامنے ایک کتاب بھی تھی۔ الیاس نے کتاب اُٹھا کر دیکھی اور اس کی پشت پر چھپی کتاب کے مصنف کی تصویر کو دیکھا۔ وہ ایک نوجوان اور الیاس سے زیادہ خوبصورت نوجوان تھا۔
''کیا لکھ رہی ہو؟''
''کل اس کتاب کی رونمائی ہے۔ آپ نے اجازت دی ہے تو مضمون لکھ رہی ہوں۔'' صدف نے جواب دیا۔
''جب فارغ ہو جاؤ تو مجھے ایک کپ چائے دے دینا۔ میں ٹی وی دیکھ رہا ہوں۔ بالکل فارغ ہو کر بتانا۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔'' الیاس مسکراتا ہوا دوسرے کمرے کی طرف چلا گیا۔ صدف کے لیے اس کا رویہ حیران کن تھا۔ وہ لکھنے میں مصروف ہو گئی۔

☆......☆

وہ ہوٹل شہر کے وسط میں تھا اور ادبی لوگوں کی آمد و رفت اور بیٹھک اس جگہ رات گئے تک رہتی تھی۔ اسی ہوٹل کے ہال میں اس کتاب کی رونمائی تھی۔ صدف ناز کے پیر کا درد بہت کم ہو گیا تھا اس لیے وہ آسانی سے ہوٹل پہنچ گئی۔
ابھی تقریب شروع نہیں ہوئی تھی کہ ایک نوجوان تیزی سے صدف کی طرف بڑھا اور اس کے پاس پہنچ کر شائستہ لہجے میں بولا۔ ''آپ صدف ناز ہیں؟''
''جی میں صدف ناز ہوں۔''
اس نے اپنی جیب سے اپنا کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بتایا۔ ''میرا نام دانش راحیل ہے۔ ادب جدید پبلی کیشنز کا نام آپ نے سنا ہوگا۔''
''جی وہ بہت بڑا پبلشنگ ادارہ ہے۔''
''اس ادارے کے مالک میرے والد صاحب ہیں اور میں چھ ماہ قبل اس بزنس میں آیا ہوں۔ لاہور آتا ہوا تو والد صاحب نے خصوصی تاکید کی کہ میں آپ سے لازمی ملوں۔'' دانش بولا۔ ''دراصل انہوں نے آپ کی شاعری پڑھی ہے وہ چاہتے ہیں ہم آپ کا مجموعہ چھاپیں۔ میں اسی ہوٹل کے کمرا نمبر دو سو انیس میں ٹھہرا ہوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ تقریب ختم ہونے پر مجھے تھوڑا سا وقت دے دیں تو نوازش ہوگی۔''
''جی ضرور میں آپ سے مل کر جاؤں گی۔'' صدف کے علم میں تھا کہ وہ ایک بہت بڑا پبلشنگ ادارہ ہے۔ وہ ادارہ ہر کسی کو منہ نہیں لگاتا یہ تو اس کی قسمت کہ وہ خود چل کر اس کے پاس آئے تھے اس لیے صدف اس موقعے کو ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے فوراً ہامی بھر لی تھی۔
نواز کچھ فاصلے پر کھڑا ان کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دانش کو نہیں جانتا تھا۔ البتہ اس کی جگہ اگر اس کا باپ کھڑا ہوتا تو وہ فوراً پہچان جاتا کہ وہ کون ہے۔ دانش ایک طرف چلا گیا اور صدف ہال کی طرف چل دی۔ نواز اس کے پیچھے لپکا۔
''ابھی پروگرام شروع ہونے میں دیر ہے، تب تک ایک کپ چائے پی لیتے ہیں۔''
صدف نے ایک نظر ہال کی طرف دیکھا، ابھی لوگ آ رہے تھے۔ صدف نے سوچا چائے پینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ اس کے ساتھ ڈائننگ ہال کی طرف چل دی۔
دونوں نے ایک میز منتخب کی اور آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ چائے آنے تک دونوں ادب پر باتیں کرتے رہے پھر اچانک نواز نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ادب کی دنیا میں مجھے بیس سال کا طویل عرصہ ہو گیا ہے۔ میں نے اس دنیا میں بہت سے چہرے دیکھے ہیں۔ اور اب اتنا تجربہ ہو گیا ہے کہ چہرہ دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ اس کے اندر کا حال کیا ہے۔''
صدف اس کی بات سن کر مسکرائی۔ ''اچھا...... پھر بتائیں میرے اندر کا حال کیا ہے۔''
''دکھی ہے۔'' نواز نے ایک دم سے کہہ دیا۔ صدف اس کا جواب سن کر خود بھی سنجیدہ ہو گئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ نواز ایک دم سے اس کا چہرہ پڑھ کر وہی بتا دے گا جو سچ ہے۔ اب وہ یہ تو نہیں جانتی تھی کہ وہ الیاس سے اندر کی ساری باتیں پوچھ چکا ہے۔ نواز کچھ ثانیے کے بعد بولا۔ ''میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ بھی ان تخلیق کار خواتین میں ہیں جو اپنے شوہر کی سختی کا سامنا کر کے اپنے نام اور کام کو زندہ رکھنے کی کوشش میں کرب کی سولی پر لٹکی اصل چہرے پر دوسرا چہرہ سجا کر مسکراتی رہتی ہیں لیکن اندر سے ڈری اور سہمی رہتی ہیں کہ کب خون جلا کر تخلیق کیے الفاظ ردی کہہ کر جلا دیئے جائیں گے۔''
صدف کے دل میں ایک دم سے نواز کے بارے میں

جو سوچ تھی وہ بدل گئی۔ وہ یہی سمجھتی تھی کہ نواز کو خواتین سے باتیں کرنے کا شوق ہے۔ وہ ان کے قریب ہونے کے بہانے تراشتا ہے۔ لیکن آج اسے پتا چلا کہ وہ ایک سنجیدہ اور دوسرے کے درد کو سمجھنے والا شخص ہے۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ایسا ہی ہے۔'' صدف نے اس کی باتوں کی تصدیق کردی۔

''میں نے ان خواتین کو بھی دیکھا ہے جو اپنی شاعری میں تو محبت کی باتیں کرتی ہیں لیکن ان کو محبت کبھی ملی ہی نہیں...... وہ اپنی شاعری کی داد سمیٹ کر جب گھر جاتی ہیں تو انگاروں میں لپٹے شوہر کے طعنے ان کے منتظر ہوتے ہیں۔'' نواز بولا۔

''شادی کے بعد میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا ہے۔'' صدف کی زبان پر سچ آگیا۔

''آپ بہت خوبصورت شاعرہ ہیں۔ آپ کی غزلوں میں جڑے لفظ ہیروں کی طرح ہوتے ہیں اور جب آپ غزل پڑھتی ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے داد بے اختیار منہ سے نکل رہی ہو۔ میں نہیں چاہوں گا کہ آپ کے لکھے الفاظ کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پرزے بن کر ہوا کے ساتھ زمین پر کبھی ادھر اور کبھی ادھر اڑتے نظر آئیں۔ آپ خود کو دفن ہونے سے بچائیں۔'' نواز کے لہجے میں ہمدردی اور متانت تھی۔

''الیاس اب بدل گئے ہیں۔ ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے اور انہوں نے مجھے خود اجازت دی ہے۔'' صدف نے بتایا۔

نواز نے چائے کا آخری گھونٹ بھرا اور بولا۔ ''خدا کرے کہ وہ واقعی بدل گیا ہو...... لیکن اگر اس کا یہ ڈراما ہوا تو ایک بار مجھے ضرور یاد کر لیجیے گا۔''

صدف بھی چائے ختم کر چکی تھی۔ دونوں اُٹھے اور ہال کی طرف چلے گئے۔ وہاں پروگرام شروع ہونے ہی والا تھا۔ دونوں اپنی اپنی نشستوں پر براجمان ہوگئے۔

کتاب کی رونمائی کی تقریب اختتام کو پہنچی تو صدف اوپر چلی گئی۔ جس کمرے میں دانش ٹھہرا تھا، اس نے دروازہ نوک کیا تو کچھ ہی دیر میں دانش نے دروازہ کھول دیا۔ صدف اندر چلی گئی۔ نواز کچھ فاصلے پر کھڑا اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

اندر پندرہ منٹ کی مختصر گفتگو میں دونوں کے درمیان مسودے کی بات ہوئی اور معاوضہ طے ہوا۔ صدف نے مسودہ دینے کا وعدہ کیا اور وہ اجازت لے کر باہر نکل آئی۔

نواز نے دیکھا تو وہ جلدی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا

جیومیٹری

اس موضوع پر البیرونی نے حسبِ ذیل کام کیے۔

☆ منتظم کثیر الاضلاع یعنی مخمس، مسدس، مثمن، معشبرہ وغیرہ کو کسی دائرے کی مدد سے بنانا۔

☆ کسی دائرے کا وتر اور مماس کھینچنا اور اس کی لمبائی بذریعہ پیائش اور بذریعہ حساب نکالنا۔

☆ اقلیدس کے بہت سے مسائل کے متبادل ثبوت بتائے۔ ایک مسئلے سے دوسرا مسئلہ نکالا اور ثبوت بھی دیے۔

کیلکولس

خیال ہے کہ ریاضی کی اس شاخ کا موجد بھی البیرونی تھا۔ البیرونی نے جو فارمولے وضع کیے وہ مشکل تھے اور لوگ انہیں سمجھ نہ سکے۔ سترویں صدی میں یورپ میں البیرونی ہی کے عربی زبان کے لکھے ہوئے ان فارمولوں اور حسابی طریقوں کا مطالعہ کر کے اور ان میں ذرا سی تبدیلیاں کر کے اس طرح پیش کر دیا گیا کہ جیسے یہ ایجاد اہل یورپ کی ہی ہو۔

ارض پیمائش

یہ ایک ایسا علم ہے جس سے زمین کے چھوٹے چھوٹے قطعات کو ناپنا آسان ہوتا ہے لیکن بہت بڑے علاقے کا رقبہ نکالنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ زمین کی سطح ہموار نہیں ہوتی بلکہ گول ہوتی ہے۔ بڑے بڑے نقشے بنانے والوں کو اس گولائی کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ البیرونی نے اس پیائش میں قروی یا گول مثلث پیمائی، سے کام لیا۔ پیائش کا یہ طریقہ آج تک رائج ہے۔ البیرونی نے زمین کا نصف قطر اور محیط معلوم کیا۔ آج سے ایک ہزار سال پہلے اس نے جو نتائج اخذ کیے وہ آج بھی بہت کم فرق سے ملتے جلتے ہیں۔ جدید طریقوں سے نکالے ہوئے نصف قطر سے صرف بارہ میل کم تھا۔ اسی طرح محیط ستر میل کم تھا۔ پاکستان کے ایک گاؤں نندنہ، ضلع جہلم کو البیرونی کی وجہ سے خاص اہمیت حاصل ہے البیرونی نے اسی جگہ زمین کا محیط اور قطر ناپا تھا۔

مرسلہ: سلطانہ بھٹو، لاڑکانہ

گیا۔ جونہی صدف اس کے سامنے سے گزرنے لگی وہ ایک دم سے ستون کے پیچھے سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔

''کل دن گیارہ بجے آپ میرے آفس آ سکتی ہیں؟''

''وہ کیوں؟'' صدف نے پوچھا۔

''آپ سے ریکویسٹ ہے، آ جائیں گی تو مجھے اچھا لگے گا۔'' نواز نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ وہ اپنی باتوں سے صدف کو مائل بھی کر چکا تھا اور اس کے اندر جو اس کے بارے میں منفی تاثر تھا وہ بھی معدوم ہو گیا تھا۔ صدف نے آنے کی ہامی بھر لی۔

ادھر صدف باہر نکلی اور ادھر نواز نے الیاس کو کال کر دی۔ کچھ رسمی باتوں کے بعد نواز نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے، صدف کو آنے سے منع کر دیا آپ نے؟''

''میں نے منع تو نہیں کیا، وہ تو گئی ہوئی ہے۔'' نواز کی بات سن کر الیاس چونکا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے تقریب ختم ہوئی ہے۔ مجھے تو صدف کہیں نظر نہیں آئی۔'' نواز نے کہا۔

''وہ تو مجھے یہ کہہ کر گئی تھی کہ وہ تقریب میں جا رہی ہے......'' دوسری طرف الیاس کی حیرت کم نہیں ہو رہی تھی۔

''ایک منٹ ایک منٹ......ایک منٹ میں ابھی کال بیک کرتا ہوں۔'' نواز نے اس انداز میں کہا جیسے اس نے کوئی چیز دیکھی ہو اور وہ ایک دم اس کی طرف متوجہ ہو گیا ہو۔

نواز نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور ٹھیک دو منٹ کے بعد پھر کال کی تو پہلی ہی بیل پر الیاس نے فون آن کر دیا۔

''کیا ہوا تھا......؟''

''پہلے آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ یہ بات ابھی صدف سے نہیں کریں گے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں میں اس سے کوئی بات نہیں کروں گا۔'' الیاس نے جلدی سے وعدہ کر لیا۔

''اگر آپ نے بات کی تو میں صاف مکر جاؤں گا۔ پھر نہ کہنا میں نے آپ کو جھوٹا کر دیا ہے۔''

''میں بات نہیں کروں گا، آپ مجھے بات بتائیں کیا ہے۔'' دوسری طرف سے الیاس نے مضطرب لہجے میں کہا۔

''ابھی صدف کسی اجنبی کے ساتھ سیڑھیاں اتر کر باہر گئی ہے۔'' نواز بولا۔

''کیا یہ سچ ہے؟''

''میں یہ سب دیکھ کر آپ کو بتا رہا ہوں۔ اب آپ بات نہیں کریں گے۔ ورنہ میں اپنی کہی ہر بات سے مکر جاؤں گا۔ تب تک چپ رہیں جب تک میں آپ سے کچھ کہہ نہ دوں۔ کل تک کا انتظار کریں کہ وہ کہاں جانے کے لیے باہر جاتی ہے۔''

الیاس کو نواز کی بات سن کر غصہ تو بہت آیا تھا۔ اس کا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ جیسے صدف گھر آئے وہ اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا باہر لے جائے اور اسے اپنے گھر میں داخل ہی نہ ہونے دے۔

نواز نے پھر کہا۔ ''الیاس بھائی آپ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔ بس نارمل رہیں۔ آپ میری بات کو سمجھ رہے ہیں ناں۔''

''جی میں سمجھ رہا ہوں۔''

''میں فون بند کر رہا ہوں اور پھر کہتا ہوں آپ نارمل رہیں۔ اگر کل صدف کہیں جانے کا کہے تو اسے جانے دیں بس مجھے فون کر کے بتا دیں۔'' نواز نے تاکید کی اور فون بند کر دیا۔

الیاس سے بات کرنے کے بعد نواز مسکرایا اور خراماں خراماں چلتا ہوٹل سے باہر نکل گیا۔

☆......☆

صدف اپنے فلیٹ میں پہنچی تو الیاس ٹیلی ویژن دیکھ رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر صدف کا استقبال کیا اور بولا۔ ''بہت دیر کر دی تم نے؟''

''کتاب کی رونمائی میں دیر ہو ہی جاتی ہے۔ جیسے ہی تقریب ختم ہوئی میں فوراً نکل پڑی تھی۔'' صدف نے بتایا۔

''کھانا کھایا......؟''

''آپ نے کھا لیا؟''

''میں تمہارا انتظار کرنے کے بعد کھا چکا ہوں۔ فریج میں پلاؤ پڑا ہے۔ میں تمہارے لیے بھی لے آیا تھا۔''

''مجھے بھوک لگی تو میں گرم کر کے کھا لوں گی۔'' صدف نے کہا اور بیڈ روم میں چلی گئی۔ الیاس اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جونہی وہ اندر گئی الیاس کے چہرے کی مسکراہٹ معدوم ہو گئی اور اس کی جگہ غصے نے لے لی۔

☆......☆

وہ بیڈ پر لیٹی ایک میگزین دیکھ رہی تھی کہ فون گنگنا اٹھا۔ اس نے ریسیور کا بٹن دبایا تو دوسری جانب سے نواز کی آواز آئی۔ ''کچھ دیر کے لیے میرے دفتر آ جائیں۔ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

صدف اس تذبذب میں رہی کہ اسے نواز کی طرف جانا چاہیے، یا وہ فون کر کے معذرت کر لے۔ پھر اسے نواز کی کہی ہوئی باتیں یاد آئیں تو اس نے سوچا کہ نواز اچھی سمجھ کا مالک ہے۔ مجھے اس کے پاس جانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی اہم بات کرنا چاہتا ہو۔

یہ سوچ کر صدف تیار ہوگئی۔ تیار ہونے کے بعد اس نے اپنے موبائل فون سے الیاس کو کال کی۔ تھوڑی دیر کے بعد الیاس نے فون اُٹھایا تو صدف نے بتایا۔ ''میں احمد نواز کی طرف جا رہی ہوں۔ وہی احمد نواز جن سے مشاعرے میں تعارف کرایا تھا۔ یاد آیا۔''

''ان کے پاس کیوں جانا ہے؟''

''رات تقریب میں انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ان کے آفس آؤں۔ شاید وہ میرے مجموعہ کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ میرے مجموعہ کی بات ایک اور ادارے سے ہو چکی ہے لیکن میں نے پھر بھی سوچا کہ ان سے مل لوں۔ کیا میں چلی جاؤں۔''

''ہاں چلی جاؤ..... جلدی آجانا۔'' الیاس نے کہا۔ رابطہ منقطع ہوتے ہی الیاس نے اسی وقت نواز کو فون کیا۔

رابطہ ہوتے ہی بولا۔ ''صدف کو آپ نے اپنے آفس بلایا ہے؟''

''میں نے......؟'' نواز چونکا۔ ''میں نے تو نہیں بلایا۔ کیوں کیا ہوا؟''

''ابھی مجھے صدف کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ آپ سے ملنے آپ کے آفس جا رہی ہے۔ آپ نے ان کو بلایا ہے۔''

''آپ اگر فری ہیں تو میرے آفس آجائیں۔ ہم دونوں دیکھتے ہیں کہ وہ یہاں آتی ہے یا کہیں اور جاتی ہے۔ میں آپ کو پیچھے بیٹھا دوں گا۔'' نواز نے کہا۔

''میں ابھی پانچ منٹ میں آپ کے پاس آرہا ہوں۔'' الیاس نے کہا۔

نواز نے الیاس سے بات کرنے کے بعد صدف کو کال کردی۔ ''کیا آپ میری طرف آرہی ہیں؟''

''میں رکشا میں بیٹھی آپ ہی کی طرف .... آرہی ہوں۔'' صدف نے بتایا۔

''آپ نے میرا دوسرا آفس دیکھا ہے جو پچھلی گلی کی طرف ہے۔'' نواز نے پوچھا۔

''آپ نے ایک بار بتایا تھا وہ کیفے کے اوپر ہے۔''

''بالکل وہی..... آپ وہاں آجائیں۔'' نواز نے کہہ کر فون بند کردیا۔ دس منٹ میں الیاس بھی آگیا۔ نواز نے اسے پچھلے کمرے میں بیٹھا دیا جہاں شیشہ لگا ہوا تھا جس سے باہر تو دیکھا جا سکتا تھا لیکن اندر کمرے میں دیکھنا ناممکن تھا۔

☆......☆

صدف اس کے دوسرے آفس پہنچ گئی تھی۔ وہاں ایک لڑکی ملازمہ تھی جس نے صدف کو بٹھایا اور اس کے لیے چائے تیار کرنے لگی، ساتھ ہی اس نے نواز کی ہدایت کے مطابق صدف کی آمد کا نواز کو میسج کردیا۔

آدھا گھنٹا گزر گیا صدف اس آفس میں نہیں آئی۔ نواز یہ کہہ کر اُٹھ گیا کہ وہ اسی جگہ بیٹھا رہے وہ تب تک اپنا ایک کام نمٹا کے آتا ہے۔ الیاس اسی جگہ جم کر بیٹھ گیا۔

نواز سیدھا صدف کے پاس چلا گیا۔ وہ خوش اخلاقی سے اس سے باتیں کرتا رہا، اور پھر کتاب کا مسودہ لینے کی بات چھیڑ دی۔

صدف نے کہا۔ ''اس کے لیے تو معذرت، میری ایک پبلشر سے بات ہو چکی ہے۔''

''لیکن میں نے آپ کو بہت پہلے پیشکش کی تھی۔'' نواز جلدی سے بولا۔

''آپ نے پیشکش ضرور کی تھی، لیکن میں نے ہامی نہیں بھری تھی اور نہ ہی آپ سے کوئی وعدہ کیا تھا۔''

''وہ کون پبلشر ہے؟''

''فی الحال وقت آنے پر بتاؤں گی۔'' صدف مسکرائی۔

''گھر میں سب ٹھیک چل رہا ہے؟'' نواز نے موضوع بدلا۔

''ابھی تو ٹھیک ہے۔'' صدف نے جواب دیا۔

اس کے بعد نواز نے دوسرے مجموعہ کی بات شروع کردی اور بضد ہو گیا کہ وہ دوسرا مجموعہ اسے ہی دے۔ صدف نے اس بار بھی ہامی نہیں بھری اور بات کو ٹال گئی۔

نواز نے صدف کو بہت سی کتابیں اور ایک گفٹ پیک بھی دیا۔ صدف کے انکار کرنے کے باوجود نواز نے اسے زبردستی دے دیا۔ وہ اجازت لے کر چلی گئی اور نواز وہاں سے اُٹھ کر الیاس کے پاس چلا آیا۔

نواز بڑی ہوشیاری سے کھیل کھیل رہا تھا۔ وہ صدف کے حسن اور صلاحیتوں کا دیوانہ بن چکا تھا۔ اسے ضد چڑھ گئی تھی کہ وہ اسے حاصل کر کے رہے گا۔

نواز نے الیاس کے پاس پہنچ کر پوچھا۔ ''صدف تو نہیں آئی......ایک بار اسے فون کر کے تو پوچھو کہ وہ کہاں ہے۔لیکن اچھے لب و لہجے کے ساتھ پوچھنا۔'' نواز نے اشارہ کیا کہ وہ موبائل فون کا اسپیکر آن کر لے۔

الیاس نے صدف کو فون کیا۔ جونہی اس سے رابطہ ہوا۔ الیاس نے سوال کیا۔

''کہاں ہو......؟''

''میں ابھی احمد نواز کے آفس سے نکلی ہوں اور واپس جا رہی ہوں۔'' صدف نے جواب دیا۔

جواب سنتے ہی غصے کا تیز اور شکی مزاج الیاس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ لیکن نواز نے اسے ٹھنڈا رہنے کا اشارہ کیا۔

''ٹھیک ہے میں بھی کچھ دیر میں پہنچ رہا ہوں۔'' الیاس نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

''اب تم جو چاہو کر سکتے ہو۔لیکن اگر میرا کہیں نام آیا تو میں صاف مکر جاؤں گا اور اس کے سامنے کہہ دوں گا کہ تم میرے پاس نہیں آئے تھے کیونکہ مجھے اپنے آپ کو بھی بچائے رکھنا ہے، میں تم لوگوں کے معاملے میں فریق نہیں بننا چاہتا۔'' نواز نے اطمینان سے کہا۔ الیاس اُٹھا اور باہر نکلتا چلا گیا۔

☆......☆

صدف کچھ دیر قبل ہی فلیٹ میں پہنچی تھی۔ اس نے نواز سے ملنے والی تمام کتابیں اپنی دوسرے کتابوں کے ساتھ رکھ دیں اور وہ گفٹ پیک کھولا جو اسے نواز نے دیا تھا۔

اس بند ڈبے میں لیڈی پرفیوم اور ایک کارڈ تھا جس پر سرخ رنگ کا دل بنا ہوا تھا۔ اس کارڈ پر کچھ نہیں لکھا تھا۔ صدف اس کارڈ کو دیکھتے ہوئے نادانستہ مسکرا دی۔ اسی وقت الیاس نے کال بیل بجائی۔ صدف نے وہ سب اسی جگہ رکھا اور دروازہ کھولنے چلی گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس وقت الیاس ہوگا۔ جونہی اس نے پوچھا 'کون ہے' باہر سے الیاس کی آواز آئی تو اس نے دروازہ کھول دیا۔ الیاس نے اندر آتے ہی دروازہ بند کیا اور اپنے غصے کو دبانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کہاں گئی تھیں؟''

''میں احمد نواز کے آفس میں تھی۔''

''جھوٹ مت بولو اور مجھے بتاؤ کہ تم کہاں تھی۔'' اس بار الیاس کا لہجہ بلند ہو گیا۔ اور ساتھ ہی الیاس کی نظر اس دل والے کارڈ پر پڑی۔ وہ اس طرف بڑھا اس نے پرفیوم دیکھا اور پھر کارڈ اُٹھا لیا۔

''تم یہ تحفے لینے گئی تھیں محبت بھرے کارڈ کو وصول کرنے گئیں تھی۔'' الیاس چیخا۔

''کیا کہہ رہے ہو۔ یہ مجھے......'' صدف کو حیرت ہوئی۔ لیکن الیاس کا ہاتھ اس پر اُٹھ چکا تھا۔

☆......☆

الیاس کے تشدد نے صدف کو زخمی کر دیا تھا۔ اس کا چہرہ سوجھ چکا تھا اور جسم میں بھی درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ الیاس کو آفس سے کال آ گئی تھی اس لیے وہ دروازہ باہر سے لاک کر کے چلا گیا تھا۔

صدف بمشکل اُٹھی اس نے اپنے کپڑے ایک بیگ میں رکھے اور ایک اہم فیصلہ کر لیا۔ الیاس نے اس کی ایک نہیں سنی تھی، اسے بولنے کا بھی موقعہ نہیں دیا تھا۔ صدف کا سچ اس کے غصے اور تشدد میں دب گیا تھا۔

سامان بیگ میں رکھنے کے بعد صدف نے سوچا کہ وہ کہاں جائے۔ اس شہر میں اس کے کچھ رشتے دار تھے لیکن اس کے ماں باپ اور بھائی دوسرے شہر میں مقیم تھے۔ صدف نے سوچا کہ وہ اس حال میں ان کے پاس جانے کی بجائے کہیں اور چلی جائے۔ اپنے اوپر ہونے والے تشدد کو وہ فی الحال اپنے گھر والوں پر عیاں نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جائے۔ ایک احمد نواز ہی تھا جس کے پاس وہ جا سکتی تھی۔ وہی ایک تھا جو ان کے گھریلو حالات سے واقف تھا۔ صدف نے باہر کے دروازے کی دوسری چابی نکالی تبھی اس کی نظر اپنے موبائل فون پر پڑی، اس نے اپنا موبائل فون اُٹھا لیا، اپنا بیگ پکڑ کر دروازے کا لاک اندر سے کھولا اور باہر نکل کر پھر لاک کر دیا۔ پھر وہ سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ اس نے اپنا سارا ضروری سامان لے لیا تھا لیکن اس کے مجموعے کا مسودہ اسی دراز میں رہ گیا تھا۔

☆......☆

ٹیکسی میں بیٹھنے سے قبل صدف نے اپنی ماموں زاد کو فون کر کے کہا۔ ''مجھے ایک دو روز کے لیے رہائش چاہیے۔ الیاس ایک ہفتے کے لیے کمپنی کی جانب سے دبئی گئے ہیں۔ اکیلے گھر میں مجھ سے رہا نہیں جائے گا۔ امی کے پاس جاؤں تو واپسی میں دیر لگ جائے گی۔''

''یار یہ گھر تمہارا ہی ہے۔ چلی آؤ۔ عادل بھی اسلام آباد گئے ہیں۔''

اگلے روز وہ نواز سے ملنے پہنچی تو وہ سمجھ گیا کہ اس کا کھیل کامیاب ہو گیا ہے۔

اس نے صدف کی حالت دیکھ کر تاسف بھرے لہجے میں بولا۔

''مجھے اسی کا ڈر تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ حسد کا مارا آپ کی عزت کو برداشت نہیں کر سکے گا۔''

''میں چاہتی تو اپنے ماں باپ کے پاس چلی جاتی لیکن میں اس حالت میں ان کے پاس جانا نہیں چاہتی۔'' صدف کہتی ہوئی رو دی۔

''آپ بے فکر ہو جائیں۔'' نواز نے کہا۔

''آپ سے درخواست ہے۔ کسی کو بتایئے گا نہیں کہ میں آپ سے ملنے آئی تھی۔ آپ کیونکہ سب کچھ جانتے تھے اس لیے میں آپ کے پاس آ گئی۔''

''آپ کا دل کیسا ہے؟ اتنا کچھ سہہ کر بھی آپ اس بدبخت کی عزت پر کوئی حرف نہیں آنے دینا نہیں چاہتیں۔''

صدف چپ بیٹھی رہی۔ اسے الیاس کے اس وحشیانہ رویے پر کرب تھا۔ نواز اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ لیکن وہ دل ہی دل میں بہت خوش تھا کہ اس کی چال کامیاب ہو گئی اب صدف کو وہ کہیں جانے نہیں دے گا۔

اچانک صدف کا فون بجا تو اس نے دیکھا دانش کا نمبر تھا۔ اس نے فون کان کو لگا لیا دوسری طرف سے آواز آئی۔

''میں دانش بول رہا ہوں میم...... کل آپ نے مجھے کتاب کا مسودہ دینا ہے۔ کل ہی میں آپ کے شہر آ رہا ہوں۔ چیک بھی لیتا آؤں گا۔''

''ٹھیک ہے آپ آ جائیں۔'' فون بند کرنے کے بعد صدف کو یاد آیا کہ وہ مسودہ تو اپنی دراز میں ہی بھول آئی ہے۔ وہ سوچنے لگی کہ اس مسودے کے اسے اچھے خاصے پیسے مل رہے ہیں۔ ابھی پیسوں کی ضرورت بھی ہے۔ کیوں نہ وہ جا کر اپنا مسودہ لے آئے۔ اب اگر الیاس نے اس پر ہاتھ اُٹھایا تو وہ اپنی کمزوری نہیں دکھائے گی۔

☆......☆

الیاس فلیٹ میں پہنچا تو صدف نہیں تھی۔ اس نے ایک ایک کمرا دیکھا۔ اس نے اپنا موبائل فون نکال کر صدف کو کال کی لیکن صدف نے اس کی کال ریسیو نہیں کی۔ الیاس نے نواز کو فون کر دیا۔

''صدف جانے کہاں چلی گئی ہے۔''

''آپ نے سلوک کیا کیا تھا اس کے ساتھ؟ چیخ پکار ہوئی تھی کہ کچھ بات آگے بھی بڑھ گئی تھی؟''

''بس ایسے ہی ہاتھ اُٹھ گیا تھا۔ زیادہ نہیں مارا۔ اب آپ دیکھیں وہ آپ کا کہہ کر جاتی ہے اور جانے کس سے ملتی ہے۔''

''اس بات پر تو آپ حق پر ہیں۔''

''اسے فون کر رہا ہوں لیکن وہ بات نہیں کر رہی ہے۔''

''اتنا کچھ ہونے کے باوجود اسے فون کر رہے ہو۔ خیر یہ بتائیں آپ کہاں ہو اس وقت؟''

''میں اپنے فلیٹ میں ہوں۔''

''میں ابھی آپ کے پاس آتا ہوں۔'' نواز کہہ کر مسکرایا اور اپنا ہاتھ اپنی گاڑی کی طرف بڑھا دیا۔

☆......☆

الیاس بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس نے صدف کو تشدد کا نشانہ بنا تو دیا تھا اب وہ اس بات سے ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں اس کے گھر والے اس کے خلاف کوئی ایسا ردِعمل ظاہر نہ کر دیں جس سے اس کے لئے پریشانی ہو جائے۔ ان باتوں کے باوجود اسے ابھی تک صدف پر غصہ تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد نواز بھی آ گیا۔ دونوں کمرے میں بیٹھ گئے۔ نواز اس سے ساری کارروائی سننے لگا۔ جب الیاس ساری بات سنا چکا تو نواز نے کہا۔

''وہ بتاتی کچھ ہے، جاتی کہیں اور ہے، اور آپ اس کو فون کر رہے ہو۔ اب بھی آپ اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں؟''

''اب تو اسے رکھنے کا کوئی جواز ہی نہیں بنتا۔''

''پھر دیر کس بات کی، اسے طلاق دے کر فارغ کر

شمارہ نومبر 2017ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش......آپ کا انتخاب

☆اول: صاحب جی نعیمہ سلیم (کراچی)

☆دوم: خوش بخت ابرار احمد (کراچی)

☆سوم: دل والا ڈاکٹر عظمیٰ (فیصل آباد)

پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

دیں۔ آپ جوان ہیں کسی دوسری لڑکی سے شادی کرلیں۔'' نواز بولا۔
''شادی تو میں کروں گا۔ ڈنکے کی چوٹ پر کروں گا۔'' الیاس نے کہا۔
''میرا دوست وکیل ہے۔ میں اسے فون کرتا ہوں، وہ طلاق کے تمام معاملات حل کردے گا۔'' نواز نے اپنی جیب سے موبائل فون نکالا۔
''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''
''کیا مطلب؟ وکیل کی ضرورت نہیں ہے؟'' نواز نے اس کی طرف دیکھا۔
الیاس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ''میں اسے بساؤں گا بھی نہیں اور چھوڑوں گا بھی نہیں۔''
''کیا مطلب......؟''
''میں اسے طلاق نہیں دوں گا۔ عدالت جائے گی تو اسے وہاں گھسیٹوں گا، اور اپنے گھر بھی نہیں بساؤں گا، اور خود یوں شادی کروں گا یوں۔'' اس نے کہہ کر چٹکی بجائی۔
نواز نے سوچا تھا اب وہ اسے طلاق دے دے گا اور اس کے بعد وہ صدف کو اپنی باتوں کے حصار میں لے کر اس سے شادی کرلے گا۔ اس صدف سے جس کے حسن کا وہ دیوانہ تھا، جس کی صلاحیتوں اور شاعری کو وہ پسند کرتا تھا، جس کی شاعری کو وہ چھاپ کر اپنا کاروبار چمکائے گا۔
''یہ کیا بات ہوئی آپ ایسا مت کرو۔ اسے طلاق دے کر فارغ کرو۔ اب یہ قصہ ختم کرو۔'' نواز نے زور دیا۔
''ضد کا میں بھی پکا ہوں۔ طلاق نہیں دوں گا۔ اسے کسی قابل بھی نہیں چھوڑوں گا۔'' الیاس نے مصمم ارادے سے کہا۔
نواز نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ الیاس کے لب و لہجے سے صاف عیاں تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے وہ کر دکھائے گا۔ نواز کے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی۔ اس طرح تو اس کا کھیل ادھورا رہ جاتا۔ وہ صدف کو اپنا ہی نہیں سکتا تھا۔ نواز نے متانت سے پوچھا۔ ''یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟''
''بالکل میرا یہی فیصلہ ہے۔'' الیاس بولا۔
نواز اپنی جگہ سے اٹھا اور سوچتے ہوئے بولا۔ ''اس طرح تو میرا مقصد پورا نہیں ہوگا۔ میں تم دونوں کو جو آئینہ دکھاتا رہا اس کا کیا فائدہ ہوگا؟ صدف کو طلاق دینی بہت ضروری ہے ورنہ میری محنت تو ضائع ہوجائے گی۔''
''کیا مطلب، کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' الیاس نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔
نواز آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے عقب میں چلا گیا۔ وہ اپنی ٹائی کی گرہ بھی کھول رہا تھا۔ پھر ایک دم اس نے اپنی ٹائی الیاس کے گلے میں لپیٹ دی اور دباؤ پوری قوت سے بڑھا دیا۔ الیاس کے لیے یہ سب غیر متوقع تھا۔ اس کی سانس رکنے لگی اور آنکھیں باہر نکلنے لگیں۔ وہ مزاحمت کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگا۔ لیکن نواز کی گرفت بہت مضبوط تھی۔
نواز ساتھ ہی ساتھ بول بھی رہا تھا۔ ''اگر تم طلاق نہیں دو گے تو میں اس سے شادی کیسے کروں گا...... میں نے جو تجھے صدف کے بارے میں بتایا وہ جھوٹ تھا تاکہ تم اسے چھوڑ دو اور میں اسے اپنالوں۔ بہتر ہے کہ اب تم مرجاؤ۔ مجھے تمہارے فلیٹ میں آتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا اور نہ مجھے کوئی جاتے ہوئے دیکھے گا......''
اس سے پہلے کہ نواز اسے گلا گھونٹ کر مار دیتا ایک دم نواز کے سر پر کوئی وزنی چیز لگی اور اس کی گرفت ڈھیلی ہوگئی۔ وہ بے ہوش ہوکر نیچے گر گیا۔
الیاس نے اپنے گلے کے گرد سے ٹائی کا پھندا نکالا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ جب اس کی سانس بحال ہوئی تو اس نے دیکھا سامنے صدف کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ہاکی اسٹیک تھی جسے الیاس بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس نے الیاس کو اپنی طرف دیکھتے پا کر اسٹیک فرش پر رکھی اور دروازے کے قریب پڑی فائل اٹھالی جس میں اس نے اپنی غزلیں اور نظمیں لکھ کر دراز میں رکھی تھی۔
''میں اپنی فائل لینے آئی تھی...... دروازہ کھلا تھا۔ اچھا ہوا تم نے حقیقت اس کے منہ سے سن لی، تمہیں جلدی خلع کا نوٹس مل جائے گا۔''
صدف یہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھی تو الیاس اسے رکنے کے لیے آوازیں دینے لگا۔
''صدف...... صدف رک جاؤ۔''
صدف ایک لمحے کے لیے رکی اور بولی۔ ''اب جو سننا اور سنانا ہے وہ اس کالی بھیڑ سے ہی کہنا۔''
صدف باہر نکل گئی۔ وہ سیدھی ماموں زاد کے گھر گئی وہاں سے اپنا سامان اٹھایا اور اسٹیشن کی طرف چل دی تاکہ ماں باپ کے سامنے اپنا مقدمہ رکھ سکے۔